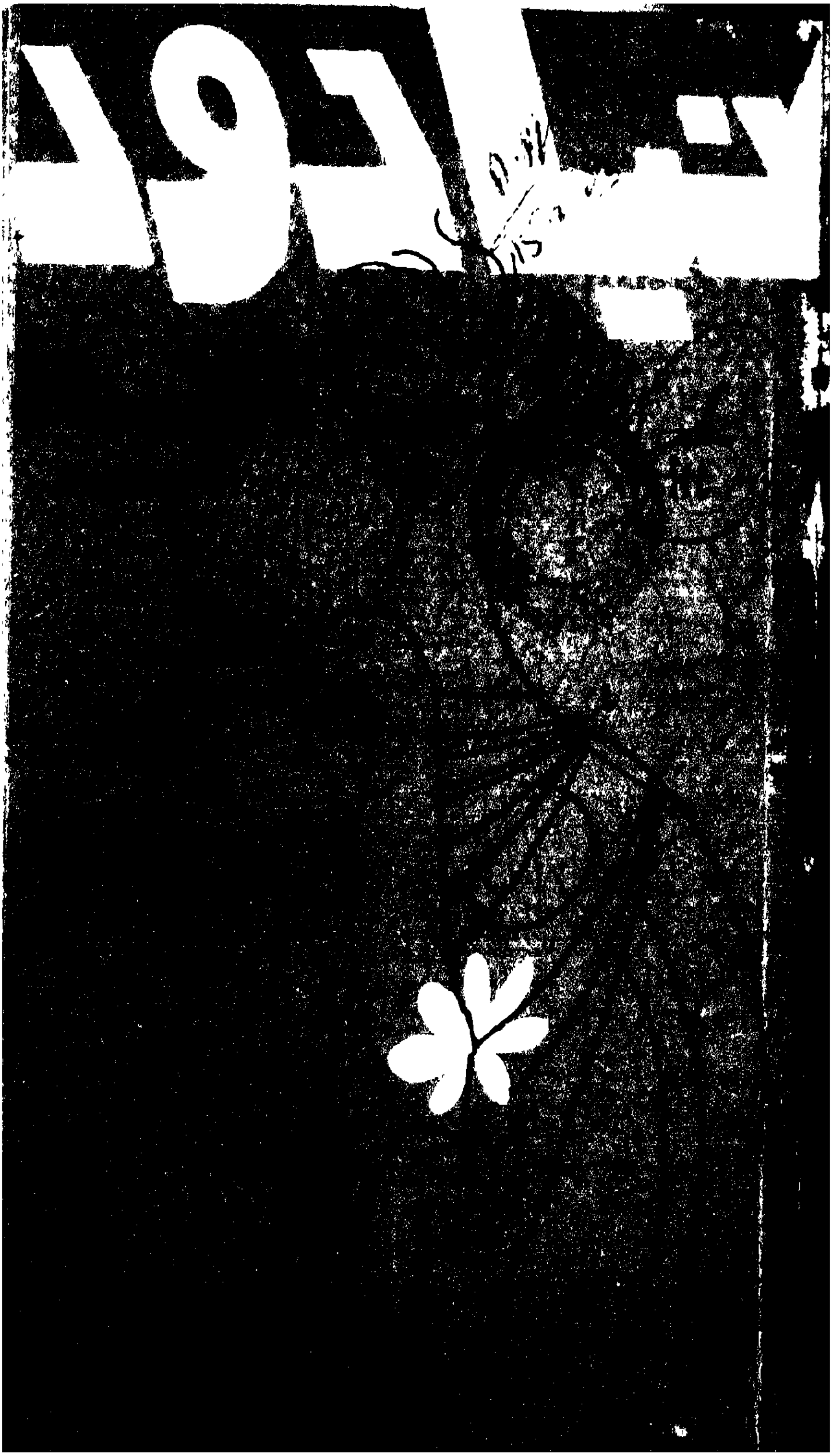
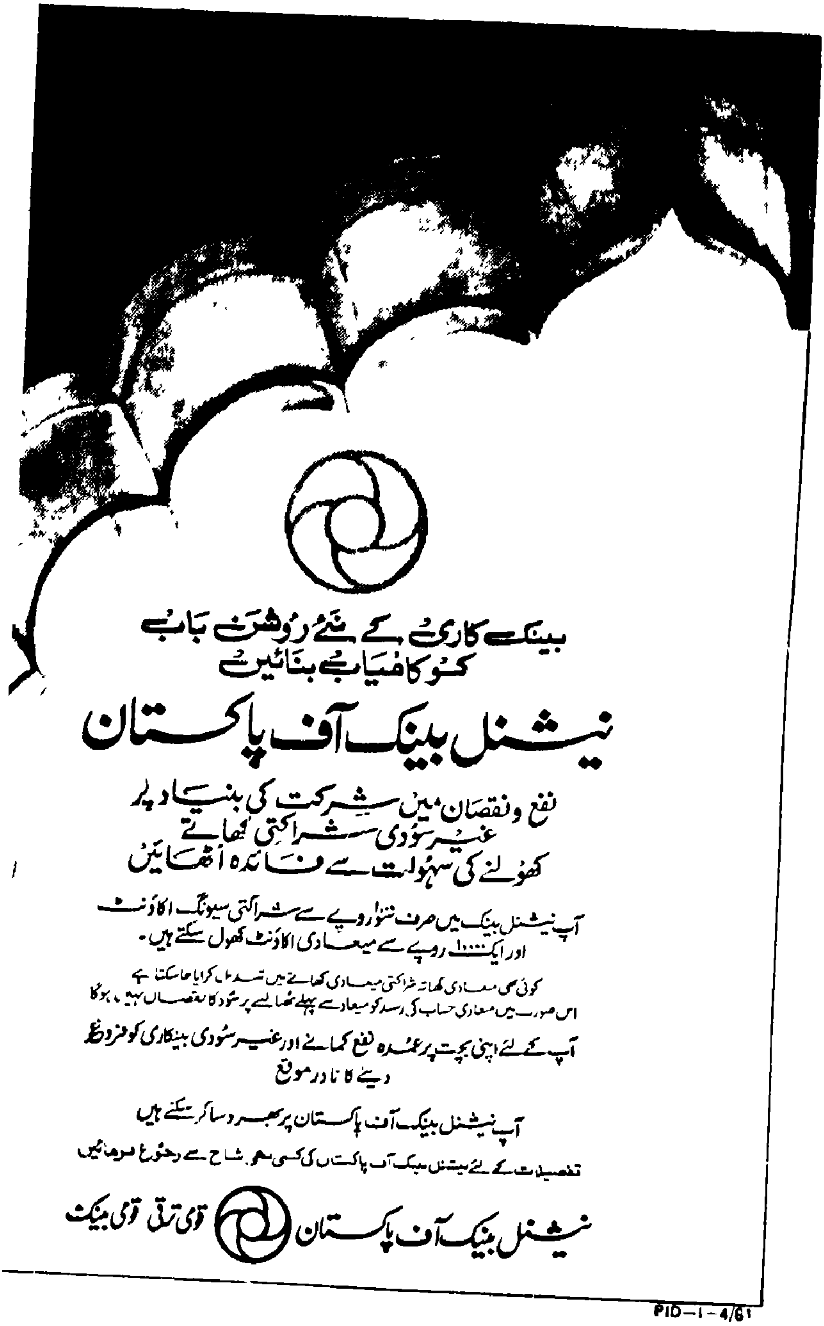



بینک کاری کے نئے روشن باب
کو کامیاب بنائیے
نیشنل بینک آف پاکستان
نفع و نقصان میں شرکت کی بنیاد پر
غیر سودی شراکتی کھاتے
کھولنے کی سہولت سے فائدہ اٹھائیں
آپ نیشنل بینک میں صرف سو روپے سے شراکتی سیونگ اکاؤنٹ
اور ایک 1000 روپے سے میعادی اکاؤنٹ کھول سکتے ہیں۔
کوئی سی معیادی کھاتہ شراکتی میعادی کھاتے میں تبدیل کرایا جاسکتا ہے
اس صورت میں معیادی حساب کی رسید کو میعاد سے پہلے تڑوالینے پر سود کا نقصان نہیں ہوگا
آپ کے لئے اپنی بچت پر عمدہ نفع کمانے اور غیر سودی بینکاری کو فروغ
دینے کا نادر موقع
آپ نیشنل بینک آف پاکستان پر بھروسا کر سکتے ہیں
تفصیلات کے لئے نیشنل بینک آف پاکستان کی کسی بھی شاخ سے رجوع فرمائیں
نیشنل بینک آف پاکستان
قومی ترقی قومی بینک

PID—1—4/81

نیا دور کراچی

شمارہ نمبر

۷۳ — ۷۴

افسانہ نمبر

قیمت:- تیس روپے

شائع کردہ:- پاکستان کلچرل سوسائٹی. کراچی

ادارہ

قمر سلطانہ

جمیلہ ہاشمی

خاور جمیل

ترتیب

افسانے

افسانے

تبصرے

کتابیں جن پر تبصرے کئے گئے

مبصرین

ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش	عالم صدیقی	ذہین عالم خاں
سجاد باقر رضوی	ڈاکٹر جمیل جالبی	نکہت حسن
ریاض صدیقی	شمیم احمد	فیض احمد فیض

اداریہ

لیجئے نیا دور کا "افسانہ نمبر" حاضر ہے۔ اس افسانہ نمبر میں ۴۲ افسانے شامل ہیں اور افسانہ نگاروں کی فہرست میں، چند کو چھوڑ کر کم و بیش آپ کے سب محبوب اور پسندیدہ نام شامل ہیں۔ اس نمبر میں سب کہانیاں اچھی اور پڑھنے کے لائق ہیں اور اس اعتبار سے نیا دور کا یہ افسانہ نمبر اس دور کی بہترین کہانیوں کا نمائندہ شمارہ ہے۔ ان کہانیوں میں ایسی کہانیاں بھی شامل ہیں جن میں افسانہ نگار نے حقیقت پسندانہ نظر سے زندگی کو دیکھا ہے اور ایسی کہانیاں بھی جن میں زندگی کو علامات و استعارات کے حوالے سے پیش کیا ہے یا ایسی کہانیاں بھی جن میں کہانی پن ہے اور ایسی کہانیاں بھی جن میں کہانی پن نہ ہوتے ہوئے بھی کہانی پڑھنے والے کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ ایک بات اور اس افسانہ نمبر کی پہلی کہانی ڈاکٹر احسن فاروقی کی آخری کہانی ہے جو مرحوم نے اپنی وفات سے کچھ عرصے پہلے لکھی تھی اور ان کی وفات کے تقریباً دو سال بعد پہلی بار شائع ہو رہی ہے۔ عزیز احمد مرحوم کی کہانی "جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں" برسوں پہلے نیا دور میں شائع ہو کر انتہائی مقبول ہوئی تھی۔ مرحوم نے اپنی زندگی میں ہم سے فرمائش کی تھی کہ اس افسانے کو نیا دور میں ایک بار پھر شائع کر دیا جائے۔ عزیز احمد اب ہم میں نہیں ہیں لیکن ان کا یہ افسانہ دوبارہ شائع کر کے ہم ان کی وصیت کو پورا کر کے خوشی محسوس کر رہے ہیں۔ یہ افسانہ اردو زبان کے اُن افسانوں میں سے ایک ہے کہ جب بھی اور جتنی بار پڑھا جائے گا یوں معلوم ہوگا کہ پہلی بار پڑھا جا رہا ہے۔

گزشتہ دس سال میں اُردو افسانے نے بہت ترقی کی ہے۔ موضوع، تکنیک اور اسلوب کی سطح پر بہت سے نئے تجربے ہوئے ہیں۔ بہت سے نئے افسانہ نگاروں نے اپنی تازہ دم تخلیقی صلاحیتوں سے اردو افسانے کو ایک نیا اعتماد اور وقار دیا ہے۔ نیا دور ان سب نئے افسانہ نگاروں کو خوش آمدید کہتا ہے۔ نیا دور نے بدلتے ہوئے حقیقی رجحانات کا ہمیشہ ساتھ دیا ہے اور اچھے اور سچے نئے لکھنے والوں کو آگے بڑھایا ہے مگر ہم تاشے باجے کے قائل نہیں ہیں۔ یہ عمل آج بھی جاری ہے۔ ہم نئے لکھنے والوں کو ایک بار پھر دعوت دیتے ہیں کہ وہ اپنی تخلیقی سچائیوں کو محنت و ریاضت سے بروئے کار لائیں۔ نیا دور کے صفحات ان کے لئے حاضر ہیں۔

ہمیں اس بات کا اعتراف ہے کہ نیا دور باقاعدگی سے شائع نہیں ہو رہا ہے لیکن اب ہم نے ایسے انتظامات کر لئے ہیں کہ نیا دور ہر تیسرے مہینے مقررہ تاریخ پر شائع ہو سکے۔ اس سلسلے میں ایک تبدیلی ہم یہ کر رہے ہیں کہ نیا دور کی ضخامت کم کر کے اسے ڈیڑھ سو دو سو صفحے تک محدود کر دیں تاکہ ایک طرف وہ وقت پر شائع ہو سکے اور

دوسری طرف اس کی قیمت بھی اتنی ہو کہ ہر شخص آسانی سے خرید سکے۔ نفع کمانا نہ پہلا مقصد ہے اور نہ کبھی رہا ہے۔ کاغذ کی گرانی، اچھے کاتبوں کی کمیابی، طباعت کی مہنگائی نے ادبی رسائل کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ ادبی رسائل علم و ادب کے وہ چراغ ہیں جن کی روشنی میں معاشرہ اپنا راستہ تلاش کرتا ہے اور زندگی آگے بڑھتی ہے۔ ادبی رسائل کی زندگی و ترقی کے ساتھ معاشرے کی زندگی و ترقی وابستہ ہے۔ ادبی رسائل ہی معاشرے کو وسعت دیتے ہیں، ذہن کو نئے عصری تقاضوں سے باخبر رکھتے ہیں اور قوم کی تخلیقی قوتوں کو پروان چڑھاتے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ دنیا کے ہر معاشرے میں یہ کام ادبی و فکری رسائل ہی نے انجام دیا ہے۔ کیا ہم تہذیب الاخلاق، مخزن، معارف، الناظر، نگار، ہمایوں، ساقی، ادب لطیف، ادبی دنیا وغیرہ کی ذہنی و فکری، ادبی و علمی خدمات کو فراموش کر سکتے ہیں؟ ادبی رسائل کا ہمارے معاشرے میں ایک ایک کر کے دم توڑنا ایک ایسا رجحان ہے جس کی طرف فوراً توجہ دینی چاہیے۔ ضروری ہے کہ حکومت ان رسائل کی سرپرستی کرے۔ لائبریریوں کو خصوصی ہدایت جاری کرے کہ وہ انہیں خریدیں۔ اہل قلم کانفرنس کی سب کمیٹی نے صدر مملکت کو جو سفارشات پیش کی تھیں ان میں ادبی رسائل کے مسائل بھی شامل تھے۔ ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ادب کے خوش ذوق قارئین، جن کی ملک میں خاصی تعداد ہے، ادبی رسائل کو خرید کر پڑھیں تاکہ یہ رسالے زندہ رہیں اور وہ خدمات انجام دے سکیں جو ہر مہذب و زندہ معاشرے میں یہ آج تک دیتے آئے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ حکومت اور ادب کا ذوق رکھنے والے قارئین ان چراغوں کو بجھنے نہیں دیں گے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی عہد آفریں تصنیف

☆

تاریخِ ادبِ اردو

جلد دوم

(اٹھارویں صدی)

☆ اس جلد میں اٹھارویں صدی کے اردو ادب (نظم و نثر) کا مطالعہ اصل ماخذ کے حوالوں سے کیا گیا ہے۔

☆ اس جلد میں بھی آپ کو گہرا تاریخی شعور محسوس ہوگا جو تنقیدی فکر، تحقیقی و معروضی اندازِ نظر اور تخلیقی قوت سے مل کر ایک ایسی اکائی بناتا ہے جس کے آئینے میں اردو ادب کی روایت، اس کے سارے رجحانات، میلانات اور فکری و تہذیبی رویوں کی صاف و واضح تصویر سامنے آجاتی ہے۔

☆☆☆☆☆

مجلس ترقیِ ادب لاہور

تاریخِ ادبِ اردو کی جلد دوم کو اپنے مخصوص اندازِ طباعت کے ساتھ عنقریب شائع کر رہی ہے۔

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی

راکھ میں چنگاری

میں برتھ کی کھڑکی کے پاس والی سیٹ پر آرام سے بیر تھ پر بیٹھ گیا تھا اور سگار سلگا کر پینے لگا تھا کہ اور مسافر آنا شروع ہوئے۔ میں نے دیکھا کہ ایک جوان مرد اور اس کے ساتھ دو عورتیں ایک جوان گود میں بچہ لئے اور دوسری ادھیڑ، آکر میرے سامنے والی برتھ پر اسی طرح بیٹھے کہ بالکل میرے سامنے کھڑکی کے پاس مرد تھا اس کے پاس جوان عورت نے بچے کو لٹا دیا جو سو رہا تھا اور خود پاس بیٹھ گئی تھی۔ ادھیڑ عورت برتھ کے کنارے کی سیٹ پر سنبھل کر بڑے وقار کے ساتھ بیٹھ گئی۔ نہ معلوم کیوں میں اس عورت کو بڑے غور سے دیکھنے لگا۔ معلوم ہوا کہ جیسے کبھی پہلے کہیں دیکھا تھا اور یاد کرنے لگا کہ کب اور کہاں دیکھا تھا۔

اتنے میں دو اور مسافر آئے اور میری برتھ پر بیٹھ گئے۔ میں نے ان کو دیکھا۔ سگار کی طرف دھیان دیا کھڑکی کے باہر دیکھا میری نگاہ ایک مال گاڑی پر پڑی جو آہستہ آہستہ آ رہی تھی۔ نگاہ پلٹ کر پھر اس عورت پر آئی۔ اس کا چہرہ کافی ڈھلا ہوا تھا۔ گالوں کی کھال ڈھیلی تھی۔ آنکھوں کے نیچے حلقے تھے مگر پھر بھی اس میں ایک دلکشی تھی جو یہ یاد دلاتی تھی کہ ایسے ہی ایک چہرہ کو کبھی میں نے پسند کیا تھا بلکہ اس کے لئے بیقرار رہا تھا۔

ریل چھوٹ گئی۔ شہر کے تمام آثار نکل گئے۔ اب کھڑکی سے میں دور تک پھیلے ہوئے کھلے میدان کو دیکھ رہا تھا جو بالکل بنجر تھا اور جس پر ادھر ادھر ایک آدھ پہاڑی کھڑی نظر آ رہی تھی۔ اس خشک منظر پر میرے سامنے وطن کی ہری لہلہاتے کھیت بڑے بڑے گھنے درختوں کی قطار حلقہ بنائے ہوئے آجایا کرتی تھی۔ آج وہ بھی سب یاد آیا مگر بار بار نگاہ اس عورت پر آتی اور اس کا سر سے پاؤں تک جائزہ لیتی۔ اس کا پیٹ اور کولہے کافی پھیلے ہوئے تھے اور میرا دل ہمیشہ نازک نازک، دبلے دبلے جسموں پر لگتا تھا۔ کھڑکی کے باہر نظر کئے کئے مجھے وہ سب یاد آ گئیں جن پر میں نے جوانی میں خاص دھیان دیا تھا۔ پہلی نورا تھی جس کو بچپن ہی سے دیکھتا رہا تھا اور جو جوانی پر آکر ایسی دلکش ہو گئی تھی کہ اس کے سوا کسی کو دیکھتا ہی نہ تھا مگر وہ میری نہ ہو سکی تھی اور شادی ہونے کے سال بھر بعد بچہ ہونے میں مر گئی تھی۔

وہ میرے لیے حسن کا ماڈل رہی اور پھر جس کی طرف بھی دھیان گیا وہ کچھ نہ کچھ تو ضرور رہی اسی کی سی ہوئی پانچ کی صورتیں تصور میں کھینچیں اور مجھے غالب کا شعر یاد آیا۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں — خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہوگئیں

عرصے سے ان کے بابت سوچنا بھی ترک ہوگیا تھا مگر اب وہ سب اپنی اپنی مخصوص اداؤں کے ساتھ نورا کی صورت کا بنیادی ڈھانچہ لئے ہوئے آنکھوں کے سامنے پھر گئیں. میں نے پھر اس عورت کی طرف دیکھا۔ اس میں اور ان میں کسی طرح کی مشابہت نہ تھی۔

ایک طرف میں نے طے کیا کہ اس کو دیکھوں ہی نہیں مگر دوسری طرف کوئی قوت مجھے مجبور کرتی رہی کہ اسے ضرور دیکھوں اور یہ معلوم کروں کہ وہ ہے کون۔ اسی گومگو کے عالم میں مَیں نے یہ بھی محسوس کیا کہ وہ بھی کچھ کچھ دیکھ کے بعد میرا جائزہ لینے لگی تھی. میری صورت بھی جوانی کے زمانہ سے بہت بدل گئی تھی. میں بہت زیادہ دُبلا ہوچکا تھا گالوں میں گڑھے پڑ گئے تھے. آنکھوں کے نیچے جھرّیاں تھیں ماتھے پر نشان نمایاں ہوچکے تھے اور سر کے بال کافی حد تک سفید تھے. جوانی کے دوست اگر کہیں مل جاتے تو دیر ہی میں پہچان پاتے۔ اس لئے اسے بھی مجھے پہچاننے میں مشکل پڑ رہی تھی۔ مگر وہ نسائی طریقہ پر اپنی میری طرف توجہ نمایاں ہونے سے رک رک کر مجھے پہچاننے کی کوشش ضرور کر رہی تھی۔

میں نے چاہا کہ اس کی آنکھوں سے آنکھیں لڑاؤں اور ممکن ہے کہ ہم دونوں کو کچھ یاد آجائے مگر اس نے آنکھیں پھیر پھیر لیں اور کئی دفعہ تو رُخ بھی بدل لیا. میں سوچنے لگا کہ جوانی میں اس کا رنگ کُھلتا ہوا ہوگا اور اب بہت دھیما ہوگیا اور میں یاد کرنے لگا کہ پانچ میں سے کسی کا رنگ اس کے رنگ سے قریب بتایا جاسکتا تھا. پھر ناک کی شکل اور ہونٹوں کے خط پر غور کیا تو یاد آیا کہ ان پانچ کے علاوہ جو دل میں عرصہ تک بسی رہی تھیں ایک سلیمہ بھی تھی جس سے کچھ عرصے کے لئے کچھ لگاؤ ہوا تھا مگر وہ کچھ زیادہ اچھی نہیں لگی تھی. دو چار ملاقاتوں کے بعد وہ تن گئی تھی پھر نہ دکھائی دی تھی اور میں اس مقام سے جہاں وہ رہتی تھی ایسا الگ ہوا تھا کہ اس کے عزیزوں تک سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی. مجھے دو کوارٹر یاد آئے جن میں سے ایک میں میں اکیلا رہتا تھا اور دوسرے میں منظور صاحب ان کی بیوی اور لڑکی سلیمہ رہتی تھی. منظور صاحب نے میرے کھانے کا ذمہ لے لیا تھا اور سلیمہ دروازے کی آڑ سے ہاتھ بڑھا کر مجھے کھانے کی سینی دے دیا کرتی تھی. اس کے ہاتھ کوئی خاص حسن نہیں رکھتے تھے بلکہ گھر داری کا کام کرنے کی وجہ سے کچھ بدنما ہی ہوگئے تھے. میرا کبھی جی نہیں چاہا تھا کہ اس کی جھلک دیکھوں۔

ان ہاتھوں کا نقشہ میرے سامنے آیا اور میں نے اس عورت کے ہاتھوں کو غور سے دیکھا جو میرے

سامنے تھی۔ اس کے بعد بھی ایسے معلوم ہوتے جیسے میں نے کبھی پہلے ضرور دیکھے تھے مگر وہ بھی اب اس قدر بدل گئے تھے کہ ان کو پہچاننا مشکل تھا۔

اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ منظور صاحب مجھے ساتھ کھانا کھانے کے لئے اپنے گھر کے اندر بلا لیا کرتے تھے۔ ان کی بیوی باورچی خانے میں بیٹھی رہا کرتی تھی اور سلیمہ برقعہ اوڑھے ہوئے ہم لوگوں کو پانی وانی دیا کرتی تھی۔ کئی دفعہ ایسا ہونے کے بعد سلیمہ اکثر مجھے سینی دینے کے بجائے یہ کہہ کر "یہیں آکر کھا لیجئے" گھر کے اندر چلی جاتی۔ میں کمرے میں داخل ہو کر کھانا کھانے بیٹھ جاتا تو برقعہ میں لپٹی ہوئی آتی، پانی دیتی۔ ایک طرف مونڈھے پر بیٹھ جاتی اٹھ کر پانی دیتی اور جب میں کھانا کھا چکتا تو سینی لے کر چلی جاتی، میں اٹھ کر اپنے کوارٹر میں آجاتا۔

پھر ایک دن اس نے برقعہ کی نقاب الٹتے ہوئے کہا تھا "آپ سے کیا پردہ۔ آپ گھر کے ہیں"۔ اور میں نے اس کا چہرہ دیکھا تھا جو مجھے کسی طرح نہ پسند آیا تھا۔ اس چہرہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے آئی اور میں نے اس عورت کو دیکھا جو سامنے بیٹھی ہوئی اب مجھے زیادہ غور سے دیکھ رہی تھی اور اس کے چہرہ سے یہ معلوم ہو رہا تھا کہ کچھ یاد کرنے کی شاید کوشش کر رہی تھی۔

اک دم سے وہ اٹھی اپنے ساتھ کے جوان کو متوجہ کرتی ہوئی بولی۔ "شمو میرے ساتھ آؤ، لوٹا کدھر رکھا ہے؟"

جوان نے کھڑے ہو کر اوپر کی برتھ پر رکھی ہوئی ایک ٹوکری سے لوٹا نکالا اور اس کے ساتھ ساتھ باتھ روم کی طرف چلا گیا۔ اس عورت کی چال باوجود تبدیلی کے سلیمہ کی چال سے بہت کچھ مشابہ معلوم ہوئی۔ میں نے دل میں حساب لگایا تو منظور صاحب کے ساتھ رہنے والے زمانہ کو ستائیس برس ہو گئے تھے سلیمہ کو میں نے زیادہ تر برقعہ اوڑھے ہوئے آتے جاتے دیکھا تھا اور اس کی مخصوص چال کی مجھے بڑی پہچان ہو گئی تھی۔ برقعہ کے خاص طور پر چلنے سے ہی میں اسے پہچان لیا کرتا تھا۔ اب جو عورت میرے سامنے چلتی ہوئی گئی تھی وہ برقعہ نہیں اوڑھے تھی اور شلوار اور لمبا کرتہ پہنے تھی مگر اس کے پیروں کی حرکت اور چلنے کی رفتار میں کچھ ایسی بات ضرور تھی جس کی بنا پر میرا دل کہنے لگا "ہو نا ہو۔ یہ سلیمہ ہی ہو سکتی ہے۔"

سلیمہ کی یاد کے ساتھ ایک بڑا اہم واقعہ وابستہ تھا جو مجھے اکثر یاد آجایا کرتا تھا اور اس وقت بڑی شدت کے ساتھ حافظہ سے ابھر کر آنکھوں کے سامنے آگیا۔ وہ واقعہ یہ تھا کہ ایک رات کو مجھے نیند نہیں آرہی تھی میرے کوارٹر والے کمرے کی بجلی کھلی ہوئی تھی اور اندر کا دروازہ جو میں سوتے وقت بند کر دیتا تھا وہی

بھرا ہوا تھا کہ اک دم سے دروازہ کھلا اور سلیمہ دراتا گھستی چلی آئی۔ میرے پلنگ کے پاس اس طرح کھڑی ہوئی کہ اس کے پیروں کے پلنگ کی پٹی سے لڑنے کی دھمک محسوس ہوئی۔ میں نے اس کی طرف رخ کر کے اسے غور سے دیکھا۔ اس کا چہرہ عجیب قسم کی سرخی سے تمتمایا ہوا تھا۔ اور وہ بڑی نڈری سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ وہ اتنی اچھی معلوم ہوئی تھی کہ میں تجھ کو جس کے خیال میں تڑپ رہا تھا بھول گیا۔ اور میرا جی چاہا کہ اٹھ کر اسے پکڑ لوں اور اپنے پاس لٹالوں۔ مگر کسی پُر اسرار قوت نے مجھے روک لیا تھا اور میں بے بسی کے عالم میں اسے دیکھتا ہی رہا تھا۔ وہ تھوڑی دیر میری اس بے حسی کو دیکھتی رہی تھی۔ پھر اک دم سے پلٹ کر کمرے سے باہر چلی گئی تھی اور دروازے کے پٹ کو بڑی زور سے بند کر دیا تھا۔ اس آواز سے میں چونکا تھا اور میرے دل کا عجیب عالم ہو گیا تھا۔ ایک رات خیال آیا کہ وہ آپ سے آئی تھی اسے پکڑ لینا چاہیئے تھا۔ دوسری طرف خیال تھا کہ اگر پکڑ لیتا تو پھر زندگی بھر کے لئے پھنس جاتا اور پھر تجھ کیا کہتی میری بے وفائی پر کتنا روتی اور نہ معلوم کیا کیا کرتی۔ میں اٹھ کر دروازے پر آیا تھا اور اس کو کھول کر انگنائی میں نکل گیا تھا۔ سلیمہ کدھر سے آئی تھی؟ ضرور دیوار پھاند کر آئی تھی اسے مجھ سے اس قدر شدید محبت ہو گئی تھی کہ وہ یہ سب کر گزری تھی۔

اس سارے واقعے کی تصویر اور اس سے وابستہ تمام خیالات میرے ذہن میں گزر رہے تھے کہ وہ عورت باتھ روم سے واپس آئی۔ اب میں نے اسے اور اس نے مجھے بڑے غور سے دیکھا۔ میرے دل نے کہا "سلیمہ ہی ہے ستائیس برس میں اس قدر بدل گئی۔"

وہ اکیلی ہی واپس آئی تھی اور اپنی سیٹ پر بیٹھنے کے بجائے وہ آگے بڑھتی چلی آئی اور بالکل میرے سامنے کھڑکی کی طرف رُخ کر کے بیٹھ گئی۔ پھر مُڑ کر اس نے اپنے ساتھ کی جوان عورت سے کہا "میری ڈبیہ اور بٹوا کہاں ہے؟"

جوان عورت نے اٹھ کر اوپر کی برتھ پر رکھی ہوئی ٹوکری میں سے ڈبیہ اور بٹوا اسے نکال کر دیا۔ وہ پالتھی مارے بیٹھی ہوئی کھڑکی کے باہر دیکھتی رہی اور ڈبیہ سے پان نکال کر اور بٹوے سے اس میں ڈلی اور تمباکو ڈال کر منہ میں رکھنے لگی۔ اس وقت میرے اور اس کی آنکھیں چار ہو گئیں اور ایسی مسکراہٹ اس کے سارے چہرہ پر کھیلی کہ مجھے یقین ہوا کہ وہ مجھے پہچان گئی۔

میری ہمت ہوئی کہ میں بات کروں مگر اتنے میں وہ جوان آگیا اور اسے اپنی جگہ بیٹھا دیکھ کر بولا۔ "اماں آپ اِدھر بیٹھ گئیں۔ اچھا میں اُدھر ہی بیٹھ جاؤں گا۔" اور بیٹھتے ہی بولا "اچھا آپ پان کھا رہی ہیں"

ایسے مجھے بھی دیکھئے"

عورت نے ڈبیہ اور بٹوا کھول کر پان بنایا اور جوان اٹھ کر اس کے پاس آیا۔ پان منہ میں رکھ کر اس نے میری طرف رخ کیا اور اک دم سے میں نے اس سے پوچھا "میاں صاحبزادے آپ کون ہیں مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے آپ لوگوں کو کبھی کہیں دیکھا تھا۔"

جوان کچھ چکرا گیا اور کچھ کہنے ہی والا تھا کہ عورت بول اٹھی، "تم اس لڑکے کو کیا پہچان رہے ہو گے۔ اسے تم نے کبھی نہیں دیکھا۔ ہاں میں تمہیں پہچان گئی حالانکہ تم اب تک چکرا رہے ہو کہ میں کون ہوں"

جوان اب ہمارے درمیان سے ہٹ کر بیٹھ گیا اور میں اور وہ عورت آمنے سامنے ہو گئے۔ میں نے اپنی بڑائی ثابت کرنے کے لئے کہا "میں نے تم کو پہلی نظر ہی میں پہچان لیا تھا حالانکہ ستائیس برس میں تم بہت زیادہ بدل گئی ہو۔"

"باتیں بنا رہے ہو یا سچ مچ مجھے پہچان گئے۔ بتاؤ میں کون ہوں۔" اس نے ہنس کر کہا۔

"تم سلیمہ ہو۔ منظور صاحب کی لڑکی۔ ہم تم پاس پاس کے کوارٹروں میں رہتے تھے۔"

"ہاں پہچان گئے"۔ اس نے اس قدر خوش ہو کر کہا کہ اس کے چہرہ پر سے سارا ادھیڑپن غائب ہو گیا اور وہ مجھے بالکل ویسی معلوم ہوئی جیسی اس رات تھی جب وہ میرے کمرے میں چلی آئی تھی۔

"میرے وہاں سے چلے آنے کے بعد ہم لوگوں کو ایک دوسرے کی کوئی بات معلوم ہی نہیں ہوئی منظور صاحب کا کیا حال ہے۔"

"ان کا تو وہیں ہندوستان میں انتقال ہو گیا تھا۔ میری شادی کوئی پانچ برس بعد۔ یہ میرا سب سے بڑا لڑکا شمیم اس وقت چار برس کا تھا۔" اس نے شمیم کی طرف رخ کر کے کہا۔ "بیٹے شمیم۔ آپ کو سلام کرو۔ آپ معین صاحب ہیں۔ آپ ہمارے ابو جان مرحوم کے ساتھ کام کرتے تھے ہمارا اور ان کا کوارٹر ملا ہوا تھا۔ کھانا ہمارے یہاں کھاتے تھے۔"

شمیم نے مجھے سلام کیا۔ میں نے دعا دی۔ سلیمہ کہنے لگی۔ "یہ میری بہو ہے۔ دو برس شادی کو ہوئے یہ ایک بچہ ہے ۔ایک برس کا۔ تین لڑکے اور ہیں دو لڑکیاں ہیں۔ لڑکیوں کی شادیاں ہو گئیں لڑکے ابھی پڑھ رہے ہیں۔"

"تمہاری شادی کب اور کہاں ہوئی تھی مجھے پتہ ہی نہ چلا تھا۔"

"تم کو کیا معلوم ہوتا۔ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ نجمہ کے ساتھ تمہاری شادی نہیں ہو سکی۔ پھر کہیں اور ہو گئی تھی۔ تمہارے جانے کے دو برس بعد والد نے میری شادی اس لڑکے کے باپ سے کر دی تھی جو اس کوارٹر میں آکر رہے تھے جس میں تم رہتے تھے۔"

"تمہارے شوہر کون ہیں کہاں ہیں؟"

"اب انہیں مرے ہوئے چار برس ہو گئے۔ اس لڑکے کی شادی بھی نہیں دیکھی ہاں بڑی لڑکی کی جو اس کے بعد کی ہے شادی کر دی تھی اور چھوٹی لڑکی کی بھی جو بڑی کی پیٹھ پر کی ہے۔ دونوں اپنے اپنے گھر والوں میں سکھ چین سے ہیں۔ اب رہے لڑکے تو ایک اسی سال پڑھائی ختم کر دے گا۔ دوسرے کو بھی دو برس لگیں گے، سب سے چھوٹے کو کوئی چار چار پانچ پانچ سال لگ جائیں گے۔"

"سب اس بڑے لڑکے شمیم ہی کے ساتھ رہتے ہیں؟"

"اور کہاں رہیں گے۔ باپ نے کراچی میں ایک مکان بنوایا تھا۔ اس کا چار سو روپیہ مہینہ کرایہ میرے ہاتھ میں آتا ہے۔ شمیم کی چھ سو تنخواہ ہے۔ اچھا خاصا بنگلہ رہنے کو ملا ہوا ہے۔ شہر سے چھ سات میل دور ہے۔ ہم سب اس میں رہتے ہیں۔ لڑکے بس سے شہر پڑھنے جاتے ہیں۔ یہ بہو وہیں کالونی میں ایک اسکول ہے اس میں پڑھاتی ہے۔ میں اکیلی سب گھر دیکھتی ہوں۔ اب اس بچے کو بھی بہلاتی رہتی ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے ڈبیہ کھولی پان نکالا بٹوہ کھول کر اس میں ڈلی ڈالی اور مجھ سے پوچھا۔ "تم تمباکو کھاتے ہو۔"

"میں نے پان ہی کھانا چھوڑ دیا۔ بس سگار پیتا ہوں۔ مگر لاؤ اب تم نے بنایا ہے تو کھا لوں گا۔"

"ارے ہاں! میں تمہارا حال تو پوچھنا بھول ہی گئی۔ تمہارے بھی بال بچے ہیں کہاں ہیں؟"

"میرے تین بچے ہیں۔ دو لڑکے ایک لاہور میں ایک اسلام آباد میں، دونوں سرکاری ملازم ہیں۔ بیاہے ہوئے ہیں، بچے ہیں مزے میں رہتے ہیں۔ ایک لڑکی ہے اس کا شوہر کراچی میں بینک کا برانچ مینیجر ہے موٹر رکھتا ہے اپنا گھر بنوا لیا ہے۔ میں یہاں سرکاری ملازم ہوں حیدرآباد میں ون یونٹ کالونی میں اکیلا رہتا ہوں۔ اب انچاس برس کا ہو گیا، چھ برس اور ملازمت ہے۔ پھر پینشن مل جائے گی۔ کراچی میں ایک مکان ہے۔ ایک منزل بنی ہے وہ تین سو مہینہ کرایہ پر اٹھی ہے۔ دوسری منزل رفتہ رفتہ بنوا رہا ہوں۔ ہر ہفتہ

کو کراچی آجاتا ہوں۔ مکان کا کام دیکھتا ہوں۔ اتوار کی شام واپس آجاتا ہوں۔"

"اور تم نے بیوی کا تو ذکر ہی نہیں کیا۔"

"وہ چھ برس ہوئے مرچکی۔ ادھر سے فراغت ہے۔"

"حیدرآباد میں گھر کون دیکھتا ہے۔"

"کسی کی ضرورت نہیں۔ چائے وغیرہ خود بنا لیتا ہوں۔ دفتر سے نکل کر کسی ہوٹل میں کھانا کھا لیتا ہوں۔ بس ایک وقت پیٹ بھر کر۔"

یہ سن کر وہ مجھے بڑی افسردگی کے ساتھ دیکھنے لگی۔ پھر اپنے لڑکے سے پوچھا "کیوں شمو جہاں یہ رہتے ہیں وہاں سے ہماری کالونی کتنی دور ہوگی؟"

"ہم دیل پاک کالونی میں رہتے ہیں" لڑکے نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"وہ میرے یہاں سے آٹھ میل دُور ہوگی۔" میں نے کہا۔

وہ خاموش رہی۔ اس کے چہرہ پر کچھ ایسا اثر آیا جس سے مجھے محسوس ہوا کہ وہ مجھ پر ترس کھا رہی تھی۔ مگر کچھ کہنا نہیں چاہتی تھی۔ کیا اس کے دل میں میری محبت تھی! کہ عشق از خانۂ عصمت بیروں آرد زلیخا را۔ ستائیس برس پیشتر اس کا رات کے وقت دیوار کود کر میرے پاس آجانا عشق کی حرکت تھی۔ میں نے اس کی قدر نہ کی۔ نجمہ کے وہم میں رہا۔ وہم۔ بالکل وہم۔ نجمہ سے کوئی بات کوئی ملاقات کوئی وعدہ وعید تک نہ ہوا تھا۔ اس کے گھر والوں نے مجھے کبھی اہمیت نہیں دی۔ اور پھر میرے والدین نے زبردستی میرے اوپر ایک بیوی عائد کر دی۔ مجھے اپنی مری ہوئی بیوی یاد آئی جو کسی طرح میرے معیار حسن پر نہیں اترتی تھی۔ وہ گدبدی تھی، اور موٹی بھی ہو گئی تھی۔ میں نے سلیمہ کو دیکھا۔ دل نے کہا "ہاں وہ بھی اسی طرح موٹی اور ڈھلی ہوئی ہو گئی تھی۔" اور اب سلیمہ کا موٹاپا اور ڈھیلا پن اچھا معلوم ہوتا گیا۔ دل میں اس کے لئے ایک پُر اسرار محبت جاگنے لگی۔

باتیں ہوتی گئیں۔ وقت گزرتا گیا۔ کوٹری کے اسٹیشن پر سلیمہ نے اپنا ناشتہ دان اتروایا۔ اور سب میں پہلے مجھے پوریاں، کباب اور آلو دئے۔ وہ سب بھی کھاتے پیتے رہے۔ میں نے ہاتھ منہ دھو کر اپنا سگار نکالا اور کہنے لگا۔ "سلیمہ یہ کھانا تمہارے ہاتھ کا پکایا ہوا ہے۔ آج ستائیس برس کے بعد تمہارے ہاتھ کا کھانا کھایا۔ محسوس ہوتا ہے کہ میں ستائیس برس پہلے پہونچ گیا۔"

میں سگار پیتا گیا۔ اس کی راکھ بڑھتی گئی۔ میں آدھا سگار پی چکا تھا جب گاڑی چھوٹی۔ سلیمہ اور اس کا لڑکا اور میں اپنا سامان ٹھیک کرنے لگے۔ بچہ جواب دیر کا اٹھ چکا تھا سلیمہ کی گود میں تھا اور مجھے دیکھ رہا تھا میں نے اسے لینا چاہا تو سگار کی راکھ میرے کوٹ پر گری میں اسے جھاڑنے لگا تو وہ ٹوٹ گئی اور اس کے اندر سے ایک مہین سی چنگاری نکل کر ہوا میں غائب ہو گئی۔

حیدر آباد آنے لگا تو سلیمہ نے اپنے لڑکے سے کہا "انہیں اپنے گھر کا نمبر اور پتہ دے دو۔" اور مجھ سے کہنے لگی "تم میرے گھر ضرور آنا!"

حیدر آباد میں اسٹیشن کے باہر آ کر جب میں اس سے رخصت ہونے لگا تو اس نے پھر کہا "دیکھو آنا ضرور میرے گھر، ضرور آنا۔"

ساڑھے دس بجے تھے جب میں نے اپنے گھر کا تالا کھولا۔ اندر داخل ہو کر میں نے حسب معمول سٹو کا سوئچ آن کیا اور اس پر کیتلی میں پانی رکھ دیا۔ کپڑے اتار کر آرام سے بستر میں لیٹا۔ پھر اٹھ کر چائے بنائی۔ ڈبہ کا دودھ ایسے ہی وقت کام آتا تھا۔ اس کو چائے میں ڈال کر چائے پیتا رہا۔ پھر بستر میں لیٹ گیا بجلی بجھا دی اور سگار جلا کر پینے لگا۔

مجھے نیند نہیں آ رہی تھی اور خیالات کا عجیب ہیجان مجھے بیقرار کرنے لگا۔ سلیمہ کا چہرہ آنکھوں کے سامنے تھا اور زیادہ سے زیادہ حسین ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ میں ستائیس برس پیچھے پہونچ گیا اور اب محسوس کر رہا تھا کہ سچ مچ مجھ میں ستائیس برس پہلے کی زندگی واپس آگئی تھی۔ مجھے وہ رات یاد آئی جب سلیمہ میرے کوارٹر میں آ کر میرے پلنگ سے لگ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اس کا اس وقت کا چہرہ آنکھوں میں پھرا اور میں اس کا مقابلہ اس کے اس وقت کے چہرہ سے کرنے لگا۔ دونوں قریب آتے گئے اور یہ معلوم ہوا کہ دونوں ایک ہو گئے۔ مجھے یہ چہرہ نجمہ کی شادی ہو جانے پر بھی کافی دیر یاد آتا رہا تھا اور جب وہ یاد آتا تو میں دل میں کہتا "ہائے میں نے اس کی محبت کی قدر نہ کی۔" مگر اپنی پسند کے اور چہرے دیکھے اور اسے بھول گیا۔ شادی ہو جانے پر بھی کوئی نہ کوئی نازک لڑکی دھیان میں رہی بیوی سے چھپ چھپ اس سے ملاقاتیں کرتا رہا۔ مجھے ایک خاص طرح ہی کی عورتیں پسند تھیں۔ اس طرح کی نہ بیوی تھی اور نہ سلیمہ۔ خیر بیوی کے ساتھ رہنے کی وجہ سے وہ بھی پسند کی چیز ہوتی گئی۔ طویل مدت تک لگاؤ نے اس میں بھی دلکشی پیدا کر دی۔ مگر سلیمہ کا چہرہ کبھی خاص طریقہ پر یاد نہیں آیا۔ وہ بالکل ذہن

عزیز احمد مرحوم اپنی
پوتیوں کے ساتھ
(کینیڈا - ۱۹۷۸ء)





[illegible]



دائیں سے بائیں:۔ غلام عباس، رام لعل، ڈاکٹر جمیل جالبی



دائیں سے بائیں:۔ بیگم جمیل جالبی، رضیہ فصیح احمد، غلام عباس، ابوالفضل صدیقی، جیلانی بانو،
[illegible] ڈاکٹر جمیل جالبی (کراچی ۱۹۸۰ء)



دائیں سے بائیں :۔ رضیہ فصیح احمد اور ہاجرہ مسرور (کراچی ۱۹۸۰ء)





دائیں سے بائیں :۔ محسن بھوپالی، ڈاکٹر انور معظم، جیلانی بانو، ڈاکٹر جمیل جالبی، غلام عباس (کراچی ۱۹۷۹ء)

ڈاکٹر جمیل جالبی اور شکیلہ اختر (کراچی ۱۹۸۰ء)



سے اتر گئی تھی۔ اسے بالکل ہی بھول گیا تھا۔ کبھی بھولے سے بھی شاید ہی یاد آئی ہو۔ کبھی اپنی محبوباؤں کا شمار کرتا تو اس کا خیال ہی نہ کرتا۔

مگر آج یہ کیا ہو گیا تھا۔ وہ کیوں دل میں سمائی جا رہی تھی۔ یقیناً اسے مجھ سے محبت تھی جس کا اس نے اپنی حد سے زیادہ بے باکی سے ایک رات اظہار کر دیا تھا۔ میں سنا کرتا تھا کہ عورت ایک ہی دفعہ اور ایک ہی سے محبت کرتی ہے اور آج مجھے محسوس ہو گیا تھا کہ ستائیس برس کے عرصے نے زندگی میں ہر قسم کی تبدیلی نے گھریلو زندگی اور بال بچوں میں ہر طرح دل بہل جانے نے سلیمہ کی محبت کو اب تک ختم نہیں کیا تھا باتیں کرنے میں اس کا چہرہ کیسا روشن ہو گیا تھا۔ کیسا چمکتا رہا تھا۔ کس پیار سے اس نے مجھے کھانا دیا تھا اور آخر میں کس زور کے ساتھ بار بار کہتی رہی تھی "میرے گھر ضرور آنا۔"

یوں ہی سوچتے سوچتے مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں اس پر عاشق ہو گیا۔ دس برس سے زیادہ ضرور ہونے ہوں گے جب سے میری عورتوں کی طرف توجہ ختم ہو چکی تھی۔ اپنے پسند والے ہیٹے کی عورتوں میں بھی کچھ نہ دکھائی دیتا۔ اکثر ایسیوں کو دیکھ کر ہنس دیتا اور دل میں کہتا "کیا حماقت تھی کہ میں ان پر مرا کرتا تھا۔ ان میں کچھ بھی تو نہیں ہے" ہر روز مجھے اپنا شباب دور سے دور ہوتا ہوا معلوم ہوتا تھا اور میں یہ مصرع دہرانے کا عادی ہو گیا تھا ع گیا شباب سکے ہمراہ ولولہ دل کا۔ مگر آج تین گھنٹے سلیمہ کو دیکھنے اور اس سے باتیں کرنے کے بعد سے مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میرا سن ستائیس برس کم ہو گیا۔ یہ کیا تھا! جوانی واپس آ گئی تھی۔ آنکھوں کے سامنے سلیمہ کی صورت صاف صاف کھنچی ہوئی تھی۔ کوئی صورت کبھی اتنی صاف نہیں کھنچی تھی، اور دل بیقرار ہو ہو کر یہ چاہتا تھا کہ ابھی دوڑ کر اس کے پاس جاؤں اور کہوں۔" میں تجھ سے ایسی محبت کرتا ہوں جیسی کبھی کسی سے نہیں کی۔ ستائیس برس پہلے میں اپنی حماقت میں پھنسا تھا۔ پھر ہمارے ماں باپ بھی تھے جو ہمیں باندھنے کا حق رکھتے تھے مگر اب میں بھی آزاد ہوں اور تم بھی۔ ہم دونوں ایک ساتھ رہ کر باقی زندگی نہایت خوشی سے گزار سکتے ہیں۔"

اسی قسم کے خیالات آتے رہے اور آنکھ لگ گئی۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ وہ دولہن بنی ہوئی ہے اور میں دولہا بنا ہوا ہوں۔ پھر ہم دونوں نہایت عمدہ سجے ہوئے کمرے میں پہونچے میں نے اسے ہاتھوں پر اٹھا کر مسہری پر لٹا دیا اور اس کے پاس لیٹ گیا۔ یہ خواب ہر پھر کر گڈ مڈ ہو ہو کر صبح تک نہ معلوم کتنی دفعہ دکھائی دیا۔ فجر کی اذان کے وقت اٹھ کر اسٹو پر پانی رکھا اور نماز پڑھنے لگا۔ نماز پڑھنے میں

اس کی صورت آنکھوں کے سامنے رہی اور چلتے پھرتے میں محسوس کیا کہ وہ کسی طرح عمر بھر ساتھ رہی ہو گی پھر لیٹ کر سگار پیتا رہا مگر سگار کے بجائے اس کے تصور میں محو رہا۔

جب وہ آدمی آیا جو روز دودھ، مکھن، ڈبل روٹی اور انڈا وغیرہ دے جاتا تھا تو میں اٹھا ناشتہ تیار کرتا رہا مجھے اس وقت پیٹ بھر کر کھا لینے کا عادی تھا اس کے بعد شیو کرتا اور دفتر روانہ ہو جاتا۔ آج شیو کرتے میں میں نے اپنے چہرے کو غور سے دیکھا تو محسوس ہوا کہ میں ابھی ایسا بڈھا تو نہیں ہوا ہوں۔ یوں بیوی کے مرنے کے بعد سے یہ سوچا کرتا تھا کہ اب چل چلاؤ ہے اور کسی طرح زندگی کے دن کاٹ دینا ہیں مگر اب سلیمہ کے تصور نے جو آنکھوں کے سامنے کھیل رہا تھا دل میں زندہ رہنے کی خواہش پیدا کر دی۔ وہ سلیمہ جس کو میں نے ستائیس برس پہلے ٹھکرا دیا تھا اب میرے سامنے اسی محبت کے ساتھ آئی تھی اور اب میں تمام غلط فہمیوں سے بالاتر ہو جانے کی وجہ سے اس کے پیروں پر گر پڑنے کے لئے تیار تھا۔ اس جذبہ کی وجہ سے میں نے آج زیادہ اچھی طرح منہ ہاتھ دھوئے اور زیادہ بہتر طریقہ پر سوٹ پہن کر زیادہ ہوشی خوشی دفتر آیا۔ ساتھ ہی ساتھ دل میں ایک خواہش بے قراری کی حد تک ابھر رہی تھی کہ اس کے پاس جاؤں اور اس سے باتیں کرتا رہوں۔ میرے رویہ میں کوئی ایسی تبدیلی نہیں آئی تھی کہ لوگ مجھے دیکھنے سے کچھ بھی معلوم پاتے مگر اپنے اندر میں ضرور محسوس کر رہا تھا کہ میں پھر سے زندہ ہو گیا۔ یہ بھی محسوس کرتا رہا کہ حالانکہ جوانی میں میں پانچ یا چھ دفعہ اس عالم میں آ چکا تھا جسے عشق کہا جا سکتا ہے مگر اب قریب بچاس برس کے سن میں حقیقت میں عاشق ہوا تھا کبھی کسی کے تصور کا نقشہ اتنا صاف صاف سامنے نہیں آیا تھا جتنا اس وقت سلیمہ کا تھا اور پھر دل میں کبھی ایسا میٹھا میٹھا درد نہیں محسوس ہوا تھا جیسا اب محسوس ہو رہا تھا۔ رہ رہ کر جی چاہتا رہا کہ اس نے پتہ بھی دے دیا ہے تاکید سے بلایا ہے تو پھر کیوں اڑ کر اس کے پاس نہ پہونچ جاؤں۔

حسب دستور قریب تین بجے کام ختم کر کے دفتر سے اٹھا اور چلتا ہوا شہر کے اس ہوٹل میں پہونچا جہاں کھانا کھایا کرتا تھا۔ یہاں کچھ جاننے والے مل گئے ان سے باتیں بھی ہوتی رہیں کھانا پینا بھی چلتا رہا مگر بار بار ذہن غائب ہو جاتا اور میرا دھیان تصور کی اس تصویر پر جم جاتا جو زیادہ سے زیادہ خوبصورت ہوتی جا رہی تھی اور دل میں ولولہ پیدا ہوتا۔ "ضرور چلوں، آج ہی چلوں، ابھی کھانے کے بعد چلوں۔ اب کسی قسم کی رکاوٹ نہیں ہے۔ اس سے صاف صاف کہہ دوں کہ میں تجھ پر بری طرح عاشق ہو گیا ہوں اور اب جو تمہاری مرضی ہو اس پر چلنے کے لئے تیار ہوں۔" پھر دل میں کچھ جھجک آئی اور سوچا کہ اتنی جلدی ٹھیک نہیں۔ ایک آدھ دن گزر جانے دو۔ پھر کسی دن چلا۔

ہوٹل سے نکلنے کے بعد عموماً میں بازار کا چکر لگاتا کسی دوست کے یہاں جا کر بیٹھ جاتا اور رات میں

مگر آتھا آمد آج ہوٹل سے نکل کر دس قدم گیا ہوں گا کہ ایک رکشہ کھڑا نظر آیا اور رکشا والے نے پوچھا۔ "کہیں چلیں گا؟"

"ذیلی پارک کالونی چلو گے؟" میرے منہ سے بے تحاشہ بالکل لاشعوری طور سے نکل گیا۔

رکشا تیزی سے چلی جا رہی تھی تو میرا دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔ پُر اسرار تذبذب کا عالم تھا مگر کالونی میں پہونچ کر مکان تلاش کر کے جب میں اس کے گھر کے اندر داخل ہوا تو اطمینان ہو گیا تھا۔ وہ اندر کے حصے میں برآمدے میں پلنگ پر بیٹھی تھی۔ ملازم جو مجھے اندر لے گیا تھا سامنے باورچی خانہ میں چلا گیا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کا چہرہ کھل گیا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلی۔ سُرخی گالوں پر دوڑ گئی۔ پلنگ کے پاس ایک آرام کرسی پڑی تھی۔ میں اس پر بیٹھ گیا۔ آنکھ بھر کر اسے دیکھا۔ اس کی صورت اتنی اچھی نہیں معلوم ہوئی جتنی میرے تصور کی تصویر میں نظر آتی رہی تھی۔ میرے جذبات پر اوس سی پڑ گئی، وہ نہ معلوم کیا کیا باتیں کرتی رہی اور میں نہ معلوم کیا کیا کہتا رہا۔ اس نے مجھے چائے دی۔ پان دیا۔ کئی بار اٹھ اٹھ کر باورچی خانہ میں گئی اور پھر آکر اپنی جگہ پر بیٹھی اور باتیں کرتی رہی۔ میرے دل میں جو کچھ تھا اور جو میں کہہ دینا چاہتا تھا وہ منہ پر آتے آتے رہ گیا۔ شاید میری آنکھوں نے دل کی بات اسے بتا دی۔

اس نے یہ بھی پوچھا تھا کہ "دفتر سے اٹھ کر کیا کیا کرتے ہو۔ گھر میں جا کر اکیلے پڑے رہتے ہو؟"

میں نے اپنا روز کا روٹین بتا دیا تھا۔ وہ کہنے لگی۔ "تم یہاں آکر کھانا کیوں نہ کھایا کرو۔ میں ویسے ہی انتظام کر دوں گی جیسے پہلے زمانہ میں کرتی تھی۔" پھر منہ میں پان رکھ کر اور ہنس کر بولی تھی۔ "لڑکا اور بہو دن بھر کام پر رہتے ہیں۔ میں بچہ کو دیکھتی ہوں۔ پھر وہ لوگ سہ پہر کو بچہ بھی لے کر نکل جاتے ہیں۔ میں اکیلی رہ جاتی ہوں دم گھبراتا ہے۔ اگر تم یہاں کھانا کھایا کرو گے تو شام تک تم سے باتیں رہیں گی دل بہلے گا۔"

میں نہ معلوم کیا کیا کہنے کے منصوبے باندھتا رہا تھا مگر کچھ نہ کہہ سکا تھا۔ اس نے ربط اور ملاقات کا بہترین ذریعہ نکال لیا تھا۔ باتوں باتوں میں مجھے جو رقم دینا تھی وہ بھی طے ہو گئی اور میں نے پیشگی ادا کر دی۔ اس کے لڑکے شمیم نے روز بس سے آنے جانے کی بڑی سستی ترکیب بھی بتا دی۔ وہ میری زندگی میں جس حد تک داخل ہو سکتی تھی داخل ہو گئی اور میری زندگی ایک سیدھے سادے روزانہ روٹین کے بجائے بڑے انفرادی طور پر رنگین ہو گئی۔ اگر کچھ اور آگے بڑھنے کی خواہش ہوتی تو غالب کا یہ شعر پڑھنے لگتا ؎

عشرتِ صحبتِ خوباں ہی غنیمت سمجھو — نہ ہوئی غالبؔ اگر عمرِ طبیعی نہ سہی

میرے جلے ہوئے دل کی راکھ میں سے جو چنگاری اٹھی تھی اس کی عجیب کیفیت تھی۔ ظاہر ہے یہ جوانی

کے عشق کا شعلہ نہیں تھی جو سب کچھ جلا دیتا ہے مگر اس میں بھی گرمی تھی جلا دینے کی قوت تھی۔ جب میں سلیمہ سے دور ہوتا تو اس کی شکل دماغ کے کسی حصہ میں چھپی ہوئی اندرونی آنکھوں کو دکھائی دیتی رہتی اور دل کو ہلاتی رہتی جب سڑک پر اکیلا چلتا تو اِدھر اُدھر دیکھتا کہیں وہ آتو نہیں رہی ہے۔ رات میں پلنگ پر لیٹتا تو اس سے چمٹ جانے اس کو اپنانے اس کے ساتھ رہنے کے بڑے بڑے منصوبے باندھتا۔ اس کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے بڑے بڑے خواب دیکھتا۔ سوچتا کہ کل یہ کہوں گا اور یہ کروں گا۔ مگر اس کے سامنے پہونچتے ہی نہ کچھ کہا جاتا اور نہ کیا جاتا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہتا اس کے جسم کے ہر ہر حصہ پر نگاہ جماتا۔ وہ پہلی نظر میں کچھ بھونڈا معلوم ہوتا مگر دیکھتے ہی دیکھتے اچھا لگنے لگتا۔ جب میں چلنے لگتا تو وہ میرے ساتھ ساتھ دروازے تک ضرور آتی۔ دروازے میں کھڑی مجھے جاتا ہوا دیکھتی رہتی۔ میں اسے مڑمڑ کر دیکھتا۔ اس کا چہرہ زیادہ سے زیادہ دلکش ہوتا جاتا اور اس دلکشی کا شدید تاثر لئے ہوئے میں گھر آتا اور رات بھر اس پر سر دھنتا رہتا اور اس کو اپنانے کے منصوبے باندھتا رہتا۔ دن ہفتے مہینے برس یوں ہی گزرتے گئے۔

کبھی کبھی وہ میرے ساتھ بازار جاتی اور مختلف قسم کی خریداریاں کرتی رہتی۔ میں اس کا خریدا ہوا سامان لئے ہوئے ساتھ ساتھ چلتا اور اس کی ہر ادا کو دیکھتا رہتا۔ میں ہر ہفتہ کراچی آتا تھا۔ اس کو بھی مہینہ میں ایک دفعہ کراچی آنا لازمی تھا۔ وہ اتوار کی صبح کو میرے ساتھ آتی۔ دن بھر میں اس کے پاس رکشا میں بیٹھا شہر بھر میں گھومتا پھرتا کئی دفعہ اس لے میرا بنتا ہوا گھر بھی دیکھا اور اس کو بنانے کے سلسلے میں ہدایات اس طرح کرتی رہی جیسے وہ اسی کا گھر تھا۔ ہم دونوں ہر بات میں اتفاق کرتے اور ایک دوسرے کو نہایت محبت اور خوشی سے دیکھتے۔ دو سال میں مجھے محسوس ہوا کہ میں اس کے گھر بار کا ایک ایسا حصہ تھا جو اس سے الگ بھی تھا مگر ایسی طرح جوڑا ہوا تھا کہ اسے الگ کرنا ناممکن تھا۔ ہمارے تعلقات پر کبھی کسی کو اعتراض نہیں ہوا کیونکہ کبھی کسی نے ان میں کوئی اعتراض کی بات نہیں دیکھی انجان لوگ ہمیں پرانے میاں بیوی سمجھتے تھے اور جاننے والے یہ جانتے تھے کہ ہم میاں بیوی کے تعلق سے بالاتر جا چکے ہیں۔ کسی کو بھی کبھی میرے دل کی راکھ میں چھپی ہوئی اس چنگاری کا احساس نہ ہوا جو مجھے بیقرار کر دیا کرتی تھی اور میں سلیمہ کے ساتھ ہر ہر طرح رہنے کے خواب دیکھنے لگتا تھا کسی کسی وقت مجھے یہ محسوس ہوتا کہ میں یونانی دیو مالا کے ٹنٹالس کی طرح ہوں۔ پانی کے درمیان پیاسا کھڑا ہوں۔ پانی پینے کے لئے منہ جھکاتا ہوں۔ پانی دور ہٹ جاتا ہے کبھی سوچتا کہ اس چکر کو ختم کیا جائے۔ ادھر یا ادھر مگر بہتر یہی ہے کہ ادھر ہو۔ مگر اس کی زندگی کے مختلف بندھن اور ان میں اس کا مقام یہ ناممکن ہی کئے ہوئے تھا کہ وہ بالکل میری ہو جائے۔ میری

بے قراری کے ساتھ ساتھ ایک امید بھی دل میں اٹھتی کہ کبھی نہ کبھی میری سب حسرتیں ضرور پوری ہو جائیں گی۔ یہ امید ہی مجھے زور اس سے لگے رہنے کی ترغیب دیتی رہتی اور گزرتے ہوئے زمانہ کا خیال نہ آنے دیتی۔

چھ برس نہ معلوم کس طرح گزر گئے۔ اس دوران میں اس کے لڑکے پڑھائی ختم کرتے اور ملازم ہو کر اپنے اپنے گھر کے ہوتے رہے۔ ان کی شادیاں بھی ہوئیں۔ ان کے ہر کام میں میں ماں کے ساتھ اور ماں کے برابر شریک ہوتا رہا۔ میرے بچوں اور اس کے بچوں میں ملاقاتیں ہوئیں ربط قائم ہوئے۔ میرا کراچی والا گھر بالکل تیار ہو گیا اور میری پنیشن کا وقت بھی آگیا۔

میری آٹھ مہینے کی چھٹی ڈیو تھی۔ وہ میں نے لے لی۔ گھر جو سرکاری طرف سے ملا ہوا تھا خالی کر دیا۔ اسباب کراچی بھجوا دیا۔ ڈیڑھ بجے کی گاڑی سے کراچی روانہ ہونے والا تھا اور دس بجے سلیمہ کے پاس رخصت ہونے کے لئے پہونچ گیا تھا۔ لڑکا اور بہو اپنے اپنے کام پر جا چکے تھے۔ ان کے دو بچے تھے جو اب اسکول جانے لگے تھے اور اسکول گئے ہوئے تھے۔ سلیمہ اپنے خاص انداز میں پلنگ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ میں اپنی مخصوص آرام کرسی پر بیٹھ کر باتیں کرتا رہا۔ دل کی راکھ میں چھپی ہوئی چنگاری خاص طریقہ پر تلملانے لگی۔ میں نے کہا "سلیمہ ہم تم الگ ہی تھے ادھر چھ برس سے جڑ گئے تھے۔ اب پھر بالکل الگ ہو جائیں گے۔ تم کو روز دیکھنا۔ تم سے باتیں کرتے رہنا ہی میری زندگی تھی۔ اب یہ زندگی ختم ہو رہی ہے۔" یہ کہتے ہوئے میرا دل بھر آیا۔

اس کے چہرہ پر بھی افسردگی آئی۔ پھر آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔

اس وقت میرے دل کے اندر چھپی ہوئی چنگاری کچھ اس طرح تلملائی کہ میں نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور منہ پر ایک کے بعد ایک پیار کیا۔

"تم چاہتے کیا ہو۔" وہ سنبھل کر بولی اور پھر اپنی نگاہیں ترچھی کر کے مجھے دیکھتے ہوئے ہنس پڑی۔ وہ مجھے عجب کرشمہ نظر آئی۔

"میں کیا بتاؤں کیا چاہتا ہوں اب تم ہی سمجھ لو اور جو کچھ کر سکتی ہو کر دو ہمیشہ میل تمہارے ہی ہاتھ میں رہی۔"

وہ کھلکھلا کھلکھلا کر ہنسی اور ہنسی خوشی مجھے رخصت کیا۔ دروازے تک مجھے پہونچانے آئی۔ مجھے جاتا ہوا دیکھتی رہی۔ میں اس کا ہنستا ہوا چہرہ مڑ مڑ کر دیکھتا ہوا چلا آیا۔

اس کے چہرہ کا یہ آخری تاثر راستے بھر اور کراچی میں گھر پہونچ کر بھی میرے سر پر سوار رہا۔ بیوی کے مرنے

(باقی صفحہ ۱۳ پر)

عزیز احمد

جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں

مینار کی سیڑھیوں پر شکست خوردہ تاجدار کو انجام کا انتظار تھا۔ قزل قم اور قراقسم ویران کی شطرنج پر ایک ایک کر کے سب مہرے پٹ چکے تھے۔ شہ مات پر شہ مات۔ بامیان کے اسپ اور کابل کے پیادے سب نثار ہو چکے تھے، قرشی میں امیر موسیٰ کا رُخ کب کا کام آ چکا تھا، تورانیا کے اُشتر اور منگول فرزیں، اور اب شاہ اکیلا تھا۔ زچ ہو چکا تھا، مگر جنگ کی شطرنج کھیل کی شطرنج سے الگ تھی۔ زچ ہونے پر بھی ملک الموت کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ اسی طرح سنائی دیتی تھی۔ اور اب چنگیز کی نسل کے آخری جابر تاجدار سلطان حسین کو اس کا انتظار تھا کہ اس ویران مینار میں اس کے گوشت کے آر پار ہڈیوں تک پہلے کون سا حربہ پہنچے گا؟ چلچلاتی ہوئی دھوپ میں چکر لگاتے ہوئے گرگسوں کی چونچیں یا تیمور کے کسی سپاہی کا خنجر۔

اُس کے ہاتھ میں تاجدار پجاری کی سنہری شاخ تھی، جس سے وہ اُس مقدس درخت کی پوجا کسی اور ملک میں کیا کرتا، جہاں زہرہ، حسن کی دیوی کا مندر تھا۔ اُس کی رگوں میں صحیح النسبی کا خون تھا، جو فرات کے کنارے اس سے پہلے بھی بہایا جا چکا ہے۔ اس کے ہاتھ میں عصائے شاہی تھا اور اس کے سر پر تاج تھا اور اس لیے اس کے سر، اس کے عصا اور اُس کے تاج کی قیمت تھی۔

یہ ویران مینار کسی زمانے میں کسی مسجد کا مینار ہوگا، مگر مسجد کب کی منہدم ہو چکی تھی۔ ان صدیوں کی شطرنج میں قزل قسم پر کبھی شمال کے وحشی ترکوں اور مغلوں کا قبضہ ہو جاتا اور کبھی جنوب کے ہل چلانے والے، بیل جوتنے والے، کلمہ پڑھنے والے ترکوں اور ایرانیوں کا اور اس ویران مینار سے اگر کوئی چیز نظر آتی تھی، تو اس لق و دق سرخ ریت اور سرخ ٹیلوں کے سمندر میں ایک چھوٹا سا نخلستان جس کے کنارے اونچی اونچی گھاس اُگ آئی تھی اور کچھ خاک آلودہ ٹھٹھرے ہوئے پستہ قد درخت تھے۔

آخری شکست کو پانچ چھ روز گزر چکے تھے۔ تیسرا دن تھا کہ روٹی کا آخری سوکھا ٹکڑا ختم ہو چکا تھا اور اس تین دن کے عرصے میں سلطان حسین کے جسم کی چربی جیسے کچھ پگھل گئی تھی۔ اس کی داڑھی کے بال دفعتاً سفید ہونے لگے تھے، اُس کے سر کے بال وحشیوں کی طرح الجھ گئے تھے اس کی آنکھوں کے گرد لکیریں پڑ گئی تھیں، اس کے زرتار لبادے پر میل کے چھوٹے بڑے دھبے تھے۔ رات کو گلی سے اور گلی سے زیادہ خوف سے لمحہ لمحہ وہ چونک چونک پڑتا۔ وہ بار بار چشمے پر جاتا، وضو کرتا اور نمازیں پڑھتا، مگر اس کے دل کو تسلی نہ ہوتی اس سے پہلے بھی اس نے مصیبت جھیلی تھیں کبھی دیبا و حریر کے بستر پر حسین حوروں کے ساتھ اور حسین تر دلشاد کے ساتھ راتیں گذاری تھیں کبھی تپتے ہوئے پتھروں پر سر رکھ کر، گرم ریت کے بستر پر، لیکن اور ہر مرتبہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ خواب ٹل جائے گا۔ مگر اس مرتبہ ٹلتا نظر نہ آتا تھا، اُسے خدائے ذوالجلال سے نرم نرم سا شکوہ تھا، جس نے یہ تاروں بھری رات بنائی تھی، اور ریت کے ان چمکدار ذرّوں کے درمیان نگینے کی طرح اس نخلستان کو جڑا تھا کہ اس کی قسمت کیوں کھوٹی نکلی۔ جب کہ اس کا خون کھرا تھا۔ اپنے ساتھ اپنی قسمت کی غداری کا احساس تیمور کی غداری اور نمک حرامی کے احساس سے کہیں زیادہ سخت تھا، اس کی کنپٹیوں کی رگیں چربی کی تہوں کے اندر دھڑک دھڑک کر فریاد کر رہی تھیں اور اس فریاد میں بھی ایک شاہانہ جاہ و جلال تھا۔ اس شکست میں ایک جارحانہ ملامت کا انداز تھا اور اس ملامت کا نشانہ تمام کون و مکاں تھے۔ یہ دشت و در، یہ پہاڑ یہ وادیاں اور ان کے پرے بدخشاں کے لعل اور ختن کے غزال، اور عبیر کے جنگل سب اس سے منہ موڑ چکے تھے۔ سب غداری کر چکے تھے۔ آسمان پل صراط کی طرح سمٹ کر ایک تلوار کی دھار بن چکا تھا اور سمٹ کر چمکتے ہوئے تاروں کو اوپر کی ظلمت کے حوالے کر کے اس کے قدموں کے نیچے آ چکا تھا اور سمٹ کر چمکتے ہوئے تاروں کو اوپر کی ظلمت کے حوالے کر کے اس کے قدموں کے نیچے آ چکا تھا کہ اس کے دو ٹکڑے کر کے اُسے نیچے قعرِ جہنم کی بے پناہ گہرائیوں میں گرا دے اور اب بھی سلطان حسین کے دل میں تاسف نہ تھا، افسوس تھا اور حسرت تھی۔ صرف وہ مظلوم تھا اور ہر شخص، ہر شے تقدیر، تدبیر ہر شے ظالم تھی۔ اُسے یاد نہ رہا تھا کہ اس نے بھی شب خون مارے ہیں کیونکہ ایسی باتیں اس آخری وقت کے خشوع و خضوع میں یاد نہیں آتیں۔ نہیں اب ساری کائنات ظالم تھی اور صرف وہی مظلوم۔

جب بھوک کا تیسرا دن گزرا اور چوتھا دن آیا اور سوائے پانی اور درخت کے پتوں کے، جن کا چبانا تک ممکن نہ تھا اور کچھ نہ رہا، تو صبح کی سنہری دھوپ میں اُس نے پہلی بار ایک گدھ کو اپنے سر پر منڈلاتے دیکھا۔ گدھ اس مینار کی چوٹی پر اطمینان سے جا بیٹھا، جس کی سیڑھیوں پر سلطان حسین نے پناہ لی تھی۔ کبھی اُس

کی انگلیوں سے شاہین و شہباز اڑتے تھے اور زمین و سما کا شکار کرتے تھے۔ اب گدھ کو اس کی بوٹیاں نوچنے کا انتظار تھا۔ روز صبح اور شام یہ گدھ چکر لگائے گا، ابھی تو یہ تفتیش کو نکلا ہے کہ اور کتنے دن یہ گھستی ہوئی جان چلے جائے گی اور پھر اس کے ساتھ اور گدھ آئیں گے سلطان حسین کی نظروں میں وہ ہزاروں منظر گھوم گئے جو اس نے زندگی بھر دیکھے تھے جب جنگ میں فتح کے بعد اس کا گھوڑا چکر کاٹتا اور سڑتی ہوئی لاشوں سے چیختے ہوئے گدھ چاک کے کچھ دور اوپر اڑتے اور پھر ضد کرکے اپنے خوانِ ضیافت پر بیٹھ جاتے۔

سلطان حسین نے اس شدید گرم جلتی ہوئی رات کو ایک کپکپی سی محسوس کی۔ گویا گدھ ابھی تک اسی طرح تاک لگائے بیٹھا ہے۔ کچھ خواب، کچھ بیداری میں اسے محسوس ہوا کہ جیسے گدھ کی بھی ایک ٹانگ لنگڑی تھی تیمور کے لنگ کی طرح اور یہی اس مردار خور کی قسمت کا راز تھا۔ یہ کہ اس مردار خور گدھ نے بھی شاید کسی شہباز یا شاہین کی بہن سے شادی کی تھی اور اب وہ شاہین کا گوشت کھانے کے لیے قزل قسم کے نوکیلے پتھروں پر اپنی چونچ تیز کر رہا تھا اور شاید یہ سب بھیانک خواب ہو، مگر اس سے پہلے کے خوابوں میں دلشاد اس کے ساتھ تھی، اب دلشاد بھی اس سے بچھڑ چکی تھی۔ اس کا حرم، اس کی کنیزیں، اس کے صبا رفتار راہوار، اس کے جاں نثار جلائر، اس کے وفادار محمود اور مہمند، اس کے کالے گیسوؤں اور تیز بیخوں والے ترکمان سب پہاڑوں گھاٹیوں، دریاؤں میں منتشر ہو چکے تھے، کوہ و دشت، دریا پر غاصب کا قبضہ تھا۔

اور اب جب کہ سب کچھ چھن چکا تھا، سلطان حسین کو قدر ہوئی کہ سب سے زیادہ عزیز چیز اب بھی اس کی اپنی تھی اور اس کے قبضے میں تھی۔ یہ اس کی اپنی جان تھی۔ وہ زندہ تھا اور یہ خود ایک بہت بڑی امید تھی، یہ کہ اس کی سانس چلتی ہے اور ہر سانس پر شکر واجب ہے۔ یہ کہ جب تک سانس ہے، زندگی ہے حال بھی ہے اور مستقبل بھی اور یہ حقیقت بھوک سے بڑھ کر تھی گدھ سے بڑھ کر شکست سے بڑھ کر۔ یہ کہ اور سب نعمتیں اس نعمت کے لیے ہیں اور اگر یہ نہیں تو کچھ نہیں، لیکن اگر کچھ اور نہیں تو یہ تو ہے۔

اور وہ اسی کو لیے آن چھپا تھا، چھپتا پھر رہا تھا، افریقہ کے کالے شکاری پجاری کی طرح جس کے سر کا شکار کھیلا جا رہا تھا، یا ہر صحیح النسب تاجدار کی طرح جس کا تاج اس کا مرض الموت ہے۔

۲

یہ پہلی رات نہیں تھی جو سارنگ لوغانے تاروں کی چھاؤں میں گزاری تھی، یہ پہلی مرتبہ نہیں تھی کہ اس

نے المالیک سے سمرقند تک تنہا سفر کیا تھا، لیکن جب تارے ڈوب چکے اور آدھا سفر ابھی باقی تھا، تو اس نے اپنے سر پر دھوپ کی گرمی محسوس کی۔ حالانکہ ابھی ابھی صبح ہوئی تھی اور آفتاب صبح کا زاویہ ابھی بہت ٹیڑھا تھا اس نے اٹھ کر انگڑائی لی۔ سر پر آہنی خود پہنا، زرہ لگائی، مشکیزے سے ایک گھونٹ پانی پیا۔ کھانے کو کچھ نہ تھا۔ دُنبے کی پوری کی پوری بھنی ہوئی ران وہ رات ہی کو پوری کی پوری کھا گیا تھا۔ اس سے دو قدم پر ہڈی پڑی ہوئی تھی۔ اس ریگستانی حصے میں سوائے چٹانوں اور ریت کے کچھ نہ تھا۔ پتھریلے یا ریتلے ٹیلے تھے اور کچھ اوٹ تھا اور دفعتاً اس کے ذہن میں بجلی سی دوڑ گئی کہ اس کا رفیق غائب تھا۔

اپنے رفیق کو اس نے تھوڑی سی سوکھی ہوئی گھاس رات کو دے دی تھی۔ اپنے مشکیزے سے تھوڑا سا پانی بھی دیا تھا۔ حالانکہ یہ جنس بہت قیمتی تھی۔ پھر اُس نے اُسے کندکی رسی سے گرہیں دے کر ایک نکیلی چٹان سے باندھ دیا تھا۔ رات کو اسے یاد تھا کہ ایک آدھ بار اس نے اپنے رفیق کے ہنہنانے کی آواز سُنی تھی۔ پھر وہ ایسا غافل سویا کہ اسے نہ دنیا کی خبر رہی نہ آخرت کی اور اب جب صبح کا اعلان نہ مُرغِ سحر نے کیا نہ سمرقند کی طرح کوؤں کی کائیں کائیں نے اور آفتاب نے ریگستان میں سوا نیزے پر سر نکالا، تو اس کا رفیق غائب تھا، زین، رکاب، لگام سمیت

اس کا احتمال کم تھا کہ کوئی چور آکے اس کے پستہ قد منگول ٹٹو کو لے گیا ہو کیونکہ ریت میں دُور دُور تک کسی کے قدموں کے نشان نہ تھے۔ ساری بوغا نے سب سے پہلے اطمینان کر لیا۔ نہیں یہ بے وفائی اس کے رفیق نے کی تھی جو عام طور پر وفادار تھا۔ معلوم نہیں اس وحشی جانور کے دل میں کیا سمائی، جو کسی نہ کسی طرح رسی چھڑا کے بھاگ کھڑا ہوا۔ ایک دوسرے کے بغیر ریگستان دونوں کے لیے موت تھا، لیکن بھاگتے وقت اس کے رفیق نے یہ بھی نہ سوچا۔ جانور جو ٹھہرا۔

ساری بوغا نے مشکیزہ کمر سے باندھا، تلوار لگائی اور گھوڑے کے سُم کے نشانات ڈھونڈتا ہوا روانہ ہوا، تھوڑی دور تک تو چمکتی ہوئی ریت پر نشانات صاف صاف نظر آتے، پھر پتھریلی زمین یا کوئی ٹیلہ آجاتا اور نشانات چھپ جاتے۔ معلوم ہوتا تھا، بے وقوف جانور نے واپس المالیک کا رُخ کیا تھا۔ ویسے یہ بڑا بزدل ناخلف ٹٹو نکلا۔ حالانکہ اس کے آباؤ اجداد نے چنگیز کے ساتھ نکل کر دنیا فتح کی تھی۔ روس کی چراگاہوں میں جاڑوں میں سُموں سے برف کھود کھود کے گیلی جمی ہوئی گھاس کھائی تھی اور ایران کے ریگزاروں کو تپتی ہوئی دھوپ میں طے کیا تھا۔ ساری بوغا میں ابھی تک منگولوں کی سخت جانی باقی تھی۔ تیمور اور سلطان حسین کے ساتھ رہ کر بھی اس نے اپنی وضع نہ بدلی۔ وہی لمبی لمبی مونچھیں دونوں رخساروں پر بچھو کی ٹوٹی ہوئی ڈنک کی طرح جھکی ہوئی اور ٹھوڑی پر دا

مختصر سی ڈاڑھی، گرد سے اٹی ہوئی۔

دھوپ ہر لمحے تیز ہوتی جا رہی تھی۔ گھوڑے پر یہ دھوپ کچھ نہیں تھی۔ کیونکہ جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا، گھوڑا اس کے جسم کا گویا نصف حصہ تھا۔ اس کے بغیر اس کی زندگی، اس کا وجود اس کا جسم نامکمل تھا۔ وہ دماغ تھا، قوی بازو تھا، تلوار تھا، مگر قدم، رفتار، حرکت یہ سب گھوڑے کا کام تھا۔ اپنی زندگی میں ساری بوغا نے کبھی اپنے آپ کو اس قدر مجبور محسوس نہیں کیا تھا، جیسے اس تپتی ہوئی صبح کو، اس جھلستے ہوئے ریگستان میں پیادہ پا۔

جب گھوڑے کی ٹاپوں کے نشان غائب ہو جاتے، تو ساری بوغا کسی ٹیلے پر چڑھ کے دیکھتا اور تھوڑی دور پر پھر نشان نظر آتے اور وہ پھر ٹیلے پر سے اترتا۔ اس مرتبہ جو وہ ایک ٹیلے پر چڑھا، تو اس نے ایک ویران سا مینار دیکھا۔ کسی مسمار عمارت کا مینار جو اس لق و دق ریگستان میں معلوم نہیں کس نے بنائی تھی؟ غالباً خوارزم شاہیوں نے غزوں یا مغلوں یا شمال کے شہسواروں کی نقل و حرکت دیکھنے کے لیے اور اب بھی وہ نامکمل منقد مینار اس ریگستان میں کھڑا تھا، اس امر کی واحد علامت کہ یہاں انسان کا بھی گزر ہوتا رہا ہے۔ ورنہ اس کڑکتی ہوئی دھوپ میں کسی جاندار کا پتہ نہ تھا۔ نہ کوے کی کائیں کائیں تھی نہ گیدڑ کی آواز۔ آسمان پر اکیلا ایک گدھ منڈلا رہا تھا۔

ساری بوغا نے جلدی سے مینار کا رخ کیا۔ یہی ایک موقع تھا۔ اگر مینار پر چڑھنے کی سیڑھیاں ہوں یا کم سے کم دیوار میں کچھ پتھر ایسے ہوں جن کے سہارے اوپر چڑھا جا سکے، تو اطراف میں بہت دور دور تک کا علاقہ نظر آئے گا اور کہیں نہ کہیں اس کا گھوڑا نظر آ ہی جائے گا۔ کیونکہ بیوقوف گھوڑا اکیلا کہیں تک پہنچ ہی نہیں سکتا۔ اس کے بغیر اس کے گھوڑے کا وجود بھی تو نامکمل تھا۔ کیونکہ وہ اس کا دماغ تھا، وہ وہ ہاتھ تھا جو اس گھوڑے کو سوکھی ہوئی گھاس اور مشکیزے کا پانی دیتا اور اس ریگستان میں نہ کہیں ہری گھاس تھی اور نہ چشمے کا پانی۔

مینار کے قریب پہنچ کر اس نے دیکھا، تو یہ کافی اونچا تھا، پتھروں کا رنگ ریت کے پڑوس میں اور زیادہ ریتیلا ہو چکا تھا اور ان میں کہیں کہیں سرخی جھلک رہی تھی۔ زینے پر چڑھنے سے پہلے اس نے صدا لگائی "او۔ او۔ او"

اور اس کی اپنی ہی آواز گونج کر واپس آئی۔ اس کی تلوار کی نیام پتھروں سے ٹکرائی، اس کے

چمڑے کے جوتوں کی چرچراہٹ کی آواز سے بھی گونج سی پیدا ہوئی۔ اس نے کھنکھارا اور کھنکھارنے کی آواز بھی مینار کی سیڑھیوں پہ گونج اٹھی۔ ساری بوغا بہادر تھا، لیکن ان لوگوں کے مقابل غول بیابانی کے متعلق اُس نے بہت سے قصے سمرقند میں سُنے تھے اور بڑے معتبر لوگوں کی زبانی۔ مثلاً جلال الدین گیلانی نے ایک بڑے مناظرے میں جنات، غول بیابانی اور ارواحِ خبیثہ کا وجود ثابت کیا تھا اور ساری بوغا کا عقیدہ ذرا ذرا کچا تھا کہ یہ ساری حیرانی اور غیبانی مخلوق شاید ہو شاید نہ ہو۔

معلوم نہیں اسے غول بیابانی کا خیال پہلے آیا، یا وہ آواز پہلے سنائی دی یا دونوں ایک ساتھ مگر یہ ایک نئی طرح کی آواز تھی کسی اور کے چمڑے کے جوتوں کی چرچراہٹ کی گونج، پتھروں سے کسی اور کی تلوار کے میان کے کھڑکھڑانے کی آواز اور پھر ایک صدائے بازگشت۔

اس نے فوراً لاحول ولا قوۃ پڑھا اور بہادری سے دل میں سوچا کہ اب تک آدمیوں سے لڑتا رہا ہوں، اب غولِ بیابانی سے بھی مقابلہ سہی۔ لاحول ولا قوۃ کے ساتھ ہی ساتھ اس نے من کے کوکو تینگری، نیلمیں جاودانی آسمان کو یاد کیا کیونکہ اور چغتائی مغلوں کی طرح اس کا عقیدہ کچا تھا۔ کبھی وہ خدائے واحد القہار سے مراد مانگتا اور کبھی جاودانی آسمان سے کبھی ایک پر ایمان لے آتا اور کبھی اپنے دل کی گہرائیوں میں دوسرے کی حکومت محسوس کرتا اور کبھی کبھی سوچتا کہ دونوں ایک ہی ہیں۔

اس نے وحشیانہ مغل انداز میں پھر نعرہ لگایا "کون ہے؟... اُو... اُو... اُو"

وہ جو اوپر کی چھپی ہوئی چکردار سیڑھیوں پر آگے آگے اوپر چڑھ رہا تھا، ایک لمحے کے لیے رکا اور پھر جوتوں کے چرچراہٹ کی گونج بڑھ گئی۔

ساری بوغا نے تلوار کھینچ لی "یہ جن نہیں انسان ہے۔ میری آواز سُن کے اوپر بھاگ رہا ہے" اور اس نے جلدی جلدی سیڑھیاں پھاند کے اوپر چڑھنا شروع کیا۔ اب اوپر اوپر جو آدمی چڑھ رہا تھا، اس کی شکل اسے اپنے سے بہت قریب نظر آئی۔ اس نے بھی تلوار کھینچ رکھی تھی اور ساری بوغا کو اوپر چڑھتا دیکھ کر وہ ایک لمحہ کے لیے ٹھٹکا اور تلوار سونتی۔ بے اختیار ساری بوغا کی زبان سے حیرت کے عالم میں نکل گیا۔

"سلطان حسین!"

سلطان حسین کا بھاری بھرکم جسم اس سے صرف چند سیڑھیوں اوپر تھا، اس کی گھنی داڑھی کے بھیگے بالوں پر ردا تھی، وہ منہ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی سفید چوڑی پیشانی کے نیچے اس کی چھوٹی چھوٹی

آنکھیں مایوسی اور اندوہ سے اپنی چمک کھو چکی تھیں۔ اس کا وقار اب بھی شاہانہ تھا اور اس کی تلوار کی دھار تیز تھی۔

سلطان حسین نے ساری بوغا کی چھوٹی چھوٹی منگول آنکھوں میں مکاری اور چالاکی کی چمک پڑھ لی۔ اس نے پھر اپنا سوال دُہرایا: "تو یہاں کیا کر رہا ہے؟"

"میں المالیک سے سمرقند جا رہا تھا۔ اکیلا۔ خداوند یہ بھی کوئی زندگی ہے برفستانوں اور ریگستانوں میں اکیلے ایلچی اور جاسوس کی زندگی، مگر آپ کی خدمت میرا فرض ہے۔ میں ہر خدمت کے لیے تیار ہوں میں المالیک سے ختن گیا مغلستان کی سرحدوں تک گیا اور مجھے چغتائیوں کے سب حالات معلوم ہیں.... میں المالیک سے سمرقند واپس جا رہا تھا کہ میرا گھوڑا رات کو کھو گیا۔ وحشی گھوڑا تھا۔ چھوٹا سا منگول ٹٹو مگر اپنے آپ کو شاید عرب شبدیز سمجھتا ہے، یا سمجھتا ہے کہ میں سن کے کوکو تینگری کے علاوہ کسی اور کی سواری کے قابل نہیں۔ رات کو میں نے اسے کھلایا پلایا۔ صبح کو دیکھا تو غائب۔ خداوند میں نے تلی کی بے وفائی کے قصے سُنے ہیں، عورت کی بے وفائی کے قصے سنے ہیں، بھائی بھائی کی بے وفائی کے قصے سنے ہیں، لیکن کتے یا گھوڑے کو نہ بے وفا دیکھا تھا نہ سُنا تھا اور جو نہ دیکھا تھا اور نہ سُنا تھا وہ مجھ پر گزر گئی۔ میں نے دور سے یہ مینار دیکھا اور سوچا کہ اس پر چڑھ کر اِدھر اُدھر نظر دوڑاؤں۔ یہاں آیا تو خداوند کی قدم بوسی نصیب ہوئی مگر حضور یہاں اکیلے کیسے؟"

"تو نے واقعات کا احوال نہیں سُنا؟" سلطان حسین نے شک کے لہجے میں پوچھا۔

"حضور والا کون سے واقعات؟"

"میری اور امیر تیمور گورگان کی لڑائی۔ اس لنگڑے کے آگے میری تقدیر میرا ساتھ چھوڑ گئی۔ میرے خیال میں تو اُسی کا بھیجا ہوا جاسوس ہے۔"

ساری بوغا ایک لحظہ کے لیے ہچکچایا کہ اپنی تلوار سلطان حسین کے سینے میں گھونپ دے یا اُس کے قدموں پر ڈال دے، لیکن اس کی اپنی گردن کے قریب سلطان حسین کی تلوار کی نوک تھی۔ اس نے المالیک میں تیمور اور سلطان حسین کی لڑائی کی خبریں خوب سنی تھیں۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ نکلتے ہوئے سورج کا ساتھ اچھا ہے، ڈوبتے ہوئے چاند کا کیا ساتھ۔ اس کے چہرے پر یک لخت کرختگی پیدا ہوئی یہ خواہش کہ ایک وحشیانہ وار میں یہ تلوار سلطان حسین کے ہاتھ سے گرا دے۔

اور اس کی آنکھیں سلطان حسین کی سرد، منجمد آنکھوں سے دوچار ہوئیں، تو اسے محسوس ہوا کہ جیسے

اس کے خیالات سلطان حسین پر آئینے کی طرح روشن ہیں۔

اس نے ایک لحظے کے اندر اندر تصفیہ کیا اور اپنی تلوار سلطان حسین کے قدموں پر الٹ دی اور گردن جھکا دی۔

"خداوند! میں مغل ہوں اور آپ جلائر مغل سلاطین ہیں۔ آپ کی رگوں میں خانِ اعظم چنگیز خاں اور ایلخان ہلاکو خاں کا لہو ہے۔ یاسائے چنگیزی نے مجھے آپ کی اطاعت کا حکم دیا ہے۔ میں آپ سے غداری کر کے تیمور لنگ کا ساتھ کیسے دے سکتا ہوں، جو گورگان ہے۔ جو چنگیز کے خانوادے کا داماد ہے اور ہے بھی تو آپ ہی کے رشتے سے۔ میں من کے کوکو تینگری کی، یاسائے چنگیزی کی قسم کھاتا ہوں کہ میں آپ ہی کا نوکر ہوں۔"

یہ کہہ کر ساری بوغا نے اوپر کی سیڑھیوں پر سلطان حسین کے قدموں کے قریب اپنا سر رکھ دیا۔

سلطان حسین کے ہونٹ لرزنے لگے، اس کے ہاتھ کپکپائے۔ شک ایک لمحے کے لیے چمکا اور غائب ہو گیا۔ پھر یہ کہ شک سے فائدہ ہی کیا تھا۔ اب شہ مات کے وقت دیر کیا سویر کیا۔ وزیر نہیں رُخ نہیں سپاہ نہیں، ایک مغل اسپ ملا ملا نہ ملا ملا۔ سلطان حسین کی گھنی پلکوں پر ایک نمکین ستارہ جھلکا۔ اس نے اپنی میلی خورجی سے مروارید کا ایک ہار نکالا اور ساری بوغا کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ "اس وقت میرے پاس کچھ نہیں، تو جا اپنا راستہ لے اور کسی سے اس کا ذکر نہ کر کہ تو نے مجھے یہاں دیکھا ہے۔ میں نے اوپر سے گھوڑے کو دیکھ لیا ہے، شمال مشرق میں اس نوکیدر ٹیلے کے اس پار ایک نخلستان ہے جہاں تیرا ٹٹو گھاس چر رہا ہے۔"

ساری بوغا خوشی سے چیخ پڑا۔

سلطان حسین نے پھر اسی وقار سے دہرا کر کہا: "جا اپنا راستہ لے۔"

سلطان حسین کے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ ساری بوغا نے اس کی طرف دیکھا اور اب وہ ایک نظر میں بھانپ گیا کہ ہارا ہوا شہریار کئی روز سے بھوکا ہے۔ اس کے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ وہ دیوار کے سہارے اپنا وزنی بوجھ سنبھالے تھا، لیکن اب بھی اس کا ہاتھ تلوار کو مضبوطی سے تھامے تھا اور ساری بوغا کو مجال نہ ہو سکی کہ اپنی نثار کی ہوئی تلوار پھر سے اٹھائے اور وہیں غداری کا وار کرے۔ اس نے نظر اٹھا کے سلطان حسین کی طرف دیکھا، اس کے سارے خیالات پھر سلطان حسین پر آئینے کی طرح آشکارا تھے، گویا سلطان کی آنکھیں اس کی غداری کو سمجھ بھی رہی تھیں اور معاف بھی کر رہی تھیں۔ اس نے پھر سلطان کے قدموں پر سر رکھ دیا اور رونے لگا۔ "میرے آقا نے مجھ پر رحم کیا۔ میری جان بخشی کی مجھے مروارید کا ہار دیا، اور میں نے اپنے آباؤ اجداد سے وفاداری نہ سیکھی۔ میرے آباؤ اجداد نے چغتائی خان کے ساتھ ختن فتح کیا اور میں

آج حضور کے کام نہ آ سکا۔ اب مجھے جاں نثاری کی اجازت مرحمت ہو۔ اس وقت میرے مشکیزے میں گندے پانی کے سوا کچھ نہیں۔ میں نخلستان سے اپنے ٹٹو کو لے کر کسی قریب کی ترکمان خیمہ گاہ تک جاؤں اور وہاں سے اپنے آقا کے کھانے کے لیے کچھ نہ کچھ لیتا آؤں۔

سلطان حسین نے اُسے اٹھنے کا حکم دیا، لیکن اس کی تلوار اُس کے حوالے نہیں کی۔ یہ حفاظت کی آخری کوشش تھی، لیکن اسے قتل بھی نہیں کیا۔ شاید اس کے دل میں وفا کی شمع روشن ہو۔ شاید وہ پہلا منگول اسپ ہو اور شطرنج کے سب مہرے اسی کے ذریعہ فراہم ہوں اور شاید تقدیر کا یہی منشا ہو۔ اس سے پہلے بھی کئی بار یہی ہو چکا ہے کہ دوست نے دشمنی کی اور دشمن نے دوستی۔ غدار نے جان بچائی اور جان نثار نے غداری کی۔ سلطان حسین نے اسے اٹھنے کا حکم دیا اور کہا: "یا تو اپنا راستہ لے یا اگر تو سچا ہے تو دن کو ادھر کا رُخ نہ کرنا۔ رات کو اگر کچھ کھانے کے لیے لا سکتا ہے تو لے آ۔"

یہ کہہ کے سلطان حسین نے اسے شک کی نظروں سے دیکھا، مگر اب اس منگول سردار کے چہرے پر کہیں مکاری اور چالاکی کے آثار نہ تھے۔ اس نے سلطان حسین کے ہاتھ چومے، اپنی تلوار وہیں اس کے قدموں پر پڑی رہنے دی اور ادب سے سیڑھیاں اترنے لگا اور مینار سے باہر جانے سے پہلے ایک بار پھر اس نے سر بہ سجدہ ہو کے سلام کیا اور کہا کہ "یہ جاں نثار اندھیرا ہوتے ہی اپنے آقا کے لیے کھانے کا سامان کہیں نہ کہیں سے لیتا آئے گا۔"

سلطان حسین اسی طرح دیوار کا سہارا لیے ہوئے کھڑا رہا، مگر اُسے بھوک سے چکر آ رہا تھا۔ جب ساری بوغا مینار سے باہر غائب ہو چکا، تو سلطان حسین نے مینار پر سے چڑھ کے دیکھا۔ نخلستان میں اپنا ٹٹو دیکھ کے ساری بوغا اس اشتیاق سے اس کی طرف دوڑا کہ اس عالم میں بھی سلطان حسین کو ہنسی آ گئی اور پھر اسے ذرا اطمینان ہوا کہ ساری بوغا نے سمرقند کا رُخ نہیں کیا بلکہ وہ جنوب میں اس طرف روانہ ہوا جہاں ترکمانوں کے خیمے تھے۔ اس کے باوجود سلطان حسین کو ساری بوغا کی غداری کا اندیشہ برابر کھٹکتا جاتا تھا۔ اس کے دل میں یہ بھی آئی کہ شام ہوتے ہی اس ویران مینار سے کہیں اور بھاگ نکلے، لیکن پھر بھوک پیٹ میں اژدہے کی طرح پھنکارے مارنے لگی اور سلطان حسین نے اپنے دل میں کہا کہ یہ گدھ جو دن بھر مینار پر میرے انتظار میں منڈلاتا رہا ہے، مجھے کتنی مدّت اور جانے دے گا۔ وہ تن بہ تقدیر نیم غشی کے عالم میں سو سا گیا۔

۳

اور جب اندھیرے میں اس نے سپاہیوں پر اور اپنے اطراف قدموں کی چاپ سنی تو وہ لمحہ بھر میں سمجھ گیا کہ یہ ساری بوغا اکیلا نہیں ایک پورا دستہ کا دستہ اس کے ساتھ ہے اور یہ دستہ وفاداروں کا نہیں اور اس نے ساری بوغا کی مکار آواز سنی جو تاریکی میں استہزا بکھیر رہی تھی: "ہم حضور کے جاں نثار خادم ہیں، لیکن اب حضور کی مزاحمت بیکار ہے۔"

سلطان حسین نقاہت کے عالم میں تلوار ٹیک کر اٹھ کھڑا ہوا، اس کا تن ہلکے ہلکے بخار سے اور اس کا من ایک طرح کی بے حسی سے جل رہا تھا، مگر اس نے پورے شاہانہ دبدبہ کے ساتھ کہا: "مجھے اپنے امیر کے پاس لے چلو۔"

تیمور کے خیمے میں ہر چیز سلطان حسین کی جانی پہچانی ہوئی تھی، یہاں تک کہ وہ شکل بھی جو نچلے سے حاشیہ دار تخت پر آہنی خود پہنے براجمان تھی اور جس کی ایک ٹانگ آگے کی طرف پھیلی ہوئی تھی۔

تیمور نے سلطان حسین کی طرف ایسی آنکھوں سے دیکھا جو گویا شیشے کی بنی ہوئی تھیں، جن میں جذبہ ندارد تھا۔ اس کے چہرے پر نہ خوشی تھی نہ رحم نہ خشونت۔ ایک خشکی تھی جس میں جذبات کا قطعاً وجود نہ تھا۔ اس نے سلطان حسین کو عزت سے بٹھانے کا حکم دیا۔

پھر اس نے اپنے اس رقیب، اس عزیز کی طرف دیکھا جو اولجائی کا بھائی تھا اور اولجائی اسے یاد آ گئی۔ اب وہ شہر سبز کے ایک سرسبز و شاداب پائیں باغ میں سرو کے ایک نوخیز پودے کے سائے میں ازلی ابدی نیند سو رہی تھی۔ اس کی اولجائی جس کے حسین، گداز جسم سے ایسی زندگی ٹپکتی تھی کہ وہ ہر لمحے جھانکتی ہوئی بھیانک دانت دکھاتی ہوئی موت کو بھول جاتا، جو ہر زاویہ، ہر گوشہ سے اس سے آنکھ مچولی کھیلتی اور جب تیمور کو اولجائی یاد آئی، تو اس کی آنکھوں سے آنسو نہ نکلے، لیکن ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے اوپر سے نیچے تک اس کے دل کو کسی بڑھئی کے آرے سے چیر دیا ہے۔ جیسے یہ زخم جسے کسی انسان کے ہاتھ نے نہیں لگایا تھا، شہر سبز کی طرح ہمیشہ ہرا رہے گا۔

سلطان حسین میں اولجائی سے ذرا سی مشابہت تھی، وہی کشادہ پیشانی، وہی ذرا ذرا پھیلی ہوئی ناک اور پھڑکتے ہوئے نتھنے اور تیمور نے ایک جذبہ سا محسوس کیا کہ وہ اٹھ کر اپنے اس خون کے پیاسے دشمن سے بغل گیر ہو جو اس کی محبوبہ کا بھائی تھا لیکن سنگین آنکھیں، فولادی اعصاب پھر سنگ و آہن کے ہو گئے۔ اولجائی کو سلطان حسین

کے ہاتھوں کون سی راحت ملی تھی۔ کیا اُس نے اولجائی کا ایک ایک محبوب زیور اپنے ہاتھ سے اُتار کے سلطان حسین کو بطور محصول کے نہیں دیا تھا اور یہ جان کر بھی کہ یہ زیور بہن کا ہے سلطان حسین نے اس خراج کو قبول نہیں کیا تھا۔ کیا اولجائی کی زندگی میں بھی وہ اس کے خون کا پیاسا نہیں رہا تھا۔

اس جنگل میں کوئی کسی کا بھائی نہیں تھا۔ کوئی کسی کا عزیز نہیں تھا۔ یہاں شیر تھے۔ چیتے تھے اور ان کے ساتھ بہت سے جنگلی جانور بستے ہوئے تھے۔ کچھ شغال کچھ بھیڑیئے کچھ خرگوش۔ یہاں کون کس کا تھا؟ یہاں نری موت تھی۔

پہلا فرض مہمان نوازی تھا۔ سلطان حسین کے ہاتھ دھلائے گئے اور اس کے آگے دسترخوان بچھایا گیا۔ تیتروں کی یخنی، شیش کوفتہ اور پتلی پتلی ترکانی نانوں کی رکابیاں اس کے آگے سجائی گئیں۔ تیمور کو معلوم تھا کہ سلطان حسین کو تورانی کو میں پسند نہیں۔ ہراتی انگوروں کی کشید کی ہوئی شراب کا ساغر اور اس کے ساتھ کاشان کا منقش طلائی جام اس کے آگے رکھا گیا۔ اس کا اپنا بھانجا اور تیمور کا سب سے بڑا بیٹا جہانگیر اس کے سامنے، تیمور کے اشارے پر دوزانو ہو بیٹھا۔ سلطان حسین کئی دن کا بھوکا تھا، لیکن اس کے چہرے سے یا اُس کے شاہانہ انداز استغنا سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ابھی ابھی اتنا کھا پی چکا ہے کہ اب صرف اپنے میزبان کی خاطر سے دوبارہ کھانے پر آمادہ ہوا ہے۔

کھانے کے درمیان میں زاست اور خالص ترین شر کی ایک جھلک تیمور کے چہرے پر نمودار ہوئی۔ اس کے ابرو اور گھنے ہو گئے اور اس کی پیشانی پر تین لکیریں نمودار ہوئیں اور اس نے تین مرتبہ تالی بجائی۔ اس سہ بارہ تالی کا مطلب سب کو معلوم تھا۔ ایک زرد رو لاغر اندام شخص پردے کے پیچھے سے نمودار ہوا، وہ چینی اطلس کا لبادہ پہنے تھا اور اس کی تلوار کی میان طلائی تھی۔ وہ سر سے پیر تک بجائے زرہ بکتر اور جوشن کے محبوب خواجہ سراؤں اور غلاموں کی طرح جواہرات سے پہنے تھا۔ اس کے کان چھدے ہوئے تھے اور اس کے گلے میں مروارید کے ہار پڑے تھے، لیکن اس کے سر پر مغلوں کا چنگیز خانی تاج تھا۔

تیمور کے ہونٹوں پر ایک طرح کی ذلیل شیطانی مسکراہٹ جھلکنے لگی اور اس کا اشارہ پاتے ہی، تیمور کی اپنی اولاد کے سوا جتنے درباری اور سپہ سالار تھے وہ سب جھک کر آداب بجا لائے اور تیمور نے اس چینی اطلس کے لبادے کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

سلطان حسین نے یہ سب کن انکھیوں سے دیکھا اور نفاست اور بے نیازی سے نان اور شیش کوفتہ کا ایک بڑا سا لقمہ اپنے منہ میں رکھا اور پھر ہراتی شراب کا جام اپنے منھ سے لگا لیا۔

اب تیمور نے اس سے کہا: "برادرِ عزیز سلطان حسین جب آپ ہم سے جدا ہو گئے اور آپ نے مجھ سے مقابلہ اور میرے خلاف صف آرائی میں مصلحت جانی تو میں نے سیور غاتمش کو جو خانِ اعظم چنگیز خاں کی نسل سے

ہے اور جس طرح آپ ایلخانی شاخ کے چشم و چراغ ہیں، اسی طرح اس کا تعلق چغتائی شاخ سے ہے، ماوراءالنہر سمرقند اور تاتار کا بادشاہ مقرر کیا۔ کیونکہ بادشاہ کا خانِ اعظم چنگیز خاں کی نسل سے ہونا ضروری ہے۔"

سلطان حسین نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ جہانگیر نے اپنے باپ کی طرف نیچی نظر سے ایک بار دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔ خدام نے آگے بڑھ کے سلطان حسین کے آگے سلفچی رکھ دی اور اس کا ہاتھ دھلانے لگے۔ سلطان حسین نے منہ میں انگلی ڈال کے دانت صاف کیے اور کلی کی۔ خدام نے ترکی طوال اور کنگھا پیش کیا۔ سلطان حسین نے طوال سے منہ صاف کیا اور اپنی گھنی داڑھی میں کنگھی کی۔ دسترخوان بڑھایا جانے لگا اور اس وقت دانتوں میں طلائی خلال کرتے کرتے سلطان حسین تیمور کی طرف متوجہ ہوا۔ سیورغاتمش پر اس نے حقارت اور رعونت کی نظر ڈالی اور تیمور سے کہا: "برادرِ عزیز امیر تیمور گورگاں تعز من تشاء و تذل من تشاء۔"

قاضی زین الدین نے تسبیح پڑھتے پڑھتے گردن جھکا لی۔ تسبیح ختم کر کے اس نے گہری سانس لی اور تیمور کی طرف لجاجت کی نظر سے دیکھا، گویا وہ سلطان حسین کی سفارش کر رہا ہے۔ پھر ہمت کر کے اس نے ہاتھ جوڑے اور کہا:

"اگر اس بوڑھے بے صرف جان کو اماں ملے، تو کچھ عرض کرنے کی جرأت کروں۔"

تیمور نے اس کی طرف دیکھا، یہ گویا اس کے اپنے ضمیر کی آواز تھی۔ "زین الدین بابا آپ کا ارشاد میرے سر آنکھوں پر۔"

زین الدین نے کہا: "امیر تیمور صاحب قراں، اللہ تعالیٰ کی مصلحتیں عظیم ہیں اور عجیب و غریب ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو عزت اور توقیر بخشی۔" .... تیمور کے چہرے پر بے صبری کی لہر دیکھ کر اس نے کہا: "اس کے فیض سے آپ کے بازو کو وہ قوت عطا ہوئی کہ آپ نے چغتائی مغلوں کا قلع قمع کیا، ماوراءالنہر اور سمرقند کو کفار سے پاک کیا۔ اپنے اور تمام حریفوں کو شکست دی اور بجا طور پر آپ نے اپنے لیے امیر صاحب قراں کا لقب انتخاب فرمایا۔ آپ نے قرآن کے ساتھ یاسائے چنگیزی کی بھی پابندی کی۔ آپ نے تاج کو ٹھکرایا، اور اپنی ایک ٹھوکر سے امیر سیورغاتمش کو تاجدار بنا دیا۔ آج آپ کا حریف اور برادرِ نسبتی سلطان حسین آپ کے دربار میں اسیر ہو کے آیا ہے۔ یا امیر صاحب قراں یہ فیاضی کا وقت ہے ......" زین الدین کی آواز میں اب خوشامد یا مصلحت کا اثر باقی نہ رہا اور اس نے کڑک کر کہا: "یہ جان بخشی اور فراخ دلی کا موقع ہے۔ سلطان حسین آپ کا بھائی ہے۔ آپ کی مرحوم اہلیہ جنت مکانی الجائی خاتون آغا کا بھائی ہے۔ اس بوڑھے کی سفید داڑھی کی لاج رکھیے۔

آپ دونوں میری آنکھوں کا نور ہیں۔ آپ سلطان حسین کی خطا سے درگزر کیجیے، اور ادلجائی خاتون آغا کی محبت اور ان کی یاد کے واسطے سے......"

تیمور نے دیکھا کہ جہانگیر کی گردن جھک گئی ہے اور اس کی پلکوں پر ذرا سی نمی پیدا ہو چلی ہے۔

تیمور نے کرخت آواز لیکن بڑے ادب کے لہجے میں کہا: "بابا زین الدین مجھے ایک لمحے کے لیے معاف فرمائیں میں ساری بوغا سے ایک سوال پوچھ لوں۔"

جہانگیر پر نظر گاڑ کے تیمور نے ساری بوغا سے پوچھا۔

"ساری بوغا مروارید کا جو ہار تمہیں سلطان حسین نے دیا، تمہارے پاس ہے؟"

ساری بوغا نے وہ دانوں جڑا ہوا ہار اپنی خورجی سے نکالا اور تیمور کی خدمت میں پیش کر دیا۔

تیمور نے کہا: "ساری بوغا اس کے بدلے اس کی دُہری قیمت کے جواہر تمہیں ملیں گے۔ میں نے تمہیں تمہاری وفاداری کے صلے میں منگ باشی مقرر کیا" اور پھر تیمور نے جہانگیر پر شفقت کی ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈال کے اسی طرح بیٹھے بیٹھے اپنی گردن سلطان حسین کی طرف پھیری اور اس طرح کہا جیسے کوئی اپنے آپ سے کوئی راز کی بات کہے۔

"یہ ہار ادلجائی خاتون آغا کا تھا"

دفعتاً خیمے میں سناٹا چھا گیا۔ زین الدین کی زبان بند ہو گئی۔ جہانگیر کی پلکیں خشک ہو گئیں۔ ایلچی بہادر کے چہرے کے اعصاب سخت ہو گئے، ساری بوغا کی منگول مونچھوں کے نیچے ایک وحشی سی مسکراہٹ ایک کان سے دوسرے کان تک پھیل گئی ——— اور سلطان حسین نے سر جھکا لیا اور لمحہ بھر بعد جب کنکھیوں سے تیمور کی طرف دیکھا، تو معلوم ہوتا تھا کہ تیمور کی آنکھیں زرد ہو چکی ہیں، جیسے اسے یک لخت یرقان ہو گیا ہو۔

اور تیمور نے آہستہ آہستہ کہا: "سلطان حسین، خدا نے تمہیں سالاروں کے خاندان میں، چنگیز خان کی اولاد میں پیدا کیا۔ تم سلطان تھے، الجائی تمہاری بہن تھی۔ یاد ہے میں نے ہمیشہ تم سے وفاداری کی۔ میں نے چغتائیوں کو سپرد دیا کے اس پار دھکیلا اور جیحون اور سیحوں کے درمیان کی سرزمین تمہارے حوالے کی۔ میں نے تم سے برابری اور ہمسری کا دعوے نہیں کیا تھا، لیکن تم نے مجھ پر اور اپنی بہن پر جو مصیبت کے زمانے میں تمہارے ساتھی تھے، اپنی سلطنت کے زمانے میں بہت سختی کی......" مصنوعی زخم خوردہ آواز میں تیمور نے کہا۔ "تم اس ہار کو پہچانتے ہو، جب تم نے مجھے نکال باہر کیا اور مجھ پر سختی کی تو میں نے ادلجائی خاتون آغا کے زیور اتار

سکے تکاں میں ادا کیے اور تم جانتے تھے کہ یہ ہماری بہن کا زیور ہے، لیکن تم نے اسے بطور نگان کے قبول کیا۔ تم نے مجھ پر اور اپنی بہن کی زندگی میں اس پر رحم نہ کھایا...." اور پھر بپھرے ہوئے زخمی شیر کے لہجے میں اس نے "قاضی زین الدین کو مخاطب کیا:" میرے مرشد کامل زین الدین بابا سچ بتاؤ کیا جو کچھ میں کہہ رہا ہوں غلط ہے ؟"

زین الدین کا ہاتھ اسی طرح تسبیح کے دانوں سے الجھا رہا۔ دوسرے درباریوں نے بآوازِ بلند ندا لگائی۔

"امیر صاحب قراں کا ارشاد درست اور برحق ہے۔"

سلطان حسین نے پہلو بدلا۔ پہلے وہ ذرا بے تکلفی سے آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا، اب دوزانو ہو گیا۔ اس نے اس کی بڑی کوشش کی کہ اس کی آواز گلوگیر نہ ہونے پائے اور اس کے لہجے میں کھویا ہوا وقار کھوٹے سکے کی طرح کھنکھتا رہے۔ اس نے کہا: "امیر تیمور گورگاں....."

آوازیں آئیں: "امیر تیمور صاحب قراں:"

اس نے کہا: "امیر تیمور صاحب قراں، خدا تجھے صاحب قرانی مبارک کرے۔ خدا سیورغاتمش کو سلطنت مبارک کرے۔" اس نے ایک حقارت کی نظر سیورغاتمش پر ڈالی جو کھسک کر تیمور کے ہنگرٹے پیر کے قریب آ بیٹھا تھا۔ "مجھے اب سلطنت کی ہوس باقی نہیں رہی۔ میں اب صرف ایک استدعا کر رہا ہوں اور وہ یہ کہ مجھے اجازت ہو کہ میں حج بیت اللہ کا ارادہ کروں۔ میں اس سرزمین سے جہاں میں نے کچھ دن پہلے حکومت کی تھی، اپنا منہ کالا کر لوں اور باقی ایام خانۂ کعبہ کے طواف اور توبہ و استغفار میں بسر کروں۔"

ساری بوغا اتنی آسانی سے اپنے شکار کو چھوٹتا نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے کہا: "اے امیر کتنی بار سلطان حسین سے صلح کی اور دوستی بڑھائی اور کتنی بار دھوکہ کھایا.....؟"

بابا زین الدین نے پھر ہاتھ جوڑے اور لرزتی ہوئی آواز میں کہا: "امیر صاحب قراں عفو لطف درگزر میں ہے انتقام میں نہیں۔ اگر اجازت ہو تو کچھ عرض کروں....." تیمور کے قیافے پر بے صبری کے آثار دیکھ کر اس نے کہا: "میں کوئی فقہ و حدیث کا حوالہ نہیں دینا چاہتا صرف دنیاوی دانش و سیاست کا ایک واقعہ عرض کرنا چاہتا ہوں اور یہ واقعہ امیر معاویہ کی زندگی کا ہے جس کے متعلق یعقوبی نے یہ روایت کی ہے کہ کسی نے امیر معاویہ سے پوچھا کہ کس طرح آپ نے اپنے اطراف اتنے وفادار سپہ سالار مہیا کیے اور کس طرح دنیاوی کامرانی میں آپ بازی لے گئے، تو امیر معاویہ نے ہنس کر جواب دیا کہ گفتار زبان سے کام چل سکتا ہے، تو میں تلوار استعمال نہیں کرتا اور اگر

شہر کو تسخیر کرے گا۔"

اور اس پر آق بوغا نے جو ابھی تک خاموش بیٹھا تھا صدا لگائی: "ہاں سلطان حسین اس وقت تم کہاں تھے، جب امیر تیمور صاحب قراں نے آگ جلا کے ایک لشکر کو شکست دی اور گرد اڑا کے ایک شہر کو تسخیر کیا۔"

سیورغاتمش جو تیمور کی لنگڑی ٹانگ کی قریب خاموش بیٹھا تھا، اس طرح بول اٹھا جیسے راوی ایک دوسرے کی داستان بڑھانے کے لیے بول اٹھتے ہیں یا جیسے شاعر ایک دوسرے کا مصرع اٹھاتے ہیں "بدخشاں کا کون ساشامان؟"

بات کو کبابوں کی طرح دانتوں میں پیس پیس کر ایلچی بہادر نے کہنا شروع کیا "وہی اندھا شامان جسے آمودریا کے پل کی لڑائی سے پہلے ہم نے بدخشاں میں چغتائیوں کا جاسوس سمجھ کر پکڑا تھا......"

یہاں سے آق بوغا نے بات اٹھائی "مگر وہ شامان چغتائی نہیں، قپچاقی لہجے میں الغوری بولتا تھا معلوم نہیں کس دھن میں قپچاق کی ہری بھری چراگاہیں چھوڑ کے بدخشاں کے برف زاروں میں آنکلا تھا۔ بودھ مت کے بھکشوؤں کی طرح کہا کرتا تھا کہ یہیں پہاڑوں میں من کے کو کو تینگری سے لو لگائی جا سکتی ہے۔ حالانکہ یہ بات بالکل میری سمجھ میں نہ آئی کیونکہ نیلا جاودانی آسمان قپچاق کے مرغزاروں سے تو صاف صاف نظر آتا ہے مگر بدخشاں کے پہاڑوں میں بادلوں سے گھرا رہتا ہے......"

بات کاٹ کے ایلچی بہادر نے کہا "حضور امیر صاحب قراں، بابا زین الدین کی طرح آق بوغا نے بھی لن ترانی شروع کر دی۔ وہ عربی لن ترانی تھی یہ تورانی لن ترانی ہے .... میں .... میں تو صرف سلطان حسین سے کہنا چاہتا تھا کہ میں نے جو امیر تیمور سے وفاداری کا عہد باندھا وہ اس لیے تھا کہ سلطان حسین کا تو دُور دُور کہیں پتہ بھی نہ تھا، اگر چغتائیوں کے مقابلے میں امیر تیمور نے گرد اڑا کے ایک حصار کو تسخیر کیا۔"

تیمور کے چہرے پر تحسین کی ایک جھلک تھی۔ عدالت دفعتاً روایت گاہ بن گئی تھی۔ ایلچی بہادر نے نمکین مچھلی اور تلے ہوئے باداموں کی آہستہ آہستہ جگالی شروع کی۔

سلطان سیورغاتمش، تم اس زمانے میں ہمارے ساتھ نہیں تھے۔ میرے رفیقوں کو یاد ہوگا کہ ہم سب چالیس آدمی تھے۔ سب سے آگے آگے امیر تیمور گورگاں، ان کے پیچھے اولجائی ترکان آغا، پھر جاکو برلاس، پھر میرا یہ یار آق بوغا، پھر میں تھا اور پھر اور سب تھے اور پہاڑی پگڈنڈی بہت تنگ تھی۔ گھوڑوں کے سُم بار بار

زبان سے کام چل سکتا ہے تو میں تازیانہ استعمال نہیں کرتا...... یہ روایت میں نے اس لیے بیان کی ہے کہ یہ دنیا داری کی دانش ہے۔ اسی مناسبت سے الفخری نے اپنی تاریخ میں امیر معاویہ کے علم کی تعریف کی ہے۔ علم کا تقاضا یہ ہے کہ شکست خوردہ دشمن سے درگزر سے پیش آیا جائے۔"

تیمور کی پیشانی کی شکنیں اسی طرح گہری تھیں، ابرو پر وہی بل تھے۔

ایلچی بہادر جو ذرا ذرا سرور کے عالم میں تھا، بے صبری سے پہلو بدلنے لگا۔ جب کومیس کا نشہ تیز ہوتا تھا تو اس کے چہرے کی سنجیدگی میں خشونت کا انداز پیدا ہونے لگتا۔ وہ دنیا بھر سے برہم معلوم ہوتا۔

بابا زین الدین کی بات کاٹ کے اس نے اکھڑ سپاہی کی طرح تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھا، سر بہ سجدہ ہو کے زمین چومی اور کہا: "امیر صاحب قراں، سلطان حسین نے آپ سے بغاوت کی ہے اور اسے اس کی سزا ملنی چاہیے یعقوبی اور فخری مجھ جیسے سپاہی کی سمجھ سے باہر ہیں۔"

اس پر سلطان حسین کو طیش آ گیا اور وہ یہ بھی بھول گیا کہ وہ قیدی ہے۔ جلائروں کے خاندانی دبدبہ کے لہجے میں اس نے کہا: "نمک حرام ایلچی بہادر تو نے یہ کیا کہا کہ ہم نے بغاوت کی ہے؟ ہم نے؟ ہم جو جلائروں کے خاندان سے ہیں۔ ہماری رگوں میں ہلاکو خاں اور چنگیز خاں کا خون ہے۔ تو اپنے آپ کو مغل کہتا ہے، تو نے کبھی یاسائے چنگیزی پڑھی ہے یا پڑھوا کر سنی ہے۔ تو نے خانِ اعظم چنگیز خاں کا حکم نہیں پڑھا کہ سلطانی اور بادشاہی اسی کے اپنے خاندان میں رہے گی۔ تیمور اس لیے امیر ہوا کہ وہ میرے خاندان کا گورگاں ہے، میرے خاندان میں اس نے دامادی کی۔ اس کی شادی میری بہن الجائی سے ہوئی اور الجائی جو شاہزادی تھی آج زندہ نہیں پھر بتا کس نے کس سے بغاوت کی اور بادشاہت کس کا حق تھا......"

اب ایلچی بہادر کا سر گھومنے لگا۔ وہ سولوتائی بہادر کی اولاد تھا۔ جو چنگیز خاں کا دست راست تھا، جس نے کبھی چنگیز سے غداری نہیں کی اور چنگیز سے غداری کر کون سکتا تھا، جس نے کبھی باتو خاں سے غداری نہیں کی لیکن چنگیز خاں کی بات اور تھی اور سلطان حسین کی بات اور تھی۔ یاد ایلچی بہادر کے دانتوں میں ہرن کے نمکین کباب کی طرح پسنے لگی اور پھر یاد کچھ یوں بدل گئی گویا وہ تلا ہوا اگر دہ تھی جسے وہ نمکین ککڑی کی طرح چبا رہا تھا اور اس نے کہا۔

"بادشاہت کسی کا حق سہی مگر صاحب قرانی اور سلطنت اس کا حق ہے جس کے حق میں بدخشاں کے بوڑھے شاماں نے پیشین گوئی کی تھی کہ یہ آگ جلا کے ایک لشکر کو شکست دے گا اور گرد اڑا کے ایک

چٹانوں کی نوکوں سے ٹکراتے۔ ڈھلوانوں پر گندی گندی برف چمک رہی تھی۔ ہم جہاں کہیں دم بھر کو ٹھہرتے نگاہیں ڈھیلی چھوڑ دیتے۔ ہمارے گھوڑے نرم برف سے رستے ہوئے پانی کی ڈھلی ہوئی گھاس کو اس طرح چباتے جیسے مرغ کی یخنی میں ڈوبی ہوئی ترکاری ہم لوگ کھاتے ہیں۔ پہاڑی درندے خال خال تھے، مگر جب ایک موڑ پر امیر گرگان نے اپنے گھوڑے کی باگ موڑی، تو ان سے چند قدم کے فاصلے پر ایک پہاڑی تیندوا اسی پگڈنڈی پر سامنے کھڑا ہوا تھا۔۔۔۔"

اس یاد کے جادو سے تیمور کی پیشانی پر روشنی سی جھلکنے لگی اور وہ بے ساختہ بول اٹھا: "مجھے خوب یاد ہے بالکل میرے مقابل، گویا یہ مقابلہ کرنے کو آ نکلا تھا۔ مجھے اس کا رنگ یاد ہے۔ برف کے سمور کی طرح سفید اور اس پر بھورے بھورے دھبے تھے۔ بہت کم زمانے میں میں نے ایسے خوبصورت جانور دیکھے ہیں۔ جاکو برلاس نے کمان اٹھائی تو میں نے اسے روک دیا اور کہا کہ یہ میری تقدیر کی نشانی ہے۔ مگر اس زخمی ہاتھ سے تیر چلا کے میں نے اس تیندوے کو مار لیا، تو میرے تاریخ کے چالیس ساتھی ایک دن چالیس ہزار بن کے چغتائیوں کو شکست دیں گے۔"

آق بوغا نے کہا: "اور جب حضور نے تیر چلایا، تو چشم زدن میں تیندوا وہیں ڈھیر تھا۔۔۔۔ اور یہی حال امیر صاحب قراں کے اور دشمنوں کا ہوگا۔" اس پر سب نے نظر بھر کے سلطان حسین کو دیکھا جس کے چہرے کا رنگ سفید پڑتا جا رہا تھا۔

ایلچی بہادر نے کہا "جیسا امیر صاحب قراں نے ارشاد کیا تھا وہی ہوا۔ برلاس سوار آتے گئے، اور ہماری تعداد بڑھتی گئی اور ہم اپنے پیارے آمو دریا کے کنارے کنارے بڑھتے گئے، جس کے اس پار دشمن کا پڑاؤ تھا۔ اُدھر بکی جوک کا لشکر تھا اور سینہ تک ہم آمو دریا کے آرپار اس سے آنکھ مچولی کھیلتے رہے۔ مغل فوج ہمارے ساتھ ساتھ بڑھتی، ہمارے ساتھ ساتھ پیچھے ہٹتی اور روز تیروں کے بادل اس کنارے سے اس کنارے سے اُس کنارے سے اس کنارے تک اُمڈتے اور برستے جاتے۔ یہاں تک کہ ہمارے پیارے آمو دریا نے ایک نرالی وادی میں قدم رکھا جس میں نہ سبزی تھی، نہ صنوبر تھے۔ کالی کالی چٹانیں تھیں، جن کے کنارے کائی جم رہی تھی اور گھوڑوں کے قدم پھسلتے تھے اور یہاں پتھر کا ایک مضبوط پل تھا۔ کالا پل، مضبوط پل، آمو کے اس پار سے اُس پار تک۔ اس پل پر امیر نے معاوہ اور امیر موسےٰ کے ساتھ پانچ سو برلاس سوار چھوڑے اور ہم سب امیر کے ساتھ مغلوں کی فوج کے پیچھے والی پہاڑیوں میں جا پہنچے۔ یہاں امیر تیمور کے حکم سے ہم سب منتشر ہو گئے اور ہم نے دُور دُور تک پہاڑیوں میں آگ جلائی۔ آدھی رات کو جب بکی

تک غائب رہا گئے پیچھے ہو لیا۔ پھر تک الٹا جا لی کے اندر دشمن چھپتا دیکھا، تو سب کو
ہماری فوج اس سے کسی قسم کی ... ہمارے ... اس کی فوج ہم سے ... سب کو وہ ہماری فوج سے
گزر گیا۔ سب کو شکار نہ کر سکا۔ سب حیرت اس میں ہے کہ بچ کر نکل جاتے اور جب وہ بھاگ گیا، تو اس
طرح اندھے چغتائی شامان کی پہلی پیشین گوئی پوری ہوئی۔ امیر لیاس نے صرف ایک ہزار جرار لشکر
کو شکست دی۔ سلطان حسین اس وقت تم کہاں تھے؟

اور اس پر آق بوغا نے کہا "ایلچی بہادر سچ کہتا ہے۔ اس واقعہ کے بعد ہمارے آقا امیر صاحب قران
نے کہا۔ آق بوغا وہ اندھا شامان جھوٹا نہیں تھا اگر وہ پیشین گوئی نہ کرتا تو مجھے آگ کا لطیفہ ہرگز نہ سوجھتا۔ اب اس کی
دوسری پیشین گوئی پوری کر دکھاؤں۔ آق بوغا کے انداز بیان میں خلیل ہندی کا سرخ سرخ چہرہ نہیں تھا۔ امیر
نے کہا سب سے پہلے ماوراء النہر کا جو شہر چغتائیوں سے آزاد ہوگا وہ میرا اپنا شہر، میرا شہر سبز ہوگا۔ تو آپ نے ساتھ
دو سو سوار لیے۔ ان سواروں کی رکابوں کے دونوں طرف سوکھی ہوئی خاردار جھاڑیاں اس طرح باندھ دیں جب
وہ گھوڑوں کو سرپٹ دوڑائیں تو بے حد گرد و غبار بلند ہو اور ان سواروں کے ساتھ آپ نے علی الصباح شہر سبز کی
فصیلوں کا طواف شروع کر دیا۔ الغرض صبح سے کر نصف النہار تک ہمارے گھوڑے شہر سبز کی فصیلوں کا طواف
کرتے رہے۔ گرد و غبار کا یہ عالم تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ لاکھوں کا لشکر شہر کا طواف کر رہا ہے۔ چغتائی دستے نے
سفید جھنڈا لہرایا اور شہر کے دروازے کھول دیئے۔ اس طرح اندھے شامان کی دوسری پیشین گوئی پوری ہوئی۔"

دربار میں "سبحان اللہ۔ سبحان اللہ" کا شور بلند ہوا اور تیمور نے زور سے قہقہہ لگایا: "بابا زین الدین تم
نے امیر معاویہ کی روایت کیا شروع کی کہ میرے بہادر سرداروں کو راوی بنا دیا۔"

ایلچی بہادر نے کہا: "سلطان حسین اس وقت تم کہاں تھے۔ تم جب چغتائیوں سے لڑتے۔ غلط طریقے
چلاتے اور جیتے لڑتے اور ہمیشہ منہ چھپاتے پھرتے۔"

امیر تیمور کے چہرے پر کڑوی، استہزائی ہنسی کے آثار پیدا ہوئے لیکن اس نے اپنے آپ کو روک
کے اشارے سے کہا "ایلچی بہادر خاموش۔"

پھر اس نے سلطان حسین کی طرف دیکھا: "حسین اس میں کوئی شک نہیں کہ بادشاہت کا حق مجھے
پہنچتا تھا، مجھے نہیں لیکن میں نے کبھی بادشاہت کا دعویٰ نہیں کیا۔ جب تم میری جان کے دشمن ہو گئے
نے تیرا ساتھ دیا۔ میں نے قرشی کو فتح کیا میں نے سمرقند فتح کیا جبکہ میں نے سیہ کا تخت کر بادشاہ بنایا

کیا میرے قدموں سے لپٹا ہوا بیٹھا ہے۔ یہی سیورغاتمش تاتار کا بادشاہ ہے۔ میں مانتا ہوں کہ سلطانی یا خانی کسی گورگاں کو نہیں ملے گی۔ بادشاہ چنگیز خاں کی نسل سے ہوگا، لیکن پہلے وہ ہلاکو خاں کی نسل سے تھا۔ اب چغتائی خاں کی نسل سے ہے۔ اس لیے اب ماورالنہر میں تیرا کوئی مقام نہیں؛

سلطان حسین نے کہا: میں تخت و تاج سے دست بردار ہو چکا ہوں۔ مجھے بیت اللہ جانے کی اجازت دو؛

تیمور نے آنکھیں بند کر لیں۔ گویا وہ کچھ سوچ رہا ہے۔ ایلچی بہادر نے پھر آق بوغا سے باآواز بلند کہا: اس بہانے ایک مرتبہ پھر جنگل سے نکل گیا، تو پہلے کی طرح پھر سر اٹھائے گا اور امیر صاحب قراں سے پھر بغاوت کرے گا؛

امیر تیمور نے ڈانٹ کر کہا: ایلچی بہادر۔ خاموش؛

جب دربار میں خاموشی چھا گئی، تو امیر تیمور نے باآواز بلند کہا: کسی اور امیر کو کچھ اور کہنا ہے۔ سلطان حسین کو میں کوئی سزا اس لیے نہیں دے سکتا کہ جب وہ میرا حریف تھا، اس ملک کا بادشاہ تھا۔ آج جب کہ وہ بادشاہ نہیں، وہ صرف اس ملک سے باہر حج بیت اللہ کو جانے کی اجازت چاہتا ہے۔ میں اسے روک نہیں سکتا۔ کوئی اور امیر ایسا ہے کہ جسے سلطان حسین سے کوئی اور شکایت ہے، اگر ہے تو وہ بھی بیان کرے کیونکہ میرے دربار میں انصاف ہے، جبر نہیں؛

تیمور کی آنکھوں میں چالاکی اور مکر کی ایسی بے پناہ چمک تھی کہ بابا زین الدین نے سر جھکا لیا۔ سب سمجھ گئے کہ اب کے جو چال چلی جائے گی۔ اصلی شہ مات وہی ہے۔

عین اس وقت اس بے ساختگی سے جیسے کوئی مہرہ خود بخود اٹھے، جیسے برابر برابر کی بازی کے درمیان یک لخت خطرناک طور پر شہ پڑ جائے، ایک نوجوان نے دو زانو ہو کر فریاد کی۔ بادشاہی آپ کا، سلطان حسین کا اور سلطان سیورغاتمش کا آپس کا معاملہ ہے۔ میں آپ سے انصاف کا طالب ہوں کہ مجھے اپنے بھائی اولجاتیو کے خون کا قصاص ملنا چاہیے؛

یہ مہرہ جو یوں بے ساختہ اٹھا تھا، تیمور نے سلطان حسین کی گرفتاری کی اطلاع سنتے ہی محض اس موقع کے لیے جما دیا تھا، اب تک وہ خاموش تھا۔ اب اس مہرے کے چلنے سے سناٹا سا چھا گیا۔

امیر تیمور نے قاضی زین الدین کو ارشاد کیا: بابا زین الدین۔ یہ امیر بلخ کی خسرو کی فریاد ہے سلطان حسین

کے حکم سے اُس کے بھائی اولجا تیو کو قتل کر دیا گیا تھا۔ تم نے سب سے انصاف کا مشورہ دیا ہے اور میں نے ہمیشہ مانا ہے۔ اب تم انصاف کا فتویٰ دو۔۔۔۔۔"

سلطان حسین نے کہا "مجھے یہ واقعہ یاد بھی نہیں، لیکن امیر تیمور کسی نے آج تک بادشاہ پر قتل کا الزام لگایا ہے؟ کیا ہر جان بادشاہ کی ملکیت اور اس کے اختیار کی چیز نہیں ہے؟"

مگر شاطر کے چہرے کے اعصاب سخت ہو گئے اور اس نے کہا "یہ معاملہ انصاف کا ہے۔ اس کا باقاعدہ فیصلہ ہونا چاہیے۔ میں اس میں دخل نہ دوں گا" اور پھر اس نے تحکم اور تقویٰ کے ملے جلے لہجے میں کہا "ورنہ کل داورِ محشر کو کیا منہ دکھاؤں گا"

اس نے نظر اٹھا کے دیکھا، اس کے سامنے ایک خمیدہ قامت پیر مرد عصا کا سہارا لیے کھڑا تھا اور پیر مرد کے جسم میں رعشہ تھا۔ یہ اس کا پرانا رفیق، اس کا استاد قاضی زین الدین تھا۔

زین الدین کی رعشہ دار آواز میں لجاجت بھی تھی اور ملاحت بھی "اے امیروں کے امیر، اے سرداروں کے سردار جس داورِ محشر کا تو نے نام لیا وہ عادل ہے۔ میں نے مانا کہ وہ رحیم بھی ہے اور قہار بھی۔ وہ سب کچھ ہے مگر مدعی نہیں اور قاضی اگر مدعی بھی ہو تو انصاف کیا خاک کرے گا۔ وہ کسی فریق کا فریقِ مخالف نہیں"

بوڑھے کی نظروں میں ایک طرح کا جلال تھا جس کے آگے تیمور کا اپنا جلال ماند تھا۔ اس نے کہا "بابا زین الدین آپ تشریف تو رکھیں۔ آپ کا ارشاد سر آنکھوں پر، لیکن اب تو اس قضیے میں ایک فریق امیر کیخسرو ہے جو مدعی ہے اور دوسرا فریق سلطان حسین ہے۔ میری حیثیت اس مقدمے میں منصف اور قاضی کی ہے۔ کیا آپ مقدمے کی اس صورت کو تسلیم نہیں کرتے؟"

بابا زین الدین نے اسی طرح بھرائی ہوئی آواز میں رک رک کر جواب دیا "میں کیا اور میری مجال کیا کہ آپ کے مقدمے کی اس صورت کو تسلیم کروں یا نہ کروں، لیکن آپ ہی کے والد نے مجھے شہر سبز کا قاضی مقرر کیا تھا، پھر آپ کے ماما کازغان نے مجھے سمرقند میں قاضی القضاۃ بنایا۔ میں نے ہمیشہ آپ کی اور آپ کے خاندان کی خدمت کی اور آپ کا خاندان سلطان حسین کے خاندان سے الگ نہیں۔۔۔۔۔"

شاطر گویا لمحہ بھر کے لیے مات کھا گیا، اس دہکتے ہوئے جہنم میں کہیں ٹھنڈا نور تھا جو اُبل پڑا اور تیمور نے کہا "اگر آپ چاہیں تو بجائے خود فیصلہ کرنے کے میں سلطان حسین کا مقدمہ آپ کے سپرد کرتا ہوں"

زین الدین کی تھکی ہوئی آواز نے جواب دیا "میں کیا اور میری بساط کیا، لیکن اے امیر میں اب

چراغ سحری ہوں۔ اس مقدمے اور اس کے بعد کے ہر مقدمے کی سماعت محترم آپ کو کرنی ہے جب میں نے آپ کے لیے امیر صاحب قِراں کا لقب تجویز کیا، تو خوشامد کی بات نہیں تھی۔ میں نے آپ کی پیشانی پر اقبال کا ستارہ چمکتا دیکھا جو آج اگر توران میں چمک رہا ہے تو کل مصر، روم، شام اور قپچاق پر چمکے گا اب یہ آپ کے اختیار کی بات ہے کہ یہ جبر کا ستارہ ہوگا یا عدل کا۔ یہ پہلا مقدمہ آپ کا پہلا امتحان ہے۔ بظاہر سلطان حسین کا حریف اور مدعی کیخسرو ہے لیکن کیخسرو کو مدعی بننے کی جرأت اس لیے ہوئی ہے کہ اصلی مدعی آپ ہیں۔ اے امیر اگر اس بوڑھے کی زبان کٹوانی ہو تو کٹوا دیں، لیکن جب تک اس زبان میں طاقت گویائی ہے مجھے یہ کہنے کی اجازت دیں کہ عدل میں سازش کا کوئی مقام نہیں۔ عدل ایک مقصود بالذات صفت ہے اور یہی میری ساری زندگی کے سارے تجربے کا نچوڑ ہے۔ اس سے زیادہ اس بوڑھے نمک حلال کو کچھ اور نہیں کہنا ہے۔ ۔ ۔ ۔"

جب زین الدین اپنی تقریر ختم کر چکا، تو پرانے جانثاروں نے ـــــ ایلچی بہادر نے اور جاکو برلاس نے، اور آق بوغا نے دیکھا کہ تیمور کے چہرے کا رنگ بدل چکا تھا۔ اس کی نظریں سامنے قالین پر گڑی ہوئی تھیں، اس کی پیشانی کی تینوں لکیریں اور گہری ہو گئی تھیں اور وہ گہری سوچ میں تھا۔ اس وقت پورے دربار پر موت کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ زور سے سانس لے سکے یا پہلو بدل سکے۔

دفعتاً زور سے تیمور نے اپنی ران پر ہاتھ مارا اور کہا "خدا کی قسم میں اس وقت کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ اب دن ڈھلتا جا رہا ہے۔ صبح کو سلطان حسین کو پھر دربار میں پیش کیا جائے۔"

محافظ دستے کے سپاہی سلطان حسین کو حراست کے خیمے لے گئے اور جب تیمور دربار کو برخاست کرنے کے لیے اٹھنے لگا تو اس نے پوچھا: "بابا زین الدین آپ کو کچھ اور کہنا ہے؟"

قاضی زین الدین نے کہا "صرف اتنا کہ جب جسم کو فولاد کا زرہ بکتر پہنایا جاتا ہے اور سر پر آہنی خود اوڑھا جاتا ہے، تب بھی آنکھیں کھلی رہتی ہیں، حالانکہ آنکھیں جسم کا سب سے نازک حصہ ہیں، لیکن جب آنکھیں آہن پوش ہو جائیں تو زرہ بکتر بیکار ہے، فولادی خود بیکار ہے، تیر اور تبر، ڈھال اور تلوار بیکار ہے۔ عدل میں اتنا ہی خطرہ ہے جتنا آنکھیں کھلی رہنے میں، لیکن آنکھوں کے آہن پوش ہونے میں اور زیادہ خطرہ ہے۔"

تیمور نے کہا: "میں آپ کا مطلب سمجھ گیا"

۴

آدھی رات کو اُردو میں خاموشی سی چھا گئی، یعنی مگر اُردو میں خاموشی ممکن ہے کیونکہ گھوڑوں کے ہنہنانے اور کتوں کے بھونکنے کی آوازیں لگاتار آ رہی تھیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد نقیبوں کے گشت اور ان کی تلواروں کے کھڑکھڑانے کی آواز آتی۔ خیمے کی سیاہ اطلسی چھت کے نیچے، قالینوں کے نرم فرش پر سرائے ملک خانم غافل سو رہی تھی۔ تیمور نے اس کے جوان، خوابیدہ، مقبوضہ حسن کی طرف دیکھا اور پھر شطرنج کی بازی میں محو ہو گیا جو وہ ہمیشہ کی طرح اپنے آپ سے اکیلا کھیل رہا تھا اور پھر اس نے ایک ہاتھ مار کے تمام مہرے بکھیر دیئے اور اپنے اور سلطان حسین کے متعلق سوچنے لگا۔

یاد کی بساط پر ایام کے بیتے ہوئے مہرے پڑے تھے، جو دن کو تو فوجوں کے کوچ، تلواروں کی چمک، ڈھالوں کی کھڑکھڑاہٹ اور رزم و بزم کے ہنگاموں میں یاد نہ آتے۔ لیکن راتوں کو بے شمار ستاروں کی طرح نیلگوں جاودانی آسمان کے پردے سے جھانکتے، جگمگاتے اور چھپ جاتے۔ گویا دن کی ساری مہم رات کے ان گنت تاروں، ان ایام، ان یادوں سے فرار کے علاوہ کچھ اور نہ تھی اور وہ جس کا ثانی عمل اور حرب اور دن کی دنیا میں کوئی اور نہ تھا۔ رات کو وہ بھی ان بے خواب ستاروں کے آگے بے بس تھا۔ کیونکہ ان گزرے ہوئے ایام کی ہر بازی، خواہ وہ جیتی ہوئی بازی ہو یا ہاری ہوئی دراصل پوری ہوئی بازی تھی ہر روز جو ختم ہو چکا تھا اب نیلگوں آسمان پر تارہ بن کے چمک رہا تھا، ایک شہ مات تھا اور ہر ستارہ اس طرح جھلاتا تھا گویا یہ کل ہی کی بات ہو اور ہر ستارے کی چمک ریاکی، دغا کی، فریب کی چمک تھی۔

اور بابا زین الدین کے الفاظ۔ آج کے الفاظ نہیں، کئی برس پہلے کے الفاظ جب جہانگیر شیر خوار بچہ تھا اور اولجائی حسین تھی، جوان تھی ــــ اور زندہ تھی۔ یہ الفاظ کہ چغتائیوں کا خان تو غلوق اس طرح ہمارے سروں پر نمودار ہوا جیسے شہباز کا فوری پر جوڑ کر قرلیں کی ٹولی میں آ گرتا ہے اور چچا حاجی برلاس رنگیلی داڑھی کرنجی آنکھیں، مکروہ دہانہ) کی بدحواسی اور ریاکاری" تیمور، میرے بیٹے۔ تیرے باپ تارغائی کے مرنے کے بعد میں ہی برلاسوں کا سردار ہوں۔ یہ بھی کوئی شک کی بات ہے؟ بزدلی کے پیچھے

کے قطرے: بایزید جلائر تیری بیوی کا چچا ہمیں دھوکا دے چکا ہے۔ کہہ گیا تھا کہ خجند پر وہ جم کر چغتائیوں کا مقابلہ کرے گا، لیکن اس نے پہلے ہی تو غلق خاں کے اردو میں پہنچ کر چغتائیوں کی اطاعت کر لی۔ اب ماوراالنہر میں مقابلہ بیکار ہے۔ چل ہرات چلیں اور جتنے بچے عورتیں مویشی ساتھ چل سکیں ہرات لے چلیں سمرقند جانے اور اس کی قسمت۔ ویسے سمرقندیوں نے ہم برلاسوں سے کون سا اچھا سلوک کیا ہے جو ہم لوگ ان کے لیے اپنی جانیں خطرے میں ڈالیں۔ سمرقند اور قرشی اور شہر سبز کو لوٹ کے چغتائیوں کا جی بھر جائے گا اور وہ اپنا راستہ لیں گے۔"

تیمور نے اسے ٹوک دیا "کیا کہا آپ نے؟ شہر سبز، جہاں میرے باپ کی ہڈیاں دفن ہیں؟"

[اور وہی دن تھا جب سلطان حسین سے اس کی رفاقت کا آغاز ہوا تھا۔ رفاقت اور رقابت دونوں کا۔ اپنے خیمے پہنچ کر اس نے اولجائی سے کہا تھا "تیرا چچا چغتائی مغلوں سے مل گیا اور میرا چچا اُن سے بھاگ کے ہرات جا رہا ہے۔ میرے خیال میں تیرا چچا زیادہ عقلمند ہے۔"

اولجائی نے جہانگیر کو جو ابھی چھوٹا تھا اٹھا کے پیار کیا اور لپٹا لیا اور اس طرح پوچھا جیسے یہ کوئی بالکل معمولی سی بات ہو "اور تمہارا کیا ارادہ ہے؟"

"چغتائی مغل لوٹ اور مال کے بھوکے ہیں۔ وہ شہر سبز اور قرشی اور سمرقند کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔ اور پھر یہ علاقہ ہے بھی تو انہیں کا۔ تیرے نانا کازغان نے ان سے بغاوت کر کے اس علاقہ کو آزاد کرایا تھا، اب مغل پھر اپنا حق مانگتے ہیں جو انہیں چنگیز اور چغتائی سے ملا ہے۔ میں نے تو تغلق کے اردو میں پہنچ کے اطاعت کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ یہی صورت ان شہروں کے بچانے کی ہے۔"

اولجائی خاموشی سے سنتی رہی جیسے وہ ہمیشہ خاموشی سے سنتی رہتی تھی، شکایت کے بغیر، ہراس کے بغیر۔

اور تیمور نے اس کی گود سے جہانگیر کو لے لیا۔ وہ مسکرائی۔ عام طور پر تیمور اپنے بچے کو گود میں لیتے ہوئے گھبراتا تھا مگر اس نے جہانگیر کو اپنی گود میں لیا۔ اس کے ابرو چومے۔ اولجائی کھلکھلا کر ہنسی اور تیمور نے پھر اسی سنجیدہ چہرے کے ساتھ جس پر مسکراہٹ کا کہیں شائبہ نہ تھا۔ آہستہ آہستہ کہا گویا اپنے آپ سے سرگوشی کر رہا ہے: "لیکن چغتائیوں کا کوئی اعتبار نہیں، تو غلق خان کے اُردو میں جانا اپنی جان کو ہتھیلی پر لے کر جانا ہے۔ میں تجھ کو اور جہانگیر کو اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا

سکھیے میں اپنے چچا حاجی برلاس کے ساتھ ہرات بھیج رہا ہوں، وہاں سے تو اپنے بھائی سلطان حسین کے پاس کابل چلی جائے گی اور تو اور جہانگیر وہاں محفوظ رہیں گے۔"

(پہلی مرتبہ سلطان حسین کا نام اس طرح آیا گویا مغلوں کے خلاف دماغ میں تیمور کی اور سلطان حسین کی تقدیر منسلک تھی۔)

آہستہ آہستہ اولجائی کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے اور اس کے چکنے سرخ رخساروں پر ستیاں نمک کی طرح ڈھلکنے لگے۔ [تیمور نے یہ یاد کر کے ایک گھری آہ بھری اور اپنے سمور کے کمبل میں کروٹ لی] اور پھر اولجائی نے سر جھکا لیا اور کوئی جواب نہیں دیا۔ جواب اس کا دل دے چکا تھا اور تیمور اس جواب کو جانتا تھا کہ "میں تمہارے ہی ساتھ جینا اور تمہارے ہی ساتھ مرنا چاہتی ہوں، لیکن جو تم کہہ رہے ہو ٹھیک ہے۔ میں مغلوں کے ہاتھ پڑنا اور ان کی لونڈی بننا نہیں چاہتی۔ نہ میں یہ چاہتی ہوں کہ میرا بچہ جہانگیر غلاموں کی طرح پلے۔ خیر یہی سہی میں اپنے بھائی سلطان حسین کے پاس کابل چلی جاؤں گی۔"

اور پھر مغلوں کے مقابل لباط چغتائی مال کے بھوکے ہیں۔ جواہرات سے جب آنکھیں چندھیا جائیں تو آنکھوں میں سلائی بھونک دی جائے۔ یہاں تک کہ نقیبوں نے خبر دی کہ چغتائیوں کے ہراول دستے پہاڑیوں سے اتر کر وادی میں داخل ہو رہے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے خوفناک سپاہی جو چھوٹے چھوٹے، بڑی بڑی ایالوں والے پہاڑی ٹٹوؤں پر سوار تھے۔ ہر ایک کے پیچھے کئی کئی ٹٹوؤں پر لوٹ کا مال اسباب جسین دوشیزائیں جن کے چہروں پر نقاب نہیں تھے، جن کی زلفیں سوگوار تھیں مغل سواروں کے کاندھوں پر لمبے لمبے نیزے۔ ان کے ٹٹو گیہوں اور جو کی پکی ہوئی کھیتوں کو اس طرح چر رہے تھے جیسے ان کے لیے بوئی ہوئی گھاس ہے، انسان کی محنت اور غذا نہیں۔

تیمور یہ ... اپنے ... تی محل سے باہر نکل آیا اور جب چغتائی ہراول دستے کا سردار وہاں پہنچا، تو اس کا اس طرح استقبال کیا جیسے کوئی مہمانوں کا استقبال کرتا ہو۔ ضیافت کے سیلے دسترخوان بچھے بسلم بھیڑ ... ، ... کوئلوں کی آگ پر بھونی جانے لگیں، چاولوں کے بڑے بڑے خوانوں پر میلے گرسنہ ہاتھ بڑھے۔ احتیاط سے مغلوں میں اتنی کومیس تقسیم کرائی گئی کہ وہ سرور کے عالم میں رہیں لیکن اتنی زیادہ نہ پی جائیں کہ شہر سبز میں لوٹ کھسوٹ شروع کر دیں۔ چغتائی سردار ایک بھیڑ کی

ان کے پاؤں میں لکڑیوں کی کھڑاویں تھیں، مگر کھڑاوں پر چمڑے کے تسمے تھے جن پر سنہرا کام بنا ہوا تھا۔ ان کی مونچھیں، پتلی لکیروں کی طرح دہانے کی دونوں جانب رخساروں پر نیچے جھکی ہوئی تھیں اور اب تو تیمور کے اپنے وطن میں بھی اس طرح کی مونچھیں بہت مستعمل تھیں۔ نہ ان کے چہروں پر داڑھیاں تھیں، نہ ان کے دلوں میں خدا کا خوف۔

(تیمور نے تغلوق خاں سے اپنی ملاقات یاد کی) وہ اپنے خیمے میں جس کے دروازے کے قریب گھوڑے کی دُم والا علم لہرا رہا تھا، ایک شہنشاہ کی سی صولت و جبروت کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ فرش سموروں کا تھا، قالینوں کا نہیں۔ یہ دشت و جبل کی فضا تھی، شہروں کی نہیں۔ تغلوق کی پیشانی چوڑی تھی اور گالوں کی ہڈیاں برلاسوں اور دوسرے تاتاریوں اور ترکوں کے مقابل زیادہ ابھری اور اٹھی ہوئی تھیں وہ چنگیزی نسل کا صحیح النسب خان تھا۔ اس کی آنکھوں میں جنگلی لومڑیوں کی سی مکاری تھی اور نیچے جھکی ہوئی مونچھوں کے ساتھ ساتھ اس کی ٹھوڑی پر چھوٹی سی چینی داڑھی تھی جس کا بال بال جھٹکا ہوا تھا۔

تیمور نے مغل انداز میں کورنش بجا لایا اور اس کے آداب ایسے شائستہ تھے کہ چغتائی سردار جو خان کے اطراف نصف دائرے میں بیٹھے ہوئے تھے دل میں تعریف کیے بغیر نہ رہ سکے۔

الیغوری میں جو اس کی اور چغتائیوں دونوں کی زبان تھی، تغلوق خان نے اس سے پوچھا" تمہارا نام تیمور ہے۔

شائستگی اور بے خوفی سے تیمور نے جواب دیا" میرا نام تیمور ہے۔ میں برلاسوں کا سردار ہوں۔ مجھ سے پہلے میرا باپ تارگائی برلاسوں کا سردار تھا، لیکن اس نے اللہ کی طلب میں یہ دنیا چھوڑ کے درویشوں کی زندگی اختیار کی (اس پر چغتائی کافر سردار بدتمیزی سے کھلکھلا کے ہنسے) میرے باپ کے بعد برلاسوں کی سرداری اور شہر سبز اور قرشی کی ولایت میرا حق ہے۔ لیکن میرے چچا حاجی برلاس نے یہ حق غصب کر رکھا ہے۔ اسی لیے میں تیری اطاعت کرنے حاضر ہوا ہوں کہ مجھے میرا حق عنایت کر:

تیمور دیکھ رہا تھا کہ اس کے الفاظ تغلوق خان پر اثر کر رہے ہیں۔ اس نے کہا" خاقانِ اعظم چنگیز خاں اور چغتائی خاں کے زمانے سے ماوراء النہر کی سرزمین تیرے آباؤ اجداد کی اور تیری ہے۔ میں تجھے اپنا آقا اور سرپرست مانتا ہوں، لیکن میرے چچا حاجی برلاس نے تیرا مرتبہ نہیں پہچانا اور جنوب کی طرف بھاگ گیا۔ میں نے برلاسوں کی وادی کی ساری دولت بچالی اور اُسے جمع کر کے تیرے قدموں میں ڈالنے کے لیے لایا ہوں"

توغلوق اور چغتائی سرداروں کی آنکھوں میں بے پناہ حرص کی سودمی چمک نمودار ہوئی اور تیمور کے رفیقوں نے ان چرمی تھیلیوں کے دہانے کھول دیے جن میں جواہر، زیورات، طلائی زیورات، عذا لے کے خزانے تھے۔ قیمتی قیمتی سمور خیمے کے فرش پر بکھیر دیے۔ کمخواب اور اطلس کے تھان اور طرح طرح کے ریشم جو فرنگ سے ماوراءالنہر کے شہروں میں آتے تھے۔ چغتائیوں کے قدموں پر ڈال دیے اور جب انہوں نے خیمے کا پردہ اٹھا کے اونٹوں پر لدے ہوئے قالینوں کے ڈھیر، چاندی کے ظروف کے انبار دکھائے تو توغلوق اور اس کے امیروں کو یقین آ گیا کہ اب برلاسوں کے پاس سوائے ان کے کھیتوں، ان کے محلوں کی دیواروں، اور ان کے خیموں کے اور کچھ نہیں رہا۔

"تو نے اور کسی کو کوئی تحفہ دیا؟" توغلوق کی مکار، خوفناک آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہوئی۔

تیمور نے اسی بے خوفی اور بے تکلفی سے جواب دیا: "صرف تیرے تین سرداروں کو۔ ایک جو مجھے شہر سبز میں ملا اور جس نے تجھ تک پہنچنے کا پروانہ دیا۔ دوسرے دو سردار جنہوں نے تجھ تک پہنچنے کا راستہ روکا۔"

توغلوق نے بگڑ کے کہا "یہ یاسائے چنگیزی کے خلاف ہے کہ انہوں نے تجھے ستایا اور خان کے حصے سے مال لیا وہ کتے ہیں لیکن میرے کتے ہیں اور ان کی لالچ سے میں اس قدر تنگ ہوں جیسے آنکھ کے دیدے میں بال پڑ جائے یا جیسے زبان میں پھانس چبھ جائے۔" پھر اس نے حکم دیا کہ وہ مال ان مغل سرداروں سے چھین کے حاجی برلاس کو بھیجا جائے۔ وہ تیمور کو ماوراءالنہر یا شہر سبز کے علاقے کا واحد سردار نہیں بنانا چاہتا تھا، نہ وہ یہ چاہتا تھا کہ برلاسوں اور تاتاریوں کی باہمی رقابت اور خانہ جنگی کم ہو اور تیمور نے یہ اسی وقت سمجھ لیا جب اسے محض تومان باشی بنایا گیا۔ ہزار سواروں کا سالار اور شہر سبز کا حاکم اور پھر جیسا کہ مغل چغتائیوں کا قاعدہ تھا گرمیاں گزارنے کے لیے ان کا لشکر دیکھتے دیکھتے ختا و ختن کی پہاڑیوں میں غائب ہو گیا۔

تیمور نے اپنے خیمے میں لیٹے لیٹے گرم سمور کی تہہ کے اندر خانہ جنگی کے وہ تین سال یاد کیے جو کل کی بات معلوم ہوتے تھے۔ چغتائیوں کی واپسی کے بعد حاجی برلاس ہرات سے واپس آیا اور بایزید جلائر خجند سے سمرقند آیا اور سلطان حسین کابل سے آیا اور اس کے ساتھ اولجائی آئی اور اولجائی کے ساتھ جہانگیر آیا جو عون خان کہنے کے بجائے کچھ لفظ فارسی میں اور کچھ لفظ الغوزی میں تتلا تتلا کے بول لیتا اور اس کو دیکھ کر تیمور کو اتنی خوشی ہوئی جتنی شہر سبز اور قرشی کو چغتائیوں کے ہاتھ سے بچا کے بھی نہ ہوئی تھی۔

اور پھر اسے قذآن کی وہ شام یاد آئی جب اس کے چچا نے اسے قتل کرنے کی سازش کی تھی۔ سمرقند

ٹانگ واسنوں سے لوٹ لوٹ کے کھا رہا تھا اور تیمور توغلوق خان سے اپنی امارت کا اظہار کرتا جا رہا تھا۔ تیمور نے یہاں تک کہہ دیا کہ توغلوق خاں نے مجھے خفیہ پیغام بھیجا کہ تو نے اپنے اصلی بادشاہ توغلوق خاں کی اطاعت قبول کرلی ہے، تجھے شہر سبز کی سرداری دوبارہ عطا ہوگی۔ یہ سن کر چغتائی سردار شہر سبز کے اس سفید محل کے لوٹنے کی اُمید سے اور مایوس ہوگیا، لیکن اس نے چکنے چکنے ہونٹوں پر چکنی چکنی زبان پھیر کے چاندی کے آفتابوں کی مبالغہ سے تعریف کی اور تیمور نے یہ آفتابے اس کی نذر کردیے۔ پھر اس نے کومیس کے طلائی جام کی تعریف کی اور تیمور نے یہ بھی اس کی نذر کردیا اور اس سے توغلوق خاں کے اُردو تک پہنچنے کا پروانہ لیا اور پھر شہر کی قحباؤں کو مغلوں کے خیمے میں بھیج دیا۔ جہاں دوسرے شہروں کے شرفا کی بہو بیٹیاں کنیزوں کی طرح گھوڑیوں کا دودھ دوہ رہی تھیں اور کومیس تیار کر رہی تھیں اور اُن کے گریبان کھلے ہوئے تھے۔

اور پھر مغل خیمہ و خرگاہ۔ دُور دُور تک فوجی گھوڑے اور باربرداری کے ٹٹو ڈوبی ہوئی کھیتیوں یا پہاڑوں کی ڈھلوانوں پر شبنم سے دھوئی ہوئی نرم نرم گھاس چر رہے تھے۔ اونٹ اطمینان سے بیٹھے بیٹھے اوپر گردن اٹھا کے میوے درختوں کے پتے اپنے جبڑوں سے چبا رہے تھے اور کف نکالتے جاتے تھے۔ مویشیوں کے ریوڑ چراگاہوں سے جگالی کرتے ہوئے واپس آ رہے تھے اور قریب ہی مطبخوں کی آگ جل رہی تھی اور ان پر بڑی بڑی دیگوں میں گوشت کے تکّے اور چاول ابالے جا رہے تھے، کومیس کی سڑاند، اور اس کے اُبال کی بدبو کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ خیمے دس دس، سو سو، ہزار ہزار کے ٹکڑوں میں بٹے ہوئے تھے اور بڑے بڑے خیموں سے گھوڑے کی دُم کے بالدار جھنڈے لہرا رہے تھے۔ جب زور سے ہوا چلتی تھی تو آدمیوں کے قدموں، گھوڑوں کی ٹاپوں اور بھیڑ بکریوں کے گلّے سے خاک، اور گوبر سے ملا جلا ایک غبار سا اٹھتا اور چکر کاٹتا ہوا خیموں کے درمیان غائب ہو جاتا۔ چغتائیوں کے سفید خیموں کا ایک سمندر تھا کہ دُور دُور تک لہریں مارتا نظر آتا تھا۔

نقیبوں کے گھوڑے، تیمور اور اس کے ساتھیوں کے ہمراہ ہو گئے۔ جب وہ خیموں کے درمیان سے اس مال و اسباب کے ساتھ گزر رہا تھا، تو ہزارہا مغل سپاہی اپنے خیموں سے نکل نکل کے اس کی طرف للچائی نظر سے دیکھتے اور جب تک وہ گزر نہ جاتا دیکھتے رہتے۔ یہ سپاہی چینی اطلس کے لبادے پہنے تھے جن پر رنگ برنگ کے سنہری، قرمزی، سبز، لاجوردی پھول اور طرح طرح کے جانور کڑھے ہوئے تھے۔

کی وہ خنک شام جب حاجی برلاس کے محل میں ہر طرف خربوزوں کی مہک پھیلی ہوئی تھی اور باغوں میں فوارے چل رہے تھے اور گرم گرم کبابوں کی مہک پھولوں کی خوشبو سے کچھ کم نہ تھی۔ تیمور پہلے ہی کھٹکا تھا کہ آس پاس مسلح سوار کیوں پھر رہے ہیں۔ لیکن دستر خوان بڑی نفاست سے بچھا ہوا تھا۔ حاجی برلاس کے ساتھ ہرات سے کئی باورچی آئے تھے جو کھانوں میں فلفل ہندی اور دوسرے ایسے مسالے ڈالتے تھے جن کا کسی نے سمرقند میں نام بھی نہ سنا تھا اور جن کی خوشبو بڑی گرم تھی۔ مگر حاجی برلاس زہر کھلانے والا چچا نہ تھا۔ تھا وہ برلاس ترک، اور قتل کے لیے وہ تلوار ہی استعمال کرتا زہر نہیں۔

دستر خوان پر اس کے قریب بایزید جلائر بیٹھا تھا، جو بہت زیادہ کومیس پی گیا تھا اور نشے سے بدمست ہو رہا تھا اور اس نے جھک کے تیمور کے کان میں سرگوشی کی۔

"بھاگ یہاں سے بھاگ۔ تیرے سر پر قضا کھیل رہی ہے!" یہ کہہ کے مدہوشی کے عالم میں بایزید جلائر نے قہقہہ لگایا۔ تیمور نے ذرا جو نظر اٹھائی تو جو خادم مور چھل جھل رہا تھا وہ بھی مسلح تھا۔ تیمور نے جلدی سے لقمہ کے ساتھ ایک نوکدار ہڈی اٹھائی اور ہڈی سے اپنے نتھنے کو کھرونچ لیا۔ کوئی اس کی طرف دیکھ تو نہیں رہا تھا۔ کوئی نہیں۔ اس نے اپنے نتھنے پر ایک اور زخم لگایا اور دوسرے ہاتھ سے پونچھ کے دیکھا تو تھوڑا تھوڑا خون بہنے لگا تھا۔ اس نے حاجی برلاس کی طرف نظر جھکا کے دیکھا اور ایسی آواز میں جس سے ذرا بھی شک یا ہراس ظاہر نہ ہو، ذرا سعادت مندی کے لہجے میں کہا: "چچا میری نکسیر پھوٹی ہے۔ اجازت ہو تو حوض میں دھوآؤں اور سر پر ذرا ٹھنڈا سا پانی ڈال لوں۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا تو موت کے فرشتوں کو شک نہیں ہوا، وہ مطمئن تھے کہ سر پہ ٹھنڈا پانی ڈال کے پھر واپس آئے گا خوب کھائے گا، خوب کومیس پیئے گا اور پھر اطمینان سے۔

اس نے حوض کا رخ کیا، جہاں سرو حصار باندھے کھڑے تھے ایک مسلح سپاہی کا ہاتھ مروڑ کے اس کی تلوار پیچھے سے چھینی اور اسے قتل کیا اپنے گھوڑے کی رسی کاٹی اور جب وہ دروازے سے باہر نکل چکا، تو چند لمحوں کے بعد اس نے اپنے پیچھے تعاقب کرنے والے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سنی لیکن سمرقند کی گلیوں میں تعاقب آسان نہیں تھا۔

گھر پہنچ کے اس نے اولجائی سے کہا: "تیرا چچا بھی سازش میں ضرور شریک تھا۔ پھر معلوم نہیں کیوں اس نے مجھے خطرے سے آگاہ کیا۔ اس نے میرے کان میں سرگوشی کی بھاگ یہاں سے بھاگ۔"

اولجائی نے کہا: "یہ نشہ کی شرارت ہوگی اس کی نہیں۔"

"اب اس شہر میں رہنا اگرنہیں۔ بھاگ یہاں سے بھاگ۔ تیرے چچا نے غلط نہیں کہا:"

"کہاں شہر سبز؟"

"تمام برلاس میرے چچا حاجی برلاس کے ساتھ ہیں اور بے غدار اور چغتائیوں کا دوست سمجھتے ہیں، شہر سبز میں بھی بچاؤ کی صورت نہیں:"

اولجائی کی آنکھیں ذرا ذرا چندھی ہو گئیں۔ اس نے بلغم بگل کے پوچھا "پھر کہاں؟"

"تیرے بھائی سلطان حسین کے پاس جو بلخ کی پہاڑیوں میں اپنے لشکر کے ساتھ میرا انتظار کر رہا ہے۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ آملنے کا پیغام بھیجا ہے:"

(تیمور نے یہ سب کچھ یاد کیا۔ کس طرح ان دنوں اس کی قسمت سلطان حسین سے منسلک تھی، لیکن آج اولجائی شہر سبز کے ایک باغ میں مٹی کے نیچے ابدی نیند سو رہی ہے اور پھر اس نے ایام میں تسلسل کی تلاش کی۔

(یہ ساری یاد ایک زہر خند تھی، یہی تیمور کی یادداشت اور اولجائی کی یادداشت کا فرق تھا۔ تیمور کی یاد میں کسی طرح کی آرزو کا شائبہ نہ تھا۔ کوئی تمنا شامل نہ تھی۔ یہ جنگل کے خطرے، شکاری جانور کی چاپ، پتوں کی کھڑکھڑاہٹ، جھلستی ہوئی ریت کی یاد تھی، قزل قسم اور قرا قرم کے لال اور کالے ریگستانوں کی یاد)

اور پھر جب جلائر اور برلاس آپس میں لڑ رہے تھے اور سازشوں کا بازار گرم تھا، تو غلوق خاں افق پر نمودار ہوا۔ خان تیلگری کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا پی چکا تھا جس میں گرمیاں گزار کے جاڑوں کے شروع میں اس نے کوچ کا حکم دیا۔ اس کے پستہ قد، تیز قدم، ٹٹوؤں اور اونٹ سے لدے ہوئے ریلوں نے ایسیک کول کی جھیل کا ٹھنڈا نیلا نیلا پانی پیا اور صنوبر سے لدے ہوئے پہاڑوں سے اتر کے کھیتوں اور لہلہاتی چراگاہوں میں پھر فرغانہ کی وادی سے ہوتے ہوئے قزل قسم کے لال لال ریگستانوں میں منگولوں کا اژدہام ٹڈی دل کی طرح چھا گیا۔

قضا و قدر کی طرح ایک ایک کر کے تیمور کے دشمن منگولوں کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اترے۔ بایزید جلائر کے قتل کا حال سن کے اولجائی رو دی تھی اور تیمور کے چہرے کا سبب حس دیکھ کر اس نے کہا تھا "میں نے مانا میرا چچا بایزید تیرا دشمن تھا۔ مگر شریف دشمن تھا، اسی نے تجھے تیرے چچا کے فریب سے آگاہ کر کے تیری جان بچائی تھی۔"

اس پر تیمور سے نہ رہا گیا اس نے کہا تھا: "شکرم پہلے تو تو کہتی تھی کہ اس نے نہیں بلکہ توران کی کوہیں نے اور ایران کی انگوری شراب نے میری جان بچائی تھی:"

"اب تو شرابیوں کی سی باتیں کر رہا ہے" اولجائی جھنجھلا گئی تھی۔

"شراب کی فضیلت سے مجھے انکار نہیں." وہی بایزید جلائر کے منہ سے بول رہی تھی اور تجھے یاد ہے؟ میں نے تجھ سے کہا تھا کہ تیرے چچا نے مجھے خطرے سے آگاہ کیا، تو تو خود بول اٹھی تھی کہ یہ نشہ کی شرافت ہو اس کی نہیں!

"مجھے یاد ہے:" فورا جواب ہو کے اولجائی نے کہا: "مگر جب میرا چچا زندہ تھا اور میں جو چاہتی کہہ سکتی تھی. اب تو وہ مر گیا!"

(یہ اولجائی کی عادت تھی اور تیمور کی سخت اور خشمگیں آنکھوں سے اس کی یاد میں ایک ایک قطرہ ٹپک پڑا. ناممکن تھا کہ اولجائی دشمن کو تہہ دل سے معاف نہ کرے اور مرے ہوئے دشمن کو تو وہ دوست سمجھتی تھی

اور پھر تیمور کو اپنے چچا حاجی برلاس کی موت یاد آئی. کیسی کمینی موت. بزدلی کی موت. وہ موت نہیں جو مغلوں سے لڑتے میں میسر آتی. تلوار کی، تبر کی، نیزے کی موت نہیں، قراقرم کے کالے ریگستان میں سفید بھیڑ کے اونی خیمے میں چوروں کے ہاتھ قتل. اس واقعہ کا ذکر بھی بڑی تفصیل سے قاضی زین الدین نے لکھ بھیجا تھا جس نے سارا قصہ حاجی برلاس کی ترکمان کنیز کی زبانی سنا تھا. آدھی رات کو ترکمان کنیز کی آنکھ کھلی تو اس نے عجب تماشا دیکھا، یعنی ایک بڑا اونچا پورا سیاہ فام سا آدمی جس کے سینے پر گھنے بال تھے اور جو کمر تک ننگ دھڑنگ تھا، اپنے منہ پر صافہ لپیٹے ایک بڑا سا پتھر اپنے ہاتھ میں لیے حاجی برلاس کے سرہانے دوزانو بیٹھا تھا کہ اگر وہ ذرا بھی حرکت کرے تو وہ پتھر سے اس کا سر کچل دے اور دوسرا چور بڑے اطمینان سے اس کے سمور سمیٹ رہا تھا اور اس صندوق کو اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا جس میں سونے اور جواہر کے کیسے رکھے تھے. مارے خوف اور بے چینی کے حاجی برلاس کے اعصاب کھنچے جا رہے تھے اور اندھیرے میں بھی یہ معلوم ہوتا تھا کہ خوف سے اس کی آدھی جان نکل چکی ہے. باہر برلاس سپاہی غافل سو رہے تھے. ترکمان کنیز نے پہلے چیخنا چاہا، مگر پھر آنکھ ذرا سی کھلی رکھی اور سوتی بن گئی. اسے یقین تھا کہ مال اسباب لینے کے بعد یہ چور اسے بھی پکڑ لے جائیں گے. اتنے میں باہر آہٹ ہوئی اور حاجی برلاس نے جھپٹ کے اپنا خنجر کمربند سے نکالنا چاہا. بڑا سا پتھر پوری طاقت سے چور کے ہاتھ سے نکل کے اس کے سر پر آ گرا. ترکمان کنیز نے خون کی سرخی اور بھیجے کی سفیدی کا ملا جلا ملغوبہ بہتا دیکھا اور مارے کراہت اور خوف کے آنکھیں بند کر لیں. پھر جو اس نے آنکھیں کھولیں، تو نہ چوروں کا پتہ تھا نہ سونے اور جواہر کے صندوق کا حاجی برلاس کی لاش البتہ اس کے قریب اسی طرح پڑی تھی اور قالین کے نیلے نیلے پھولوں پر سرخ اور

سفید ملغوبہ اُبل اُبل کے پھیل گیا تھا۔ اب کے وہ بہت زور سے چیخی اور سپاہی اندر آ گئے۔

اور پھر تیمور نے یاد کیا کہ اس کے دشمنوں کے بعد اس کے دوستوں کی باری تھی کیونکہ اس کے دوست اور اس کے دشمن دونوں چغتائی مغلوں کے دشمن تھے۔ اس نے اور اولجائی نے سلطان حسین کو کتنا سمجھایا کہ مغل بہت طاقتور ہیں۔ ان سے لڑنا بیکار ہے۔ کابل واپس جانے ہی میں سلامتی ہے۔ مغل ماوراء النہر کو تاراج کر کے واپس چلے جائیں گے، خواہ مخواہ کابل پر حملہ نہ کریں گے اور کابل بہرحال چغتائیوں کا علاقہ نہیں ایلخانیوں کا علاقہ ہے اور جلائر ہونے کی حیثیت سے سلطان حسین کا حق ہے کہ ایلخانیوں کی سرزمین پر حکومت کرے، لیکن ہمیشہ کی طرح کبھی سلطان حسین اس کی باتیں مانتا تھا اور کبھی نہیں مانتا تھا۔

[بے چینی سے تیمور نے قیدی سلطان حسین کی پرانی رفاقت یاد کی] ہاں اس نے اور اولجائی نے سلطان حسین کو بہت سمجھانا چاہا مگر بے سود۔ سلطان حسین نے اسے طعنہ دیا: "میں چنگیز اور ہلاکو کی اولاد سے ہوں اور بادشاہت میرا حق ہے۔ تو برلاس ہے، ترک ہے، نوکر ہے۔ تیرے لیے برابر ہے کہ میرا نوکر بنے یا تغلق خاں کا۔ میں اور تغلق تلواروں کے پھل ہیں جو ایک ہی درخت سے اُگے ہیں، وہ چغتائی خاں کی شاخ پر ہے اور میں ہلاکو خاں کی شاخ پر۔ دو تلواریں ایک میان میں رہ نہیں سکتیں۔ رہ گیا تُو، تجھے تو بہرحال کسی نہ کسی کی خدمت کرنا ہے۔"

تیمور کو یہ سن کے بڑا طیش آیا تھا، مگر اولجائی کو اور زیادہ غصہ آیا اور اس نے کہا تھا کہ "بھائی اگر تم چنگیز اور ہلاکو کی اولاد سے ہے، تو کیا میں ان کی اولاد سے نہیں؟ اور اگر میں ان کی اولاد سے نہیں تو پھر تیری بہن کیسے ہوئی؟"

سلطان حسین نے جھنجھلا کے کہا: "عورتوں کی زبانی منطق ہے۔ تیرے رشتے سے تیمور کیسے شاہزادہ ہو گیا؟"

زبانی منطق نے جواب دیا: "شاہزادہ نہ سہی، لیکن وہ گورگاں ہے۔ چنگیز کے خاندان کا داماد ہے۔ اسے تم نے نوکر کیوں کہہ دیا۔ اگر وہ بجائے تمہارا ساتھی ہونے کے چنگیز خان خانِ اعظم کے زمانے میں پیدا ہوتا تو ترخان بنایا جاتا اور ترخانوں کا سردار ہوتا۔"

"کیا گورگان نوکر نہیں ہوتے۔ آسائے چنگیزی کے مطابق ہر وہ شخص جو خان نہیں خان کا نوکر ہے مثلاً میرا سگا بھائی بھی میرا نوکر ہی ہوتا۔"

اور اولجائی سُنے غضب ناک ہو کے کہا تھا: "تیری بہن ہونے کے بجائے اگر میں تیرا بھائی ہوتی تو میں بھی دیکھتی کہ تو میرا نوکر بنتا ہے، یا مجھے نوکر بناتا ہے"

اس پر سلطان حسین اٹھ کھڑا ہوا، اس کا بھاری بھرکم جسم اطلس اور کمخواب کے لبادے میں سچ مچ بادشاہ کا پیکر معلوم ہو رہا تھا اور اولجائی سُنے اس لڑائی کے عالم میں بھی فخر سے اس کی طرف دیکھا کہ وہ اس کا بھائی ہے اور سلطان حسین نے شاہانہ تمکنت سے تیمور کے شانے پر ہاتھ رکھ کے کہا: "تیرے لیے برابر ہے کہ تو میرا ساتھ دے یا تغلق خاں کا، تو چغتائی خاندان کا ساتھ دے یا ایلخانیوں کا۔ یہ یاد رکھ کہ تیری شادی ایلخانیوں میں ہوئی ہے۔ ایلخانی رسول اللہ پر ایمان لے آئے ہیں اور چغتائی ابھی تک نیلے جاودانی آسمانی کو پوجتے اور مسلمانوں کو قتل کرتے ہیں"

تیمور اٹھ کھڑا ہوا، سرو قد، اس کی چوڑی، سفید، بلند پیشانی پر غصے اور حرارت سے پسینے کے قطرے جگمگا رہے تھے اور اس نے اپنی لانبی نوکدار تلوار زمین پر ٹیکی اور خشونت کے لہجے میں اپنے برادر نسبتی سے کہا: "میں گورگاں ہوں، کسی کا نوکر نہیں۔ اگر تم نے تغلق خاں سے لڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو خدا تمہیں ظفریاب کرے میرے لیے شہر سبز کا رستہ کھلا ہے۔ جہاں میرے باپ کی ہڈیاں دفن ہیں"

سلطان حسین کے لہجے میں استہزا کی خفیف سی جھلک تھی۔ جب اس نے کہا تھا: "تو کیا تمہارا ارادہ تارک الدنیا کی جگہ خانقاہ میں صوفی بن کے بیٹھنے کا ہے، مگر کافر چغتائی صوفیائے کرام کی کوئی قدر نہیں کرتے۔ وہ خانقاہوں کو اپنے گھوڑوں کا اصطبل بناتے ہیں"

تیمور شانے ہلا کے خاموش ہو گیا، لیکن جب سلطان حسین خیمہ کا پردہ ہٹا کے باہر نکل رہا تھا، تو تیمور نے کہا: "بھائی خدا تمہیں ظفریاب کرے۔ میں اتنا اور کہنا چاہتا ہوں کہ میں اس وقت صوفی بنوں گا، جب میری فولادی تلوار کو زنگ لگ جائے گا اور تیمور جو خود لوہا ہے اس کی تلوار کو مشکل سے زنگ لگتا ہے، لیکن ہر چیز کا وقت ہوتا ہے، ابھی اس کا وقت ہے کہ میں دیکھوں کہ ہوتا کیا ہے"

شہر سبز میں جب تیمور نے تغلق خاں کے ہاتھوں سلطان حسین کی شکستِ فاش کی خبر سُنی تو اُسے صدمہ ہوا، اُسے اس کا بھی رنج تھا کہ کاش اُس نے سلطان حسین کا ساتھ دیا ہوتا، لیکن اب بہر حال اُسے اپنی غیر جانبداری کا انعام وصول کرنے جانا تھا۔

اور کوچ سے پہلے کی رات، اندھیری اندھیری، مٹیالی مٹیالی سی تھی، جس میں شہرِ سبز کے کچے مٹی کے

مکانوں میں دیئے جگنوؤں کی طرح جگمگا رہے تھے۔ چنار کے ایک سایہ دار قدآور درخت کے نیچے بیٹھا تیمور اپنے ساتھیوں کو کوچ کے آخری احکام دے رہا تھا۔ اس حالت میں بوڑھا قاضی زین الدین ایک ہاتھ میں زیتون کے تیل سے روشن چراغ اور دوسرے ہاتھ میں تسبیح لیے آکے اس کے پاس کھڑا ہو گیا اور تیمور کے سلام کا اس نے بڑے کرخت لہجے میں جواب دیا۔

تیمور نے اس کی طرف گردن اٹھا کے دیکھا اور اپنے ساتھیوں کو جلدی جلدی رخصت کیا۔ ان کے جانے کے بعد قاضی زین الدین ایک ٹھنڈی سی آہ بھر کے سفید سمور کے فرش پر بیٹھ گیا۔

"منگ باشی امیر تیمور برلاس"

تیمور نے اس کی طرف استفہامیہ نظر سے دیکھا۔

"مجھے کچھ پوچھنا ہے"

بہت کم قاضی زین الدین نے اس لہجے میں بات چیت کی تھی۔

"پوچھئے"

"آج تک کسی چٹان سے کبھی دودھ کے فوارے اُبلے ہیں؟"

"نہیں"

"آج تک کسی شیرنی کو بھیڑ بکری کے بچے پر رحم آیا ہے"

"نہیں"

"زرخانہ کی چراگاہوں میں آج تک بجائے پانی کے کبھی خون کی بارش سے سبزہ اُگا ہے؟"

"نہیں"

"اگر نہیں تو پھر تم سمرقند جاؤ اور ضرور جاؤ اور تولوق خاں سے کہو کہ چٹان سے دودھ نکالے اور شیرنیوں کے بھٹ میں میمنوں کو جھونک دے اور مرغزاروں کی آبیاری کے لیے خون چھڑکے"

وہ اوہام پرست جو بہادر تیمور کے سائے میں کہیں چھپا بیٹھا تھا ذرا گھبرا گیا "آپ کا مطلب؟"

"کچھ نہیں"

قاضی زین الدین زمین پر ہاتھ ٹیک کے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر جھک کے اس نے وہ چراغ اٹھایا جو زیتون کے تیل سے روشن تھا۔

"زین الدین بابا" تیمور نے پھر ایک بار اسے مخاطب کیا۔

"کیا ہے؟"

"میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھا۔"

"ہر چیز کا ایک وقت ہوتا ہے، جب وقت آجائے گا تو مطلب خود بخود سمجھ میں آجائے گا۔"

لیکن صبح کو تیمور نے اپنا ارادہ نہیں بدلا۔ وہ اپنے مختصر سے دستے کے ساتھ توغلوق خاں کی قدم بوسی کے لیے سمرقند روانہ ہوا۔

[یاد پھر ایک زہر خند بن گئی] کیا یہ وہی سمرقند تھا جو موسم سرما میں اس نے حاجی برلاس کی سازش کے خوف سے چھوڑا تھا۔ صرف چند مہینے پہلے اس کے باغوں کے درخت بچے ہوئے تھے۔ اس خزاں میں چناروں تک کو یاد نہ رہا تھا کہ لہلہاتے آگ کے شعلوں کی طرح سرخ ہو جائیں۔ کیونکہ چناروں تک کی پتیاں گھوڑوں اور دو کوہانوں والے اونٹوں کی خوراک بن چکی تھیں۔ وہ اور آگے بڑھا، مغلوں کے بدلودار سموروں کے لبادوں کی بو سونگھتا اور ان کے گھوڑوں کی لید کے انباروں کو دیکھتا ہوا۔ اس مرتبہ مغل سردار اسے کھلم کھلا مغلظات سنا رہے تھے اور یہ سب سنتا ہوا لاچار و مجبور قیدیوں کے دستے کے قیدی سردار کی طرح توغلوق خاں کی سرائے کو جا رہا تھا۔ جہاں امیر کازغان کا محل تھا۔ اس محل کے باغ میں توغلوق خاں کا زرد پھلا خیمہ تھا۔ خیمے کی روشیں ویران تھیں، پھولوں کے تختے کچلے جا چکے تھے، محل جل کر خاکستر ہو چکا تھا اور اس کی لکڑیاں تک ہیزم بن چکی تھیں۔ یہ جو صدہا کنیزیں مغلوں کے خیمے میں ماری پیٹی جا رہی تھیں، سمرقند کے برلاسوں، تاتاریوں اور ترکمانوں کے شریف ترین گھرانوں کی دوشیزائیں تھیں۔ جس طرف سے وہ گزرتا، وہ اسے دیکھ کر منہ پھیر لیتیں اور اس مرتبہ جب تیمور توغلوق خاں کے سامنے پہنچ کے مغل انداز میں کورنش بجا لایا، تو توغلوق خاں نے اسے بیٹھنے تک کو نہیں کہا۔

اس مرتبہ اس نے سچ مچ اپنے آپ کو نوکر محسوس کیا۔ ماوراالنہر کی ساری آبادی کی طرح وہ بھی حقیر تھا، محکوم تھا، غلام تھا۔

بڑی کرخت آواز میں توغلوق نے کہا "تیرے چچا حاجی برلاس نے ہم سے بغاوت کی۔"

"خانِ اعظم۔ وہ میرا بھی دشمن تھا" تیمور نے جواب دیا۔

"ہمیں معلوم ہے۔"

اب اس کے سامنے کومیس کا بڑا سا سفالی جام اور ابلے ہوئے گوشت کی ایک قاب رکھی گئی اور تو غلوق خاں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

اس نے اپنی پیشانی سے تو غلوق خاں کے قدموں کے پاس کی زمین چومی۔ اس کا خون عظمت سے کھول رہا تھا۔ جس سمرقند کو وہ آنا چاہتا تھا وہ یہ سمرقند نہیں تھا۔

"تیرے برادر نسبتی سلطان حسین نے ہم سے بغاوت کی" کرخت الغندی میں تو غلوق خان کی آواز پھر گونجی۔

"میں نے اسے بہت روکا" تیمور نے ابلے ہوئے گوشت کا لقمہ چباتے ہوئے جواب دیا۔

"ہمیں معلوم ہے۔ ہمارے مخبروں نے یہی خبر دی" اب تو غلوق خاں کا لہجہ ذرا نرم تھا۔

اس نے پھر پوچھا "امیر حسین اب کہاں ہے؟"

"خانِ اعظم مجھے معلوم نہیں"

اس نے ایک ہڈی چبائی اور کومیس کا ایک گھونٹ پیا۔ اس کو اس طرح کھاتے دیکھ کر تو غلوق خان نے اطمینان سے ڈکار لی۔

تو غلوق خاں نے اپنے بیٹے الیاس خواجہ اوغلان کو مخاطب کر کے کہا "سمرقند کے برلاسوں کا کوئی اعتبار نہیں"

کئی چغتائیوں نے اس کا جملہ دہرایا "کوئی اعتبار نہیں" اور تلواریں کھڑکھڑائیں۔

ایک سمرقندی غلام، آفتابہ لایا۔ تیمور نے غور سے دیکھا تو وہ سید بدرالدین تھا جو امیر کازغان کے مقربین میں سے تھا۔ اس کی سفید داڑھی آنسوؤں سے تر تھی۔ تیمور نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا اور ہاتھ دھو کے، کلی کی منہ میں انگلی ڈال کے دانت صاف کیے اور ڈکار لے کے "الحمد اللہ" کہا اور کھانے کی تعریف کی۔

اس کے بعد تو غلوق خاں کی گرجدار آواز بلند ہوئی۔ اس نے پکارا "بکی چوک بہادر!" اس کا سپہ سالار بکی چوک آگے بڑھا۔ تیمور نے اس کا ذکر بہت سنا تھا۔ اب اسے غور سے دیکھا۔ گول منگول چہرہ زرد زرد رنگ، پتلی چھوٹی سی داڑھی، بچھو کے اٹھے ہوئے ڈنک کی طرح لٹکتی ہوئی مونچھیں، چھوٹے چھوٹے پاؤں، مگر بڑا چوڑا اور مضبوط سینہ۔

"راوی سے کہو کہ ہمارا یہ یرلیغ سُنائے"

بکی جُوک نے سر بہ سجدہ ہو کے تُوغلوق خاں کے قدموں کے قریب کی زمین چومی اور جب وہ اٹھا، تو راوی نے اس کے ہاتھوں سے چینی ریشم پر لکھا ہوا الیغوری فرمان لے کر چوما اسے بڑے ادب سے کھولا اور پڑھنا شروع کر دیا۔

یہ یرلیغ ہے تُوغلوق خاں خانِ اعظم چغتائی کی۔ یہ فرمان بیت پاک والوں اور قزل قسم اور قراقُم کے رہنے والوں کے لیے واجب التعمیل ہے۔ یہ یرلیغ سمرقند اور قوقند اور فرغانہ اور کابل کے باشندوں کے لیے واجب التعمیل ہے کہ خانِ اعظم تُوغلوق خاں نے منگ باشی امیر تیمور برلاس کو سمرقند کا حاکم مقرر کیا۔

اس مقام پر تیمور نے جھک کے تُوغلوق خاں کے قدموں کے آگے کی زمین چومی۔

لیکن یہ یرلیغ ختم نہیں ہوئی تھی۔ راوی کی لڑکھڑاتی ہوئی، رُکتی ہوئی آواز پھر گونجی اس طرح جیسے کوئی بے سُرا نغمہ الاپتا ہے۔

"امیر تیمور برلاس پر ہم نے بکی جُوک بہادر کو سردارِ اعلیٰ مقرر کیا۔ بکی جوک بہادر قزل قسم، قراقسم، اُست اُرت کابل اور بدخشاں میں مغل اُردو کا سپہ سالار ہوگا۔"

تیمور کے چہرے کا رنگ زرد ہو گیا۔ سر بہ سجدہ ہو کے بکی جُوک نے تُوغلوق خاں کے قدموں کے آگے کی زمین چومی اور پھر کھڑا ہو گیا اور اسی لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں راوی نے آگے پڑھنا شروع کیا۔

"اور بکی جُوک پر ہم نے اپنے فرزند الیاس خواجہ اوغلان کو سردار مقرر کیا۔ خانِ اعظم تُوغلوق خان کا یہ فرمان ہے کہ اِلی دریا اور چو دریا اور سیر دریا کے جنوب میں جتنا علاقہ ہے اور سیر دریا اور کافرنہاں دریا اور سُرخاں دریا کے مغرب میں جتنا علاقہ ہے اور جتنا علاقہ اِن دریاؤں اور دشتِ قپچاق کے درمیان ہے، اُن سب پر ہم نے اپنے فرزند الیاس خواجہ اوغلان کو نائب السلطنت مقرر کیا۔"

الیاس نے بڑھ کے اپنے باپ کے زانو پر سر رکھ دیا اور تُوغلوق خاں نے اس کا سر اٹھا کے اس کے گالوں اور چینی داڑھی کے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔

تیمور کے دماغ میں کوئی فولادی تلواریں اور ڈھالیں کھڑکھڑا رہا تھا۔ اس کی رگوں میں طبلِ جنگ اور قرنا کے بجنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس کا خون اس شدت سے کھول رہا تھا کہ دماغ کی رگیں گویا اب پھٹیں۔ اب پھٹیں۔ یہ سمرقند کی دوشیزائیں تھیں جو اب وحشی پہاڑی چغتائیوں کے ریوڑ چرا رہی

تھیں۔ یہ سب تیمور کے ہاتھ دکھلا رہے تھے اور ان سب سے بڑھ کے یہ کہ اسے صرف توغلوق خاں کا نوکر نہیں بننا تھا۔ اسے ایاس خواجہ اوغلان کا اور الیاس کے بعد وحشی گندے بکی چوک کا نوکر بننا تھا۔

اس نے آخری مرتبہ شطرنج کی چال چلنی چاہی۔

سینے پر ہاتھ رکھ کے اور زمین کی طرف جھک کے اس نے کہا: خانِ اعظم توغلوق خاں کا یہ لیغ ہم سب کے لیے واجب التعمیل ہے لیکن خانِ اعظم کے جدِ امجد نے ماورالنہر کی حکومت ہم برلاسوں کے سپرد کی تھی۔ میری یہی استدعا ہے کہ خانِ اعظم توغلوں کے ساتھ ہی الیاس خواجہ اوغلان اور بکی چوک بہادر کا اسیک کول کے ٹھنڈے پانی کے کنارے اور خان تینگری کے خنک صنوبروں اور مرغزاروں میں قیام رہے۔ میں چغتائیوں کا وفادار ہو کے ماورالنہر میں اور قزل قم اور قراقسم کے تپتے ہوئے ریگزاروں میں امن قائم رکھوں گا۔ یہاں کا موسم چغتائیوں کے لیے خشک اور گرم اور ناخوشگوار ہے۔

بکی چوک بہادر اور چغتائی سرداروں نے طنز و استہزا سے ناخوشگوار قہقہہ لگایا اور توغلوق خاں نے ذرا خشمگیں لہجے میں پوچھا۔

"منگ باشی امیر تیمور برلاس تجھے ہمارے یرلیغ کی اطاعت سے انکار ہے؟"

تیمور نے پھر جھک کے زمین چومی اور کہا "مجھے خانِ اعظم کے حکم سے کیسے انکار ہو سکتا ہے۔ میں نے تو محض وفاداری کا مشورہ دیا۔"

توغلوق خاں نے کہا: "تو یہ جان لے کہ ہمیں برلاسوں پر اعتبار نہیں۔ برلاسوں نے امیر کازغان کے زمانے میں اور اس کے بعد چغتائیوں سے بغاوت کی ہے۔"

امیر تیمور نے سینے پر ہاتھ رکھ کے بے ہراس لہجے میں کہا: میں نے کبھی خانِ اعظم سے بغاوت نہیں کی، حالانکہ میری بیوی جلائر ہے اور خانِ اعظم ہلاکو خاں کی اولاد سے ہے۔ میں نے اپنے اور اس کے عزیزوں کا ساتھ نہیں دیا۔"

"یہ ہمیں معلوم ہے" توغلوق خاں نے کہا: "اسی لیے ہم نے تجھے سمرقند کا حاکم مقرر کیا۔ حالانکہ ہماری اردو کے لوگوں کو سمرقندی عورتیں پسند ہیں اور سمرقند کے باغوں کے میوے پسند ہیں۔"

تیمور کا خون غصے سے کھولنے لگا، مگر وہ خاموش رہا اور توغلوق خاں نے کہا: "رہ گئی یہ بات کہ تو

چنگیز خاں کے خاندان کا داماد اور گورگان ہے۔ یہ بھی ہمیں قبول ہے، لیکن کیا تجھے اپنے جدِ امجد کیپلی خان کا وہ پیمان یاد ہے جو اس نے چین کے خانِ اعظم قبلائی خان سے کیا تھا، جو خانِ اعظم چنگیز خاں کا پوتا تھا اور تیرا جدِ امجد کیپلی خاں چنگیز خاں کے خاندان کا داماد تھا۔ قبلائی خاں سے کیپلی خاں نے یہ پیمان کیا تھا کہ بادشاہت چنگیز خاں کی اولاد میں رہے گی اور گورگان بادشاہت کا حق نہیں مانگیں گے، وہ چنگیز کے شاہی خانوادے کے نوکر رہیں گے۔"

راویوں نے توغلوق خاں کی بات اٹھائی اور نعرہ لگایا: "من کے کرکو تینگری کی قسم کہ یہ بات سچ ہے اور اس پیمان کا ذکر پرانی داستانوں میں ہے۔"

تیمور نے آخری کوشش کی: "خانِ اعظم یہ سچ ہے کہ بادشاہت چنگیز خانِ اعظم کے خانوادے کا حق ہے اور نوکری ہم دامادوں اور گورگانوں پر واجب ہے۔ یہ میں مانتا ہوں، لیکن اس صورت میں فرضاً اپنے بیٹے الیاس خواجہ اوغلان کو میرا حاکم اعلیٰ بنا۔ یکی جوک بہادر تو محض ایک چغتائی امیر ہے۔ میں جو شاہی خانوادے کا گورگان ہوں۔ اس کی اطاعت کیسے کر سکتا ہوں۔"

بے صبری سے توغلوق خاں نے ہاتھ کا اشارہ کیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں، توغلوق خاں، چغتائی، خانِ اعظم جو کہنا تھا، کہہ چکا۔ اب مجھے اور کچھ نہیں کہنا ہے۔"

اور راویوں اور نقیبوں نے صدا بلند کی۔ "خانِ اعظم توغلوق خاں جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا۔ اس کی یرلیغ واجب التعمیل ہے۔"

تیمور نے پھر آستانے کی زمین چومی۔ اس کی آنکھوں میں زہر بھرا تھا، اس لیے اس نے اپنی آنکھیں نیچی رکھیں، اور الٹے پاؤں توغلوق خاں کے نقرئی خیمے سے باہر نکل گیا۔

اور جب رات آئی تو اس نے قاضی زین الدین کی بات یاد کی اور چپکے سے اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "چلو۔"

وہ سب سمرقند کے ایک ویران مکان میں جمع تھے۔ انھوں نے پوچھا "کہاں؟"

"جہاں ہماری قسمت لے جائے۔ جہاں ہمارے خدا کی مرضی ہو۔"

[تیمور کروٹیں بدلتا رہا اور یاد کرتا رہا۔]

ایک شاہ، ایک فرزیں اور بیس مہرے۔ بیس رفیق جو اس کے ساتھ تھے اور اس کی فرزیں، اس کی

فرزانہ ملکہ اولجائی ترکان آغا، جو سیاہ لباس پہنے تھی، جس کی دونوں چوٹیاں بید مسند کے افعیوں کی طرح بل کھاتی جاتی تھیں۔ وہ اس عزیمت، اس بے مقصد سفر میں بھی برابر ہنستی ہنساتی جا رہی تھی۔
آج مجھے یقین ہے کہ سلطان حسین سے ملاقات ہوگی" اس نے پھر ایک بار بڑی شگفتہ ہنسی ہنس کر کہا۔
"یہ تو تو روز کہتی ہے، جس دن سے ہم نے سمرقند چھوڑا ہے۔"
روز جھوٹ موٹ کہتی تھی، آج سچ مچ کہتی ہوں۔ تیمور تمہیں معلوم ہے کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے آج یہ بات ہو کر رہے گی۔ اس کی وجہ پوچھو تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا، مگر یقین سا ہوتا ہے کہ یہ بات آج ہو کر رہے گی۔ آج صبح جب میں سو کر اٹھی، جب میں نے تمہیں نان اور کومیس دی تو اسی وقت سے مجھے یقین سا تھا کہ آج سلطان حسین ضرور ملے گا۔"
تیمور کا منہ فکر اور سوچ سے سُوجا ہوا تھا۔ اس نے زور سے "ہوں" کہا۔
اس کی طرف جھک کے اولجائی ترکان آغا نے دیکھا اور اس نے ایک لحظہ کے لیے لگام کھینچ لی۔ اولجائی کے کانوں کے دونوں آویزے جو چینی موتیوں کے تھے جھولا جھولنے لگے، اس کی زلفیں سینے پر لہرا گئیں، اس کی آنکھوں میں محبت اور شرارت کی ملی جلی چمک تھی۔
[آج وہ خاک کے تلے ہمیشہ کے لیے سو رہی تھی]
وہ ہنسی، تو اس کے دانت موتیوں کی طرح چمکے اور اس نے پوچھا "کیا سوچ رہے ہو؟"
"کچھ نہیں۔"
"مرد ہمیشہ سوچتے رہتے ہیں اور کبھی نہیں بتاتے کہ کیا سوچتے ہیں۔ زیادہ سوچو گے تو گھوڑا لگام توڑ کے بھاگ جائے گا۔"
تیمور کے چہرے کی سختی ذرا کم ہوئی اور وہ بے اختیار مسکرا دیا۔
اطمینان سے، اولجائی پھر زین پر تن کر بیٹھ گئی اور اس نے اور تیمور نے لگام کھینچ لی۔
"تیمور" اولجائی نے تھوڑی دیر کے بعد پوچھا۔
"میں سوچتی ہوں کہ ساری دنیا اس سرخ ریگستانوں کی جیسی نہیں ہے۔ ہرات کے قریب بڑے ہرے بھرے کھیت ہیں اور سمرقند کے باغ خربوزوں سے لدے رہتے ہیں۔ فرغانہ میں نہریں بہتی ہیں

اور ایک کول کے کنارے پہاڑوں پر صنوبروں کے جھنڈ ہیں"
"او لیائی تو تھک گئی ہے، اسی لیے ایسی باتیں سوچتی ہے۔ ہمیں ہمیشہ اس سرخ ریگزار میں پھرنا نہیں پڑے گا"
"ہاں کبھی نہ کبھی ہمارے دن پھریں گے۔" اولیائی نے کہا، تم میرے لیے شہر سبز میں ایک باغ بنوا دینا۔ وہاں میں جانگیر کے ساتھ رہوں گی اور وہاں جانگیر پڑھنا لکھنا سیکھے گا"
"پہلے اسے تیر اندازی اور لڑنا بھڑنا سیکھنا ہے۔ تیمور نے کہا۔
"خیر یہی سہی"
"اور میں اس باغ سے باہر نہ نکلوں گی"
[آج وہ ایک باغ میں ہمیشہ کے لیے گہری نیند سو رہی تھی، قزل قسم کا بے پایاں سفر اب لذازہ آوارہ گردی ختم ہو چکی تھی اور یہ یاد کر کے تیمور کا سینہ جل اٹھا اور اس نے گہری ٹھنڈی سانس لی۔]
تیمور نے اوپر آسمان کی طرف دیکھا اور انگلیوں کی آڑ سے سورج کے مقام کا اندازہ کرنا چاہا۔ ابھی اور کتنا دن باقی تھا۔ معلوم نہیں رات ریت کے ٹیلوں پر ہی گزارنی پڑے گی یا کہیں کوئی نخلستان مل جائے گا۔ آسمان پر آفتاب بہت گرم تھا اور سر پر خود تپ رہا تھا۔ تیمور نے خود کو سر سے اتار کے کیسے میں رکھا اور سر پر قزاقوں کی اونی کلاہ پہن لی۔
پھر ایک ٹیلے سے اس نے ریگ اور پتھر کے اس سمندر کی طرف دیکھا، جسے قزل قسم کہتے ہیں۔ ہر طرف لال لال ریت۔ زمین پر، ہوا میں، آسمان پر ہر طرف ریت کی سرخی۔ حالانکہ آسمان کا رنگ نیلا ہونا چاہیے اور ہوا کو بے رنگ ہونا چاہیے لیکن گرم ہوا کے جھکڑ ہر طرف لال لال ریت کو اڑا رہے تھے۔ زمین اس طرح تپ رہی تھی، جیسے تنور پر کوئی نان کی جگہ مٹی کی ٹکیاں پکائے۔ اس بنجر ریت کے سیلاب کے سیلاب اس طرح اٹھتے جیسے سمندر کی موجیں، ننھی ننھی ہزاروں لاکھوں کنکریاں، پانی کے قطروں کی طرح بکھرتیں اور ٹیلوں کی پسلیاں کھود کے ان میں جذب ہو جاتیں۔ جہاں زمین زیادہ پتھریلی تھی، گرمی سے چٹانیں چٹخ گئی تھیں کیونکہ یہ صدیوں کی گرمی تھی، جسے سرما کا برف کبھی ٹھنڈا کر سکتا کبھی ٹھنڈا نہ کر پاتا۔
آفتاب نصف النہار کے قریب پہنچ رہا تھا اور ریت کے جھکڑوں سے ایک دھند سی پھیل گئی

تھی، سُرخ سُرخ دھند جس میں ہزار قسم آتش کی چیز ایسے نظر آتی جیسے کسی دوسری دنیا میں ہو۔ آنکھیں معلوم ہوتا تھا کہ ابل پڑیں گی۔

اولجائی نے اپنے سر پر کپڑا باندھا اور ایلچی بہادر سے تھوڑا سا پانی مانگ کے اسے تر کیا، پانی کے کٹورے کی تہہ میں ریگ کے ننھے ننھے ذرے بیٹھ گئے تھے۔ اس ریت کو پانی میں حل ہوتا گویا نہ تھا، معلوم نہیں ہوا میں کس طرح تحلیل ہو جاتی تھی۔

جیسے کسی اور دنیا میں کوئی خوشگوار سی لکیر ابھرے، ریت کی جھلستی ہوئی لال لال دھند کے اُس پار کبھی کبھی کسی نیم خشک نخلستان کے کنارے سوکھی ہوئی گھاس کچھ دور تک نظر آتی اور گھوڑے بے اختیار ہنہنانے لگتے۔ سب سے پہلے ایلچی بہادر اور اس کے بعد اور رفیق گھوڑوں کی مرضی کمان لیتے اور لگامیں ڈھیلی کر دیتے اور جتنی دیر گھوڑے گھاس چرتے، خشک بے نم، بے رونق گھاس، کومیس کا ایک دور چلتا اور لدے ہوئے ٹٹوؤں کی پیٹھ سے خورجیاں اتاری جاتیں جن میں خشک کیا ہوا نمکدار گوشت تھا، سب اس مزیدار گوشت کو چباتے، پھر بڑی احتیاط سے لدی ہوئی مشکوں سے پانی کٹوروں میں بھر بھر کے تقسیم کیا جاتا۔ پانی کومیس اور گوشت دونوں سے زیادہ قیمتی تھا کیونکہ اس گرمی میں پیاس بہت لگتی تھی اور ٹھنڈے پانی کے چشمے یا سوکھی ہوئی ندیوں کی تہ میں نخلستانی سبزی کے ٹکڑے بہت دُور دُور تھے اور گھوڑے اور بار برداری کے ٹٹو کومیس نہیں پیتے تھے لیکن پانی کے بغیر اُن کا گزارہ نہیں تھا۔

آج بھی ایسی ہی ایک لکیر نظر آئی۔ ایلچی بہادر نے اپنے گھوڑے سے امتزاج کے لیے لگام ڈھیلی چھوڑی اور گھوڑے نے اس سبز لکیر کا رُخ کیا ہی تھا کہ ایلچی بہادر نے لگام پھر پوری قوت سے کھینچ لی اور گھوڑا غصے اور کرب سے دانت نکال کے ہنہنایا۔ اس کی گردن تھپک کے ایلچی بہادر نے للکار کے کہا "امیر، یہ کسی پرانی ندی کا کنارہ ہے۔ گھاس بھی سبز ہے، اس لیے پانی ہوگا، لیکن گھاس کے اُس پار کسی کے جانور چر رہے ہیں۔"

تیمور نے ریت پر سورج کی جگمگاہٹ سے بچنے کے لیے پیشانی پر ہاتھوں کی چھتری سی بنائی اور کہا "مجھے تو صرف گھوڑے ہی نظر آتے ہیں۔ ممکن ہے بھیڑ بکریوں کا ریوڑ قریب ہو، اگر ہے تو یہ جانور چرواہوں کے ہوں گے۔ احتیاط سے آگے چلو۔"

کارواں فی الفور فوجی دستہ بن گیا۔ صف بستہ ہو کے چلے تو اسلحے سے لدے ہوئے ٹٹوؤں کے

گئے اور چشم زدن میں تیر سب میں تقسیم ہو گئے۔ سب نے کمانیں کڑی کیں۔ گھوڑوں کی چال بدل گئی اور جنگ کے عادی گھوڑے بھی سمجھ گئے کہ اس سبز گھاس تک پہنچنے سے پہلے محنت اور زحمت ہے۔

اور پھر ایک سیلے میں اس دھند سے گزر کے یہ بائیسوں سوار ہری ہری گھاس تک پہنچے جو گھوڑوں کے ٹخنوں کے برابر اونچی تھی۔ یہاں سیلی نم مٹی اور دلدل میں درختوں اور بیلوں کا ایک جھنڈ بھی تھا جو معلوم نہیں اس سینکڑوں فرسنگ لمبے ریگستان میں کیسے زندہ تھا۔ جن سواروں کے گھوڑے چر رہے تھے وہ اپنے گھوڑوں کی طرف لپک کر ان پر سوار ہونے لگے اور انہوں نے بھی اپنی کمانیں کڑی کیں۔

اتنے میں اپنے تیز، چھلانگیں مارتے ہوئے، گھوڑوں کی رکابوں پر تقریباً نیم استادہ ہو کر اولجائی چلائی "سلطان حسین، سلطان حسین!"

کڑی کمانیں ڈھیلی ہو گئیں، ایک ملا جلا مرحبا کا شور بلند ہوا۔ گھوڑوں کی سرپٹ چال دھیمی ہو گئی۔ تیر ترکشوں میں واپس چلے گئے اور اولجائی سب سے پہلے اپنے گھوڑے سے کود کے، اپنے بھائی سے لپٹ گئی۔ اس کا جسم وزنی تھا۔ تیمور کو اس کی پھرتی پر حیرت ہوئی۔

اس نے سلطان حسین کو گھسیٹ کے گھوڑے سے اتارا اور چلا کے اس نے تیمور سے کہا، حالانکہ چلانے کی ضرورت نہیں تھی "میں نے کیا کہا تھا؟ میں نے کیا کہا تھا؟ کہ آج سلطان حسین سے ملاقات ہو گی؟"

تیمور کو یہ ملاقات یاد تھی۔ بہت اچھی طرح۔ اسے خیال تھا کہ سلطان حسین اسے طعنہ دے گا تانی منصوبوں سے دوستی کا۔ تیمور نے اس ملاقات کے دوران میں اپنے آپ کو جس قدر حقیر محسوس کیا، اس کے بعد پھر کبھی نہ کیا کیونکہ سلطان حسین نے ایک لفظ بھی نہیں کہا، نہ طعنے کا، نہ ملامت کا، اس کے برعکس سلطان حسین کا بھاری بھرکم جسم جو زرہ کے نیچے اس گرمی میں بھی اطلس سے لدا تھا مارے خوشی کے کانپ رہا تھا۔

درختوں کے جھنڈ کے پیچھے سے ایک حسینہ اپنے رہوار کی لگام ہاتھ میں تھامے ہوئے نکلی اور بے ساختہ اپنے گھوڑے سے کود کے اولجائی سے لپٹ گئی اور اولجائی ہر اتنی فارسی اور ترکی کا فرق بھول کے بار بار کہتی رہی: "تشکرم۔ خواہرم"

یہ سلطان حسین کی ملکہ دلشاد خاتون آغا تھی۔

تیمور اور سلطان حسین کبھی ایک دوسرے سے اس قدر قریب نہیں ہوئے تھے، جیسے کہ اس دن

قزل قسم کے بے پایاں طوفانی، سرخ ریگستانی سمندر کے اس ہرے بھرے نخلستانی جزیرے میں۔

تیمور کے حکم کا انتظار کیے بغیر ایلچی بہادر نے خیمے کھڑے کرنے کا حکم دیا۔ کالے کالے سمور کے گول گول خیمے، جو دور سے ترکمانوں کے خیمے معلوم ہوتے تھے اور اس لیے اس علاقہ میں محفوظ تھے۔

خشک نمکین گوشت کے تکے ابلتے ہوئے پانی میں ڈال دیے گئے، کیونکہ ابلا ہوا گوشت بہرحال خشک گوشت سے زیادہ مزے کا ہوتا ہے اور اس جلتی ہوئی دوپہر کو درختوں کے جھنڈ کے سائے میں ایسی ضیافت ہوئی جس کے آگے ایران اور توران کی تمام ضیافتیں ماند تھیں۔ اس غربت میں بھی دلشاد خاتون کی خورجی میں زعفران تھا، جو چاولوں میں ڈالا گیا۔ پگھلی ہوئی چربی میں دُنبے تلے گئے جن کو ایک دن پہلے سلطان حسین نے ترکمانوں کے ایک گلے سے خریدا تھا اور جب دانتوں کو مسواک کر کے اور ہاتھوں پر لگی ہوئی چربی نرم نرم گھاس سے پونچھ کے سب نے اوک بھر بھر کے، بلکہ چشمے سے منہ لگا کے گھوڑوں اور غزالوں کی طرح چشمے کا پانی پیا، تو یہ پانی جنت کے نہروں کے پانی کی طرح شیریں اور خوشگوار تھا۔

دلشاد خاتون آغا جب جھک کے چشمے کا پانی پی رہی تھی، تو پانی آئینہ بن گیا۔ جھوڑا تاجیک لبادہ، سر پر جواہرات سے لدی ہوئی کلاہ، دونوں شانوں اور سینے پر بل کھاتی ہوئی بھورے بھورے بالوں کی گندھی ہوئی دو دو لٹیں۔ پانی کے آئینے میں ایک اور حسینہ ابھری، ایک اور دلشاد، جو اس ریگستان میں ماری ماری نہیں پھر رہی تھی جو گویا اس چشمے کی پری تھی۔

[یہ سب تشبیہیں اولجائی کی تھیں کیونکہ تیمور نے کبھی دلشاد کو نظر بھر کے نہیں دیکھا، اس قیامت کی طرح گرم لیکن دلفریب دوپہر کو بھی نہیں، اور سلطان حسین کی تو وہ بیوی ہی تھی۔ اس کے عکس کو دیکھ کے شاعری کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ مگر اپنے بھائی کے تمام بیویوں میں اولجائی کو دلشاد ہمیشہ سے بہت پیاری معلوم ہوتی تھی۔ وہ مبہوت ہو کے دلشاد کو اور اس کے عکس کو دیکھتی رہی]

اور اس دن، اس سہ پہر کو رات کے بجائے دن ہی کو خیمے نصب ہو چکے تھے۔ خیمے میں تیمور اور سلطان حسین مستقبل کے متعلق بحث کر رہے تھے۔ یہاں درختوں کی چھاؤں میں گرم گرم لو اور ریت کے دامن میں ٹھنڈے ٹھنڈے چشمے کے کنارے، دلشاد کی آنکھ لگ گئی اور اولجائی ایک پیڑ کے سہارے بیٹھ کے اونگھنے لگی اور جہانگیر اس کی گود میں سر رکھ کے سو گیا۔

[ہم امیر تیمور گورگاں . . . . .

[ہم امیر تیمور گورگاں جو ربع مسکون کو تسخیر کر کے رہیں گے، ہمیں اپنی عظمت کی قسم ہے کہ اولجائی کی یاد دل سے محو نہیں ہوتی۔ قضا و قدر پر ہمارا اختیار نہیں . . . . میں فرد واحد تیمور جس کو اس دن اس سپاہ نے تیمور لنگ کہا تھا اور جس کو میری پیٹھ کے پیچھے ساری دنیا تیمور لنگ کہتی ہے۔ کشادہ پیشانی، سرخ و سفید، سیاہ ریش شیر دل، میں تیمور جب اولجائی کو یاد کرتا ہوں، تو دل سینے سے باہر نکل آتا ہے اور آج اس کا بھائی اس دوسرے خیمے میں میرا قیدی ہے، صبح تک مجھے اس کی زندگی یا اس کی موت کا فیصلہ کرنا ہے]

ایام کے، شب و روز کے پٹے ہوئے مہرے اس طرح گھوم رہے ہیں جیسے یہ جیتی ہوئی بازی کسی نے ابھی تک نہ جیتی ہے نہ ہاری ہے۔

مشورہ میرا تھا اور مشورہ غلط تھا۔ خوارزمیوں کا کیا اعتبار۔ ان کا دل اس کھاری جھیل کی طرح کھارا ہے جس میں آمو دریا اور سیر دریا گرتے ہیں، مگر اس کی نمکینی کو کم نہیں کر پاتے۔

خوارزمیوں کا کیا اعتبار اور ایک دن میں خوارزمیوں سے ان کی بدسلوکی کا بدلہ لے کر رہوں گا، لیکن خوارزمی تاتارانِ زرّیں خیل کے باجگذار تھے اور زرّیں خیل اور چغتائیوں میں نہ کبھی بنی ہے، نہ کبھی بنے گی۔

قراقم کا کالا کالا ریگستان۔ کالے ٹیلے۔ جلتا سورج، گھوڑوں کی گردنوں، پیٹھوں، رانوں سے اٹھتا ہوا پسینہ، گرد میں اٹے ہوئے خود، گرد پوش داڑھیاں، تھکے ہوئے گھوڑوں کی تھکی ماندی ہنہناہٹ اور جب ہم منزلِ مقصود پر پہنچے تو محض ایک سراب ملا۔ سراب میں تو خیر یہی ہے کہ پانی نہیں ہوتا، ریت ہی ریت ہوتی ہے۔ خوارزم میں ریت کے اوپر ہی اوپر جال بچھا ہوا تھا۔ غلطی میری ہی تھی۔ میں نے ہی سلطان حسین کو خوارزم چلنے کی ترغیب دی تھی۔ وہ تو کابل واپس جانا چاہتا تھا کہ چغتائیوں سے پھر ایک بار اپنی کھوئی ہوئی سلطنت چھینے لیکن چالیس سپاہیوں سے کہیں کھوئی ہوئی سلطنت چھینی جا سکتی ہے۔

کئی آوازوں نے چپکے چپکے ہم سے کہا۔ "بھاگ یہاں سے بھاگ" اور مجھے اپنا دشمن، اپنا محسن بایزید جلائر یاد آ گیا۔

خوارزم سے کئی سرگوشیاں سنائی دیں، یہاں کی چھتیں خیموں کے کلس کی طرح نوکدار نہیں تھیں، مسطح چھتیں جن میں مٹی اور خاشاک کے تنکوں پر سنہری جمی ہوئی تھی۔ چھوٹے چھوٹے چوبی دروازے جن پر تبریزی نقش کاری تھی۔ خوارزم کے شہر میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تورانی خاک پر ایرانی دنیا آباد ہے۔

میں نے سلطان حسین سے کہہ دیا تھا (سلطان حسین فربہ جسم، دراز قد تھا) چنگیز کی اولادِ نرینہ کو خوارزمیوں سے مدد کی توقع تو بیکار ہے لیکن ہمیں پناہ مل جائے گی۔ گرمیوں کے ایام تک اور گرمیوں میں چغتائیوں کا لشکر، پہاڑوں میں واپس چلا جائے گا۔ چغتائیوں کے سمندروں کو ایک کول کا خنک خنک پانی پینے کی عادت ہے، اس کے بغیر ان سے گرمیاں نہیں کٹتیں۔ چغتائی شہسواروں کے راہواروں کو خان تینگری کے علف زاروں میں صنوبروں کے ٹھنڈے سائے کے نیچے ادری اور بہی گھاس چرنے کی عادت ہے، اس کے بغیر وہ گرمیاں نہیں گزار سکتے۔ میں نے سلطان حسین سے کہا تھا کہ اگر خوارزمی ہمیں پناہ دیں تو گرمیوں میں ہم پھر واپس چلیں گے۔ سمرقند کے جوار سے برلاسوں کو جمع کریں گے، کابل اور فرغانہ کی وادیوں سے جلائروں کے وفادار مغلوں اور ترکوں کو چنیں گے اور اس کے بعد تو غلوق خاں سے مقابلہ کریں گے۔

مگر خوارزم کی نیچی نیچی مسطح چھتوں کے نیچے جو مخلوق تھی اس کے دل میں دغا اور لالچ تھی اور ہم سے ایک درویش نے کہا۔

"سلطان حسین یہاں سے بھاگ، تیمور گورگان یہاں سے بھاگ۔ خوارزم کے صوفیوں کے دل میں بجز دغا اور حرص کے سوا کچھ نہیں وہ اس فکر میں ہیں کہ تم دونوں کو پکڑ کے تو غلوق خاں کے ہاتھ بیچ دیں۔ تمہاری عورتوں کو کنیز بنائیں تمہارے بچوں کو غلام بنائیں۔ بھاگ، بھاگ"

خوارزم کے لشکریوں کے بشرے سے چالاکی ٹپکتی تھی۔ اور ان میں سے ہر ایک کی گویا چار چار آنکھیں تھیں اور وہ یہ دیکھ رہے تھے کہ ہم کتنے ہیں کس ترکیب سے زندہ گرفتار ہو سکتے ہیں، اور پھر ہم سے کہا گیا کہ صبح کو ہمیں صوفی کے دربار میں پیش ہونا ہے۔

تب اولجائی نے مجھ سے کہا۔ "یہاں آ کر تم نے غلطی کی اور دلشاد آغا نے سلطان حسین سے کہا۔ یہاں آکر ہم نے غلطی کی اور سلطان حسین نے کچھ نہیں کہا۔ اس نے میری طرف غصے سے دیکھ کر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور ہم اپنے گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ ہم خیمہ دوزوں کے محلے سے گزرے، ہم کبابیوں اور نان خطائی بنانے والوں کے تنوروں پر گئے اور ان سے گرم گرم کباب اور نان لیے ہم نے اس طرح اپنے گھوڑوں کی لگامیں ڈھیلی چھوڑ دیں کہ کسی کو شک نہ ہو کہ ہم شہر کے باہر جا رہے ہیں۔

لیکن جب ہم فصیل کے دروازے کے پاس پہنچے تو جھپٹ کے ہم نے سنتریوں کے سر کاٹ لیے فصیل کے دروازے کھولے اور اس عرصہ میں سارا شہر جاگ اٹھا۔ اب ہم نے لگامیں کھینچیں اور دانتوں میں دبا لیں، اپنی کمانیں کڑی کیں اور چٹکیوں میں تیر پکڑے۔

(سلطان حسین نے یہاں سلطانی نہیں کی، جو میں نے کہا مان لیا تھا) ہم ایک بلند ٹیلے پر چڑھ گئے اور اندھیرے میں ہم نے مشعلوں کا ایک سرپٹ طوفان آتا دیکھا۔ کئی سو خوارزمی ہوں گے جو آگ کے طوفان

کی طرح چلے آرہے تھے، جب وہ ٹیلے کے نیچے پہنچے تو ہم دونوں اور ہمارے ساٹھ ساتھیوں نے اپنے آپ کو اس آگ میں جھونک دیا۔

ہم بگولے کی طرح ٹیلے کی چوٹی سے نیچے اترے، ہم نے اپنے قلب پر اپنی چھوٹی چھوٹی تورانی ڈھالیں تان لیں، ہم نے اپنی دوہری طاقتور کمانیں تان لیں، جن کی تانت میں موت کا نغمہ مرتعش تھا۔ ہم نے فولاد کی نوک والے تیروں کی ایسی بارش کی کہ کسی خوارزمی کی زرہ اس کے آگے ٹھہر نہ سکتی تھی۔ ادھر کمان تلتی، تیر چھوٹتا، اُدھر ایک ثانیہ میں دوسری چٹکی میں دوسرا تیر۔

ہم پر موت کا نشہ طاری تھا، دشمنوں کے اس مسلح جنگل میں اِدھر سے اُدھر اس طرح گھستے اور پھر باہر نکلتے جیسے فرزیں مقابل کے پیادوں کے ہجوم میں جب ہم خوارزمیوں کے درمیان دُور تک گھس جاتے اور وہ ہمیں گھیرنے کی کوشش کرتے تو ہم اس طرح صاف بچ کر نکل آتے جیسے قصاب کی چھری دُنبے کی ران کے گوشت میں۔ ضرورت ہوتی تو ہم اپنی خمدار بھاری تلواریں نکال لیتے اور باہر آکے پھر تلواروں کو نیام کرکے چٹکیوں میں تیر پکڑتے اور کمان کھینچتے۔

پھر میں نے دیکھا، ایلچی بہادر کا گھوڑا گرا اور وہ اس صفائی سے کود کے الگ کھڑا ہوا کہ میں نے کہا "مرحبا" وہ آسانی سے ذرا پیچھے ہٹ کے کسی اور گھوڑے پر سوار ہو سکتا تھا۔ کتنے گھوڑے تھے، جن کے سوار گر چکے تھے۔ دونوں طرف، لیکن وہ اسی طرح ٹیلے کے ایک بڑے پتھر کے پیچھے سے تیر چلاتا رہا، یہاں تک کہ خوارزمی سواروں نے اسے گھیرنا شروع کیا اور یہ دیکھ کر کہ ایلچی بہادر میں شجاعت زیادہ ہے اور عقل کم، میں نے جھپٹ کے اپنی تلوار سے اس کی کمان کی تانت کاٹ دی۔ اس نے اپنی خون میں ڈوبی ہوئی سیاہ داڑھی کے بال اپنے دانتوں میں چبائے اور وہاں سے ہٹ کے اس گھوڑے پر سوار ہو گیا تھا، جو پاس ہی اپنے خوارزمی آقا کی لاش کے پاس دونوں پیر اٹھائے ہنہنا رہا تھا۔

پھر میں نے سلطان حسین کو دیکھا۔ خوارزم کے نائب والی کے بہت قریب ایک وار میں اُس نے پرچم بردار کا ہاتھ قلم کرکے پرچم گرا دیا اور دانت میں عنان پکڑے تلوار سونتے وہ نائب والی کی طرف بڑھ رہا تھا کہ خوارزمیوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ میں نے جا کر براس سے کہا کہ وہ اولجائی کے قریب ہی رہے۔ مجھے اولجائی کے چہرے پر ہراس کی شکنیں اچھی طرح یاد ہیں۔ پھر میں نے بسم اللہ کہہ کے اپنا گھوڑا بڑھایا، سلطان حسین کا رہوار تنگ سے حلقے میں چکر کاٹ رہا تھا اور چاروں طرف تلواریں چمک رہی تھیں

میں نے . . . .

خیر میں اسے خوارزمیوں سے چھڑا لایا۔

اور پھر میں نے ہم میں سے جتنے کچھ بچے تھے، ان کو یلغار کا حکم دیا اور پھر ایک بار ہم نے اپنے آپ کو خوارزمیوں میں جھونک دیا۔

مجھے یاد ہے، مجھے یاد ہے کہ سلطان حسین کا گھوڑا تیر کھا کے گرا مجھے یاد ہے کہ تڑپ کر دلشاد خاتون آغا اپنے گھوڑے سے اتر پڑی اور اپنا گھوڑا سلطان حسین کو دے دیا۔ دلشاد کا چہرہ گرد اور پسینے میں اٹا ہوا تھا اور اس کے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ بجلی کی سی سرعت سے سلطان حسین اس گھوڑے پر سوار ہوا اور چشم زدن میں وہ میرے ساتھ تھا اور میں نے سوچا کہ جب تک نائب والی کا کام تمام نہ ہو ہمارے مٹھی بھر ساتھیوں کی زندگی کی کوئی صورت نہیں۔ میں نے کمان کڑی کی اور آنکھ کے پاس جا کے نشانہ لگایا۔ نائب والی کے عین اسی جگہ تیر لگا۔ آنکھ کے نیچے رخسار پر اور وہ اپنے گھوڑے پر اس ضرب کی شدت سے جھک گیا۔ میں نے اپنی زین پر جھک کے، رکاب پہ لپیدا زور ڈال کے ایڑ لگائی اور چلتے چلتے پوری طاقت سے نائب والی کے سینے پر نیزہ جھونک دیا جو آر پار ہو گیا۔

نائب والی کے گرتے ہی خوارزمی تتر بتر ہو گئے اور جو اس کی لاش اٹھانے کے لیے ٹھہرے تھے انہیں ہم نے تیر برسا کے بھگا دیا۔

ٹیلے پر دلشاد پیدل کھڑی کانپ رہی تھی اور اس کے پاس اولجائی تھی، اس کی کماں برابر کھنچی رہتی اور اس کا نشانہ کسی اور تاتاری سے کم نہیں تھا۔ میں نے دلشاد کو اولجائی کے گھوڑے پر سوار کرایا اور رات کے تاریک پردے میں ہم نے خوارزم کے جنوب کا رخ کیا۔

ہم آٹھ آدمی تھے۔ سات آدمی تھے جو خوارزمیوں کے ہاتھ زندہ بچے تھے میں اور اولجائی اور جہانگیر سلطان حسین اور دلشاد خاتون آغا۔ جاکو برلاس اور ایلچی بہادر اور اس رات اس چشمے کے کنارے ہمیں سلطان حسین کے تین بدبخت فی سپاہی اور ملے، مگر وہ تین گھوڑے چرا لے گئے۔

ہم نے یہ فیصلہ کر لیا کہ ساتھ ساتھ رہنا موت کو دعوت دینا ہے۔ سلطان حسین اور دلشاد کے ساتھ میں نے جاکو برلاس کو بھیجا اور طے یہ ہوا کہ ہم کابل اور بامیان کی پہاڑیوں میں پھر ملیں گے، مگر الگ الگ راستوں سے سفر کریں گے۔ ہمارے تین گھوڑے تو بدبخت فی سپاہیوں نے چرا لیے تھے ایک گھوڑا میرے پاس رہ

گیا جس پر میں نے اولجائی کو سوار کیا اور اپنے ہاتھوں میں اس کے گھوڑے کی لگام تھامی۔ ایلچی بہادر نے ایک خچر پر کھانے پینے کا سامان، جو کچھ نقد و جواہر رہ گیا تھا وہ سب لادا اور اس کی لگام تھامی اور ہم دونوں چلے۔
اس زمانے میں میں کئی فرسخ پیدل چل سکتا تھا۔ میں لنگڑا نہیں ہوا تھا۔

[میں لنگڑا نہیں ہوا تھا۔۔۔۔۔]

میں نے اولجائی کی طرف دیکھا اور اولجائی نے میری طرف۔ اب صبح ہو رہی تھی اور صبح کی روشنی میں ریت چمک رہی تھی۔ ریت کی ایک بے پایاں دنیا تھی۔ میں نے اولجائی کی طرف دیکھا اور اولجائی نے میری طرف۔ میں کہیں ٹخنوں ٹخنوں تک ریت میں دھنس جاتا تھا اور یہ دیکھ کر اولجائی کھلکھلا کے ہنس پڑی۔

اور میں نے بھی اس کی ہنسی سے متاثر ہو کے قہقہہ لگایا۔

اور پھر ریگستان اور صبح کے نور کے درمیان میں نے عہد کیا کہ ایک دن میں خوارزم کے صوفیوں سے اس غداری کا بدلہ لوں گا۔ جس طرح آج اولجائی بیابان بیابان دشت و دشت پریشان پھر رہی تھی، جس طرح آج دلشاد خاتون آغا کو پیدل ہو کے، اپنی جان اور عزت خطرے میں ڈال کے سلطان حسین کی جان بچانا پڑی، اسی طرح ایک دن خوارزم کی حسین ترین خاتون میرے لشکر کے بس میں ہوگی۔ میں کسی حسین خاتون کو اپنے لیے نہیں چاہتا تھا کیونکہ مجھے اولجائی سے محبت تھی نہ ہی اپنے لشکر میں کسی اور کے لیے ایلچی بہادر کے لیے جاکو برلاس کے لیے ...... یا شاید جہانگیر کے لیے ...... کیونکہ جہانگیر چند سال میں بڑا ہو جائے گا

میں نے جب قہقہہ لگایا تو اولجائی نے پوچھا "کیا بات ہے؟"

میں نے کہا: "میں خوارزم کی عورتوں سے تمہارا اور دلشاد کا بدلہ لوں گا۔"

اس پر اولجائی غصہ ہو کے بولی: "نہیں بدلہ نہ لینا۔ اس طرح بدلہ لینے میں تمہارا فائدہ ہوگا، مگر ہمارا سراسر نقصان ہے۔"

وہ ہمیشہ اسی طرح کی باتیں کیا کرتی تھی۔

صبح کی روشنی پھیلی تو ہمیں ایک سوکھی ہوئی چراگاہ اور ایک سوکھے ہوئے چشمے کے کنارے کچھ ترکمانوں کے بُرت ملے۔ ان ترکمانوں کے چربی ملبوسوں سے ایسی سڑی بو آتی تھی کہ اولجائی نے اپنی ناک بند کر لی۔ مگر یہ ترکمان وفادار تھے، انہوں نے بھیڑ ذبح کر کے ہماری دعوت کی اور ہمارے ہاتھ گھوڑے اور دُنبے بیچے۔ اولجائی نے ان کی غلیظ، تیل اور چربی سے لپی ہوئی عورتوں کو موتیوں کے ہار دیے۔ ان ترکمانوں کے گھوڑے بہت

کام آئے۔

پھر تیمور نے یاد کیا۔

وہ باسٹھ دن جو ہم نے علی بیگ کی قید میں گزارے۔ میں نے اور اولجائی نے اور اولجائی جو جلائر شہزادی تھی، جس کے جدِ امجد چنگیز نے دنیا کو فتح کیا تھا۔ ہمارا قید خانہ مویشیوں کا اصطبل تھا۔ ہمارے کپڑوں میں کھٹمل اور گوبر کے کیڑے اور چیونٹے جمع رہتے۔ گرمیوں میں معلوم ہوتا کہ ہمارا مغز پگھل جائے گا اولجائی حسرت سے میری طرف دیکھتی اور جب بے بسی کے عالم میں مجھے غصہ آنے لگتا تو وہ کھلکھلا کے ہنس پڑتی اور کہتی کہ "میرے آقا یہ دن بھی گزر جائیں گے۔

اور جس دن سلطان حسین کی دھمکی کے بعد علی بیگ نے ہمارے جواہرات لے کے ہمیں رہا کیا میں نے خدائے عزوجل سے عہد کیا کہ "میرے مولا، میں انسانوں کو قتل کروں گا، یا انہیں معاف کر دوں گا لیکن انہیں قید نہیں کروں گا"

اور اس طرح ہم اپنے کپڑوں کے کھٹملوں، گوبر کے کیڑوں اور چیونٹوں سے رخصت ہوئے۔

[وہ جو آج خاک کے نیچے دبی ہوئی ہمیشہ کے لیے سو رہی ہے۔ اس زمانے میں جوان تھی، زندہ تھی، اور خوبصورت تھی۔ اس کا گداز جسم زندگی اور قہقہوں سے مالا مال تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی اذیت اسے خاموش نہیں کر سکتی، اس کی ہنسی نہیں روک سکتی۔ کبھی کبھی وہ سوچ میں پڑ جاتی اور خاموش ہو جاتی، مگر جب وہ تیمور کو اپنے سے زیادہ خاموش پاتی تو ایک نئی زندگی کی لہر قہقہہ بن کر اسے زندہ کر جاتی]

[اور جب اولجائی قبر میں اتاری گئی ہے، تو تیمور دور تھا] لیکن اس نے وہ دن یاد کیا جب اس نے اسے اپنے ہاتھوں قبر جیسے کنویں میں اتارا تھا۔ چغتائی شہسواروں سے بچانے کے لیے۔

لال لال سنگلاخ چٹانیں۔ دور دور تک ہوا ریت کے لال لال ذروں سے سرخ۔ جیسے لاکھوں چیونٹیاں ہوا میں منتشر ہوں۔ جیسے فضا میں روزِ نشور کی سی گرمی اور سرخی ہو۔ اینٹوں کی بھٹی کی گرمی، لیکن اس گرمی کے باوجود اس سال چغتائی شہسوار خل تنگری کے ٹھنڈے ٹھنڈے صنوبروں کے سائے میں واپس نہیں گئے تھے۔ الیاس اور بکی جوک کے شہسوار ایسک کول کے کنارے کی ٹخنوں ٹخنوں اونچی گھاس میں گھوڑے نہیں چرا رہے تھے۔ ان کے گھوڑے اب بھی ماوراءالنہر کے مغرب میں تپتے ہوئے ریگستانوں میں دشمنوں کو

تلاش کر رہے تھے۔ خود اس کو اور سلطان حسین کو ان گھوڑوں کی نگاہوں سے کھنچی ہوئی گردنیں بحیرۂ خوارزم اور بحیرۂ خزر کے کڑوے کھارے موآج پانی کو دیکھتیں، بیزاری اور پیاس سے ہنہنانے کی آواز آتی اور نگاہیں پھر مشرق کی طرف مڑ جاتیں۔

جہاں جہاں کسی زرد زرد گھاس کی چراگاہ میں یا کسی چشمے کے کنارے، یا کسی دریا کی وادی میں چغتائیوں کے ہاتھوں ستائے ہوئے ترکمان چرواہے ملتے تیمور سے یہی کہتے "بانو اجہ. یا امیر! ادھر خطرہ ہے۔ اور ترکمان چرواھیاں اپنی پتلی پتلی لمبی لمبی آنکھوں سے گھور گھور کے اولجائی ترکان آغا کو دیکھتیں اور پھر اولجائی ترکان آغا کی مسکراہٹ وبائی طرح سب میں پھیل جاتی۔

ایک لاغر سا گھوڑا تھا، جو علی بیگ نے کھٹملوں اور گوبر کے کیڑوں والے اصطبل سے چلتے وقت دیا تھا اس پر تیمور سوار تھا اور ایک اونٹ تھا جس کی کھال جابجا لٹک رہی تھی اور خارش سے جسم پر کیڑوں کے تکے جمع ہوئے تھے، اس پر اولجائی سوار تھی۔

لال لال سنگلاخ چٹانیں اور ہوائیں ریت کی ڈالی، قزل قسم کی بے حد زانتہ، کبھی اذر ہوتی تھیں معجزے کہیں کھارے پانی کے چشمے، جن کو دیکھ کر گھوڑا ہنہنا کر پسینے سے شرابور گردن پھیر لیتا اور ردکٹوں کی طرح اس کے ایال کے بال کھڑے ہو جاتے اور اونٹ بے بسی سے بلبلا کے دوسری طرف دیکھنے لگتا اور کہیں کہیں معجزہ کے طور پر میٹھے پانی کا ایک کنواں۔

اس کنویں کا اس ماحول سے کوئی تعلق نہ تھا، دُور دُور تک کہیں سبزی کا کوئی پتہ نہ تھا، اس کا امکان کم تھا کہ دشمن کے سوار یہاں تک آئیں۔ یہ ایک معجزہ تھا ان سنگلاخ چٹانوں کے درمیان تہ بہ تہ، ان کراری چٹانوں کو کاٹ کر کسی زمانے میں کسی نے انسانوں کے لیے یہ کنواں کھود ا ہوگا۔ اب کئی کئی فرسخ تک کوئی آبادی نہ تھی، ترکمانوں تک کے خیمے کہیں نظر نہ آتے تھے لیکن تیمور کو معلوم تھا کہ کسی زمانے میں یہاں سے قریب ہی دریا بہتا تھا، جو سیحوں کے پانی کو جیحون کے پانی سے ملاتا تھا۔ یہاں آبادی تھی، لوگ رہتے تھے جو وحشی قبیلوں، مغلوں اور ریگستان کی نذر ہو گئے۔ جن کو مٹے کے صدیاں گذر گئیں۔

اور اس کنویں کے کنارے چار جانداروں نے رات گذاری۔ تیمور نے، اولجائی ترکان آغا نے، لاغر گھوڑے نے اور خارش زدہ اونٹ نے۔

اور جب رات اندھیری تھی تو تیمور نے کہا "شکرم"۔

اولجائی ترکان آغا کی آنکھیں گرم گرم نیند سے بند ہوئی جاتی تھیں۔ اس نے سوتے جاگتے میں کہا "ہمل" بستر کے نیچے۔ بہت سخت اور تکلیف دہ تھی۔ تیمور نے کہا "شکرم۔ اس طرح تو قزل قسم کا یہ ریگستان ہمیں کھا جائے گا۔ ہماری ہڈیاں تک یہاں بھوک اور پیاس سے سفید ہو جائیں گی اور کسی کو خبر نہ ہوگی اور اس ریگستان میں بھی چغتائی ہر جگہ ہمارا پیچھا کر رہے ہیں۔"

اولجائی نے ہنس کے کہا "اچھا اب سو جاؤ۔ صبح کو اٹھ کے سوچیں گے۔ رات کو نیند نہ آئے گی تو صبح کو بادیہ میں سفر کرنے کی طاقت کہاں سے آئے گی۔"

تیمور نے کہا "شکرم۔ میں سوچ رہا تھا کہ کچھ کرنا چاہیے۔ اس ریگستان سے نکلنا چاہیے۔ اگر میرے پاس صرف چند رفیق اور ہوتے۔ اگر میں اس قدر تیز سفر کر سکتا کہ ان رفیقوں کو پا سکتا جو خوارزم کے قریب کے دیہاتوں میں چھپے ہوئے ہیں۔ جیسے امیر سیف الدین جس کے ساتھ ہمارا جاگیر ہے اور آق بوغا اور ایلچی بہادر اور جاکو برلاس ہے۔ یہ اگر میرے ساتھ ہوتے یا میں ان کے پاس پہنچ سکتا یا میں انہیں پا سکتا۔ میں اتنا تیز سفر کر سکتا یا اکیلا سفر کر سکتا۔"

اولجائی پر ہاس راہ بیٹھی۔ اوپر نیلگوں آسمان تھا، جس سے دن کی اُڑی ہوئی سُرخ خاک کے ذرے آہستہ آہستہ غیر مرئی طور پر برس رہے تھے۔ ان سے اوپر چمکتے ہوئے ستارے تھے، کہکشاں اور لال تارے اور سنہرے ستارے اور ایک سبزی مائل تارہ اور نیچے دُور دُور تک لال لال چٹانوں اور ریت کی ہڈیوں اور پسلیوں جیسی شکنیں تھیں۔

اس عالی شہزادی نے اس سنگلاخ زمین اور اس دور دراز آسمان کی طرف دیکھا اور چشم زدن میں فیصلہ کر لیا۔ اس نے تیمور کے دونوں ہاتھ اپنے نرم و نازک ہاتھوں میں دلوچ لیے اور کہا "اچھا آپ اکیلے جائیے اور انہیں ڈھونڈ لیجیے۔"

"اولجائی۔ اولجائی۔ میں تجھے اس ریگستان میں تنہا کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔۔۔۔"

اولجائی نے جواب دیے بغیر ایک سوال کیا "یہ بتاؤ تمہیں یہاں واپس آنے میں کتنے دن لگیں گے؟"

"اگر زندہ رہا تو دو ہفتے۔" تیمور نے کہا اور اب وہ بھی اٹھ بیٹھا۔

اولجائی نے اس کے چوڑے مضبوط شانے پر سر رکھا اور اپنے زار و قطار امڈتے ہوئے آنسو روکے اور کہا "تیمور مجھے اس نیلگوں آسمان سے ڈر نہیں لگتا، جسے مغل پوجتے ہیں۔ مجھے اس سنگلاخ زمین سے ڈر

لگتا جس پر کوسوں تک ایک سبز پتا نہیں، لیکن اگر تیرے جانے کے بعد چغتائی یہاں آ پہنچے اور میرا وہی
ر ہوا جو چنگیز کی بیوی بورتے ٹی کا ہوا تو میں تیرے پاس کبھی واپس نہیں آؤں گی۔ میں اپنی جان دے
ں گی۔"

تیمور کی داڑھی کے کالے گھنے بال، اس کی دوہری زلفوں میں الجھ رہے تھے۔ تیمور نے اس کے رخسار کے
ے آنسو پونچھتے ہوئے کہا: "اولجائی میں تجھ سے ہمیشہ کہتا آیا ہوں کہ راویوں سے فضول داستانیں نہ سنا کر۔
ں تجھے اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ زندہ رہیں گے تو دونوں زندہ رہیں گے اور اگر قسمت میں ہوگا تو رفیق مل ہی
یں گے۔"

اولجائی نے اس کے ہاتھوں کو اپنی بھیگی ہوئی آنکھوں سے لگایا: "مجھ پر سے میری ایسی ہزار جانیں قربان
اس کنوئیں میں اتار دے۔ اگر دشمن کے سپاہی آئیں گے بھی تو میں چٹانوں کے نیچے چھپ جاؤں گی اور
رسے ڈول ڈال کے پانی لے جائیں گے، لیکن اس طرف شاید ہی کسی کا گذر ہو۔ لیکن اپنا وعدہ یاد رکھیو
پندرہ دن بعد آ کے مجھے لے جائیو۔"

تیمور نے کہا: "نہیں میں تجھے اس لق و دق بیابان میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔"

اولجائی ذرا ہٹ کے بیٹھ گئی اور استقلال سے اس نے کہا: "کیسے نہیں ہو سکتا یہی تقدیر ہے
ر یہ ہو کر رہے گا۔ مگر پندرھویں دن آ جانا۔"

دوسری صبح کو تیمور نے دور سے جا کر خارش زدہ اونٹ کو ذبح کیا اور اس کا کچھ گوشت اولجائی
ے ساتھ کنوئیں میں اتارا۔ آگ جلانے کے لیے گھوڑے کے کھانے کی سوکھی ہوئی گھاس دی۔ اس آوارہ گردی
ے زمانے میں آدھا کچا اور آدھا پکا گوشت کھانے کی ان دونوں کو عادت ہو گئی تھی۔ اپنے لیے ایک روٹی
ی اور باقی ساری روٹیاں اولجائی کے لیے کنوئیں میں اتار دیں۔ آگ جلانے کے لیے چقماق کے پتھر دیے۔
ڈھن کے لیے اونٹ کا کمل دیا اور پھر کنوئیں کے کنارے سے جھانک کے اسے دیکھا۔ پانی تہہ میں آئینہ کی
رح چمک رہا تھا اور کنارے کی چٹان پر جس کا رنگ پانی کی ریت سے سرمئی ہو رہا تھا۔ اولجائی کھڑی اس
طرف دیکھ رہی تھی، اس کا چہرہ تمتا رہا تھا اور دونوں چوٹیاں سینے پر گندھی ہوئی پڑی تھیں، اس کی آنکھیں
شک تھیں اور ایک بے پایاں محبت اور قربانی کی چمک سے جگمگا رہی تھیں اور اس کے ہونٹوں پر امید وار بے ہراس
ی وہ مسکراہٹ تھی، جس نے سخت سے سخت مصیبت میں بھی تیمور کا دھیان بٹائے رکھا۔

"اولجائی فی امان اللہ۔"

"فی امان اللہ۔ آج سے پندرھویں دن؟" اولجائی کی آواز اور صدائے بازگشت کنویں میں گونج گئی۔

"پندرھویں روز۔"

اور پندرھویں دن جب وہ واپس آیا، اپنے بیٹے جہانگیر کے ساتھ اور سیف الدین اور جاکو برلاس اور آق بوغا، اور ـــــــ قاضی زین الدین کے ساتھ اور اس نے کنویں میں جھانک کر دیکھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تو وہ جو کنویں میں اتاری گئی تھی، چونکی تک نہیں۔ اس نے گردن اٹھا کے یہ معلوم کرنے کی بھی زحمت نہیں کی کہ گھوڑوں کی ٹاپ دشمنوں کے راہواروں کی تھی یا تیمور کی۔ ان دو ہفتوں میں اس کنویں کی زندگی نے اسے عارضی طور پہ اندر سے تسخیر کر لیا تھا، یہاں سے آسمان کا صرف ایک حصّہ نظر آتا تھا، وہی حصّہ جسے کنویں کے منہ نے معیّن کیا تھا اور دو ہفتہ تک شب بہ شب، ساعت بہ ساعت وہی ستارے اُسی جگہ نظر آتے تھے۔ دن کو یہ چھائیں اسی جگہ سے کھسکتی اور شام کے اژدھے جیسے دھندلکے میں جذب ہو جاتی۔ اوپر آسمان تھا۔ اس کے نیچے زمین اور یہ جگہ زمین سے بھی نیچے تھی۔ ایک دو دن تک اسے یہ محسوس ہوا تھا کہ قبر بھی ایسی ہی کوئی جگہ ہوگی جو زمین سے زیادہ نیچے ہے۔ جہاں کوئی ساتھی کوئی رفیق نہیں۔ جہاں راتوں کو آسمان پہ ستارے بھی نہیں چمکتے۔ صرف انسان ہوتا ہے اور اُس کا خُدا۔

اور وہ کیفیت جو سالہا سال کی ریاضت سے پیدا ہوتی ہے، ساعت بہ ساعت اولجائی ترکان آغا کے دل میں پیدا ہوتی گئی یہ کہ یہ سب ایچ ہے۔ یہ زمین، یہ آسمان، یہ زندگی، دشت بہ دشت، قریہ بہ قریہ، کو بکو یہ کہ وہ خود ہے، جب تک زندہ ہے، ہے۔ اور اس کے سوا صرف خدا ہے، جو ہر جگہ ہے۔ باقی جو کچھ ہے غول بیابانی ہے۔ ریگستان کے غیر مرئی جن اور عفریت ہیں خواہ وہ سپاہی ہوں، دوست ہوں یا دشمن ہوں، خون کے پیاسے ہوں یا چاہنے والے ہوں۔ سب کے سب لاحول کے مستحق ہوں۔ ان تمام صحرائی آسیبوں، ان غول بیابانی کے خوف کو اس نے سب سے بڑے خوف کے سپرد کر دیا۔ اس کا خوف جس کا بنایا ہوا نیلگوں آسمان تھا، جہاں اکیلی راتوں میں تاروں کی قندیلیں جلتی تھیں، جس کا بنایا ہوا اس کنویں کا ٹھنڈا پانی تھا، جسے اس سرخ ریگستان کی گرم ہوا خشک نہیں کر سکتی تھی اور یہ خوف ایک طرح کی محبت بھی تھی۔ جیسے تیمور سے اس کے رشتہ میں محبت اور خوف دونوں منسلک تھے۔

اس کنویں میں جب دوسرا دن گزرا اور دوسری رات ہوئی تو رات کو اس خوف کے دامن میں جو

رحمت بھی تھا، جو سہارا بھی تھا اولجائی نے پناہ لی۔ اس نے جب وضو کیا، تب بھی اسے شک تھا کہ یہ محض رسمی عبادت ہے یا کچھ اور بھی ہے لیکن جب اس نے عشا کی نیت باندھی تو اس اندھیری اکیلی رات میں، اس سنسان صحرا، اس سنسان آسمان میں اس کے اور کسی اور کے درمیان ایک ایسا رشتہ بندھ گیا جو ہر طرح کی رسمی عبادت سے بالاتر تھا۔ اسے یاد نہیں رہا کہ اس نے کتنی رکعتیں پڑھیں، کتنی دیر تک قرآن کی آیتیں پڑھتی رہی اور کون کون سی آیتیں پڑھتی رہی، وظیفہ میں کیا کیا پڑھا اور کیوں پڑھا اور اس حالت میں کب سو گئی۔

تیسرے دن جب وہ سو کر اٹھی تو آفتاب اس کنویں پر اس طرح طلوع ہوا جیسے گھر کے صحن میں جیسے خانہ باغ کی روش پر طلوع ہوتا ہے اب اس دشت، اس بادیہ، اس گرمی، اس تنہائی، اس زمین، اس آسمان سے اس کی صلح ہو چکی تھی۔ کوئی اور اس کے ساتھ تھا۔ وہ جو ہر جاندار سے زیادہ جاندار تھا۔ اس نے سڑے ہوئے اونٹ کے گوشت کو دور پھینک دیا اور کنویں کے ٹھنڈے پانی میں بھگو کے سوکھی روٹی کا ٹکڑا کھایا اور پھر کنویں کی دیوار کی چھاؤں میں اس بے وقت کی نماز کی نیت باندھی اور ساری دنیا سے غافل ہو گئی اور اسی طرح دن گذرتے گئے، سوکھی روٹیاں کم ہوتی گئیں وہ کمزور ہوتی گئیں۔ پندرھویں دن جب تیمور نے کنویں کے سرے پر آ کے آواز لگائی "اولجائی، اولجائی" تو اس نے گردن تک نہیں اٹھائی لیکن جب تیمور کے قریب سے جہانگیر نے اسے پکارا "انا۔ انا" تو وہ چونک پڑی۔ گویا وہ کڑی جو ان دو ہفتوں میں اس دنیا سے، اس تنہائی میں ٹوٹی تھی، پھر جڑ گئی۔ وہ ماں بن گئی ایک خالقانہ جذبہ تھا جو بیدار ہوا اور اس نے سر اٹھا کے اوپر دیکھنا چاہا کہ کنویں کی دیواریں اور محدود آسمان کا حدود اربعہ دست و گریبان ہو کے گھوم گیا اور وہ بے ہوش ہو گئی۔

"بیٹی ایسا ہوتا ہے،" بابا زین الدین نے کہا "کبھی کبھی ایسی جھلک دکھائی دے جاتی ہے۔ کبھی سر راہے فقیر کو وہ نعمت عطا ہو جاتی ہے جو زاہد کو عمر بھر کی ریاضت میں نہیں ملتی۔ کیونکہ جہاں امتحان ہے وہاں زحمت ہے اور جہاں زحمت ہے وہاں اطمینان ہے۔ زندانِ چاہ بھی ایک مقام ہے جس سے گذرنا ضروری ہے کیونکہ جو اس سوئی کے ناکے سے ہو کر نہ گذرے، وہ قلبِ ضمیر سے محروم رہ جاتا ہے اور یہ نعمت ہر ایک کو میسّر نہیں آتی۔"

اولجائی سر جھکا کر سنتی رہی۔ پھر اس نے کہا "مگر بابا زین الدین میرا دل پھر اب پہلا سا ہو گیا۔ اب مجھے

نماز میں حضورِ قلب میسر نہیں آتا۔ مجھے اب پھر اپنے بیٹے اور اپنے خاوند سے ویسی ہی محبت ہے، اس دن جب میں نے جہانگیر کی آواز سنی جس نے مجھے ماں کہہ کے پکارا تو معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی خواب تھا، جس سے میں یک لخت بیدار ہوئی۔ جیسے اصل حقیقت یہی دنیا تھی جس میں تیمور ہے، جہانگیر ہے، میں ہوں اور وہ دنیا۔۔ وہ محض کنویں کی دنیا تھی۔

زین الدین بابا نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا: "بیٹی یہ راز تیری سمجھ میں نہیں آئے گا۔ تجھے جس کام کے لیے پیدا کیا گیا ہے وہی کام کر۔ اپنے شوہر کا خیال رکھ۔ اپنے بیٹے کی پرورش کر اور صرف یہ سمجھ لے کہ جس طرح تو جہانگیر کو پالتی ہے جیسے تو نے اسے اس وقت پالا جب وہ تیرے پیٹ میں تھا، اسی طرح تجھے اس نے پالا، اور اپنی ذات میں سمیٹ لیا جو اس کنویں کا مالک ہے۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں بتا سکتا۔ اگر میں بتا سکتا ہوں تو یہ کہ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ اس کنویں کے امتحان کے بعد تیرے اور تیمور کی زندگی کے دن بدل گئے، خاص طور پر تیمور کی زندگی کے......"

بابا زین الدین، کیا میری زندگی کے دن نہیں بدلیں گے؟

"بدلیں گے ضرور بدلیں گے۔ لیکن تیمور کی زندگی کے دن بہت بدلیں گے۔ کیونکہ چاہِ کنعان اور زندانِ مصر دونوں کی صعوبت یوسف نے اٹھائی، لیکن یعقوب اور اسحاق کی جانشینی یوسف کے حصے میں نہیں آئی، یہودا کو ملی جو یوسف کے ان سوتیلے بھائیوں میں سے تھا جنھوں نے یوسف کو قید کیا تھا اور یہودا عیاش تھا، لیکن یوسف پاکدامن تھا۔

ہراساں ہو کے اولجائی نے کہا: "بابا زین الدین میں آپ کی بات نہیں سمجھتی۔ کیا آپ کا مطلب ہے تیمور مجھے چھوڑ دے گا یا تیمور دوسری شادی کرے گا۔ میں نے اسے کبھی منع نہیں کیا لیکن اس نے آج تک کسی اور عورت کی طرف آنکھ اٹھا کے نہیں دیکھا۔"

بابا زین الدین نے ذرا بے صبری سے کہا۔ "اولجائی بیٹی اور سب عورتوں کی طرح تیری عقل کچی ہے، یہ تو کنویں کا مالک ہی بہتر جانتا ہے کہ تو تیمور کو پہلے چھوڑے گی یا تیمور تجھے پہلے چھوڑے گا، لیکن ایک بات جو تو شاید سمجھ لے یہ ہے کہ اس نے تیمور کو نہیں، تجھے چاہ میں اسیر کیا اور اس کا کوئی کام دانش اور مصلحت سے خالی نہیں۔ مگر ان باتوں کو، اس خیال کو چھوڑ۔ یہ دنیا چار دن کی ہے۔ اپنے شوہر اور اپنے بچے کے ساتھ خوش رہ۔"

اولجائی کے جانے کے بعد بابا زین الدین نے سوچنا شروع کیا۔ کڑیاں تھیں کہ جڑتی ہی چلی جاتی تھیں۔

حالانکہ ان کڑیوں کو جوڑنا گستاخی تھی بہت سے کنویں سچے ہوتے ہیں اور بہت سے جھوٹے چاہ کنعان سچا کنواں تھا اور چاہ بابل، چاہ نخشب جھوٹے کنویں تھے۔ آنکھ کا کنواں سچا ہے اور نرگس کا جھوٹا۔ حالانکہ نرگس آنکھ سے زیادہ پرانی ہے۔ آنکھ کے چشمے میں نظر کا سوتی ہے اور نرگس کے چشمے میں سراب ہی سراب ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کس چشمے کا پانی کھارا ہے اور کس کا میٹھا۔ یہ تو وہی جانتا ہے جس نے میٹھا اور کھارا پانی بنایا ہے۔

بابا زین الدین کو کارغان کی اس نواسی، اس جلائر شہزادی پر رشک آ رہا تھا جس کنویں میں وہ تھی، اس میں کیا شک ہے کہ وہ کنواں کھرا کنواں تھا۔ سچا کنواں تھا، یوسف کا، نظر کا، امتحان کا، تزکیۂ نفس کا کنواں۔ وہ زندان جس سے رہائی ملتی بھی ہے تو انعام نہیں ملتا کیونکہ اس کا انعام اتنا زیادہ ہے کہ وہ اس دنیا میں دیا نہیں جا سکتا۔ یوسف کا انعام مصر کی حکومت نہیں تھی، اصل انعام تو وہ تھا جو یہودا کو ملا۔ دانش انسانی ہیچ در ہیچ ہے اور دانش قربانی ہی جانتی ہے کہ کیوں امتحان یوسف کا لیا جائے اور اس کا انعام یہودا کو ملے۔ کیوں الجائی کنویں میں اتاری جائے اور تیمور کی قسمت کا ستارہ چمکے۔ اس مفروضے کا کوئی منطقی ثبوت نہ تھا، لیکن یہ بغیر منطق کے ظاہر اور ثابت تھا اور اس رات قاضی زین الدین نے تیمور سے کہا۔

"امیر! میں نے تم سے کہا تھا کہ تغلق خاں سے اور چغتائیوں سے صلح نہ کرنا کیونکہ چٹان سے دودھ نہیں نکل سکتا، لیکن تم نے میری بات نہ مانی۔ خیر جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ اب تمہیں سمرقند کی ان بیٹیوں کی قسم ہے جو مغلوں کے اصطبلوں میں بھیڑوں کا دودھ دُہتی ہیں اور راتوں کو ان کے ساتھ بیسواؤں کا گناہ کرنے پر مجبور ہیں کہ جاؤ اور چغتائیوں کا مقابلہ کرو۔ اب مجھے امید ہو رہی ہے کہ خدا تمہیں ظفریاب کرے گا۔۔۔۔۔۔"

تیمور نے کہا: "قاضی زین الدین۔ میرے پاس لشکر نہیں۔ فوج نہیں، دولت نہیں، صرف چند ساتھی ہیں جو میری اور اپنی جان کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ لیکن چغتائیوں سے مقابلہ کرنے کا تو بہرحال میں نے اور سلطان حسین نے عہد کر ہی رکھا ہے۔ کیوں کیا آپ کو میری فتح کی بشارت ہوئی ہے؟"

بابا زین الدین نے ارشاد کیا: "امیر تیمور گورگاں میں صوفی نہیں، کیونکہ میں نے کبھی صوف نہیں پہنا۔ میں نے کچھ دن تک تمہارے والد تارغائی کا زاویہ اور تکیہ سنبھالا تھا، لیکن وہ روشنی جو باطن سے آتی ہے جو اندر سے روشن ہوتی ہے مجھے نصیب نہیں ہوئی کیونکہ جو راستہ میں نے شروع سے اختیار کیا وہ شریعت کا تھا طریقت کا نہیں تھا۔ میرا سوز و گداز اخلاق کی حد سے آگے نہیں بڑھ پایا۔ میں یہ کیسے کہہ سکتا ہوں کہ مجھے بشارت ہوئی ہے کیونکہ میں بشارت کا اہل نہیں۔ جو زمین بنجر یا شور ہوتی ہے اس پر سبزہ نہیں جم سکتا۔ نہیں مجھے ایسے

ہی خیال ہوا۔ دنیا اور اہلِ دنیا اور اہلِ دنیا کے دلوں کو دیکھتے دیکھتے مجھے خیال ہوا کہ بعض اشارے ایسے ہوتے ہیں، بعض نشانیاں ایسی ہوتی ہیں جن سے آنے والی باتوں کو خبریں مل سکتی ہیں۔ اولجائی ترکان آغا نے دریا کے قریب چاہ میں جو ایک ہفتہ گذارا وہ ایک نشانی تھا اور دوسری نشانی یہ ہے کہ اس قیدِ چاہ کا اصلی فائدہ تم کو پہنچے گا۔ امیر گورگاں یہ سب قیاس ہی قیاس ہے۔ اس سے زیادہ مجھ سے کچھ اور نہ پوچھنا۔ اس سے زیادہ میں خود اور کچھ نہیں جانتا۔"

اب گویا تیمور کی یادداشت سب کی یادداشت تھی مگر نظام الدین شامی نے بین السطور یہ لکھا:

میری آنکھوں نے دیکھا کہ سات مینار تھے کٹے ہوئے سروں کے مینار کی قدِ آدم اونچے، مصر کے اہرام کی طرح سے نیچے کی طرف پھیلے ہوئے اور پھر اوپر ان کا قطر کم ہوتا جاتا اور میری آنکھوں نے دیکھا کہ یہ سات مینار سروں کے بنے ہوئے تھے۔ مردوں، عورتوں، بچوں، جوانوں، بوڑھوں کے سروں کے بنے ہوئے تھے۔ ان کے چہرے باہر کی طرف چنے ہوئے تھے۔ کسی کٹے ہوئے ماہِ طلعت چہرے کی زلفیں، کسی اور کٹے ہوئے چہرے کی حنائی ریش سے الجھی ہوئی تھیں کہیں کہیں بچوں کے چہرے ایک ساتھ چنے ہوئے تھے، جیسے کسی بڑی عمارت میں بڑی بڑی اینٹوں کے ساتھ چھوٹی چھوٹی اینٹیں چنی گئی ہوں۔ میں نے ریشمی لٹوں کے پہلو میں گنجے سر دیکھے، میں نے نیلی نیلی آنکھیں دیکھیں جو مردہ چہروں سے جھانک رہی تھیں اور میں نے ایسے چہرے دیکھے جنہیں خنجر کی ناہنجار چمک نے موت کے لحظے میں حیوانوں کی صورت کی طرح مسخ کر دیا تھا۔ لیکن میں نظام الدین شامی اقرار کرتا ہوں کہ ان بیس ہزار کے چہروں کے متعلق میں نے کچھ نہیں لکھا۔ حالانکہ میں بھی اسی شہر حلب کا رہنے والا ہوں۔ کیونکہ امیر صاحب قراں نے بیس ہزار کو موت دی اور مجھے زندگی دی، اس لیے کہ میں امیر کی ظفر یابی کی داستاں لکھوں، لیکن جب میں حلب کے قلعے کو یاد کرتا ہوں، اپنے بلاد اپنے شہر کے حصار کو، تو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شیطان میرا گلا گھونٹ رہا ہے اور میرا گلا کسی طرح گھٹ نہیں چکتا۔ کیونکہ اپنے بچپن سے مجھے یہ حصار یاد ہے۔ جو ایک سنگلاخ چٹان پر بنا ہوا تھا اور جہاں کہیں ڈھلوان مٹی تھی وہاں اسے اینٹوں سے چن دیا گیا تھا۔ میرے حصار کی بلندی سنگین تھی۔ ڈھلوان کے نیچے خندق تھی اور خندق سے لامتناہی سیڑھیاں شروع ہوئی تھیں۔ اس کے بعد پہلا دروازہ آتا تھا جو حصار کا نہیں چٹان کا دروازہ تھا۔ اس کے برجوں پر کوئی سو سال تک ترک اور شامی افرنگ کے صلیبیوں سے اور افرنگ کے صلیبی ترکوں اور شامیوں سے لڑ چکے تھے اور پھر لامتناہی سیڑھیوں کے بعد حصار کا اصلی دو منزلہ دروازہ تھا۔۔۔۔۔۔ اور دروازے کے قریب ایک چوکور مینار اونچا کھڑا تھا جیسے

خالد بن ولید سے بہت پہلے رومیوں نے بنایا تھا۔۔۔

میں اسی سوچ میں تھا اور محو تھا۔ شاید میرے چہرے پر رنج والم کے بڑے گہرے آثار ہوں گے۔ میں اپنے آنسوؤں کو ضبط کر رہا تھا لیکن اگر میری صورت پر غم کا غبار تھا تو یہ میری کوشش کے باوجود تھا اور اس عالم میں اپنے تاتاری ساتھیوں کے قہقہے سے میں یک لخت چونک پڑا اور میں نے ہنسنے کی کوشش کی۔

میرے میزبان الحاج امیر سیف الدین نے بڑے زور کا قہقہہ لگایا۔ اس نے کہا "میرے ساتھیو۔ ہمارا یہ مہمان نظام الدین شامی بڑا سخت جان ہے۔ جب امیر صاحب قران نے بغداد فتح کیا تو یہ پہلا آدمی تھا جو فصیل سے اترا اور اس نے جان کی امان پائی، لیکن جب امیر صاحب قران نے حلب کے حصار کا محاصرہ کیا، تو یہ پھر حلب کے حصار میں محصور تھا"

اور اس کے بعد منگلی بوغا نے لکڑی کا چمچہ میری طرف بڑھا دیا، جو ضیافت کے دسترخوان کے اطراف گردش کر رہا تھا، میری باری آئی تو میں نے چمچہ بھر روغن اور بادام سے تربتر شوربہ پیا اور چمچہ اپنے بائیں ہاتھ کی طرف بڑھا دیا۔

لیکن امیر سیف الدین پر سرور کا عالم طاری ہو رہا تھا۔ شام سے وہ بجائے کومیس کے جس کا وہ عادی تھا، لبنان کے میووں کی بنی ہوئی فرنگی شراب پی رہا تھا جسے اس علاقے میں صلیبیوں نے رائج کر رکھا تھا اور ان پر خدائے تعالیٰ کا عذاب نازل ہو۔

امیر سیف الدین نے الف لیلے کے راویوں کے لہجے کی نقل کرتے ہوئے کہا "یا نظام الدین شامی۔ تم جو آج اس قدر ملول ہو اور محزون ہو گئے ہو، عزازیل تمہاری گردن پر سوار ہے، جیسے تمہارے کانوں میں صور اسرافیل پھونکا جا چکا ہے، تمہارے اس ملال میں ضرور کچھ نہ کچھ بھید ہے۔ ضرور یہ کسی حلبی دوشیزہ کا غم ہے، جو تمہارے سفید گنجے سر اور تمہاری حنائی داڑھی کو اپنی انگلیوں سے مروڑتی ہوگی۔۔۔۔" اور جب تاتاری ایک قہقہہ لگا چکے اور ایک نے میری پشت پر زور سے ایک ہاتھ جمایا۔ مزاحاً تو امیر سیف الدین نے اسی انداز سے کہا "نظام الدین ہمیں بھی اس حسینہ، اس شبینہ، اس لیلے، اس لبنیٰ، اس محبوبہ، اس مطلوبہ، اس قتالۂ عالم کا نام بتاؤ، تاکہ ہم اسے تمہارے لیے حلب کی گلیوں سے ڈھونڈ لائیں۔"

میں نے اپنے دل میں کہا: شاید اس کا سر لیتے آؤ۔ سروں کے مینار سے۔"

اور اس وقت مجھے خیال آیا، ایک داستان کا جو میں نے قاہرہ کی گلیوں میں سنی تھی۔ اس زمانے میں قاہرہ کے طعام خانوں میں الف لیلے و لیلیٰ کی ہزار کہانیوں کا بڑا چرچا تھا، جن میں ایک سندباد جہازی کی کہانی

تھی جس نے سات سفر کیے اور ہر سفر میں ایک نئے ملک میں گیا اور ایک نئی مصیبت سے دوچار ہوا۔ میں ابھی تک اپنے ہی ملک میں تھا، مگر ایک پیر تسمہ پا کی ٹانگ تھی کہ میری گردن کو جکڑے ہوئے تھی اور میں نے اپنے دل میں کہا کہ اگر زندہ رہنا ہے تو عقل کی تلوار کو تیز کر۔

تاتاریوں کے قہقہوں کی میں نے پروا نہیں کی۔ سب کی طرح میں نے اپنی انگلیاں گرم گرم چربی دار گوشت میں گاڑ دیں جو بادام اور پستوں اور دوسری مغزیات میں دفن تھا۔ جس سے لونگوں کی خوشبو آ رہی تھی اور میں نے امیر سیف الدین سے کہا۔

"خدا کی رحمت ہو امیر سیف الدین پر۔ میں نے ایسا لذیذ گوشت بہ اپنی عمر میں کبھی نہیں کھایا اور یا امیر سیف الدین جس طرح آپ نے میری محبوبہ کی تعریف کی۔ اُسے لیلیٰ اور لبنیٰ اور بثینہ سے تشبیہ دی تو مجھے کچھ کچھ شک یہ ہوتا ہے کہ عنفوانِ شباب کے زمانے میں جب آپ حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے تھے تو وہاں سے نجد بھی گئے اور مجنوں اور قیس عامری اور جمیل کی خلعت پہن لی کیونکہ آپ ماشاء اللہ سے زندہ دل نوجوان ہیں۔"

اب تاتاری ساتھیوں نے میرے ساتھ اپنے میزبان پر قہقہہ لگایا اور اس طرح امیر سیف الدین بھی خوش دلی سے ہنس پڑا۔

اور تب گفتگو کا موضوع بدلنے کے لیے میں نے کھنکار کے کہا: "امیر سیف الدین۔ اللہ تعالیٰ نے امیر صاحب قراں کے امیروں میں آپ کو کئی لحاظ سے ممتاز کیا ہے۔ وہ عزیز ہے اور اس نے آپ کو عزت دی وہ شکیل ہے اور اس نے آپ کو وجیہہ شکل و صورت عطا کی۔ وہ عقیل ہے اور اس نے آپ کو فراست اور ذکاوت بخشی اور کئی لحاظ سے اس نے آپ کو فضیلت دی۔ آپ کو امیر صاحب قراں کے پہلے شاہزادے مرزا جہانگیر کا ہم سبق، ہم رکاب، ہم پیالہ، ہم نوالہ بنایا۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

میں نے دیکھا کہ جب میں نے جہانگیر کا ذکر کیا تو امیر سیف الدین نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور اس کی آنکھوں سے تمسخر کی جھلک رخصت ہو گئی۔ میں کہتا گیا۔

"آپ کو عزت بخشی، دولت بخشی، شجاعت بخشی، آج میں آپ کے دسترخوان پر آپ کا نمک کھا رہا ہوں اور خوش ہوں۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

امیر سیف الدین نے دفعتاً بات کاٹ کے مصنوعی عربی بلاغت کے ساتھ کہا: "یا نظام الدین شامی کیا فرما رہے ہیں۔ یہ سارا نمک خدائے ذوالجلال کا بنایا ہوا ہے، جسے اس نے کچھ ہمیں کھانے کے لیے عطا کیا

کچھ مسبو یوں کے چہروں پر تقسیم کر دیا تاکہ ہم ان کی طرف اس طرح مائل ہوں جیسے اچھے کھانے کی طرف اور میں اور آپ سب امیر صاحب قراں کے نمک خوار ہیں اور کسی کے نہیں ۔

"سچ ہے۔ سچ ہے " تاتاری مہمانوں نے کہا۔

میں نے کہا : یا امیر سیف الدین یہ آپ کی بلند حوصلگی ہے۔ یہ شاہزادہ جہانگیر کے ساتھ کا اثر ہے کہ رحمت براں تربت پاک باد۔ یا امیر سیف الدین امیر صاحب قراں نے مجھے آپ کے سپرد فرمایا ہے کہ میں ایک ظفر نامہ کی صورت میں امیر صاحب قراں کی عالمگیر فتوحات کا حال لکھوں اور آپ میری مدد کریں۔ ایک مسئلہ جو مجھے پریشان کر رہا ہے یہ ہے کہ امیر صاحب قراں اور امیر حسین میں اتنی محبت تھی، اتنی دوستی تھی، اعزیزداری تھی پھر یہ کیا غضب ہوا کس طرح منافرت بڑھی، کس طرح اس کا انجام جو ہونا تھا وہ ہوا۔ یا امیر سیف الدین کیا محض اتنی ہی بات تھی جیسے شیخ سعدی شیرازی نے یوں بیان کیا ہے کہ دو سلطان در اقلیمے نہ گنجند :

میری طرح اور سب تاتاری سردار ہمہ تن گوش بن کے امیر سیف الدین کا جواب سننے لگے اور امیر سیف الدین جو اس سے پہلے حجاز اور مصر اور شام اور عراق کی سرزمینوں سے گذر چکا تھا، اس وقت الف لیلہ ولیلہ کے سحر سے محفوظ نہیں تھا۔ کچھ شراب کے اثر سے، کچھ تصنع سے وہ معمولی سی بات بھی اس طرح بیان کرتا تھا گویا یہ ایک معمہ ہو اور ہر تجربہ یوں ظاہر کرتا تھا گویا یہ کوئی عجوبہ ہو۔

یا نظام الدین شامی، یا میرے رفیق لوغایان و بہادران۔ امیر حسین اور امیر تیمور صاحب قراں کی مخالفت کا قصہ اس زمانے کا ہے جب میں کم سن اور کم شعور تھا لیکن جو کچھ میں نے دیکھا اور جو کچھ میں نے سنا ہے وہ ایسا ہے کہ سوئی کی نوک سے آنکھوں کے پپوٹوں کے اندر تحریر کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

یہ کہ اے فاضل و کامل مرد شامی میں نے دیکھا ہے کہ اس سرائے فانی میں جب کوئی واقعہ ہونے والا ہوتا ہے تو وہ حکیم وہ خالق جس نے مجھے اور تجھے پیدا کیا ہے اس کا کوئی نہ کوئی سبب تصنیف کرتا ہے اور یہی سبب تقدیر ہے۔ یاد ہے جب چغتائیوں سے لڑائی ہو رہی تھی، تو تغلق تیمور کے انتقال کی خبر آئی اور الیاس خواجہ اوغلاں کو اپنے باپ کا تخت سنبھالنے کے لیے ماوراء النہر سے مراجعت کرنی پڑی۔ نہ یہ واقعہ پیش آتا نہ اتنی آسانی سے اہلِ سمرقند چغتائیوں کے خلاف بغاوت کرتے۔ نہ امیر حسین کو اتنی آسانی سے ماوراء النہر پکے ہوئے پھل کی طرح مل جاتا۔ نہ اس میں اتنی لالچ ہوتی، نہ اس سے اور تیمور گورگاں سے مخالفت ہوتی اور نہ وہ ہوتا جو ہوا، لیکن جو کچھ ہوا وہ اس قابل ہے کہ لوحِ دل پر عبرت کے قلم سے منقش کیا جائے "

نبہ لک۔ بے شک: اور میں نے نصرانی شراب کا ساغر الحاج امیر سیف الدین کی جانب بڑھا دیا۔

امیر سیف الدین نے اپنی پتلی سی داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ شراب کا جام اٹھا کے سر ہلایا اور افغانوی انداز ترک رکے کہا: میں تمہیں بتاؤں امیر حسین کے زوال کا باعث کیا تھا۔ ایک محض ایک۔ اوہ۔ اوہ۔ اوہ۔ وہ شیخ سعدی کی فرمائی ہوئی بات غلط تھی کہ دو سلطان در اقلیمے نمی گنجند۔ یہ بات نہیں تھی۔ امیر تیمور کو سلطان حسین کا بنا ہونا، چنگیزی ہونا، سلطان ہونا منظور تھا۔ قطعاً منظور تھا۔ وعدہ کرتا ہوں بالکل منظور تھا، لیکن سلطان حسین کی فطرت میں داد و دہش کو دخل نہیں تھا۔ دار و گیر کو دخل تھا اور یہ ہم تاتاریوں، برلاسوں، جلائروں کا عسکری رہ ہے۔ دار و گیر۔ دار و گیر۔ لوٹتے جاؤ، جمع کرتے جاؤ، لوٹتے جاؤ اور جب پرائے نہ ہوں دا اپنے سہی۔

اے مولانا نظام الدین شامی، آپ کے اس شہر حلب میں بڑے باصفا آئینے بنتے ہیں لیکن جب آئینوں میں بال پڑ جائے، ذرا سی بھی درز آ جائے، تو صورت صاف نظر نہیں آتی۔ یہی حال دلوں کا ہوتا ہے انسانوں کے دلوں کا۔ اسی طرح دلوں میں کدورت در آتی ہے، جس سے ایک دوسرے کی شکل صاف نظر نہیں آتی اور یہی حال سلطان حسین اور امیر صاحب قراں کا ہوا:

اور پھر امیر سیف الدین نے مزاحیہ تصنع سے افسانہ خوانوں کی نقل شروع کی۔

جب بہار کی فصل آئی اور سمرقند کے باغوں میں لالوں کے تختے کھلے، جب اناروں کی ڈالیاں سرخ سرخ پھولوں سے لد گئیں، جب گلاسوں کے درخت سفید سفید اور گلابی گلابی پوشاکوں میں عروسوں کی طرح جگمگا اٹھے تو سبزوار کے سربداروں نے سمرقند میں سر اٹھایا۔ یہ سربدار بڑے سر پھرے لوگ ہوا کرتے تھے۔ اپنا نام ہی انہوں نے یہ رکھا تھا کہ ان کا سر گویا پھانسی پر لٹکا ہوا تھا۔ بڑے بگڑے دل لوگ تھے، مگر بڑے ظالم، بڑے سفاک اور سمرقند میں تین سربدار تھے جنہوں نے قیامت برپا کر رکھی تھی، چغتائیوں کی حکومت سے کم شہر آشوب نہ تھا اور ان تین سربداروں کے نام میرے ان تاتاری مہمان سرداروں کو یاد ہوں گے۔ ایک تو مولانا زادہ سمرقندی تھا۔ یاد ہے اس کا ٹھنگنا سا قد تھا اور چھوٹی چھوٹی چمک دار آنکھیں، پھیلی پھیلی ناک۔ دوسرا مولانا خردک بخاری تھا۔ اس کی داڑھی بڑی تھی، مگر قد مولانا زادہ سے بھی چھوٹا تھا اور اسی لیے وہ خردک کہلاتا تھا۔ کبھی کبھی اسے خردک بھی کہا کرتے تھے، کیونکہ عقل بھی اس کی ذرا چھوٹی سی تھی، مگر جتنی بھی تھی شر ہی شر سے لبریز تھی اور تیسرا ابوبکر نداف تھا جس نے نداف چھوڑ کے سپہ سالاری شروع کی تھی۔ سمرقند کے کسی گھر کی آبرو

ان تین مردکس کے ہاتھوں محفوظ نہ تھی۔ کسی کا مال و اسباب محفوظ نہ تھا۔" تاجروں نے چین سے فرنگ جانے کا راستہ بدل دیا تھا اور سمرقند کے سید اور خواجے یہ کہتے تھے کہ ان سرداروں قزاقوں سے تو ایاس خواجہ اوغلان اور بکی جوک کے چغتائی مغل ہزار درجے اچھے تھے۔

"سلطان حسین نے سمرقند کا رُخ کیا تو اہلِ سمرقند نے فصیل کے دروازے کھول دیے۔ تینوں سردار گرفتار ہوئے۔ خزدک بخاری کو بڑی اونچی سی پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ جہاں سے اس کا چھوٹا سا قد اور لمبی سی داڑھی بڑی مضحکہ خیز معلوم ہوتی تھی۔ ابوبکر نداف کو شہر کے ندافوں کے ہاتھوں اتنا پٹوایا گیا کہ وہ قیمہ قیمہ ہوگیا اور اس کا قیمہ چیلوں اور گدھوں کے حوالے کیا گیا، لیکن مولانا زادہ سمرقندی کی امیر تیمور، صاحب قران نے سفارش فرمائی۔ کیوں؟ یہ مجھے معلوم نہیں اور نہ اس زمانے کے حالات مجھے ٹھیک ٹھیک یاد ہیں۔"

"لیکن مجھے یاد ہے کہ جہاں مصیبت نے سلطان حسین اور امیر تیمور کو رفیق بنا رکھا تھا، سلطنت اور امارت نے انہیں ایک دوسرے سے دور کرنا شروع کیا۔ جب سلطان حسین نے سرداروں کو گرفتار کیا تو ان کی دولت پر بھی قبضہ کر لیا اور اس کے بعد سرداروں کی بہ صفت سلطان حسین کی سیرت میں حلول کرتی گئی کہ دولت جس قدر ہو، جتنی ہو، کافی نہیں۔ سلطان حسین کی لالچ بڑھتی گئی۔ جن سرداروں نے ان کے لیے سر کی بازی لگائی تھی۔ ان سے متنفر ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ ہم لوگوں کی باری آئی۔ مجھ سے کہا گیا کہ جو کچھ تمہارے پاس ہو محصل کے حوالے کر دو۔ اسی طرح آق بوغا، ایلچی بہادر، دولت شاہ بہادر اور امیر تیمور گورگان کے دوسرے جانباز سردار قید کر لیے گئے کہ اتنا اتنا محصول ادا کرو۔ میرے رفیق محصول میرے پاس کہاں سے آتا۔ آق بوغا اور ایلچی بہادر چغتائیوں کے ہاتھوں لٹ چکے تھے۔ ہماری زمینیں کئی سال تک دشمنوں کے ہاتھ رہ چکی تھیں۔ ہمارے دہقانوں کے پاس بونے کے لیے بیج تک نہ تھے، ہمارے چرواہوں کے پاس مویشی تو کہاں مویشیوں کی کھال تک نہ تھی اور اس پر جب ہم نے امیر صاحب قران سے فریاد کی تو امیر تیمور نے سلطان حسین سے عرض کی کہ میرے امیروں کے پاس باقی کیا رہا ہے کہ وہ محصول ادا کریں۔ ان کے پاس جو کچھ تھا وہ آپ پر نثار کر چکے یا چغتائیوں نے لوٹ لیا یا غارت کر دیا۔ اگر حکم ہو تو ان کی طرف سے میں محصول ادا کر دوں۔

اس پر بھی سلطان حسین نے محصول معاف نہ کیا اور امیر تیمور کو ہماری طرف سے محصول ادا کرنا پڑا۔ اُن کے پاس بھی جمع خزانہ کہاں سے آتا۔ یا مولانا نظام الدین جو میں عرض کرنے والا ہوں وہ حقیقت ہے اور وہ حقیقت ایسی ہے کہ صحیفۂ دل پر بصیرت کی روشنائی سے تحریر کی جائے۔ امیر تیمور گورگان نے ہم لوگوں کے ذمہ جو محصول تھا۔ اس کو

اکرنے کے لیے اپنی بیوی آغائے معظمہ اولجائی ترکان آغا کا سارا زیور، سارا زر و جواہر، جملہ گوشوارہ و دستیارہ سلطان حسین کے نذر کر دیا، اور سلطان حسین جس کو اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ اس کی اپنی بہن اولجائی ترکان آغا کا زیور و گوشوارہ ہے اس زیور کو لینے سے بھی انکار نہ کر سکا اور اس واقعہ کے بعد اولجائی ترکان آغا کا دل ٹوٹ گیا اور انہیں اپنے بھائی سے نفرت سی ہو گئی۔ سلطان حسین نے یہ نہ جانا کہ حرص اور دُون ہمتی اور سرداری اور بادشاہی ایک جگہ جمع نہیں ہوتے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

ایک لمحہ کے لیے امیر سیف الدین نے دم لیا اور دونوں ہاتھوں سے نصرانی شراب کا ساغر اٹھایا۔

تب پر میں نے کہا۔

حکیموں نے کہا ہے کہ کوئی مقام ایسا نہیں جہاں بخل ہو اور حسرت اس کے ساتھ ہم آغوش نہ ہونے پائے اور کوئی دروازہ ایسا نہیں کہ طمع اس سے ہو کے گذرے اور ذلت و خواری چاکروں کی طرح اُس کے ساتھ ساتھ نہ جائیں۔

تاتاری سرداروں نے خوش ہو کے سر ہلایا اور امیر سیف الدین نے کہا: "القصہ جتنا کچھ محصول امیر صاحب قراں ہم لوگوں کی طرف سے ادا کر سکتے تھے، ادا کیا لیکن تین ہزار دینار پھر بھی باقی رہ گئے۔ اس رقم کے بدلے امیر تیمور نے اپنے خاصے کے گھوڑے پیش کیے۔ معلوم نہیں کہاں سے سلطان حسین کے دل میں عزتِ نفس کا شرارہ بھڑک اٹھا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ گھوڑے امیر تیمور کو جان سے زیادہ عزیز ہیں۔ اس نے یہ گھوڑے واپس کر دیے اور کہا کہ میں سالی سرائے جاتا ہوں۔ مجھے زرِ نقد کی ضرورت ہے جو تین ہزار دینار مجھے ادا کرنے ہیں وہ ادا کر کے میری مدد کرنا کہ میں یہ پیشگی زرِ مہر کی صورت میں خوارزم بھیجوں۔ کیونکہ سلطان حسین صوفی کے عزیزوں میں ایک چہاردہ سالہ دختر نیک اختر ہے جس کا نام خوان زادہ ہے، میں چاہتا ہوں کہ اسے اپنے نکاح میں لاؤں۔

[اور دلشاد آغا نے انہیں خوارزمیوں سے جنگ کے دوران میں اسے اپنا گھوڑا دیا تھا اور اپنی جان ہلاکت میں ڈال دی تھی]

اس پر امیر صاحب قراں نے پس و پیش کی اور عرض کی کہ مال جمع کرنے کی تو تدبیر کرتا ہوں، لیکن آپ کی ہم رکابی سے جدا نہ ہوں گا۔ آپ کے ساتھ سالی سرائے چلوں گا۔ کیونکہ جب کوئی رفیق اپنے سلطان کی نظروں سے دور ہوتا ہے تو دشمنوں کو اس کی مجال ہوتی ہے کہ موقعہ پا کے جھوٹ کو سچ کا لباس پہنائیں اور سلطان

کا دل اس کے رفیق کی طرف سے پھیر دیں۔ اس کی مجھ میں طاقت نہیں اور اگر مجھے ہم رکابی اور مصاحبت کی اجازت نہیں ملتی تو پھر یہ اجازت ہو کہ یہ جا کر خانۂ بیت اللہ کا ارادہ کرے اور وہاں اپنے سارے گناہوں کی تلافی میں باقی عمر گزار دے۔ سلطان حسین نے اس کی بھی اجازت نہ دی۔ خود سالی سرائے کا رُخ کیا اور شہر سبز کی سرداری کا پروانہ امیر تیمور گورگاں کے نام تحریر کیا اور ......

جرعہ جرعہ شراب پی کے الحاج امیر سیف الدین خاں نے بڑے رازدارانہ لہجے میں نظام الدین شامی سے کہا۔

" اور .... اور .... امیر موسیٰ والی نخشب کو حکم دیا کہ بہ لطائف حیل امیر تیمور گورگاں کو اسیر کرے "

اور پھر ذرا سرور کے انداز میں سر ہلا کے، قہقہہ لگا کے امیر سیف الدین نے نخشب کا ذکر چھیڑا۔

"جاہِ نخشب، ماہِ نخشب، شاہِ نخشب "

اس پر اس خاکسار ہیچ میرز نظام الدین شامی نے عرض کی۔ سبحان اللہ۔ سبحان اللہ یا امیر سیف الدین آپ کی تلوار میں ذوالفقار کا سا جلال ہے، لیکن آپ کی زبان میں وہ فصاحت وہ شیرینی ہے کہ راویوں کا کمال اس کے آگے زوال آمادہ ہے، لیکن شرح اس اجمال کی اور تفصیل اس احوال کی عنایت ہو تا کہ میں اسے قلمبند کر سکوں۔

اور مجھ کم بخت نے اپنی کتاب میں جو کچھ لکھا، وہی لکھا جو امیر تیمور گورگاں چاہتا تھا کہ میں لکھوں۔]

بڑے پُر اسرار انداز میں امیر سیف الدین نے اپنے ہونٹوں کو لفرانیوں کی انگوری شراب سے تر کیا اور اپنی داڑھی پہ ہاتھ پھیر کر الحمد اللہ کہا اور پھر یوں گویا ہوا۔

" لوغایان و بہادران۔ تم میں سے بہتوں نے نخشب کو دیکھا ہے یہ وہی حصار ہے جسے ہم کم علم تورانی قرشی کہتے ہیں اور جہاں ہمارے پرانے رفیق امیر موسیٰ نے ہم سے الگ راستہ اختیار کیا جب ہم سب نے امیر تیمور گورگاں کی رفاقت کا عہد باندھا تو اس نے بجائے نکلتے سورج کے ڈوبتے چاند سلطان حسین جلائر کا ساتھ دیا اور لوغایان و بہادران یاد رہے کہ بوڑھا امیر موسیٰ بڑا حسن پرست تھا۔ اس کا جیسا حرم شاید ہی ہم میں سے کسی نے جمع کیا ہو۔ ختن کے غزال اور سُغد کی بلائیں، سرخ بالوں والی تفلیس کی مہ لقائیں، نیلی آنکھوں والی یونانی کنیزیں سب اس پیر مرد کے پاس جمع تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ حکیم جالینوس کی لکھی ہوئی

کوئی قرابادین اسے کہیں لوٹ میں مل گئی تھی. جس میں بڑی نادر نادر دواؤں اور حیرت انگیز اکسیروں اور طلاؤں کے نسخے تحریر تھے. دوسری روایت یہ ہے کہ وہ محض بوالہوس تھا. حسینوں کو اپنے پنجرے میں بند دیکھ لیتا اور خوش ہو لیتا، لیکن بوڑھے شہباز کے پنجے میں طاقت نہیں تھی. واللہ اعلم بالصواب.

عبرت کی داستان یہ ہے کہ سلطان حسین کا خون سفید ہو گیا اور اس نے سلطان موسیٰ کو حکم دیا کہ بلطائف الحیل امیر گورگان کو قید کر لے اور اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ اے بوغایان و بہادران آپ سب کو معلوم ہے.

اور اس پر بوغایان اور بہادروں نے سر ہلایا. "ہاں امیر سیف الدین:

تمہیں یاد ہے کہ جب امیر موسیٰ کے دستے ہم پر جھپٹتے ہم کوہ و دشت و دریا میں منتشر ہو جاتے اور پھر سمٹ کر اس طرح حملہ کرتے جیسے فاختاؤں کے گروہ پر شاہین. یہاں تک کہ امیر موسیٰ کو معلوم ہو گیا کہ کمند اس کے نہیں امیر تیمور کے ہاتھ میں ہے اور جب گلا گھٹنے لگا تو وہ نخشب کی چار دیواری میں جا چھپا.

"اور نخشب میں اس کا دم گھٹنے لگا."

امیر سیف الدین نے قہقہہ لگایا. میں نے عرض کی "یا امیر سیف الدین تفصیل اس اجمال کی مرحمت ہو."

بس پر امیر سیف الدین نے کہا.

اس سال گرمی سارے توران میں اس غضب کی تھی کہ نہ روئے ارض پر کبھی دیکھی گئی نہ سنی گئی عزرائیل علیہ السلام نے امیر حسین کے زوال کے لیے جہنم کے طبق زمین پر روشن کر دیے تھے. جھاڑیوں میں تیتر بھیان ہو جاتے تھے. اڑتے ہوئے پرندے کباب بن کر گرتے تھے اور نخشب پر تو خاص عذاب نازل تھا. امیر موسیٰ حصار میں محصور تھا. اس کی حرم سرا میں اس کے حرم کی نازنینیں محصور تھیں. ہر ایک کا گرمی سے برا حال تھا سرخ بالوں والی تغلبی مہ لقائیں جو قپچاق کے مغرب کے دیاروں سے آئی تھیں، گرمی سے غش کھا جاتیں. ایک کا دماغ چل گیا دوسری نے اپنی جان شیطان کے سپرد کی. نیلی آنکھوں والی یونانی کنیزیں دن بھر حوضوں میں ننگی ہو کے جا بیٹھتیں، تین خواجہ سرا ان کو نظر بھر کر دیکھنے کے جرم میں قتل کیے گئے. ختن کے غزال گرمی سے بے حال تھے کبد کی بیلاؤں کی زبانیں نکلی پڑتی تھیں. امیر موسیٰ ان کے قریب پھٹک نہ سکتا تھا. کیونکہ گرمی سے سب پسینے میں شرابور تھیں اور پسینے کی عفونت عود اور عنبر اور عبیر اور مشک پر بھاری تھی. ایک چینی سوداگر جو فرنگ کو چلے ریشم کا سامان لے جا رہا تھا. ہمارے ہاتھ پڑا اور اس نے نخشب کی گرمی کی یہ سرگزشت امیر صاحب قران

سے بیان کی اور اس پر امیر صاحب قران نے اپنے خیمے میں ہم سب کو طلب کیا، مرحوم ایلچی کرا دعا کو برلاس کو مجھ اور معاودہ اور آق بوغا کو اور کہا: یہ بڑا ستم ہے کہ ہم سخت جان سپاہی آمودریا کی ٹھنڈی وادیوں اور بدخشاں کے خشک پہاڑوں کی ہوا کھائیں اور ہمارے ڈر سے امیر موسیٰ کے حرم کی نازنین اور حسین عورتیں حرم سرا کی بند دیواروں میں جھلسیں۔ میرا ارادہ ہے کہ امیر موسیٰ اور اس کے حرم کی دلنشیں عورتوں کو چشموں کی ٹھنڈی وادیوں کی سیر کرائی جائے۔

ہمیں جو کاروان ہرات سے آتے ملے ہم نے ان کی خاطر مدارات کی۔ امیر گورگاں نے جتنا مال خریدا اس سے دوگنا انعام دیا۔ کاروان کے تاجروں کے سامنے ملک ہرات کے سفیروں کو باریاب کیا اور ہرات آنے کی دعوت قبول کی۔ تاجر بہت خوش تھے۔ ان کے کاروان نے نخشب کا راستہ سنبھالا اور ان کی نظروں کے سامنے ہم ہرات کے راستے پر ہو لیے۔ ہمارے گھوڑے مرغاب کے کنارے کنارے دونوں طرف جنوب کی جانب بڑھنے لگے اور کاروان کے تاجروں نے امیر موسیٰ کو جا کے یہی اطلاع دی کہ امیر تیمور گورگاں اور اس کا لشکر ملک ہرات کی دعوت پر مرغاب کے کنارے کنارے ہرات اور بامیان کی سمت گرمیاں گزارنے جا رہا ہے۔

بوغا وں نے امیر تیمور کی فراست کی داد دی اور کہا: "ماشاءاللہ"

امیر سیف الدین نے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرا۔ خادموں کو دسترخوان بڑھانے کا اشارہ کیا اور سب سے پہلے منہ میں انگلی ڈال کے دانت صاف کیے۔ کلی کی، غرارہ کیا، اور ترکی رومال سے ہاتھ پونچھ کر یوں گویا ہوا۔

جب آفتاب عالم تاب نے قزل قسم کی لال پہاڑیوں میں منہ چھپایا، تو ہم نے اپنے گھوڑوں کی لگامیں کھینچیں اور ان کا رُخ موڑ دیا۔ ہمارے جاسوسوں نے آ کے خبر دی کہ تاجروں نے جو دیکھا تھا امیر موسیٰ سے عرض کر دیا اور امیر موسیٰ اپنے حرم کی سنہرے بالوں والی اور سرخ بالوں والی اور سیاہ بالوں والی۔ دو زلفوں والی ایک زلف والی اور کئی زلفوں والی۔ غزالی چشم والی اور سیاہ پتلیوں والی اور نیلی آنکھوں والی، چپٹی ناک والی اور یہودی ناک والی حسیناؤں کے جم غفیر کے ساتھ سرداب کے نخلستان میں عشرت کی داد دے رہا ہے نخلستان بہشت بن چکا ہے جہاں حوریں بخارا اور توقند کے قالینوں پر دراز ہیں اور دودھ اور شہد کی نہریں بہہ رہی ہیں جوہر و ہیں مخمور ہیں، عورتیں اس ٹھنڈے چشمے کے قریب نخلستان اور بادیہ کی ٹھنڈی ہوا سے مسرور ہیں۔ قریب کے نخلستان میں امیر موسیٰ کے دوسرے ساتھی ہیں اور کاشی کے جھلستے ہوئے در و دیوار امیر صاحب قران پر نثار ہونے کے انتظار میں سرِ راہ ہیں۔

ہم نے تیزی سے یلغار کیا۔ امیر صاحب قراں کا قدم سب سے تیز تھا۔ انہوں نے جاکو براس کے ساتھ پل کے سائے سائے چھپ کر خندق کو پار کیا۔ میرے خیال میں امیر صاحب قراں نے اس روز ذرا زیادہ کومیس پی لی تھی۔ سرور کے عالم میں انہوں نے دروازے پر دستک دی۔ لیکن امیر موسیٰ کا بیٹا اور محصور دستہ یا تو گری سے بے ہوش تھے، یا غفلت کی نیند سو رہے تھے۔ ان کے سروں پر قضا کھیل رہی تھی۔ امیر صاحب قراں نے فصیل کا معائنہ کیا، رخنہ کے لیے مقامات کی نشان دہی کی اور دوبارہ خندق پار کی۔ اب کے جاکو براس آتی بوغا، میں اور بہت سے جانثار ان کے ساتھ تھے۔ ہم نے کمندیں لگائیں، دیواروں پر چڑھ گئے۔ محصور دستے میں سے کچھ نیک بختوں نے اطاعت کے لیے گھٹنے ٹیک دیے اور اپنے میان سے تلواریں نکال کر امیر صاحب قراں کے قدموں پر ڈال دیں، جو کم بخت لڑے انہیں ہم نے تہ تیغ کیا جو قلعہ میں مقابلے کے لیے جمع ہوئے ان پر ہم نے آتش نفط برسائی اور انہوں نے بھی اطاعت کر لی۔ ایک رات میں نخشب اس طرح ہمارے ہاتھ آیا جیسے کوئی کھیل کھیلتا ہے۔ امیر موسیٰ کے حرم کی کچھ معتوب عورتیں تھیں جنہیں وہ اپنے ساتھ سرد آب کے نخلستان نہیں لے گیا تھا۔ امیر صاحب قراں نے اُن عورتوں کو خواجہ سراؤں اور مجرب طلاؤں کی شیشیوں کے ساتھ امیر موسیٰ کے پاس اسی رات بھجوا دیا اور اس طرح اُسے نخشب کے چھن جانے کا پتہ چلا اور بہت جلد سلطان حسین کو بھی اس کا علم ہو گیا۔"

پھر الف لیلیٰ کے افسانہ گو کے انداز میں امیر سیف الدین نے مجھے مخاطب کیا: "اے پیرِ مردِ شامی۔ یہ داستان عجیب ہے لیکن سچ ہے کیونکہ کچھ واقعات ایسے ہوتے ہیں جو انسانوں سے زیادہ عجیب ہوتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں چاہِ نخشب اور ماہِ نخشب کا افسانہ افسانہ ہے اور یہ حقیقت ہے ......"

میں نے عرض کی: "یا امیر سیف الدین ایک تو امیر صاحب قراں کا زمانہ اور پھر آپ کا سحر بیان۔ اس کا لفظ لفظ میں کبھی نہ فراموش کروں گا۔"

لیکن داستان سرائی سے ابھی امیر سیف الدین کا جی نہیں بھرا تھا اس نے دیبا کے گاؤ تکیہ کا سہارا لگا کے پاؤں پھیلا دیے: "لیکن واضح رہے اے مولانا نظام الدین شامی کہ مقنع کے ماہِ نخشب کا افسانہ روایت کے لحاظ سے کمزور سہی، آنکھوں دیکھی بات نہ سہی، لیکن دلچسپ ہے جیسا یاد ہے۔ اسی رات کو جب ہم نے نخشب فتح کیا۔ امیر صاحب قراں کا جی چاہا کہ تازہ کومیس پی جائے ہمارے پاس جو کومیس تھی وہ کئی دن پرانی تھی۔ میں نے امیر صاحب قراں سے عرض کی۔ نخشب میں قراسرائے کی کومیس مشہور ہے۔ تاشقند تک اس کی شہرت ہے اور امیر نے گھوڑے کو ایڑ لگا کے کہا چلو۔ ہمارے سپاہی شہر میں لوٹ کھسوٹ کر رہے تھے اور اس فتح کے بعد

امیر کا وہی حال تھا جو اکثر ہوا کرتا ہے، جیسے کوئی شطرنج کی بازیاں جیتتے جیتتے اکتا جاتا ہے اور لات مار کے بساط بکھیر دیتا ہے:

اور امیر سیف الدین نے قالین کے فرش پر اس طرح لات ماری گویا وہ کسی بساط کو بکھیر رہا ہے۔

پھر امیر سیف الدین نے کہا: "سرائے میں بھی ہمارے سپاہی مسافروں کو لوٹ رہے تھے۔ امیر صاحب قران کی للکار سن کے ہمارے سپاہی تو کھسک کے نکل گئے۔ میں نے سرائے کے مالک کی کمر پہ لات جمائی۔ وہ ڈھیر ہو گیا۔ میں نے کہا امیر تیمور گورگاں کے لیے فرش بچھا۔ راویوں کو بلا۔ تازہ کومیس قدحوں میں بھر بھر کے نکال۔ چشم زدن میں اس نے حکم کی تعمیل کی۔ معلوم نہیں کہاں سے ایک اندھے راوی کو پکڑ لایا، مگر اس کا طرزِ بیان بڑے غضب کا تھا اور اس راوی نے امیر صاحب قران کی فرمائش پر مقنع کے ماہِ نخشب کا قصہ سنانا شروع کیا۔

اور امیر سیف الدین نے آنکھیں بند کر لیں۔ گویا وہ اندھے راوی کے ٹھیک ٹھیک الفاظ یاد کرنے اور دہرانے کی کوشش کر رہا ہے اور پھر اس نے کہا: "اس بد ذات، بدگہر، بد نہاد، بے بصر راوی نے امیر صاحب قران کو مخاطب کر کے حکایت یوں شروع کی تھی .....

اے امیر تیمور صاحب قران، اے سالارِ عساکر فاتحاں۔ پہلے حمد و ثنا اس خدائے ذوالجلال کی جس نے مجھے قوتِ گویائی بخشی۔ بصارت سے محروم کیا، جس نے سکندر و چنگیز کو ظفر یابی بخشی اور بصیرت سے محروم کیا۔ اس روایت کی اصلیت اسی پر روشن ہے، اس حکایت کی حقیقت اسی پر ظاہر ہے۔ کیونکہ وہی علیم ہے، وہی حکیم ہے، وہی خبیر ہے، وہی صاحب تدبیر ہے۔ اسی نے دریا بہائے، پہاڑ اٹھائے، بادل برسائے، انسان بنائے۔ اسی نے انسانوں سے کنویں کھدوا لئے اور اے امیر صاحب قران ایسا ہی ایک۔ کنواں اس شہر نخشب میں بھی ہے جس کی روایت یہ راوی بیان کر رہا ہے، جس کی حکایت میں حکمت کا رمز ہے، جسے جو صاحب فہم ہے، خدا کرے سمجھے، جو ادراک سے محروم ہے خدا کرے نہ سمجھے۔

اے امیر کارداں، امیر گورگاں کنویں کنویں کا بھید الگ ہے۔ چاہ چاہ کی بات اور ہے، ایک ہے چاہِ ذقن جس میں شاعر کا دل ڈوبتا ہے۔ ایک تھا چاہِ بابل جس میں ہاروت اور ماروت کو نظر بند کیا گیا، جو پہلے فرشتے تھے، ایک رنڈی کے فریب میں آ گئے، آنکھ کا دھوکا کھا گئے۔ اس کے ہو بیٹھے، عقل سے ہاتھ دھو بیٹھے اور اس رنڈی پر اس کریم کو رحم آگیا، اسے چمکتا ہوا ستارہ بنا دیا۔ اے میرے آقا چاہِ بابل جھوٹا کنواں ہے۔ کوئی کوئی کنواں سچا ہوتا ہے جیسے چاہِ کنعاں۔ اس میں اللہ کے پیاروں کی تربیت ہوتی ہے، ہدایت ہوتی ہے عجیب شیریں

حکایت ہوئی ہے. چاہِ کنعاں سے ماہِ کنعاں یوسف کو پیغمبری ملی. چاہِ نخشب سے المقنع کا ماہِ نخشب طلوع ہوا، جو اے میرے آقا جھوٹے کنویں کا جھوٹا چاند تھا۔

اے میرے آقا یہ امامِ تلبیس، یہ شاگردِ ابلیس المقنع الکندی ننگِ عرب، شرمِ عجم اس شہر نخشب میں خدائی کا دعویدار تھا. خلق کو اس کے دعوے پر اعتبار تھا. کیونکہ اس چاہِ باطل، اس چاہِ نخشب سے ہر اندھیری رات اس کے اشارے سے ایک چاند طلوع ہوتا اور آسمان پر بلند ہوتا جاتا، فضا بقعۂ نور ہو جاتی، چاندنی کا نور ظہور ہوتا. ارض سے سما تک سفید روشنی پھیلتی. سب اس معجزے سے حیران تھے، دلوں میں ایمان ویران تھے. کوئی کہتا کہ یہ معجزہ ہے، جو صاحبِ ایمان ہوتا اپنے دل میں کہتا کہ یہ شعبدہ ہے، کوئی روایت کرتا کہ مقنع اصل میں بڑا ماہر کیمیاگر ہے، کیمیاگری سے ایک طبق روشن کو زمین اور آسمان کے درمیان معلق کرتا ہے سادی دنیا کو اوہام میں مستغرق کرتا ہے. کوئی کہتا کہ یہ نظر بندی کا کھیل ہے، نظر کا دھوکا ہے. بصارت جھوٹی ہے، بصیرت سچی ہے. غرض مقنع کی شہرت دور دور پہنچی، اس کے دربار میں تاجر آئے، شاعر آئے، سپاہی آئے، درباری آئے، سردار آئے، سربہ دار آئے. اے امیرِ باتدبیر ایک دن اس کے دربار میں ایک حسین جوان آیا. تیغ سے تبر سے، ترکش سے، خود سے، جوشن سے، زرہ سے آراستہ. بلند بالا، اس کی پیشانی پر حوصلے کا ستارہ چمکتا تھا. اس کی آنکھوں میں شجاعت کا شرارہ دمکتا تھا. اس کا نام قرقلمش تھا. وہ قوقند کا رہنے والا تھا، لیکن سج دھج میں تورانیوں سے نرالا تھا. جب مقنع نے اسے اپنے دربار میں دیکھا اور اپنا معتقد پایا تو دل میں یہ خیال لایا. یہ ہے وہ نوجوان جو میری فوجوں کی سالاری کرے گا. یہ وفاداری سے میرے عساکر کی سرداری کر سکے گا، لیکن اس کی وفاداری مکمل ہونی چاہیے اور اس نے سوچا کہ اسے ایک ایسی نازنین طنّاز، محبوبۂ عشوہ ساز سے منسلک کیا جائے کہ پھر یہ نخشب کے دربار سے ہلنے نہ پائے۔

مقنع نے کہا اے نوجوان تو قوقند کا رہنے والا ہے، نوجوان نے کہا ہاں، مقنع نے کہا تو نے اتنے سال خراسان میں گنوائے، نوجوان نے کہا ہاں. مقنع نے کہا پھر تو بغداد گیا جہاں جھوٹا خلیفہ رہتا ہے جس کا علم سیاہ ہے، نوجوان نے کہا ہاں. مقنع نے کہا، پھر تو دمشق آیا، جہاں تو نے ایک نصرانی کنیز خریدی جس کا نام نائلہ تھا اور تجھے اس کنیز سے عشق تھا. نوجوان نے حیران ہو کر کہا ہاں. مقنع نے کہا پھر تجھے لڑائی میں رومی سپاہی انطاکیہ کے قریب پکڑ کے لے گئے اور تو نے چار سال قسطنطنیہ میں گنوائے، جو قیصر کا دیار ہے اور جو دو سمندروں اور دو زمینوں کے درمیان آباد ہے، نوجوان قرقلمش نے حیران ہو کے کہا. ہاں. تجھ پر میرا سب حال روشن ہے۔

اس وقت مقنع کا چہرہ چندا سے شہر قرشی، اس شہر پرشی، اس شہر نخشب، اس شہر منتخب پر چمک رہا تھا تو قلش کی آنکھیں اس کی ضو سے خیرہ تھیں، باطن کی نظریں تیرہ تھیں۔ مقنع نے کہا مجھے سب معلوم ہے کیونکہ میں وہ روح ہوں جو زندہ ہے، میں قوتِ تخلیق ہوں جو تابندہ ہے، یہ ارض و سما میرے ہیں، یہ مرغ و سمک میرے ہیں۔ میں نے تجھے اور تجھ جیسوں کو پیدا کیا ہے۔ اس جنم میں اور اس سے پہلے ہر جنم میں۔ میں نے تجھے جمادی نباتی بنایا، میں نے تجھے حیوان انسان بنایا۔ میں نے تجھ کو اور نائلہ کو حبیب اور محبوب بنایا۔ اس سے پہلے میں نے تمہیں آدم اور حوا بنایا تھا۔ سلیمان اور بلقیس ملکۂ سبا بنایا تھا۔ قیس و لبنیٰ بنایا تھا میں نے تیرے امتحان کے لیے تجھے رومیوں کے ہاتھ قید کیا، پھر ایمان کی شمع تیرے دل میں جلائی اور بغدادِ تیرہ روئیداد سے تجھے اپنی خدمت میں نخشب کھینچ بلایا۔ تیرے ہاتھ کو طاقت تیری تلوار کو تیزی بخشی تاکہ تو اسے عربوں کے خدا عجمیوں کے خدا کے خلاف میری حمایت میں کھینچے۔ جا آج رات میں تیری نائلہ کو تیرے سپرد کر دوں گا۔

اے امیر صاحب قراں یہ نصرانی کنیز نائلہ عجب شعلہ سجاد و پیکر تھی۔ اس کا وطن ابنان تھا۔ اس کی نظروں میں ایک طرح کا وجدان تھا۔ جب اس کا مالک تو قلش رومیوں کے ہاتھ اسیر ہوا اس سے دور ہوا۔ جب کتاب تقدیر میں یہ مذکور رہا، تو یہ اس کے عشق میں حیران و سرگرداں ہوئی، اس کی آنکھوں سے سرشکِ خون جاری ہوا۔ اس پر ایک طرح کا جنون طاری ہوا، اس عالم میں یہ گھر سے باہر نکلی۔ ایک بردہ فروش نے اسے پھر سے اسیر کیا۔ اس کے جنون کا وہی عالم تھا، کیونکہ جنونِ عشق ہجر میں کم نہیں ہوتا، جنوں کا سلسلہ بے وصالِ محبوب برہم نہیں ہوتا۔ اے امیر اس بردہ فروش کے ساتھ وہ بیروت سے دمشق آئی، دمشق سے بغداد آئی، بغداد سے تبریز آئی، تبریز سے ترشیز آئی، ترشیز سے نخشب آئی اور نخشب میں مقنع کے خواجہ سراؤں کو معلوم ہوا ایک ماہِ آسمانِ خوبی، ایک بدر سمائے محبوبی، ایک بت آفتاب طلعت، ایک لعبتِ تصویر صورت بازار میں بک رہی ہے اور انہوں نے مقنع سے عرض کی اور مقنع نے اس کو خریدنے کا حکم دیا۔

اے آقا جب مقنع نے اسے اپنے حضور میں بلایا اگرچہ ماہِ نخشب آسمان پر چمک رہا تھا۔ ارض و سما کا ذرہ ذرہ دمک رہا تھا۔ مقنع کے چہرے پر نقاب تھی۔ یہ نقاب اس کا دائمی حجاب تھی۔ کسی نے مقنع کی صورت نہ دیکھی تھی وہ خدائی کا دعویدار تھا۔ کس کی مجال تھی کہ چہرۂ الوہیت بے نقاب دیکھے، اس جلوۂ باطل کو جو جلوۂ حق ہونے کا دعوے دار تھا بے حجاب دیکھے۔ کسی نے مقنع کی صورت نہ دیکھی تھی۔ اس کے چہرے پر ہمیشہ سفید سی نقاب پڑی رہتی اور اس کے پیرووں کا اعتقاد تھا کہ جس دن مقنع کے چہرے سے نقاب اٹھے گی، یہ دنیا اس کے جلوۂ بے حجاب

کی تاب نہ لائے گی۔ ساری خلق مر جائے گی، خاکستر ہو جائے گی۔

جب یہ لبنانی کنیز نائلہ مقنع کے حضور میں آئی تو بہکی بہکی باتیں کرتی تھیں۔ اپنے پرانے آقا، اپنے محبوب تو قلش کو یاد کرتی تھی، روتی جاتی تھی، جان کھوتی جاتی تھی۔ تب اس سے مقنع نے کہا: اے کنیز تو جانتی ہے تو کون ہے! تو عورت کا حسن ہے۔ میں نے تجھے پیدا کیا تیرے محبوب تو قلش کا عشق عشق مجازی ہے جو ابتدا ہے انتہا نہیں جو مرحلہ ہے مدعا نہیں اے کنیز نائلہ ہوش میں آ۔ دیکھ میں نے یہ چاند بنایا جو اس چاہ سے نکلا ہے اور جس سے آسمان جگمگا رہا ہے۔ دیکھ میں نے تجھے چاند جیسا حسن عطا کیا، تاکہ تو میرا عشق پہچانے اے کنیز: اے نائلہ کیا تجھے دمشق کے حکیموں نے، بیروت کے دبیروں نے نہیں بتایا کہ عشق مجازی پہلی منزل ہے اور عشق حقیقی آخری منزل اور میں مقنع ہوں، خدائے خراساں جس کے نقاب کے پیچھے الوہیت کا جاہ و جلال ہے۔ اے کنیز: اٹھ اور عشق مجازی سے نجات پا، میں نے تجھے نجات بخشی۔ اے کنیز اٹھ اور عشق حقیقی سے حیات پا، میں نے تجھے حیات بخشی۔

اے امیر صاحب قراں کچھ جھوٹے چاند کی چمک تھی، کچھ جھوٹے لفظوں کی دمک۔ وہ کنیز اس جادو میں، اس طلسم، اس طلسمات، اس ظلمات میں پھنس گئی۔ اس کا جنون جاتا رہا۔ اُسے ہوش آ گیا۔ جو جنوں سے بدتر تھا۔ اس نے مقنع کی صورت نہیں دیکھی تھی، مگر وہ اس پر فریفتہ ہو گئی۔ اس نے نصرانی مذہب چھوڑا، اس امام ملبس کے عشق کا دامن پکڑا۔ وہ اس کے عشق میں اس درجہ گرفتار ہوئی کہ جس کی نہ کوئی حد تھی نہ کوئی انتہا۔

یہاں تک کہ مقنع کا دل اس سے بھر گیا۔ مقنع کا جوش اتر گیا۔ نئے نئے بردہ فروش آئے، چین سے، فرنگ سے، روس سے نئی نئی کنیزیں لائے، کچھ کالی، کچھ پیلی، کچھ سفید، لیکن نائلہ اب بھی ضد کرتی کہ اس خدائے نخشب کی اصلی محبوبہ وہی ہے۔ وہی اس کی مریم ہے، وہی اس کے عشق کے لیے حسن ہے، وہی اس کے جلال کا نسوانی جمال ہے اور مقنع کا دل اس کی طرف سے سرد ہوتا جاتا۔

"اے امیر باتدبیر جب تو قلش کی قسمت اسے نخشب کھینچ لائی، تو مقنع جو اس کا قصہ پہلے ہی نائلہ کی زبانی سن چکا تھا، جو پہلے ہی تدبیر کا جال بن چکا تھا، چاہتا تھا کہ سانپ مرے اور لاٹھی نہ ٹوٹے۔ نائلہ سے نجات ملے اور تو قلش اس کے ذریعے بندھا رہے، ہلنے نہ پائے، جانے نہ پائے، اس کی خدمت میں جان گنوائے۔

مقنع نے سر شام نائلہ کو طلب کیا۔ کہا کنیز کہ سُن، بس سُن اور کہنا مان۔ ہم نے اپنی قدرت سے تیرے محبوب کو رومیوں کے جنگل سے چھڑایا ہے ہم نے تو قلش کو اپنے قدموں میں جانثاری کے لیے نخشب بلایا ہے۔

یہ ہماری مرضی ہے، یہ ہماری مشیت ہے، یہ ہمارا حکم ہے یہ ہماری حکمت ہے۔ یہ ہمارا فیصلہ ہے کہ ہم آج سے تجھے پھر اس کے سپرد کرتے ہیں۔

کنیزک یہ سن کر دم بخود ہوئی۔ اس کا رنگ زرد ہوا، اس کی نبض سرد ہوئی۔ اس نے عرض کی اے خداوند، اے ماہِ نخشب کے خالق، اے چاہِ نخشب کے مالک، تو نے مجھے عشقِ مجازی کے بحران سے، عشقِ مجازی کے بحران سے نجات دلائی، تو نے مجھے عشقِ حقیقی میں قبولا۔ میں نے تیرے جمالِ نقاب پوش سے عشق کیا، عقد کیا اب یہ رجعت کیسے ممکن ہے، عشقِ حقیقی کے بعد تو عشقِ مجازی کی منزل نہیں آتی۔ یہ مراجعت کیسے ممکن ہے۔

قصہ مختصر اے امیر صاحب قراں جوں جوں مقنع اسے سمجھاتا وہ اور اینٹھ ہوتی جاتی، روتی جاتی۔ وہ کسی طرح اپنے پرانے محبوب کی طرف مائل نہ ہوتی۔ عشقِ مجازی کی سائل نہ ہوتی۔ یہاں تک کہ مقنع نے اس سے کہا۔ اے کنیزک بے خرد یہ راستہ جو میں نے تجویز کیا ہے میری مصلحت ہے۔ میں تجھے اپنے اور اس نوجوان قوقلش کے درمیان واسطہ بنانا چاہتا ہوں، کیونکہ میں اسے اپنے لشکر کا سردار بنانا چاہتا ہوں۔ اس پر وہ کنیز نائلہ از بس کہ عورت تھی حجت کرنے لگی اے خداوند تیرا کام رحمت ہے، زحمت نہیں۔ تجھے لشکر کی کیا ضرورت۔ تجھے جنگ و حرب سے کیا واسطہ۔ تیرا کام تو معجزوں کا ظہور ہے۔ تو اور سورج اور چاند بنا اور مجھ سے محبت کرتا رہ۔ اس کنیزک نے اسے طعنہ دیا کہ تو کیسا خدا ہے جو انسانوں کی طرح لشکر فراہم کرنا چاہتا ہے، اپنی نقاب اٹھا اور دنیا کو درہم برہم کر دے۔

"اس پر مقنع کو طیش آگیا اور اس نے اپنی نقاب کھینچ کر اتار دی۔ کنیزک نائلہ چیخ مار کر پرے ہٹ گئی۔ کیونکہ اے امیر صاحب قراں، اے سالارِ عساکر خاقان مقنع کا چہرہ ابلیس کا غولِ بیابانی کا بھیانک چہرہ تھا، اس کی ناک پر ایک بڑا سا سوراخ تھا، جس سے حلق تک کا گوشت صاف نظر آتا، اس کے ہونٹ گردوں کے برابر موٹے موٹے تھے، اس کے چہرے پر چیچک کے داغ تھے۔

طیش کے عالم میں مقنع نے کنیز نائلہ کے بال کھینچے اور اس کی صورت اپنے گھناؤنے چہرے سے قریب کی۔ اس نے کہا دیکھ کنیزک دیکھ۔ یہ صورت خدا کی نہیں شیطان کی ہے۔ میں نے خدائی کا دعویٰ کیا۔ میں نے غولِ بیابانی کے ہاتھ روح بیچی، میں نے سحر سیکھا، میں نے جادو کیا، میں نے کیمیاگری کی تاکہ میں اس کے خلاف بغاوت کروں، لشکر جمع کروں اور اس کی مخلوق کو قتل کروں، غارت کروں، تباہ کروں، تاراج کروں۔ میں اس سے اپنی بدصورتی کا بدلہ لوں۔۔۔"

یہاں تک راوی کا بیان سناتے سناتے امیر سیف الدین نے یک لخت کہا۔ وہ بدنہاد، بدگہر راوی یہ کہتا جاتا تھا اور اپنے دونوں ہاتھ آگے پھینکتا جاتا تھا، گویا وہ امیر صاحب قراں کی اس ٹانگ کی طرف اشارہ کر رہا تھا جو سجستانیوں سے جنگ میں خدنگ جستہ میں بسمل ہوئی تھی ..... میرا ہاتھ تلوار کے قبضے پر پڑا مگر امیر صاحب قراں نے مجھے اشارے سے روک دیا کہ راویوں کو قتل نہیں کرتے .....

نقرئی شراب کا ایک اور جام خالی کر کے امیر سیف الدین نے نخشب کے راوی کی حکایت پھر یوں شروع کی :۔

"القصہ اے امیر صاحب قراں غصہ میں مقنع وہ سب کچھ بیان کر گیا، وہ ساری حقیقت عیاں کر گیا، جو اُسے پوشیدہ رکھنی چاہیئے تھی۔ نائلہ نے کپڑے بدلے، سنگھار کیا اور دبیا ؤ اطلس کے ایک شامیانے میں پھولوں کی سیج پر قوتلمش کا انتظار کرنے لگی۔

جب قوتلمش دیوانہ وار اس کی طرف بڑھا، بے قرار اس کی طرف بڑھا، تو اس نے اپنا نقاب اُلٹ دیا۔ قوتلمش نے دیکھا کہ اس کے ابرو نڈھال ہیں، اس کے شانے بے حال ہیں۔ اس کا رنگ زرد ہے۔ اس کی سانس سرد ہے۔ گویا وہ اس کی نائلہ نہیں کوئی اور ہے۔ اس کو ہی اور کا کچھ عجیب ہی طرح عجیب و غریب طور ہے۔

اس نے نائلہ کو پیار کیا، تو اس کے ہونٹ ٹھنڈے تھے، اس نے اس کی نبض ٹٹولی تو نبض سست تھی۔ اس نے کہا: "اے نائلہ خدائے نخشب نے ہمیں اکٹھا کیا، لیکن تیرے دل میں میری محبت مر چکی ہے۔"

"نائلہ نے تڑپ کر کہا، پیچ و تاب کھا کے کہا "نہیں اے میری جان، اے میرے محبوب مجازی، اے میرے واحد محبوب یہ بات نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے تیرے سوا کسی سے محبت نہیں کی، کسی سے الفت نہیں کی، کسی سے الفت نہیں کی، مگر میں تجھے اسی محبت کی سوگند دیتی ہوں کہ بھاگ یہاں سے بھاگ۔ مقنع کی نقاب کے پیچھے خدا نہیں، ایک جھوٹا درندہ ہے، جو خلقِ خدا کا خون پینا چاہتا ہے، بھاگ اور سچے خدا کے ملک کو سدھار نخشب کا خدا جھوٹا ہے۔" اور پھر نائلہ نے مقنع کی اصلی شکل و صورت قوتلمش سے بیان کی، ساری بات بتائی۔ ساری حقیقت سنائی۔

"اے امیر صاحب قراں، جب امیر المومنین مہدی العباسی خلیفۂ بغداد نے نخشب کا محاصرہ کیا، جب ماہِ نخشب تمام ہوا اور چاہ نخشب سے نکل نہ سکا، تو خلیفہ کا سپہ سالار بھی قوتلمش تھا۔ جب قوتلمش سے

نخشب کے حصار میں رخنہ کیا اور اندر گھس آیا تو اس نے ایک نقاب پوش پیکر دیکھا۔ جانا کہ یہی مقنع ہے۔ یہی ماہِ نخشب ہے، یہی جادوگر نخشب ہے، یہی کیمیاگر ہے۔ یہی انسانوں کی جان اور ایمان کا دشمن ہے۔ اس نے کمان کرکی کا تیر چلایا اور نقاب پوش پیکر زمین پر گرا، تو قتلش نے جھپٹ کر اس کی نقاب اتاری۔ یہ مقنع نہ تھا، یہ اس کی اپنی کنیز تھی، اپنی مطلوبہ، اپنی محبوبہ تھی۔ یہ اس کی نگار تھی۔

"اے امیر قتلش نے اپنے بال نوچے، اپنی زرہ اتار پھینکی اور بین کرنا شروع کیا کہ ہائے یہ میں نے کیا کیا۔

نازنین نے اس سے کہا۔ "اے میرے مطلوب سن، اے میرے محبوب سن جب حسن جب ظالم کے قبضے میں آتا ہے، تو حسن نہیں رہتا، عاشق کے کام کا نہیں رہتا۔ .... جہاں ظلم ہے وہاں جمال جمال نہیں، کمال کمال نہیں، وصال وصال نہیں۔ اس لیے اے محبوب میں جو ہمیشہ تیری ہوں، تیری نہیں ہو سکی، لیکن تیرے ہاتھوں مرنے میں جو لذت ہے وہ تیرے ساتھ زندگی بسر کرنے میں نہیں۔"

اور جب امیر المومنین مہدی نے اس مہجور عاشق اور اس مجروح معشوقہ کو دیکھا، تو اُسے امیر اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے پوچھا۔ "اے کنیز باوفا یہ بتا کہ مقنع کہاں گیا۔"

کنیز نے کہا: "اے امیر المومنین ماہِ نخشب میں تیزاب بھرا تھا۔ اسی تیزاب کا ایک گولہ چاند بن کر ہر شام طلوع ہوتا تھا۔ جب نخشب کا حصار ٹوٹا تو مقنع اس تیزاب کے کنوئیں میں کود کر ڈوب گیا۔ اس کی ہڈی ہڈی گل گئی ہو گی۔ .... اے مہدی دین پناہ، وہ جو سارے عالم کے لیے وبال ہوتا ہے۔ اس کا یہی حشر ہوتا ہے۔ رہ گیا میرا محبوب قتلش تو یہ اپنی اپنی قسمت ہے۔ اپنا اپنا نصیب ہے۔ کسی کا نصیب رنج گنج شائیگاں کسی کا نصیب گنج رنج رائیگاں ....."

راوی کی بے بصر آنکھوں نے پھر امیر صاحب قران کی طرف اس طرح دیکھا گویا وہ خدانخواستہ خدانخواستہ مقنع کو ان سے تشبیہہ دے رہا ہے۔ میرا ہاتھ پھر تلوار کے قبضے پر پڑا۔ امیر صاحب قران نے مجھے پھر اشارے سے روکا کہ اتنے میں ایک سیاہ پوش سوار، گرد سے اٹا ہوا، گھوڑے سے اترا اور سر بسجدہ ہو کے عرض کرنے لگا۔

"میں شہر سبز سے ایک منحوس خبر لایا ہوں، اگر جان کی امان پائی تو عرض کروں۔"

ہم سب کا دل بیٹھنے لگا۔ امیر گورگاں نے اجازت دی اور قاصد نے اپنا عمامہ اتار کے امیر کے قدموں پہ ڈال دیا، اپنے بال نوچے اور عرض کی۔

شہر سبز میں ادلجائی ترکان آغا بیمار تھی۔۔۔۔۔ اس کا انتقال ہو گیا۔
امیر تیمور پر سکتہ طاری ہو گیا۔ بدنہاد راوی بول اٹھا ”اپنا اپنا نصیب کسی کا نصیب رنج گنج شائیگان کسی کا نصیب گنج رنج رائیگاں۔

۶

آج فتح حلب سے بہت پہلے۔۔۔۔۔۔

لیکن ایلیاس خواجہ اوغلان کی یورش کے بہت بعد، حاجی برلاس اور بایزید جلائر کی موت کے بعد اس نخلستان میں سلطان حسین اور دلشاد آغا سے اچانک ملاقات کے بعد، خوارزمیوں کی غداری اور تعاقب کے بعد علی بیگ کی قید کے بعد ویران اندھے کنوئیں میں ادلجائی ترکان آغا کے آ رہے جانے کے بعد، خدنگ جستہ سے لنگ آنے کے بعد، قرشی کی لڑائی اور فتح کے بعد۔۔۔۔۔ اور ماہ نخشب کے افسانہ کے صدیوں بعد، ادلجائی ترکان آغا کی موت کے بعد۔۔۔۔۔

ویران مینار کی سیڑھیوں پر جس شکست خوردہ تاجدار کو انجام کا انتظار تھا، وہ امیر تھا اور رات کے آخری تارے گن رہا تھا۔ آج کی رات ساری بوغاسنے تاروں کی چھاؤں میں نہیں گزاری تھی اور آج وہ المالیک سے سمرقند تک تنہا سفر نہیں کر رہا تھا۔ اردو میں اس کا پستہ قد ٹٹو اطمینان سے اس کے خیمے کے پاس بندھا ہوا چارا کھا رہا تھا۔ ادلجائی ترکان آغا، دور شہر سبز میں، آق سرائے کے ہرے بھرے باغ میں صنوبروں کے گھنے سائے میں زمین کے نیچے آرام کی دائمی نیند سو رہی تھی۔ آج ڈوبتی ہوئی رات کو چیر چیر کر آنے والے دن کی آوازیں پھیلتی جا رہی تھیں۔ کتوں کے بھونکنے اور گھوڑوں کے ہنہنانے کی آوازیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ یاد کی بساط پر بیٹھے ہوئے مہروں کی بازی ختم ہو چکی تھی اور اب صرف ایک سوال تھا جس کا جواب دینا تھا۔ قاضی زین الدین کا سوال۔ جبر یا عدل۔ جبر یا عدل۔

کیونکہ بیٹھے ہوئے مہروں نے گواہی دی تھی کہ سلطان حسین اس کا رفیق بھی تھا، عزیز بھی تھا۔ دونوں نے ساتھ مل کے مغلوں کا مقابلہ کیا۔ سلطان حسین جو جلائر تھا، تاجدار تھا، اب تاج چھوڑ کر خانہ کعبہ ہجرت کے لیے جانا چاہتا تھا، لیکن اس کا یقین تھا کہ پھر یورش کرے گا۔ پھر غداری ہو گی۔ پھر حقیر اور بیچارہ دشمن خروج کرے گا۔۔۔۔۔۔

یہاں تک تو عقل نے راستہ دکھایا اور اس کے بعد تیمور نے قالین پر لیٹے لیٹے گاؤ تکیہ کے سہارے اپنی سنگرملی ٹانگ پھیلائی۔

اس جنگل میں کوئی کسی کا بھائی نہیں تھا۔ کوئی کسی کا عزیز نہیں تھا۔ کیا کہا تھا قاضی زین الدین نے کہ عدل میں سازش کا مقام نہیں ......

تیمور کی پیشانی کی تینوں لکیریں گہری ہوئیں، پھر اس نے آہستہ آہستہ بے آواز قہقہہ لگایا اور نقیب کو حکم دیا کہ بلخ کے امیر کیخسرو کو اس کے خیمے سے جگا کے بلا لائے۔

اور اس سے تیمور نے کہا: "میں تمہیں کوئی حکم نہیں دیتا۔ نہ قصاص کا، نہ خوں بہا کا۔ میں اس مقدمہ کا کوئی تصفیہ نہ کروں گا۔ اس کا تصفیہ میرا نہیں تمہارا معاملہ ہے......"

امیر تیمور کی آنکھ میں ایک چھوٹی سی چمک پیدا ہوئی، جسے دیکھ کر کیخسرو کی دونوں آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس نے امیر کے لبادہ شب خوابی کا دامن چوما اور پھرتی سے خیمے کے باہر نکل گیا۔

بابا زین الدین نے تہجد کی نماز سے منہ پھیرا اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھایا۔ یہ کیخسرو تھا جو تیزی سے تیمور کے خیمے کی طرف جا رہا تھا، اس کے ہاتھ میں کسی کا کٹا ہوا سر تھا۔ وہ اسے اس طرح اٹھائے ہوئے تھا کہ داڑھی اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس بے حرمتی سے تو کٹے ہوئے دنبے کا سر کوئی قصائی بھی نہیں اٹھاتا۔ قاضی زین الدین نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھایا ــــــ اور خدا سے ساری دنیا کے لیے دعا مانگی۔ ان شہروں کے لیے جنہیں اب تک مسمار نہیں کیا گیا تھا، ان شہریوں کے لیے جن کا قتل عام نہیں ہوا تھا۔ ان عورتوں کے لیے جن کی عصمت دنیا بھر کے مکانوں میں محفوظ تھی، ان بچوں کے لیے جو یتیم نہیں ہوئے تھے اور غلام نہیں بنے تھے اور جب وہ دعا مانگ رہا تھا تو کوئی اس کے دل سے چپکے چپکے کہہ رہا تھا، یہ سب بیکار ہے، یہ سب بیکار ہے۔

کیونکہ وہ دونوں آنکھیں آہن پوش ہو چکی ہیں۔

ابوالفضل صدیقی

دفینہ

کھٹ کھٹ کھٹا کھٹ، کھٹ کھٹ کھٹا کھٹ، کدال کی پیہم ضربیں، پھر ٹوٹے ہوئے ملبے کو کھس کھس کھسا کھس پھاوڑے سے اٹھا کر ٹوکری میں بھرنے کی آواز، اور ساتھ ہی ساتھ مخصوص ہونکارا اور وقفوں وقفوں سے دونوں جانب لٹکی ہوئی رسیاں اوپر کھینچے کی ہلکی سرسراہٹ اور تین چار فیٹ لمبے چوڑے شگاف یا نقب میں سے جو کچھ بھی کہیے رسیوں میں بندھی ہوئی ٹوکری اوپر آجاتی، دونوں اوپر کھینچنے والے اک ذرا جھکتے، اک نصف سا قدم بڑھا کر رسیوں کو جھولاں دیتے اور ٹوکری میں سے ملبہ اچھل کر کھد کی آواز کے ساتھ منبر کی ڈاٹ کے اندر جا پڑتا اور اس غیر سائنسی عمل کی ماشینی سی تکرار کو آج تیسری رات تھی ہم نے اس خلافِ قانون اور خلاف شرع قبیح فعل کا ارتکاب بہتر گھنٹے قبل شروع کیا تھا اور آواز کا تسلسل ہمارے خون کے اندر سرور کے انداز میں شامل ہو چکا تھا، شعور میں رہ رہ کر پھلجھڑیاں سی چھٹ رہی تھیں۔ امنگوں میں چمن اندر چمن کھلتے چلے جا رہے تھے، رہ رہ کر رنگا رنگ امیدیں مچل رہی تھیں اور ان آوازوں کے سہارے ہماری زریں امید کا قافلہ الف لیلائی منزل کی جانب جھومتا رواں دواں تھا جو پشتہا پشت سے ہماری قبلہ گاہ رہی تھی۔ آج کی اندھیری راتیں جیسے ہمارے مقدر کا ستارہ شہاب ثاقب کی طرح دوڑ کر اس ولی نعمت کی تقدیر کے ستارے میں ضم ہوتا نظر آرہا تھا۔ جس کو ہم رعایا کی حیثیت سے پشتوں سے باج دیتے چلے آرہے تھے۔ راعی سے رعایا بن جانا، باج گزار سے تاجدار ہو جانا بلاشبہ خرقِ عادت کی حد تک پہنچی ہوئی خوش بختی ہے۔ ہر چند کہ اس سفر میں بھی زمان و مکان کا دخل ہوتا ہے لیکن تاریخ ایسی مثالوں سے خالی نہیں ہے اور اس طرح تاریخ کا معجزہ ہمیں اس وقت اپنے حق میں ظہور پذیر ہوتا نظر آرہا تھا۔ ہمارے کان اندر کے ہر ہونکارے اور ذرا سی گہری سانس پر مژدہ کے منتظر تھے اور کسی کسی وقت تو خوشی کے احساس میں بڑے زور سے دل دھڑک اٹھتا۔ سو سو تولہ وزنی شاہجہانی اشرفیوں کی جھنکار، دنیا کے سب سے بڑے طلائی سکہ کی آواز ہمارے شعور میں ضرب اندر ضرب گونج رہی تھی یہاں

کی تاریک ترین راتوں میں سے ایک رات تھی مگراس کی ازفرش تا عرش بھری ہوئی سیاہی میں ہمیں بار بار لہراتی ہوئی بجلی کی طرح سونے کی لکیریں چکا چوند کر دیتیں، اس گھڑی ہمارے جوشیلے رد ہیلہ سردار نواب دوند ا خاں کی طرح بڑھے ہوئے تھے۔

ویسے تو اس تمام عمل میں ہماری صورت بظاہر سنتریوں جیسی دکھائی پڑتی تھی۔ اور تحفظ و ڈیفنس جیسی ذمہ داری کا احساس اور شاید کچھ انداز بھی پہلی شب تو رہا اور دوسری رات ہی سے مائل بہ اطمینان ہو گئے تھے لیکن آج تو اس پہلو سے بالکل ہی سادھان ہو گئے تھے جیسے نواب دوندا خان کا صاحبزادہ نواب محبت خان جو ہمارے اس علاقہ کا والی تھا اطمینان کے ساتھ آبائی خزانہ نکلوا رہا ہو۔ البتہ منزلِ مقصود کا قرب بار بار خون میں گدگدی پیدا کر دیتا۔ کامیابی اور حصولِ دولت کی زریں امیدوں نے ہمارے جذبات میں وہ بالیدگی اور جسموں میں وہ کس بل عطا کر دیا تھا کہ تمام رات بندوقیں تانے پہرہ دیتے گذرتی اور صبح تڑکے سے شام تک بستر پر پڑے ہی پڑے نیند کو مناتے رہتے مگر سونا تو درکنار چین ہی نہ پڑتا منصوبہ میں ناکامیابی یا غلطی کا امکان تو ذہن کے اندر دور دور نہ تھا، مگر نوجوان خون کے اندر مستقبل کے منصوبے مچلتے، جنہوں نے خواب و خور حرام کر دیا تھا، سارا دن لچھمی دیوی کے گیان دھیان میں ساری رات گھر کے اندر آبرستے کی امید میں کٹتی صبح سے رٹ صبح تک منصوبوں کی گنگا جمنی کڑیوں کی سنہری روپہلی زنجیر پروتے رہتے شام ہوتی تو مغربی افق پر سونے کے آبشار اور یاقوت نیلم کے پہاڑ نظر آتے، اور صبح نکلتی تو اوشا دیوی کے سنہرے رتھ پر لچھمی دیوی اپنی جانب بڑھتی نظر آتیں۔ ۔ ۔ ۔

بات تھی تو بادی النظر میں الف لیلائی، مگر الہ دین کے چراغ والی نہ تھی مستند تاریخی، ایسی کہ ہمیں اندازہ تھا کہ اگر ہمارا پروجیکٹ کامیاب ہو جاتا ہے تو سرے سے ہماری اقتصادی سطح ہی بدل جاتی ہے۔ ویسے اپنے طبقے کے اونچی نیچی درمیانی ہر سطح کے گھروں کے اندر ازل سے روٹی کا سوال تازہ ہوا اور سورج کی روشنی کے نرم مرحل ہوتا چلا آرہا تھا اور ابد تک زوال کے آثار نہ تھے۔

ہم تینوں بھائی شریکِ راز تھے اور پچاس افراد کے بھرے گھر کے اندر یہ عمل ہم تین ہی تک محدود تھا۔ کیونکہ ہمیں اندیشہ تھا کہ اگر ابا اماں یا بیویوں حتیٰ کہ پرانے ملازموں تک کو ہماری اس دیوانہ کاری کا پتہ چل گیا تو سختی سے روک دیں گے اور ہمیں باز رکھیں گے، یہ مختصر سی شکستہ جگہ کسی قدیم مقبرہ اور ٹی (چھوٹی سی مسجد) ہماری صدیوں توریثی زرعی اراضی کے درمیان بیکار پڑا حصہ تھا جو صرف اپنی جائے وقوع کے سبب

کاغذاتِ مال میں ہماری ملکیت بھرا ہوا تھا اور اس پر ہمیں کچھ ویسا ہی حق حاصل تھا جیسا دریافت سے قبل مڈل ایسٹ کے سربراہوں کو اپنے تیل کے ذخیروں پر رہا ہوگا۔ دوسرے تین شریک کار نظاہری کھودنے والے مزدور تھے جو بستی کے اندر بے زمین کاشتکار تھے اور دن روزہ مزدوری اور چھوٹے چھوٹے ٹھیکوں چکوتوں کی صورت میں تیرے میرے کھیتوں پر کام کرکے پیٹ پالتے تھے مگر کھودنے کے علاوہ سراغ لگانے کا سہرا بھی انہیں تینوں کے سر تھا لہٰذا زبانی معاہدہ کے ذریعہ برآمد ہونے والی دولت کا ایک چہارم ان تینوں کا حصہ طے تھا اور وہ بھی نہ براہِ راست کائنڈ کی شکل میں نہ کیش کی بلکہ بھاؤ بازار صرافہ کے حساب سے نصف قیمت پر ان کے حصہ کا سونا ہمیں کو خریدنا تھا اور جو قیمت بنے گی اس کو بطور نذرانہ جو بمنزلہ قیمت کے ہوا کرتا ہے، ان تینوں کو اپنی مملوکہ و مقبوضہ زرعی اراضی کے مخصوص کھیتوں میں تین روپیہ فی ایکڑ سالانہ لگان کی شرح پر موروثی حقوق کاشت دینا طے پایا تھا جو نسلاً بعد نسلٍ ناقابلِ بے دخلی رہیں گے جبکہ ایسی اراضیات کا لگان دس بارہ روپیہ فی ایکڑ تھا اور سال بہ سال بے دخلی ہو سکتی تھی۔ ادھر صرافہ بازار میں سونا اسی روپیہ فی تولہ تھا اور ہمارے لئے اس کا چہارم حصہ چالیس روپیہ فی تولہ طے تھا۔ درحقیقت سونے کا ٹھکانے لگانا یا قیمت کا روپیہ ہضم کرنا ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ چنانچہ وہ اس سودے میں بہت مطمئن تھے کیونکہ مزدور سے موروثی کاشتکار بنتے تھے۔ پتہ نہیں کہ میرے دونوں بھائیوں کا کیا حال تھا مگر میرے اندر دالانفکار قرضی سہی تاہم کہنہ قبر کھودنے اور وہ بھی سونے کے لالچ، کسی کسی ساعت ایک نوعیت کے انفعال میں مبتلا کرتا تھا اور جب شاید اس قبر کے اصلی قبر ہی ہونے کا اندیشہ ہوتا تو یہ انفعال شدید تر ہو جاتا۔ تاہم ہر پہلو سے میرا مورال بلند تھا دفینہ کھود کر ہضم کر جانے کے انگریزی قانون کے جرم کی میرے نزدیک کوئی حقیقت نہ تھی یوں تو ہندوستان کے اندر چپہ چپہ پر انگریز غاصب تھا لیکن روہیلکھنڈ کی کمشنری پر تو انگریز کا غصب برٹش پارلیمنٹ نے تسلیم کرکے خود اپنے وائسرائے وارن ہیسٹنگز کو موردِ الزام قرار دے کر مستوجب سزا ٹھہرایا تھا جس سے اس بدنصیب بے ایمان نے خودکشی کرکے جان چھڑائی تھی۔ بمتعدد بدعنوانیوں کے علاوہ سب سے بڑی بدعنوانی شاہ اودھ کو کرایہ پر برٹش فوج دے کر روہیلہ سلطنت کو تباہ کرنے کا جرم تھا۔ ظاہر بات ہے کہ دفینوں کے متعلق ہمارے علاقے میں اس قانون کی ہماری نگاہ کے اندر کیا وقعت ہو سکتی تھی ہم تو اس علاقہ کو ہی آج تک اپنی آبائی توریث اور انگریز کو غاصب تصور کئے ہوئے تھے اور اس روہیلہ خزانہ کو اپنے اسی وجہ بالکل لاذ میاز ث سمجھتے تھے، تاہم دفینہ قبر کے اندر تھا اور سہر دست تو ہم ہزار سالہ

کہنہ نظر آتی قبریں کھود رہے تھے، کسی کسی وقت اندر سے میرا بیدار لسنی شاعر تھرا جاتا لیکن فوراً ہی عقل اور تقاضائے بشریت تھپکی دیتی ارے یہ ہزار سالہ قبر کا فراڈ ہے! یہ تو ہمارے بزرگوں کا بنایا ہوا پوری روہیلہ سلطنت کا سینہ لا کر ہے! یہ التمش کے دور کے ہزار سال مردہ کی قبر ہے کہاں! یہ تو ابھی کل کی اٹھارویں صدی کے اواخر کی بتائی ہوئی بات ہے انگریز لیٹروں کے خوف میں قبر کی شکل میں ــ اور ہم اس کے اصلی نسلی وارث مالک ہیں اور پھر اطمینان کا سانس آتا۔ کون جانے راتوں رات ہمارا گھر روہیلہ شاہوں کے خزانے سے بھرا ہوا اور میرے پانچویں چھٹے دادا روہیلوں کے معتمد اور پرانے باج گزار تھے اور اس مخصوص زرعی حصہ آراضی کے جس پر میری بستی کھیڑہ نوادہ آباد ہے سید بادشاہوں کے دیئے ہوئے معافی دوام نان کار کے حقوق" نسلاً بعد نسل بطناً بعد بطن " حاصل چلے آرہے تھے جو آج تک برقرار ہیں۔ اور پھر میرے سامنے شاہجہانی دور کے پروانہ کی سطریں گھومتے لگتیں جس کی رو سے ہمارے مورث کی ملکیت اس آراضی پر تجدید ہوئی تھی اور میرے دونوں چچیرے بھائیوں کے اندر شاید اس اندھیرے میں اپنی تاحد نگاہ ملکیت کا احساس رہ رہ کر ابھرتا جس کی زرخیز زرعی آراضی فصل بہ فصل سال بہ سال تھوڑا تھوڑا سونا اگلتے اگلتے آج یہ ڈھیر سا سونا پھٹ کر دینے والی تھی ان دونوں نوجوانوں کے اندر ایک مخصوص نوعیت کے بانکپن کا سراغ پاکر میں بھی کسب تحیر کرنے لگتا۔ اور ہم تینوں ہی سمجھ رہے تھے کہ آج کی صبح ہمارے گھر کے اندر منوں کی مقدار میں سونا لے کر طلوع ہوگی اور راتوں رات ہمارا طبقہ بدل گیا ہوگا۔ تاہم بیویوں اور ماں وغیرہ کے زیور اور تھوڑی سی دوسری شکلوں میں ہم سو دو سو تولہ سونے کے مالک تھے اور اس وقت منوں کی مقدار میں برآمد ہو رہا تھا، وہ تو ہم تینوں ہی بڑے باظرف تھے ورنہ ایسے ویسے قلّو پنجو ہوتے تو تصور ہی سے غش آجاتا اور شادی مرگ کے حادثے ایسے ہی واقعات کے نتیجہ میں رونما ہوتے ہیں لیکن بحمداللہ مطمئن تھے۔ حیثیت تو اتنی ہی تھی جو توروں میں تل جاتی لیکن اللہ کے فضل سے ہاضمہ قوی تھا مثلاً نہیں ٹنوں بلاڈکار کے ہضم کر جاتے۔ اور نہایت استقامت اور خود اعتمادی کے ساتھ ہاتھ آنے کے منتظر کھڑے تھے۔۔۔۔

ہمارا چھوٹا سا قصبہ نما شہر مادر التاریخی اہمیتوں کا خطہ تھا ہر دور میں مردم خیز رہا۔ غلام خاندان کے دور حکومت میں التمش کی وائسرائے والی سیٹ رہ چکا تھا، شاہان سادات کا دارالسلطنت رہا علم و فضل اور خاص طور پر تصوف کے اعتبار سے آج تک مدینۃ الاولیا کہلاتا ہے عسکری اعتبار سے کسی پرانے استاد کے اس شعر کو پڑھ کر اس کی تاریخی اہمیت کی تحقیق کر لیجیے ــ

ظالم تری گلی بھی بدایوں سے کم نہیں جس کے قدم قدم پہ مزارِ شہید ہے

اس چھوٹے سے شہر کے قریب ترین مضافاتی مقام پر ہماری آبائی بستی حدودِ چنگی سے تین فرلانگ باہر واقع تھی اور یوں کاغذاتِ سرکاری میں دو گاؤں تھے لیکن بستی ایک تھی جس کے اندر سے تین پختہ سڑکیں گذرتی تھیں جن میں دو جرنیلی سڑک کی شاخیں تھیں اور ان تین سڑکوں کے جڑاؤ پر یہ پانچ ہزار نفوس پر مشتمل قصبہ کھیڑہ نوادہ آباد تھا، جو جائے وقوع اور تمدن کے اعتبار سے شہر کا اہم ترین محلہ کہا جا سکتا تھا لیکن جیسا کہ بیان کیا بڑے زرعی زمینوں کے حامل دو گاؤں یک جائی آباد تھے۔ شہر کے اتنے قریب اتنا بڑا مضافاتی یونٹ شاذ و نادر ہی نظر آتا ہے، ورنہ میونسپلٹیاں ہڑپ کر لیتی ہیں، کھیڑہ ہندی میں اجڑی تاراج بستی کے ٹیلے کو کہتے ہیں، نوادہ نو آبادہ کی کثرتِ استعمال کی صورت ہے۔ مستند تاریخ اور ماورا التاریخی سینہ بسینہ روایات کی رو سے یہ دو مرتبہ تاراج کر کے بسائی ہوئی بستی تھی، غالباً بارہویں صدی میں پہلا مسلمان حملہ سید سالار مسعود غازی نے اسی راستہ کیا تھا جس کی یادگار کھیڑہ نوادہ کے قریب ایک گاؤں سالار پور آباد ہے خیر یہ تو مستند تاریخی بات ہے لیکن علم سینہ کے مطابق اس کو ماورا التاریخی دور میں ایک مرتبہ اس وقت تاراج کیا گیا جب برہمن اور راجپوتوں نے بدھوں کا ہندوستان سے استیصال کلی کیا۔ اس کا مستند ثبوت یوں تو جگہ جگہ اور بھی ملتا تھا لیکن اتفاقیہ طور پر کاشت کے سلسلہ میں بعض چھوٹے ٹیلوں میں سے اوپری سطح کھدنے پر کرشن جی کی مورتی برآمد ہوئی اور زیادہ کھودنے پر مہاتما گوتم کا بت نکلا۔ کہیں کہیں یہی صورت قدیم کنوؤں میں صفائی کے وقت رونما ہوئی۔ اور بستی کے اندر ایک جگہ سے راجہ اشوک کے طلائی سکے برآمد ہوئے۔

(فٹ نوٹ، جس کو افسانوی انداز میں راقم الحروف نے انصاف کے عنوان سے رسالہ نقوش میں لکھا ہے)

بہلول لودی سے شکست کھا کر سید علاؤ الدین نے شہر دہلی چھوڑ کر ہمارے شہر کو اپنا دارالسلطنت بنایا اور ہمارے مورث سید علاؤ الدین سپہ سالار تھے اس سے پہلے سید سالار مسعود غازی کے حملہ میں یہ بستی غازی کی فوج کی لپیٹ میں آ چکی تھی۔ ہمارے مورث نے اسی ویران مقام کو اپنی چھاؤنی بنایا اور اسی سے شمال کی جانب چودہ میل تک ان کی جاگیر تھی۔ انہوں نے اپنے پانچ بیٹوں کے نام پر پانچ بستیاں آباد کیں جن میں سے تین لاولد مر گئے اور دو سے نسل چلی جن دونوں کی اولاد آج تک اس بستی میں آباد ہے اور بیس سال قبل تک جاگیر زمینداری کی شکل میں بدستور تھی جو کانگریسی حکومت کے تنسیخ زمینداری کے نفاذ کے ذریعہ ۱۹۵۲ء ضبط ہوئی۔ ہمارے اس مضافاتی گاؤں کے رقبہ کے اندر حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے

والد ماجد حضرت سید احمد صاحب اور ان کی والدہ کا شاندار مزار ہے جو التمش بلبن کے دور کی تعمیر ہے۔ وہ صاحب نسبت بزرگ تھے۔ آپ کی تربیت کا نمونہ آپ کے فرزند عالی جاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء ہی جو ہیں۔ کھسیرہ نواد قصبہ کم و بیش ہزار ایکڑ پر مشتمل زرعی رقبہ پر اس شاندار مزار کے علاوہ جگہ جگہ کنکر یلے ٹیلے، شکستہ قبریں، گم نام شہدا کے "گنج شہیداں" کہلانے والے مزار، مسجدوں کی منہدم بنیاں، بے رنگی قدیم قبریں پائی جاتی ہیں جن کے متعلق علم سینہ کی روائتیں چلی آتی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے مزاروں پر جگہ جگہ تکیے ہیں جن پر صدیوں قدیم درخت کھڑے ہیں۔ خود خواجہ نظام الدین اولیاء کے والد ماجد حضرت سید احمد کے مذکورہ مزار پر جو کھرنی کے درخت ایستادہ ہیں ان کی عمر کا اندازہ لیٹیننٹ مزار کی تاریخ کے ساتھ کرتے ہیں۔ اس مزار سے متعلق ایک پورا زرخیز زرعی آراضی پر مشتمل موضع نظام پور وقت چلا آتا ہے۔ اس موضع اور مزار کے ملحقہ آراضی اور جھیل پر خواجہ حسن نظامی کے ایک جدی برادران بحیثیت سجادہ نشین قابض و متصرف ہیں۔ حضرت سید احمد صاحب کے مزار پر اور اس سے ملحقہ چھوٹے مزاروں پر بدھ کے روز مخصوص چہل پہل رہتی ہے۔ انہیں کے مقامات اور جگہ جگہ مذکورہ ملحقہ چھوٹے چھوٹے ٹیلوں اور قبروں کے اندر شاہانِ روہیلکھنڈ کے خزانہ کے بڑے حصہ کے دفینوں کی روائتیں تھوڑی بہت دیومالائی انداز میں سینہ بہ سینہ چلی آرہی تھیں۔ چونکہ ابھی اس بستی میں بیس بائیس سال قبل مذکورہ قدیم ماورا التاریخی دفینہ اتفاقیہ طور پر نکلا تھا لہذا بستی کے ذی اقتدار طبقہ میں اپنے اپنے مقبوضوں کے اندر خزانہ دریافت کرنے کا رجحان تھا اس سے پیشتر میرے بعض یک جدی بزرگ اس تلاش کے شکار رہ چکے تھے اور بچپن سے سنتا چلا آیا تھا کہ "کیمیا بننے میں صرف ایک آنچ کی کسر رہ گئی تھی اور آج اپنی بہ طلائی طالع آزمائی شاید بہت کچھ بزرگوں کی ذہنیت کی توریث تھی۔ ویسے تاریخی امر ہے کہ روہیلوں کا خزانہ اودھ اور انگریز فاتحین کے ہاتھ آیا اور دفینہ کر دیا گیا۔ چنانچہ پوری کمشنری اور ریاست رام پور کے اندر جعلی اسناد اور بیجکوں کے سہارے یہ رجحان عام تھا اور طالع آزما موقع موقع سے تلاش کرتے رہتے تھے ساتھ ہی ساتھ افواہیں بھی چلتی رہی تھیں

ماہ جون کا مخصوص ہفتہ تھا جب فضا میں مانسون کی آمد کے ابتدائی اثرات رونما ہوتے ہیں، لوئیں تھک جاتی ہیں، دن میں زمین پر بوجھل بوجھل سی ہوا گرد کے باریک باریک ذروں کو سانپ کی طرح رینگاتی ادھر سے اُدھر لیے لیے پھرتی ہے، ماحول میں اچاٹ پن پیدا ہو جاتا ہے، شامیں بلا کی اداس اور

واقعی غضب کی بھیانک ہوتی ہیں اور اگر اندھیری پاکھ ہو تو بلا اندر بلا ہو جاتی ہیں، تبدیلی موسم کے اثرات سے جسم تو ایسے ہی تھے، لیکن حسیات جسم سے زیادہ مجروح ہوتے ہیں اور ایسے میں میرے بچپن کے ساتھ کے کھیلے ہوئے تین ساتھی تین چار روز سے میرے یہاں ناخواندہ مہمان تھے یا یوں کہیے مقیم تھے۔ حافظ لڈن خاں، کمان خاں اور بچو خاں، یوں تو نسلی دعوے والے پکھو کھلے لوگ کسی بھی پہلو سے میری سطح کے آدمی نہ تھے پھر کردار کے اعتبار سے اس قماش کے تھے جن سے مجھ جیسے لوگ رجعت کرتے ہیں اور جنہیں دیکھ کر "ذرا باش" کا احساس ابھرتا ہے یقول کے ان کی کوئی ادا مجھے نہ بھاتی تھی، ہمیشہ بل کھائے ہوئے کردار تھے۔ تاریخ زیادہ قدیم نہ تھی۔ انیسویں صدی کے اوائل تک پردادا کے باپ دادا اعلیٰ عسکری صلاحیتوں کے حامل رہے ہوں گے لیکن ان تک پہنچتے پہنچتے اب وجہ کی عسکری روائتیں سپاہی کے بجائے غارت گری کی صورت میں رونما ہو گئیں۔ کبھی یہ پولیس کے تعاقب میں اور کبھی پولیس ان کے پیچھے۔ یوں تو پرزادوں کے بگڑے گو رنگ نہ سنبھلے، مگر ادھر دو تین سال سے ان کے اس کاروبار نے دوسرا قدرے محفوظ رخ اختیار کر لیا تھا سننے میں آیا تھا کہ اپنے جد امجد کے خزانہ کے دفینوں کی مہم جوئی کا کام کرنا شروع کر دیا ہے یہ انگریزی قانون میں تو نسبتاً کم و بیش ویسا ہی جرم ہے جیسا ارتکاب یہ رہزنی ڈکیتی میں کرتے آئے تھے تاہم ان کے پاس اس کے لئے قانونی نہ سہی اخلاقی منطق تھی۔ یہ تینوں مانے ہوئے روہیلہ سرداروں کے ساتویں آٹھویں پر پوتے تھے۔ شجرۂ نسب کے علاوہ ان کے خدوخال اور تن و توش بھی شاہد تھے اور مزاج بھی تصدیق کرتے تھے خاص طور پر حافظ لڈن خاں نجیب کہا جاتا تھا اور ان تینوں میں سب سے زیادہ دلیر اور بلا کا ذہین تھا۔ کہتے ہیں کہ یہ اپنے گروہ کا سردار تھا اور سب سے پہلے اسی کو دھن سوار ہوئی کہ ڈکیتی، لوٹ مار اور قتل کے بجائے اپنے آبا، روہیلہ سرداروں کا دفینہ تلاش کیا جائے اور یہ ہوا یوں کہ بریلی کے مضافات میں کسی ایسے ہی مہم جو طالع آزما کے گھر سے ڈکیتی کے مال کے ساتھ ایک چرمی سند جس کو بیجک کہتے ہیں ہاتھ آیا جس میں نواب دوندا خاں کے بیٹے نواب محبت خاں کے ہاتھ کی تحریر کوڈ ورڈس میں کسی دفینہ کا سراغ درج تھا۔ یہ مرض ایک مدت روہیلکھنڈ بھر میں عام رہا۔ محکمۂ آثار قدیمہ والوں کے ہاتھ کسی ٹیلے میں سے کھدائی کرتے ہوئے شاہجہانی اشرفیوں کا ذخیرہ لگا جس کی اخباروں میں پبلسٹی ہوئی اور بریلی، مرادآباد وغیرہ کے قصبات میں جگہ جگہ اشرفیاں نکلنے کی افواہیں اڑیں، سونے کی اینٹیں کسی بنئے کے مکان کی تعمیر کے دوران برآمد ہونے کی پھوٹی اور اسی افواہ کی بنا پر حافظ لڈن خاں کے گروہ نے اس بنئے کے یہاں ڈکیتی ڈالی۔ اور سونے کی اینٹیں وینٹیں تو نہیں تھوڑے سے مال کے علاوہ یہ بیجک ہاتھ لگا جس سے اندازہ ہوا کہ بنیا تھا تلاش کے اسی چکر میں۔ اور جب یہ افواہیں زیادہ گرم ہوئیں تو منشی صاحبوں میں چند خطوط ان بیجکوں کے کوڈ ورڈ پڑھنے کے دعوے کرنے لگے کچھ جو تشی تھا

اٹھ کھڑے ہوئے۔ حتیٰ کہ زیادہ شاطر لڑکوں نے جعلی چیک اور سندیں بنا بنا کر فروخت کرنا شروع کر دیں۔ کہتے ہیں کہ کسی بھکیے دست شناس نے حافظ لڈن خاں کے متعلق پیشین گوئی کی کہ دولا خزانہ ہاتھ لگے گا لہٰذا انہوں نے اپنا گروہ توڑ دیا اور بچو خاں اور کمان خاں کو ساتھ لے کر بجائے ڈکیتی مارنے کے ادہر متوجہ ہو گئے۔ حافظ لڈن خاں میرے ساتھ کا ابتدائی فارسی مکتب کا پڑھا ہوا تھا۔ ساتھ ہی حافظِ قرآن ہوا اور بڑا خوش الحان قاری بنا۔ جب کج راہ پر پڑا تو بلائے بے درماں ثابت ہوا اور گوناگوں کمپلیکسوں کی تعمیر سے ہولناک شخصیت بنا۔ بچو خاں اپنا سلسلۂ نسب اس مخصوص سردار سے ملاتا تھا جو نواب دوندا خاں اور ان کے بیٹے نواب محبت خاں کی دو پشتوں کا دستِ راست رہا تھا۔ اور خود بھی نجیب الطرفین تھا تاہم ماں کی جانب سے کھونٹ تھی جس کو پٹھان تسلیم نہیں کرتے دبے ذاتی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ بچو خاں لڈن خاں کی سیادت اس پہلو سے بھی تسلیم کرتا تھا۔ رہا کمان خاں۔ ابھی چالیس پچاس برس پہلے تک وہ بڑے بوڑھے زندہ تھے جو سنایا کرتے تھے کہ ان کے باپ دادا کی زبانی سنی ہوئی آنکھوں دیکھی بات ہے کہ کمان خان کی چھٹی ساتویں دادی ایک شودر کی نوخیز بیٹی تھی، رفع حاجت کے لئے گاؤں سے باہر کھیتوں میں گئی تھی۔ کوئی روہیلہ افسر مال پڑتال کرتا اور جنسوار پھرتا آ پہنچا اور وہیں فصل خریف کی آڑ میں گندھرو بیاہ ہو گیا۔ شودروں اور اونچی جاتی والوں کے ایسے اتصال آج بھی برصغیر میں عام ہیں۔ اور اس دور میں اور بھی زیادہ رہے ہوں گے اور کبھی کبھی ان اتفاقی حادثات کے ساتھ تولید و تناسل کے واقعات بھی رونما ہو جاتے ہیں اور کمان خاں کا پردادا اسی حادثہ کی اتفاقی پیداوار تھا۔ خارجی اعتبار سے اپنے دونوں ساتھیوں سے مختلف، جسمانی و صوری اعتبار سے آسٹریلین گدھے اور دیسی ٹٹیا کا میل "خچر"، عقل میں بھینسا، جو کچھ سامنے پڑ جائے اس کو صرف ٹکر کی شدید قسم "جڈ" سے ہٹا کر راستہ بنانے کا عمل کرنے والا، ذرائع روزی کے معاملہ میں تینوں کی بیس پچیس سال سے براتِ عاشقاں بر شاخِ آہو کٹی تھی۔ سیں بھیگتے ہی روز کا کنواں کھودنا روز کا پانی پینا۔ ہر رات سر پھوڑنا، پیٹ پھاڑنا اور خون پینا اور ہر شام میزان صفر اور پیٹ خالی۔ اور نئی بھوک سوار۔ اور ادھر حافظ جی کے قوائے جسمانی میں پتہ نہیں کہ اضمحلال پیدا ہوا یا قوائے ذہنی میں کچھ انقلاب، یکبارگی کیمیاگر کی طرح اپنے آبا کی پاک دولت کی تلاش کی دھن سوار ہو گئی۔

آئے ہوئے تو یہ دو تین روز کے تھے اور شاگرد پیشے میں نوکروں کے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے لیکن میں کتراتا رہا تھا البتہ دور کی صاحب سلامت ہو گئی تھی اس وقت مسجد میں مغرب کی نماز کے بعد جوتے پہنتے ہوئے بالکل ہی قریب ہو گیا۔ ساتھ ساتھ نکل کر آئے۔ اور میرے مردانہ مکان سے متعلقہ دبیج چبوترے پر پڑے مونڈھوں پر آمنے سامنے بیٹھ گئے اس چبوترے سے عین نیچے پچھم کی سمت سڑک تھی اور اس سڑک کی اُدھر والی پٹڑی سے ملحق میری خورد کاشت

آراضی کا ڈیڑھ دو سو ایکڑ لق و دق خالی میدان پڑا تھا جس میں سے ربیع کی فصل دو ماہ پیشتر کٹ چکی تھی اور بارش کے انتظار میں خریف کی فصل کاشت کرنے کے لئے گرمیوں بھر پڑا تپتا رہا تھا۔ اس تین چار روز کے عرصے میں ان لوگوں سے یہ میری پہلی تفصیلی ملاقات تھی۔ ایک مبہم سی خاموشی رسمی کلمات کے بعد چاروں کے مجمع پر چھا گئی۔ اور میں موقع پاکر اٹھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ حافظ جی بول پڑے "ہوں، کیا کہنے! واہ! دیکھ رہے ہو چودھری، کیسی سلونی سلونی ٹھنڈی سوندھی شام اور کیسی پیاری پیاری دعوت دیتی رات بڑھ رہی ہے۔" اور دھند سے بھرے مغربی افق پر نگاہیں گاڑ دیں۔ میں چونک پڑا۔ فطری طور پر میری نگاہیں ادھر اٹھیں۔ دل میں کہا، دیکھو مسخرے کی، اس بھیانک اور اُبال بھری شام میں سوندھی سوندھی سہانی سہانی دعوت دیتی رات بڑھتی ہوئی ٹٹول رہا ہے، اور سرمہ سا برساتی شام میں مغرب کی جانب ڈیڑھ دو میل تک تپتے ہوئے خالی کھیتوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا، جس کے بیچوں بیچ منڈی مسجد کی قدیم عمارت دھندلی دھندلی نظر آرہی تھی اور ہر ساعت بڑھتی ہوئی بھیانک تاریکی اس کے گرد میں اُلٹے نقوش کو نگل رہی تھی۔ میں خاموش رہا، بچو خاں نے بار بار مونڈھے پر پہلو بدلے گردن گھما گھما کر شکرے کی طرح جیسے شش جہات کو پرتالا۔ اور ایک لمبی سانس لے کر بولا۔ سی، ایسی سندر شامیں اور ایسی ڈھب کی پکارتی راتیں کسی کسی سال ایک آدھ مرتبہ ہی چھٹے چھ ماہے ملا کرتی تھیں۔ جب اندھیری باڑھ میں آپڑتیں۔" لہجہ اور انداز ایسا تھا جیسے بیتے دنوں کی حسرت بھری یادیں آرہی ہیں۔ بچو خاں پر بھی من وعن یہی ردعمل تھا لڈن خان کی بات لقمہ دے کر بڑھائی "ایسی ایسی جڑنیں جگائی ہیں اور وہ دھاک بٹھائی" کمان خاں اپنی استعداد کے مطابق پورے پورے کڑے ہوگئے اور غصیلی سی آواز میں بولے: "آج تو اپنا زمانہ یاد آگیا بھیّا، ٹھیک کہے تو بچو خاں،" پھر دائیں بائیں دیکھا اور گھونٹ سے لے کر قنوطی لہجہ میں سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ "تم دونوں نے تو ادھر چار پانچ سال سے بدھیا کر کے رکھ دیا، بچو بنا کے قبریں کھودنے پر لگادیا۔ جوانی سے بھرا بھر جوانی غارت کردیا۔ پھر ایک لمبی گہری افسوس کی مظہر سانس کھینچی اور بولے: "ہائے رے جوانی جلنے نہ جانی۔ کیسے کیسے معرکے سر کئے ایسی ڈھب کی راتوں میں" اور اس بات پر آکر جیسے اس کے اندر سے گدگدی کی لہریں سی اٹھنے لگیں: "حافظ لڈن نے بات کاٹ دی "ابے چپ دہقان کہیں کا، اور پھر سنجیدہ ہوکر مجھ سے مخاطب ہوئے۔ چودھری صاحب، —— وہ ادل، آں، —— آپ کو شاید سن گن ملی ہو، ویسے دیوار ہم گوش دارد۔ ہم لوگ ادھر ایک عرصے سے تاریخی مہم پر ہیں۔ "تاریخی مہم" کی ترکیب پر میں اک ذرا چونکا، تاہم خان صاحب آدمی تثلیث واقع ہوئے تھے اور اس وقت تو بشرہ میں کسی تاریخی محقق والی سنجیدگی جھلک رہی تھی تاہم مجھے پتہ چل چکا تھا کہ ڈکیتی و رہزنی کا گروہ تتر بتر ہوگیا ہے اور حافظ جی نے دو ساتھیوں کو

انتخاب کر کے دفینوں کی تلاش کا کام شروع کر دیا ہے، اور تخت یا تختہ، اور جگہ جگہ گڑ کر کے تختے کھودتے پھرتے ہیں۔ ماشاءاللہ، ماشاءاللہ! میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ پتہ نہیں کہ طنزیہ، استہزائیہ یا خلوص کے ساتھ اور یہ بھی اندازہ نہیں کہ حافظ جی نے اس کو کس ردعمل کے ساتھ لیا۔ البتہ انہوں نے میرے چہرہ پر اپنی عقاب جیسی آنکھیں گاڑ دیں۔ لیکن شاید مثبت اندازہ کر کے ذرا پہلو بدلا اور مونڈھا میرے قریب کو سرکا لیا۔ اور اپنائیت اور رازدارانہ لہجہ میں سلسلہ کلام جاری کیا اور میدان میں کالی کالی سی نظر آتی ویران منڈی مسجد کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولے "تین سال سے ہم مستند محکمے کے ذریعہ آپ کی آراضی میں واقع اس ویران قدیم مسجد تک پہنچ پائے ہیں۔ پردادا مرحوم جنت مکانی نواب دوندا خان کا خزانہ اس میں دفینہ کیا ہوا ہے۔ بہرحال یہ مسجد تو آپ کی ملکیت ہے اور مسلمہ امر ہے کہ بغیر آپ کے تعاون کے برآمدگی ممکن نہیں اور بلا آپ کے پورے اشتراک کے کھدائی کیا کوئی بھی اقدام اس نواح میں محال ہے۔ ہم پچھلے ہی سال سلسلہ جنبانی کرتے مگر بے سود تھا۔ کیونکہ آپ کے کھیتوں کے اس چک میں ربیع کی فصل ایستادہ تھی اور اتنی آڑ نہ تھی کہ کام ہو سکے۔ اس مرتبہ خریف کی باری ہے جوار باجرہ، گنا، ادہر ہم نے جنتری دیکھ لی ہے۔ اکتوبر کے دوسرے ہفتہ میں اندھیری پاکھ پڑ رہی ہے اور انہیں دنوں خریف کی فصل پوری اونچائی تک بڑھ چکی ہے اور اس تمام علاقہ میں دور دور تک خریف ہی خریف ہوگی۔ ترائی بھابر کے ٹانسر، چاندرے جنگل کا سا سماں ہوگا۔ اور ہم اطمینان کے ساتھ کام کر سکیں گے۔" میری نگاہ باوجود نستعلیق اور پڑھے لکھے ہم مکتب حافظ قرآن ہونے کے حافظ لڈن خان کے کرتوتوں کے سبب جو ان کی سطح تھی ظاہر ہے تاہم اس پیچیدہ سے انکشافات پر میں متاثر ضرور ہوا۔ ہم منڈی مسجد پشتہا پشت سے دیکھتے چلے آ رہے تھے، صدیوں سے مائل بہ انہدام تھی۔ پشتوں سے بڑے بوڑھوں نے اس کا چھوٹا سا واحد گنبد اس کی چھت پر الٹا ہوا دیکھا تھا اسی لئے اس کو منڈی مسجد کہتے چلے آئے تھے۔ قیاس تھا کہ کسی زلزلہ یا بجلی گرنے سے یہ شکست و ریخت ہوئی تھی۔ اس وقت حافظ جی کے بات کرنے کے انداز سے اس کو جا کر دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہوا جو عمر بھر نگاہوں میں ایسی کھبی رہی تھی کہ جیسے نظر ہی نہ آتی تھی اور میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اور یہ تینوں میرے ساتھ ہو لئے اور ٹہلنے کے انداز میں چل کر منڈی مسجد جا پہنچے۔ اور آج عمر میں پہلی مرتبہ شام کے دھندلکے میں میں نے اس عمارت کا غائر جائزہ لیا۔ مردانے مکان کے چبوترے پر سے پچھم کی جانب نگاہ جاتے ہی ہمہ وقت نظر آنے والی یہ خستہ عمارت کھیتوں کی سطح سے تین چار فیٹ اونچی تھی اور اسی لکھوری اینٹ اور مسالے کی تعمیر تھی

جس سے حضرت سید احمد کے مزار کی تعمیر ہوئی تھی ۔ یہ پٹھانوں کے دور مخصوص طرز تعمیر تھا ۔ بچپن میں اس کے چبوترے پر اونچا نیچا کھیلا کرتے تھے پھر جب کھیتوں پر جاتے تو کبھی کبھی اس کے قریب سے گزرتے تھے ، صحن میں تینوں قبریں موجود تھیں لیکن آج پہلی مرتبہ غور کیا کہ تینوں قبریں اتنی قریب قریب تعمیر کی گئی ہیں کہ جڑی ہوئی سی ہیں ۔ درمیان والی قبر پر اس نزاع کا محور رکھا ہوا تھا ۔ نہایت سخت بھورے رنگ کے پتھر کا تراشا ہوا ایک شاخ تعویذ ایسا پتھر وہاں بھر میں کہیں نہ پایا جاتا تھا ۔ اس پتھر کے تعویذ پر بعض کاشتکار کبھی کبھی اپنے اوزار تیز کر لیتے تھے جس کے جگہ جگہ نشان تھے ۔ ویسے تو حضرت سید احمدؒ کے مزار کے مضافات میں جگہ جگہ تکیے تھے اور قبروں پر مجاور بیٹھے تھے لیکن حیرت ہے کہ اس پر کوئی توجہ نہ کی تھی نہ کوئی درخت ہی تھا ۔ اور اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی تھی کہ ان قبروں کے متعلق تاریخی یا روایتی کوئی معلومات نہ تھی ۔ صرف تعمیر کے قبلہ رُخ اور طرز سے اس کو مسجد کہہ سکتے تھے ۔ ورنہ صدیوں سے اس کے اندر اذان نہ گونجی ہوگی ۔ یہ اتنی غیر اہم تھی کہ اس چک کے سروے نمبران کے درمیان کاغذاتِ مال میں حتیٰ کہ نقشہ خسرہ میں بھی نہ دکھلائی گئی تھی جبکہ اور مزار اور حضرت سید احمدؒ کی درگاہ نمایاں اندراج تھیں اور میری زرعی اراضی کے درمیان اس کی پوزیشن ویسی ہی تھی جیسے زرخیز کھیتوں کے درمیان کوئی کنکریلا ٹیلا یا دوسرے لفظوں میں عدم وجود برابر ۔ للن خاں نے راستہ ہی میں سلسلۂ کلام جاری کر دیا تھا اور قبروں تک پہنچتے پہنچتے بتایا کہ ہم اس نزاع میں دو ڈھائی سال سے سر پیچ رہے ہیں ۔ اور کچھ تفصیل کرتے ہوئے سمجھایا (جو میں بالکل نہ سمجھ سکا) کہ دفینہ کا میزان اسی مسجد اور درمیان والی قبر پر لگتا ہے ۔ تیور س سال اس چک میں خریف ایستادہ تھی ہم نے سوچا کہ آپ سے سلسلہ جنبانی کریں ، مگر پھر جنتری دیکھی تو پتہ چلا کہ وسط اکتوبر میں چاندنی راتیں ہوں گی ۔ لہذا چپ لگا گئے کھدائی کے لئے موزوں نہ تھیں ۔" یہاں تک ہم قبروں کے سہارے ٹک کر بات کرنے لگے ۔ آس پاس کی دونوں قبروں کے تعویذ اینٹ چونے کے تھے اور درمیان والی قبر سے تقریباً چھ انچ زیادہ بلند تھے ۔ تھوڑی دیر جائزہ لینے کے بعد کمان خاں غرانے سا لگا اور ایک جانب سرے والی قبر اور پتھر والی قبر کے تنگ فاصلہ میں ٹیڑھی مڑی ہو کر سما گیا اور پتھر کے تعویذ پر پاؤں کے دونوں تلوے جما کر پورے جسم سے زور کرنے لگا جیسے پتھر کو الٹنا چاہتا ہے ۔ اس فضول ہارڈی نیس پر مجھے تو ذرا حیرت سی ہوئی لیکن بچو خان نے بہت بندھائی آواز نکالی واہ بیٹا واہ کیا کہنے ! الٹ دے ۔ اگرچہ ذرا بھی کچھ چلنے بن سکے موڈ میں ہو رہا تھا مگر مجھ کو اندازہ ہوا کہ کمان خاں سنجیدگی سے ساتھ ہزار سال جما ہوا پتھر الٹنے کے لئے زور کر رہے ہیں ۔ میں نے کہا پہلوان اس پتھر پر زور کیوں کر رہے ہو دلی جا کر لال کنٹور ڈھاؤ اور چھین کر وزیر پورے ہتھیاؤ ۔ کمان خاں

اس استہزائیہ داد و تحسین پر فخریہ انداز میں اٹھ کھڑے ہوئے پسینہ میں شرابور تھے مگر جلد ہی سانس درست ہو گئی۔ اور سنجیدگی کا ماحول بن گیا: آغاز کلام کے انتظار میں چند ساعت مخصوص خاموشی رہی، یہ خاموشی شاید حافظ اللہ خاں کو کھلی، وہ وظیفہ کا راز تو مجھے دے ہی چکے تھے۔ جائے وقوع ہر وقت میرے سامنے اور میری ملکیت کے پیچھے رہی۔ بغیر میرے تعاون کے وہ لوگ لاشئہ محض تھے۔ پھر وہ میری طینت کو بھی پہچانتا تھا کہ قبر کھود پھینکنے کے قانونی اور شرعی جرم سے ممکن ہے کہ احتراز کرے۔ اس کی اصلاح زندہ انسانوں کے پیٹ اور چھاتی چیرتے چیرتے مردوں کی قبروں میں نقب لگانے تک ہوئی تھی اور اس کو اپنا آبائی حق خیال کر رہا تھا۔ پھر یہ بھی سمجھتا کہ برابر بٹھال کر کیگر ن نے تکلفی اور خوش اخلاقی سے بات کر لینا اور چیز ہے لیکن اتنا بھروسہ اور اعتبار کر لینا مشکل امر ہے کہ اس کی تحقیق اور ترغیب پر ہزار سالہ قبریں اکھاڑ پھینکے، قاری ہونے کے ساتھ ساتھ بات کرنے کے شیریں ڈھنگ سے آراستہ تھا اس کو میرے ذہن کے اوپر اس ضمن میں منفی تاثر کا دور گذرا اس کو ہٹانا چاہا۔ اور قرأت کی غنائیت لئے ہوئے حافظ جی کی آواز میں بھی چاندنی کھنکنے لگی: ہوں چودھری صاحب آپ تو ماشاء اللہ بہت پڑھے لکھے لوگ ہیں اور پھر سونے پر سہاگہ صحبت یافتہ اور علم تاریخ پر خاص طور سے اعلیٰ درک رکھتے ہیں۔ آپ کے تو علم میں ہو گا کہ اپنی اس ریاست روہیلکھنڈ کا قیام ہی فی سبیل اللہ جہاد کے پاک جذبہ کے تحت عمل میں آیا ہے، جب دہلی مرکز کمزور ہو گیا، ادھر پورب میں ضعف کا فائدہ اٹھا کر نواب وزیر اودھ شاہ اودھ بن بیٹھے اور خود سر خود مختاری کا اعلان کر دیا ادھر پچھم میں سکھوں کی آئے دن کی یلغاروں نے پشاور سے انبالہ تک سکھا شاہی قائم کر لی اور پورے پنجاب میں اذان بند کر دی، مرہٹے اتنے چڑھ گئے کہ شہنشاہ دہلی کو کٹھ پتلی کی طرح نچانے لگے، اور معمولی معمولی مرہٹہ محصل مال شاہی مہر جیب میں ڈال کر گاؤں گاؤں کھیت کھیت چوتھ وصول کرتے لئے اور شہنشاہ دیوان عام میں آتا تو بجائے کیوڑہ گلاب کے عرق کے راستہ پر گئو مترا کا چھڑکاؤ کیا جاتا اور سنکھ گھنٹے سے نقیب آمد کا اعلان کرتے جاتے۔ سلطنت شاہ عالم از لال قلعہ تا پالم بھی کہنے کو رہ گئی تو تحفظ اسلام کے لئے روہیلہ حکومت کا قیام عمل میں آیا۔ روہیلوں کے جہاد اور جمہوری المزاج ہونے کے تو کئی باب اور پہلو ہیں بلکہ اگر دیکھئے تو اس دور کے اندر ایشیا کی پوری تاریخ کا برسات۔ سلاطین کی سلطنت مجبور ہے مگر میں اس دور کے اختتام کے متعلق عرض کر رہا ہوں جو صرف حادثاتی طور پر عمل پذیر ہوا۔ اس وقت خلد آشیانی حضرت نواب دوندا خاں جو جنت مکانی حافظ الملک نواب رحمت اللہ خاں کے داماد تھے، آپ کے اس ضلع کے گورنر تھے۔ جن کا سقوط روہیلکھنڈ سے قبل انتقال

ہوا اور آپ کے صاحبزادہ نواب محبت خان گورنری پر فائز ہوئے۔ نواب دوندا خاں ولی عہد تصور کئے جاتے تھے لہذا سلطنت کا بیشتر خزانہ آپ کی تحویل میں تھا اور مالیات کے مختار کل تھے پھر روہیلے اتنے بڑے منتظم تھے کہ ان کا سونے کا ذخیرہ دن کی روشنی میں نہ نکل سکتا تھا جس پر سکہ اور ٹکسال کا دارومدار تھا اس کے وزن کا اندازہ ٹنوں ہی میں کیا جا سکتا ہے جو جگہ جگہ دفینوں کی شکل میں آج تک زیر زمین پڑا ہوا ہے۔ اور جس کا معتد بہ حصہ آپ کے ضلع میں مدفون ہے۔ کیونکہ نواب دوندا خاں کی وفات کے بعد گورنری کے ساتھ ساتھ وزارت مال بھی نواب محبت خاں کو جوں کی توں تفویض ہوئی بتوسط کے وقت نواب محبت خاں نے سب سے پیچھے اودھ اور انگریزوں کی اطاعت قبول کی۔ اور اللہ ان کی روح کو نہ شرمائے سردار فیض اللہ خاں نے سب سے پہلے ایک ضلع پر اکتفا کر کے تاج شاہی پہنا۔ خیر چھوڑیئے۔ وہ جانیں اور ان کے اعمال مشہور بات ہے کہ اپنے حلقۂ اثر میں نواب محبت خاں دوبارہ فوج آراستہ کرنے کے لئے جدوجہد کرتے رہے اور تین ہاتھیوں پر بار سونا لئے لئے پھرتے رہے۔ بالآخر جب اودھ اور انگریزی فوج کا دباؤ بڑھا تو خزانہ کا جتنا حصہ ان کے قبضہ میں تھا اسکو جستی پتروں اور چرمی سندوں پر بجک کرا کر زیر زمین دفینہ کر دیا جس کا بیشتر حصہ آپ کے اس نواح میں ہے، اور میں نے استخارہ کیا تو خواب میں دو شاہجہانی اشرفیاں ضرب کی دیکھ لیں سو سو تولہ والی۔"

میں نے پہلو بدلا حافظ جی میری نفسیات سے بچپن سے واقف تھے آدمی بہت زیرک واقع ہوئے تھے اندیشہ ہوا کہ بات الف لیلائی حدود کو چھو آئی لہذا انہوں نے شاہجہانی اشرفی کا نقشہ بتایا جو انہوں نے کہیں دیکھی ہو گی اور میں نے تو دہلی اور لاہور کے میوزیم میں دیکھی تھی۔ میں ان کی گفتگو میں سے مطلب مطلب کی چھانتا رہا۔

ہاں تو روہیلہ سلطنت تو بلا شبہ ختم ہو گئی لیکن روہیلہ خزانہ کا ایک حبہ دشمنوں کے ہاتھ نہ آیا اور شاہ شجاع اور وارن ہیسٹنگز دونوں کا انجام خراب ہوا۔" للن خاں نے یہ جملے اس طرح ادا کئے کہ اگر ایسا نہ ہوا ہوتا تو آج یہی وائی روہیلکھنڈ ہوتا۔ پھر ایک آیت پڑھ کر اس کا ترجمہ بیان کیا "ملک اللہ کا ہے جس کو چاہتا ہے دیتا ہے جس سے چاہتا ہے لے لیتا ہے۔ پھر اللہ کی مرضی یہی تھی ورنہ حافظ الملک شہید جنت مکانی نے تو مرہٹوں اور سکھوں کو جہاد کا چیلنج دیا تھا۔ وہ وارن ہیسٹنگز دور کی کوڑی لایا، روہیلہ فوج کی قوت اور تنظیم و کارکردگی سے واقف تھا لہذا اندیشہ ہوا کہ کہیں ایسی اچھی فوج کا وجود برقرار نہ رہ جائے اور اودھ والے نہ اپنا لیں۔ لہذا پوری روہیلہ فوج ہی کو تنسیخ کر دیا۔ روہیلہ فوج کے چھوٹے بڑے سرداروں کو زمیندار جاگیردار بنا دیا اور چھوٹے سپاہیوں کو موروثی کاشتکار۔ اور پانچ سال بعد ساتوں اضلاع شاہ اودھ سے بھی چھین لئے۔

ہندوستان کی تاریخ پلٹنے والی پلاسی کے علاوہ آخری روہیلہ جنگ بھی ہے۔

حافظ جی کی کچی پکی تاریخی معلومات چپکا بیٹھا سنتا رہا ورنہ میں تو بولنے والا آدمی ہوں شروع ہی میں چپ کر دیتا تاہم دیسی فوج کو منسوخ کرکے سرداروں کو زمیندار اور سپاہیوں کو کاشتکار بنا کر دیوان خانوں اور کھیتوں میں بھیج دینا، ایک نیا پہلو ذہن میں آیا یہ انگریز بہادر ہی کا طاغوتی ذہن تھا۔ ساتھ ہی حافظ جی نے اپنی پچھے دار باتوں سے میرے گلے اتار دیا کہ اس تھرکا ٹریا اکسرے کر لیا ہے اور تعلملاتی شاہجہانی اشرفیاں گن لی ہیں۔

شام کی بات آدھی رات گئے تک میرے ذہن میں متحرک رہی، روشن اور تاریک نشیب و فراز دماغ میں آتے جاتے رہے، دفینہ میرے گھر میں تھا اور دفینہ کا راز حافظ لڈن خاں کے پاس جو انہیں مجبوری میری مٹھی میں دینا پڑا تھا۔ شرع اور قانون کا احترام میرے تربیتی ماحول کے اندر رچا ہوا چلا آرہا تھا اور میری جبلت تھا اور سیدھا سادہ قانونی اقدام یہ ہو سکتا تھا کہ میں ضلع ایڈمنسٹریشن اور محکمۂ آثار قدیمہ والوں کو مطلع کر دوں اور جہاں تک میرے علم میں تھا برآمد کردہ مال کی تخمینی قیمت کا بقدر آٹھ دس فی صدی نقد سرکاری خزانہ سے بطور انعام پاؤں۔ اور میرے طریقۂ فکر کے اس پہلو سے حافظ لڈن خاں اچھی طرح واقف بھی تھے۔ دوسرا اندیشہ انہیں یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اس ماحول میں یہ قابو یافتہ آدمی ہے۔ سب کا سب مال ہتھیا کر گھر میں گھس جائے تو وہ کچھ نہیں کر سکتے، داد نہ فریاد۔ تاہم دو سنگین قانونی جرموں کا ارتکاب اس منصوبہ کے ساتھ لگا ہی ہوا تھا؛ قبر اکھیڑنا اور گورنمنٹ پراپرٹی دفینہ غصب کرنا۔ پہلی مذکورہ چیز تو حماقت محض تھی، گورنمنٹ انفارمر بن کر کچھ ہاتھ نہ آتا تھا بلکہ ان قاتلوں ڈکیتوں سے مفت میں دشمنی پیدا ہوتی تھی۔ اور سب کا سب ہتھیا کر انہیں دھتا بتانے کا سوال ہی نہ تھا، یہ عمل میری ذات سے ممکن ہی نہ تھا، شرعی پہلو سے بھی مطمئن تھا کہ یہ قبر نہیں خزانہ ہے۔ قانونی بے ضابطگی کا بہر صورت سامنا کرنا ہی تھا اور پھر عجلت بھی نہ تھی سوچنے اور مشورہ کرنے کے لئے تین چار مہینے پڑے تھے۔

میں نے اس مرتبہ اس چک پر پہلی بارش کے ساتھ ہی گہری توجہ دی، جوار یا جرہ کا وہ مخصوص تخم جو اونچا بڑھتا ہے کاشت کرایا۔ خوش قسمتی سے اس سال برسات بھی بڑی متناسب ہوئی۔ ادھر میں نے کیمیاوی کھاد اچھی طرح ڈلوائی فصل معمول سے سوائی ڈیوڑھی بڑھی۔ یہ رنگ بھی مہینہ پیچھے دو تین پھیرے کرتے رہے ستمبر ختم ہوتے ہوتے حافظ لڈن خاں نے ایک ذرا چونکا دینے والی خبر سنائی کہ ایک اور کھدائی کرنے والی پارٹی بھی اس نواح

کارخ کرنے والی ہے مگر میرا ذہن اس علاقہ میں "اندیشہ" نوعیت کا کوئی احساس قبول نہ کرسکتا تھا۔ اس بات کو سنی اَن سنی کان اڑا دی۔ ہوں! یہ شیر کی کچھار ہے! مجال ہے پرندہ پَر مار جائے کس کی ماں نے دھونسا کھایا جو بغیر ہمارے یہاں جائز ناجائز کچھ بھی کرسکے۔

پرانے طریقہ سے کی کاشتہ خریف کی فصل ستمبر اکتوبر میں بہت کچھ کمالیوں کی ترائی بھابھر کے جنگل جیسی ہو جاتی ہے جوار یا جوہ بالسوں اونچے پودوں پہنچنے میں نیچے سے ماش مونگ و بیٔے کی بیلیں چڑھ چڑھ کر پورے رقبہ پر جال جیسی صورت میں کس دیتی ہیں نگاہ تو درکنار آدمی بھی بمشکل گذر سکتا ہے اور منڈی مسجد کے گرد کیمیادی کھاد اور بھی زیادہ ڈلوایا تھا اور بڑی مکمل حصار بندی تھی۔ اب اس چک کی پیداوار کو بجائے کاشتکار کے کان کن کی ذہنیت سے تول رہا تھا، جوار یا جوے ماش مونگ کے منوں کے بجائے دل ہی دل میں سونے میں وزن کر رہا تھا، اللہ کی شان تولوں ماشوں، رتیوں، چاولوں اور خشخاش کے بجائے دھڑیوں، سیروں میں اور سونا! ظاہر بات ہے نواب مجّت خاں شکست کے بعد نئی لام بندی کے لیے جو سونا دو تین ہاتھیوں کی پیٹھ پر لادے اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر تک دو دو کرتا بیان کیا جاتا ہے اس کا وزن منوں ہی میں ہوگا۔ میرا ذہن زریں امیدوں کا مرکز تھا، ساتھ ہی ساتھ رہ رہ کر بے معنی اور ناقابلِ یقین وسوسے بھی گھر کرتے اور کسی کسی وقت دل دھڑک اٹھتا یہاں تک کہ طے شدہ منصوبہ کے عمل کا وقت آ لگا، مجھے ان تینوں کا بے چینی سے انتظار تھا، صبح کا وقت تھا میں اپنے مکان کے چبوترے پر مونڈھے پر جما بیٹھا تھا، اس چک کی گھنی فصل پر ٹکٹکی جمی ہوئی تھی اور اک دو ماہ سے یہ میرا معمول ہو گیا تھا۔

یک دم میرا اسٹری ٹائل ساؤکرس کی ڈیوٹی پو پھٹنے سے لے کر دن چڑھے تک اور دن ڈھلے سے دن چھپے تک فصل پر زیادہ سے زیادہ فس مچاکر اور مخصوص بھیانک آوازیں نکال نکال چڑیاں اڑانا اور رکھوالی کرنا تھی برے جیسل، برے احوالوں میرے سامنے آ کھڑا ہوا، اور بولنے کی کوشش میں گھگھیا کر اتنا بتا سکا کہ پتھر کے مزار والے پیر قبر پھاڑ کر نکل گئے، اور یہ کہ اس نے انہیں صبح کے دھندلکے میں جاتے جاتے ایک نظر دیکھا بھی۔ سپید کپڑے، سپید داڑھی، گورے چٹے نورانی ـ اور اس کی بات میں نے اس سے زیادہ سمجھ لی۔ میرے بدن میں سناٹا سا ہو گیا۔ ایکٹ اور گردہ بھی اسی نزاع میں کھدائی کرنے کا اُرخ کر رہا ہے میں یک دم اُدھر جا کر صورتِ حال دیکھنے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا، لیکن اس نے دامن پکڑ لیا۔ اس کے جسم پر لرزہ سا تھا اور پسینہ میں شرابور تھا: نیں، نیں، مہناں، واں نیں جاؤ۔ لیکن سچ پوچھئے تو میں اس سے زیادہ سراسیمہ تھا۔

ابے ہٹ ا— اور چل پڑا خوف کے مارے وہ ساتھ نہ ہو سکا۔ اور لرزہ میں مبتلا اپنی کوٹھری کی جانب لڑھکتا سا چلا گیا۔ میں اکیلا جائے وقوعہ پر پہنچا۔ پہلی نگاہ پڑتے ہی حیرت اور پھر یک دم غصہ میں زیر و زبر ہونے لگا۔ پتھر والے تعویذ اور فرش کے خطِ اتصال پر چھینی ہتھوڑے سے کٹائی کرکے اسی سائڈ سے قبر میں نقب لگانا شروع کیا تھا اور تھوڑا ملبہ نکال کر مسجد کے میری ڈاٹ میں کو پھینکا تھا اور ایسا اندازہ ہوتا تھا کہ اوپر دوسری قبر کے تعویذ ہونے یا کسی اور رکاوٹ کے تحت کھدائی کر نہ پائے تھے اور تھوڑا ملبہ نکالنے کے بعد کام بند کرنا پڑا تھا۔ اور دیکھتے ہی لمحے میرے خون میں غصہ کے مارے جھاگ سے اٹھنے لگے۔ جیسے رہ رہ کر کوئی میری کنپٹی کے بالوں اور نتھنوں کے رونگٹوں کو نوچ رہا ہے۔ اس نواح میں مدتوں سے کم سے کم میرے باپ دادا کے ہوش میں ایسی جسارت و مداخلت تو درکنار کوئی عمل میرے گھرانہ کی مرضی کے خلاف ہوا نہ تھا۔ وہ بے بکھیر گزشت۔ اتنی سی ہو کر رہ گئی۔ کچھ دور فصل کے اندر چلا اور آنے جانے والوں کے کھوج دیکھے اور فوراً ہی رائے قائم کرلی کہ آج ہی رات میں کام شروع کرا دینا چاہیئے اور ساتھ ہی ایک قدیم دبا ہوا جذبہ ابھرا۔ اس علاقہ میں میری تاریخ پونے چھ سو سال پرانی تھی۔ یہاں میرے مورثِ اعلیٰ نے شمشیر کے زور سے دخل حاصل کیا تھا اس کے بعد سے پھر کسی مجادلہ کی حتیٰ کہ دفاع تک میں ادنیٰ سی جھڑپ کا سراغ نہ تھا اور آج امکانات تھے۔ ایک عجیب سا جوش آیا۔ کھدائی کرنے کے لئے مزدوروں کا انتخاب بستی کے اندر ہی کرنا تھا۔ یوں تو سینکڑوں ہزاروں، ساری کی ساری بستی ہی قابلِ اعتبار تھی لیکن اس کام کے لئے میرا جی نہ ٹھکتا تھا۔ اندیشہ تھا کہ کھدائی کے دوران کہیں بات پھوٹ نہ پڑے اور مصیبت تو یہ تھی کہ گھر کے اندر سگی ماں اور بیویوں تک سے اور گھر سے باہر باپ اور تایا تک سے بات چھپائے ہوئے تھا۔ راستہ میں کچھ موزوں لوگ ذہن میں آئے، اور اب گھر پہنچتے ہی میں نے سب سے پہلے اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں کو راز میں لیا جن میں ایک وکیل اور دوسرے ڈاکٹر ہیں۔ تمام دن طرح طرح کی قیاس آرائی ہوتی رہی اور شبہ مختلف سمتوں کو تیرتا رہا۔ حافظ لڈن خاں اور ان کی پارٹی کی آمد کی متوقع تاریخ میں ابھی چند روز باقی تھے تاہم شبہ کی زد میں یہ لوگ بھی تھوڑا بہت آئے۔ حالانکہ قریب چار ماہ سے اعتماد میں تھے ورنہ یقیناً اس مذکورہ گروہ کا فعل تھا جس کی ان لوگوں نے خبر دی تھی۔ مناسب کھدائی کرنے والوں کا دستیاب ہونا رقت آمیز تھا اور الٹا ڈر تھا کہ مفت میں راز بھی ان کے پاس پہنچ جائے اور وہ ہاتھ بھی نہ آئیں۔ خوب غور و خوض کے بعد بستی کے اندر سے تین کھیت مزدوروں کا انتخاب کیا اور ان کا اعتماد اور دلچسپی برقرار رکھنے کے لئے نذر قبر اکھیڑنے کے قبیح فعل پر آمادہ کرنے اور قائم بھی رہنے کے لئے برآمد ہونے والی دولت میں مذکورہ معاہدے کے

یہ بجائے اجرت کے ان کا مذکورہ شرائط کے ساتھ زرعی آراضی میں موروثی حقوق کی صورت حصہ مقرر کیا۔ ر کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ کتنا وقت لگے اور یہ لوگ جاہل توہم زدہ گنوار ہی تو تھے اور ہزار سالہ قبر اکھیڑتے ے تو اچھے اچھے آزاد خیال بھی ایک دفعہ گرد وسوسوں کا شکار ہو جائیں گے تاہم کیسے ہی نہ کیسے یہ مہم تو سرانجام ہی تھی اور انہیں دو تین مخصوص اندھیری راتوں میں ورنہ پھر معاملہ دو برس کو ٹلتا تھا جب چک میں خریف فصل ہوا اور اس زمانہ میں اماوس کی تاریک راتیں بھی پڑیں جس کا کوئی حد وحساب نہ تھا۔

کچھ مفصل پوچھ گچھ کے لئے اس بنگلے رکھوالے کو طلب کیا تو پتہ چلا کہ تیز بخار میں پڑا ہے اور ہذیانی کیفیت ۔ اب ہم تینوں بھائی صورت حال پر غور کر کے مشورہ کرنے بیٹھے۔ دو چیزیں تو قطعی طے کیں پہلی تو یہ ہے ہر قیمت پر آج ہی کھدائی کا کام شروع ہو جانا چاہیئے اور امید تھی کہ آج ہی صبح ہوتے ہوتے اختتام تک پہنچ جائے۔ دوسری یہ کہ کسی بھی قیمت پر باہر سے اندر تک کسی گھر والے کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائے اور کسی کو بھی اندازہ ہو گا کہ ہم ہر سال کی طرح اکتوبر بغایتہ مارچ اپنے معمول کے مطابق قاز کے شکار کو گئے ہیں یا قبر کھودنے۔

پشتہا پشت سے میرا خاندان اس علاقہ کا چودھری تھا اور چودھریوں کی چودھراہٹ میرے گھر میں چلی آرہی ی۔ ان خطوط پر اس بازی گاہ کے اندر میری تعمیر کردار ہوئی تھی۔ میں نے اپنی تین پشتیں دیکھی تھیں جن کی مرضی ے خلاف کوئی امر عمل پذیر ہو جاتا تو درکنار کوئی آواز بھی کانوں میں مرضی کے خلاف نہ گئی تھی بہر حال یہ مداخلت میرے یہ بڑی سنگین نوعیت کا حادثہ تھی۔ ہر صورت میں اس سے نبٹنا تھا۔ سہ پہر تک حافظ لڈن خاں اور ان کے دونوں ساتھی بھی آگئے ذہن بالکل صاف ہو گیا۔ بلکہ یک گونہ ندامت بھی ہوئی کہ مفت میں ان بے قصوروں پر شبہ یا۔ اور رات کی مداخلت کی بات سن کر تو لڈن خاں بجلا کر جا پڑا۔ اور سانپ کی طرح بل کھانے لگا۔ ہم سب ے سب فوراً دیکھنے پہنچے۔ یہ لوگ ہم سے بھی زیادہ جز بز ہو رہے تھے۔ ان استاد کار کردہ قسم کے لوگوں نے مداخلت کاروں کی ناکامیابی کا سبب ان کے اوزاروں کا ناقص اور ناموزوں ہونا قرار دیا۔ نیز یہ معلوم کر کے کہ ہم نے تین مزدوران ان شرائط پر راز میں لے کر شریک کار کر لئے ہیں اظہارِ طمانیت کیا اور کہا کہ ہم خود اس صورت حال کے تحت یہ تجویز پیش کرتے، گھر واپس پہنچ کر زراعتی اوزاروں کی کوٹھری میں سے اپنے مطلب کے اوزار کدال چھوٹے دستوں والے، ذرا چھوٹا پھاوڑا، تیار کیا اور کھجور کے پتوں کی اپنے مطلب کی ٹوکری ایک رسی میں دو جانب سے لٹکا کر اچھی طرح کس لی۔ ڈیوٹیاں بٹ گئیں۔ پہلے تو ظاہر تھا کہ کمان خان اندر گھس کر کھدائی کٹائی کرے گا اور یہ دونوں اوپر کھینچتے رہیں گے۔ اور اب یہ طے ہوا کہ کھدائی کھنچائی مزدور کریں گے اور ہم تینوں

عین موقع پر گویا دوسرے فرنٹ پر بندوقیں بھرے دفاع کے لئے الرٹ رہیں گے اور یہ تینوں پہلے فرنٹ پر جدھر سے مداخلت کاروں کے آنے کا خطرہ ہوگا دیدبانی کریں گے اور چک کی سرحدی جگہوں پر موقع موقع سے تعینات رہیں گے اور جس وقت خطرہ کا اندازہ کریں گے منہ سے سیٹی بجا کر ہمیں ہوشیار کردیں گے اندیشہ یہاں تک تھا مداخلت کار عین اس وقت چھاپہ نہ ماریں جس وقت دفینہ باہر نکل چکا ہو۔

شام کے وقت ہم نے تینوں مزدوروں کو طلب کیا۔ اور بات چیت کر کے اس چیز کا اندازہ لگایا کہ یہ خائف تو نہیں ہیں اور جب مطمئن ہوگئے کہ خائف نہیں ہیں تب اپنے پتے کھول کر رکھے اور ان کو مغرب کے قریب موقع دکھلانے لے گیا اس وقت نہ معلوم کیوں یہ راستہ میں نے کسی نامعلوم سے خوف نہیں تو نامانوس پن کے ساتھ طے کیا گویا ڈرتا ڈرتا پہنچا۔ شاید یہ اندیشہ کہ کہیں قبر دیکھ کر وہم وسوسہ کا شکار نہ ہو جائیں۔ اور کام رک جائے یا پتہ نہیں کیا تاثر تھا مگر یہ احساس صریحًا نمایاں خوف بن کر عین موقع پر پہنچ کر میرے اپنے اندر پھر اک ذرا ابھرا۔ دیکھئے کس کل اونٹ بیٹھتا ہے آج! بلا شبہ انہوں نے خلاف قانون مداخلت کی ہے اور اب میں ان کے راستہ میں حائل ہو رہا ہوں۔ تاہم میرا بلند مورل سہارا دے رہا تھا۔ اب تین کھدائی کرنے والے یہ رہے۔ اور عین موقع پر دفاع، مقابلہ کرنے والے ہم تین بھائی۔ اور وہ تینوں تو چک کی سرحدوں پر نگہبانی کرنے پر مامور رہیں گے کہ اگر کوئی مداخلت کار آئیں تو ہونٹوں سے سیٹی بجا کر ہمیں ہوشیار کریں، اور مداخلت کار بھی کس وقت آئیں، کون جانے عین وقت کے وقت، جب خزانہ باہر ہو، اور اب قبروں اور مسجدوں کے ماحول کو مخصوص نقطہ نگاہ سے پرتالا۔ اور مداخلت کار یقینًا مسلح ہوں گے۔ اور ہم کتنے ہی اچھے نشانہ باز سہی یہ بندوق کی لڑائی کم بخت ایسی نامرد ہوتی ہے کہ جس کا ہاتھ پہلے اٹھ جائے خواہ وہ بالکل ہی اناڑی کیوں نہ ہو وہی ماہر اور بہادر ہوتا ہے۔ تاہم ہم کو اپنے دیدبانوں پر بھروسہ تھا۔ پھر مداخلت کار یہاں تک پہنچیں گے تو اتنی گھنی فصلوں کے اندر چلتے ہوئے کتنے پاؤں دبا کر چلیں کافی کھٹکا ہوگا اور ہم اندھیرے میں آواز پر نشانہ لگانا جانتے ہیں۔ مقابلہ کا موقع پڑا تو ہمارے لئے مسجد کے یہ پیچھے کمین گاہ کا کام دے سکتے ہیں۔ تاہم اس وقت مجھے دن دہاڑے اپنے گرد بھوت کے سائے سے ناچتے محسوس ہوئے۔

اور آج قدرت بھی ہم سے تعاون کر رہی تھی، بعد مغرب شمالی ہوا چلی اور ابر محیط ہوگیا اور سال کی تاریک ترین رات تو تھی ہی زمین سے آسمان تک سیاہیوں پر سیاہی چڑھ گئی۔ اکتوبر کی مخصوص موسمی خنکی اچھی خاصی

سردی سی بن گئی لوگ سرشام ہی سے گھروں چوپالوں میں دبک گئے۔ اور خریف کی فصلوں پر لپنے یہاں رات کو یوں بھی رکھوالی نہیں ہوتی بس صبح شام فس اور شور مچا مچا کر چڑیاں اڑانا ہوتی ہیں۔ کاشتہ حصہ میں مکمل سناٹا ہوگیا اور اب ہماری پارٹی بھی زیادہ منظم ہوگئی تھی۔ ٹھیک ٹھیک فوجی قواعد کے مطابق کھدائی والے تین اور شریک کار ہو گئے اور ڈیوٹیاں بٹ گئیں موقع پر پہنچ کر شاید ایک نوعیت کے خوف کے تحت جو ہر پہلو سے شاید صورت حال اور غالباً اندھیری رات کا تقاضا تھا اس تاثر اور ردعمل کو خود اپنے اندر سے نکال پھینکنے کے لئے میں نے ایک تجویز پیش کی جس سے میرے دونوں بھائیوں نے فوراً اتفاق کیا۔ غالباً ان دونوں کے داخلی حسیات میرے مطابق تھے کہ تینوں بندوقوں کے دو دو فیر مختلف سمتوں کو ہوائی کر دیے جائیں تاکہ دشمن آس پاس لگا ہو تو ڈر کر بھاگ جائے رہا بستی میں پینک پھیلنے کا معاملہ تو کوئی امکان نہیں۔ یہ ہمارا روزانہ کا قانون کے شکار میں شروع شب کا معمول ہے۔ چنانچہ فصلوں کی پھنگیوں کو کترتے ہوئے زاویوں پر ہم تینوں نے دنادن چھ فیر داغے۔ اور سنسانے میں کھدائی کا کام شروع ہوگیا۔ اسی دلاغ بیل پر جو پچھلی شب مداخلت کار ڈال گئے تھے اور پتہ نہیں کہ میرے دونوں بھائیوں کے تاثرات کیا تھے لیکن مجھے اس وقت اپنے اوپر سے خوف کا احساس ہٹانے کے لئے فیر داغنے پر ایک نوعیت کا انفعال اور ہتک محسوس ہو رہی تھی یہ علاقہ پونے چھ صدی سے میرے جد امجد کی کچھار چلا آ رہا تھا اور یہ فیر میں نے درحقیقت خود اپنے اندر سے لپکتے ہوئے خوف کو مٹانے کے لئے کرائے تھے۔

کام ہوتا رہا مگر رات پُرہول ہوتی چلی گئی۔ شمالی ہوا سے مشرقی ہوا کے چند جھونکے ٹکرائے دور ندی کے کنارے کسی ہجر زدہ بھیڑیئے نے رو رو کر اپنی محبوبہ کو پکارا۔ فصلوں کی پھنگیوں پر چڑپڑ ہوئی، اور باریک باریک بوندیاں چھم چھم کر برستی نکلی چلی گئیں۔ ابر آلود رات ہونے کے خیال سے ہم لوگوں نے ہنٹنگ کوٹوں پر برساتیاں پہلے ہی پہن رکھی تھیں، سروں پر سولا ہٹ تھے۔ کام شروع ہوتے ہی ہم سبھی چونک پڑے تھے۔ مسجد کے پچھواڑے بالکل قریب ہی ایک اکیلا گیدڑ مخصوص آواز میں کوک پڑا تھا۔ اور درگاہ کے قریب ایستادہ کھرنی کے درخت پر رہ رہ کر ڈڈو کڑکڑا پڑتے تھے اور یہ سب کے سب بدشگون تھے۔ ویسے ہم شگون کے قائل نہیں ہیں لیکن بندوق ہاتھ میں لے کر ہر شکاری نہ معلوم کیوں ایسے توہمات کا شکار ہو جاتا ہے، تاہم جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میرا ذہن اس سے ہمیشہ مبرا رہا تھا لیکن اس وقت میں بھی خواہ مخواہ متاثر ہو رہا تھا دونوں بھائی بھی اور تینوں کھدائی کرنے والے مزدور بھی۔ ۔ ۔ ۔ ان تینوں کے نہ معلوم کیا تاثرات تھے جو فصلوں میں چھپے سرحدوں پر دیدبانی کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ اور اس دوران میں بہتر ارد کی میری ایک چھینک بھی نکل گئی جس پر کام کرنے

کرنے والے مزدور خاص طور پر بددل ہو کر چونکے اور آج آدھی دوسری شب کٹی تھی پتھر کے تعویذ کے نیچے بجائے کسی اور چیز کے ستون برآمد ہو رہا تھا۔ اور مزدور ستون کو کاٹ کر اس کی بنیاد تک پہنچنے کے لئے کھدائی کر رہا تھا جس میں یقیناً خزانہ دفن تھا۔ کیونکہ اندر سے قبر کی تعمیر کا یہ طرز تھا ہی نہیں۔ فجر کی اذان پر کام بند کر کے ہم گھر پہنچے۔ اماں بڑبڑاتی تھیں ایسا بھی کیا شکار ساری رات واہی تباہی! چھلاوؤں کی طرح! نہ تندرستی کا خیال نہ کھانے پینے کا۔ بیگم تلاوت کر رہی تھیں، میرے پہنچتے ہی گردان کردی اور بڑی سنجیدگی کے ساتھ بولیں۔ میاں، ما ناکہ نئی نئی تازی آئی ہیں پھر ساری ساری رات!؟۔ ایں، اور ہاں ابھی تہجد پڑھ کر جو اک ذرا آنکھ لگی تو جیسے ایک بزرگ سبز پوش ہتھیار سجائے کھڑے ہیں اور جیسے کہہ رہے ہیں کہ خواہ مخواہ سید سالار مسعود غازی کے شہیدوں کو پریشان کیا جا رہا ہے سوتے میں۔" بیگم کے ساتھ یہ اکثر و بیشتر میرا مخصوص خلوت کا وقت ہوا کرتا تھا، اور کبھی کبھی رات کے خواب سنا کر تعبیروں پر غور کیا کرتی تھیں مگر اس وقت ایک ذہنیت کا شاک سا لگا۔ شہید مردوں کے قبرستان اور جگہ جگہ گنج شہیداں کہلانے والی قبریں منڈی مسجد کے نواح میں تھیں اور خاص بات یہ تھی کہ منڈی مسجد عین اس راستہ پر واقع تھی جس سے سید سالار مسعود غازی نے بدایوں پر حملہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ "ہفت احمد" سات اولیائے کرام کے مزار یہیں جمع تھے۔ میں نے قصداً بات اس کان سنی اس کان اڑادی۔ مگر ایک جھرجھری سی آئی اور بستر میں جا لیٹا، رضائی تان کر منہ ڈھک لیا، بغلوں، کہنیوں، جبڑوں میں سے سردی کی لہریں اٹھ اٹھ کر چھاتی اور پیٹ کی جانب چلنے لگیں اور میں کپکپانے لگا۔ "ارے جاڑا چڑھ رہا ہے!" بیگم نے کہا، ساری رات شکار میں واہی تباہی پھرنے پر لعن طعن، بڑبڑاتی اٹھیں اور رضائی کے اوپر ایک کمبل اور ڈال دیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک مگ بھر چائے اور ایک گولی دی۔ اور گھنٹہ بھر بعد ایک پیالہ دودھ میں گھلی ہوئی کافی کا دیا اور دوسری گولی کھا کر گیارہ بجے تک میں ساد نٹھا ہو گیا۔ آج تو امیدوں کا قافلہ آسودۂ منزل ہو رہا تھا۔ خون میں غضب کی بالیدگی اور جذبات میں بلا کی چستی تھی۔

انہماک میں پتہ بھی نہ چلا کہ کب رات بیت گئی، ہم تُرکے نو دو اُدھر بستی میں خاموشی ہوئی ادھر چراغوں جلے اپنی اپنی ڈیوٹیوں پر پہنچ گئے تھے۔ پچھلی دو راتوں کی طرح وہ تینوں دیدبانی کی ڈیوٹی پر جا لگے تھے اور ہم تینوں کھدائی اور کھنچائی پر۔ پتہ نہیں کہ ان تینوں کے محسوسات کیا تھے مگر ہم تینوں بس ضابطہ کے ہی اسپورٹ رہ گئے تھے۔ ہر نوعیت کے خلفشار سے بے نیاز۔۔۔ صبح کاذب کے آثار نمودار ہو گئے۔ ایک آدھ مخصوص صبح خیز چڑیا چہکی۔

آسمان پر ایک خطِ نور مشرق سے مغرب کی طرف کھنچتا چلا گیا۔ غروبِ آفتاب کی بھیگی ہوئی رات بھرپور بوجھل ہوگئی اوس کے قطرے آہستہ آہستہ نفوذ کرتے کرتے ہمارے کوٹوں اور قمیصوں کو توڑتے جیسے جسم تک نفوذ کر گئے۔ بندوقوں کا فولاد یخ ہوگیا۔ اور وقت کی تبدیلی کا احساس ہمارے شعور میں ابھرا۔ اور ہمارے اندر طمانیت کا احساس پیدا ہوا کہ ایک دم سے قبر کے اندر سے مزدور گھگھیا پڑا۔ گ گ گ ۔ای، ای، ای۔ تو ای نکلی۔ کُ کُ کُ کھو۔ اور جب ہم لپک کر ادھر پہنچے تو ٹوکری اوپر آچکی تھی۔ میں نے چھوٹی سی ٹارچ سے شعاعیں پھینکیں اور دیکھا، تو بڑی مشکل سے چیخ روک سکا۔ ملبہ بھری ٹوکری کے اوپر لمبے لمبے دانت نکوسے آنکھوں کے مہیب گڑھے پھیلائے پیلی کھوپڑی رکھی تھی۔ جس کے بیچوں بیچ ابھی کدال کی ضرب سے دراڑیں پڑی ہوئی تھیں اور چورا چورا تھی۔ حیرت کی مخصوص آواز تو سبھی کے منہ سے نکل گئی۔ مگر میرے اندر روائے شاعر نے پھڑک کر گہرے کرب کے انداز میں آواز دی "ارے کم بخت! تو نے زر کے لالچ میں ہزار سالہ مردہ اکھیڑ پھینکا" لیں حالت غیر ہوگئی۔ بندوق ہاتھ سے سرک کر ایک جانب جا پڑی، حواس درست رکھنے کی بہتیری کوشش کی۔ مگر ایک عجیب سی کیفیت۔ جیسے چکر سا آگیا، میں ڈانواڈول ہوگیا، سنبھلنے کی کوشش میں غیر حالت کا اندازہ کرکے ان لوگوں نے مجھے سنبھالا اور میں جیسے چیتھڑے کی طرح ان کے ہاتھوں پر آگیا۔ پا بدستے دگرے دست بدستے دگرے مجھے لے کر چلے تو اتنا احساس ہے کہ جوار باجرے کے بھیگے دھار دار پتے چہرے پر خراشیں ڈال ڈال کر اوس کے قطرے چھینٹے سے مار مار کر گویا مجھے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ گھر تک پتہ نہیں دو تین فرلانگ کا فاصلہ اونچی فصلوں کے اندر ان لوگوں نے مجھے لادے طے کیا یا کس طرح، سب کے سب دل میں چور لئے ہوئے تھے لہذا بجائے حویلی کے اندر لے جانے کے دیوان خانے کی ایک صحنچی میں لے جا کر ڈال دیا۔ بڑے زور سے جاڑا چڑھا۔ یہ لوگ شاید جتنی دیر جاڑا چڑھتا رہا مکمل رضائیاں ڈالے دبائے رہے، پھر تیز بخار آیا۔ جاڑے کے بعد بخار کا نشہ بڑا پُر سرور ہوتا ہے، مگر ابتدائی سرور اور اس کے بعد کی غفلت میں بھی اس کم بخت دانت نکوسے کھوپڑی نے میرا پیچھا نہ چھوڑا۔ آنکھوں کے گول گول گڑھوں میں سے جواب طلب کرتی رہی۔ کیوں میاں تم نے مجھ بدنصیب کو زر کے لالچ میں ہزار سالہ نیند سے جگا کر پاش پاش کر دیا!؟!

اکتوبر کے بڑھتے ہوئے موسم کی سردی، کئی روز سے تمام رات کا جاگنا، گنواری نمی، اور شاید داخلی کشمکش سب مل ملا کر اعصاب پر مسلط تو کل ہی شب سے ہو چکے تھے آج جاڑے بخار کی صورت بھرپور دبا لیا۔ بظاہر علامات ملیریا کی تھیں۔ اڑتالیس گھنٹے بے ہوش پڑا رہا، قارز کے شکار اور جاڑے بخار، ساری

رات واہی تباہی پھرنے" کا اسکینڈل حویلی کے اندر پہنچا تو امی جان بہت چراغ پا ہوئیں، بیگم بخار میں بھی طنز و تشنہ کے تیر برسانے سے نہ چوکیں۔ گھڑی گھڑی دونوں پردہ کرا کرا احوال پرسی کے لئے آتی ہیں۔ کچھ دوائیں دی گئیں، کہیں اڑتالیس گھنٹے بعد پسینے کے سیلابوں سے گزر کر بخار اترا۔ اور ہوش سا آیا تو اس ہفتے کی روئداد خون کے اندر ناگن کی طرح لہرانے لگی۔ اور لہراتی لہراتی پچھلے چار ماہ کی ذہنی مصروفیتوں اور مسلسل امیدوں اور نتیجہ میں طلب مجہول تک جا پہنچی۔ اور اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ رہ رہ کر سینما کے اسکرین کی طرح سامنے آتی رہی اور بخار زدہ آنکھوں کے روبرو تتلیوں کی طرح ناچتی رہی۔ جب حواس درست ہوئے تو دونوں برادران خوردا اندر آئے۔ ملول، چہرے اترے ہوئے، پرسش احوال بعد کو کی پہلے متنبہ کیا کہ قبر کے کھودنے کا اسکینڈل بستی میں عام ہو گیا ہے مگر خدا کا شکر ہے، سب گھر والے، تمام بستی والے اس کو دفینہ کھودنے والے ڈاکوؤں کی حرکت سمجھ رہے ہیں جو ایک مدت سے کمشنری کے اضلاع بھر میں سرگرم عمل سنے جاتے ہیں اور بھانت بھانت کی افواہیں آئے دن اڑتی رہتی تھیں۔

بستی کے جہلا اور اپنے اکثر ملازم اس سڑی مشکائی رکھوائے ملازم کے بیان پر یقین کئے ہوئے ہیں جس نے پہلے روز پیر کے قبر پھاڑ کر نکل جانے کی اطلاع دی تھی۔ . . . دلے بخیر گزشت۔ قدرت کی جانب سے پردہ پڑ گیا۔ ان لوگوں نے مجھے ہوشیار کر دیا۔ میں نے تمام روئداد سن کر سوال کیا۔" اور وہ تینوں، حافظ لڈن خاں؟" دونوں بھائیوں کے چہرہ پر رنگ آ گیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی جانب عجیب سے انداز میں دیکھا، اور ذرا رک رک کر بولے:" ارے بھائی جان۔ وُہ وہ تو بڑے گہرے سازشی بدمعاش نکلے۔ ہوں روز اول سے اپنی ڈیوٹی فصلوں کے کناروں سرحدوں پر لگوائی تھی۔ ہوں، نگرانی پر مامور تھے، وہ روز ہر صبح ہمارے ساتھ ہی واپس ہوتے رہے اور تمام دن نوکروں کی کوٹھریوں میں اینڈتے، کھاتے پیتے، پڑے سوتے رہے مگر اس روز صبح کو نہیں پہنچے کچھ دیر ہم نے انتظار کیا کہ فصلوں میں سے آ جائیں گے پھر ان کے ٹھکانے پر جا کر دیکھا تو غائب تھے۔ وہ تو ہوا میں زائل ہو گئے فصلوں ہی فصلوں غائب، ہمارا ماتھا ٹھنکا۔ آپ جانئے اونچی اونچی فصلوں کے اندر صبح ہی صبح اوس کے سہارے کھوج اٹھا لینا بہت آسان تھا۔ کھوج بتا رہے تھے کہ آدھی رات سے قبل ہی قبل ہمیں احمق بنا کر اور اس قبر پر لگانے کے بعد ذرا دیر میں اپنی اپنی جگہوں سے ہٹ کر ادھر درگاہ کے پورب میں جو اندھی قبر کہلاتی ہے وہاں سرک گئے تھے۔ ہوں اور اندھی قبر اکھڑی پڑی تھی۔ اور تین نشان نہایت نمایاں تعویذ کے عین نیچے ایسے تھے جیسے تین برتن اکھیڑے گئے ہیں۔ دیگ کے پیندے

جن کے جوڑیوں کے نشان اور تعویذ کے ملبے میں ٹوٹے پھوٹے نمایاں تھے، اونچائی چھوٹی دیگوں کے برابر تھی۔ اور بھائی تین اونٹوں کے کھوج، پاؤں کے نشان بھی اور فصل میں چرائی کے بھی۔ ان کا اصل گروہ اطمینان سے، ادھر کھدائی کرتا رہا اور ہمیں ادھر الجھادیا درحقیقت وہ ہماری نگرانی کرتے رہے کہ کہیں ادھر متوجہ نہ ہوں۔ مگر انہوں نے کھدائی کب شروع کی؟ میں نے سوال کیا: کھوج بتاتے ہیں کہ ہماری کھدائی سے دوسرے روز شب میں اور اونٹ پہلی شب میں نہیں آئے جب برتن نمودار ہو گئے تب اونٹ لائے گئے۔" ڈیپ ڈٹیڈ کانسپریسی" میں نے ہی سانس لے کر کہا۔ ہوں تبھی تو انہوں نے کھدائی کے لئے مزدور بھرتی کر لینے پر اعتراض کے بجائے بخوشی قبول کیا۔ یہ تو ان کے لئے عین سازگار تھا بلکہ انہوں نے پہنچتے ہی اظہار بھی کیا تھا کہ ہم تو خود ہی یہ تجویز پیش کرنے والے تھے کہ مزدور لے لئے جائیں۔"

"تو پھر تم لوگوں نے کیا کیا؟" میری بخار زدہ آواز میں غالباً محاسبہ اور تحکم کا انداز تھا اور منجھلے بھائی نے روہانسی شکست خوردہ آواز میں کہا: "بھائی جان کر بھی کیا سکتے تھے، وہ بھی تو نہیں جس کو مار پیچھے پکارتے ہیں۔ یوں سمجھئے سانپ نکل گیا اور ہم ٹھیک سے گھسیٹن بھی نہ پیٹ سکے۔" چھوٹے بھائی نے ان کے منہ سے بات لے کر آگے بڑھائی، ہوں بھائی جان علی الصبح تک ہماری تین راتوں کی کارگزاری پتھر والی قبر کی کھدائی کا حال تو کسی کو معلوم ہی نہ تھا بجز ان تین مزدوروں کے، سو وہ کھوپڑی سے اتنے خوف زدہ ہیں کہ آج تک گھر سے باہر نہیں نکلے ہیں۔ آپ کو افتاں خیزاں یاں بستر تک پہنچا کر ہم نے سب سے پہلے جائزہ لیا تو یہ اندازہ کیا کہ ہمارے تینوں شریک کار جیسے چھلاوہ ہو گئے۔ ان کی رات کی دیدبانی کی جگہ سے کھوج لئے اور یہ کھوج شروع رات ہی کے تھے: مطلب یہ ہے کہ یہ تینوں ہمیں پتھر والی قبر پر جتا کر فوراً ہی ادھر چل پڑے تھے؟" میں نے پوچھا۔ "جی بالکل بالکل چھوٹے بھائی نے جواب دیا۔ اور سلسلۂ کلام جاری رکھا اور کھوج لیتے لیتے ہم اوندھی قبر تک جا پہنچے اور وہاں سے کئی اور غالباً تین آدمیوں کے ساتھ تین اونٹوں کے بھی کھوج اٹھا کر چلے تو شاہی زمانہ کی کچی سڑک کے کنوئیں تک جا پہنچے جہاں پیپل کا بڑا درخت کھڑا ہے یہاں پہنچ کر دیکھا تو پتہ چلا کر چار اونٹ اور کئی آدمی اور پڑاؤ کئے منتظر تھے؛ اب یہاں سے سات اونٹ ہو گئے۔ اور کم و بیش دس بارہ آدمی۔ ہم نے فوراً گھر پلٹ کر گھوڑیاں کسیں اور پستول بھر کر جیب میں ڈالے اور شاہی سڑک پر اونٹوں کے کھوجوں کھوجوں چل پڑے، حالانکہ طلب مجہول تھی وہ جس کو انگریزی ضرب المثل میں کہتے ہیں۔ (WILD GOOSE CHASE) کیونکہ ہمیں کھوجوں سے روانگی کے وقت اور رفتار کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اگلے نگھنٹ

ہو چکے تھے، اور خوب سمجھ رہے تھے کہ اب تک کم از کم چالیس پچاس میل کا دھاوا مار چکے ہوں گے۔

بہرحال، ہوں، اور کرتے بھی کیا، آگے بڑھے تو اپنے سڑک کنارے والے امرود کے باغبانوں سے دریافت کیا۔ انہوں نے ہراساں ہراساں بتایا کہ آدھی رات گئے اونٹوں کا ایک تیز رفتار قافلہ گزرا ہے جن کے گلے میں گھنٹی نہ تھی۔ اور بلا گھنٹی کے اونٹ رات کے وقت ہمیشہ ڈاکوؤں کے ہوا کرتے ہیں۔ ہم شروع ہی سے اندازہ کئے ہوئے تھے کہ تعاقب بے وقت دبے کار ہے۔" میں نے بات کاٹ دی" اور اگر بر وقت بھی ہوتا تو بھر پور گھمسان کا مقابلہ ہوتا۔ وہ بھی مسلح ہوں گے۔" "تب تو ہم بھی ایسے نہ چل پڑتے یہ کھلونے پستول جیب میں ڈال کر، سو سوا سو جوان لے کر بڑھتے۔" اور بھائی جان کہیں دوپہر تک ہم دونوں بستی میں واپس پہنچے تو اونچی اونچی فصلوں کی آڑ سے دونوں راز باہر آچکے تھے اس سڑی سٹائل رکھوالے کے ذریعے بھر والی قبر کی بات بھی آرے آرے ہو چکی تھی، جتنے منہ اتنی باتیں۔ وہ لے بخیر گذشت، دونوں کھدائیاں ڈاکوؤں کے ہی سر تھوپ دی گئیں تھیں اگرچہ بستی کے جہلا کا ایک طبقہ ابھی تک یہی سمجھ رہا ہے کہ دونوں پیر قبریں پھاڑ پھاڑ کر نکل گئے۔ تایا ابا ذرا متاسف تھے خاص طور پر اپنی حد میں اس طرح چیرہ دستی ہو جانے پر دفینہ کے ہاتھ نہ لگنے سے زیادہ اپنی سبکی محسوس کر رہے ہیں مگر کیا کرتے سب کے سب کلائیاں بھنبھوڑ کر رہ گئے۔ تاہم ایک سمجھدار مدبر سردار کی طرح انہوں نے بات جہاں کی تہاں دبا دی ورنہ اندیشہ تھا کہ اگر کوتوالی میں اطلاع ہو گئی تو پولیس خواہ مخواہ بستی والوں کو پریشان کرے گی اور ہونا ہوانا کچھ ہے نہیں۔ حاصل نہ وصول۔ لہذا انہوں نے تیسرے پہر تک اس ملبہ کو قبروں کے گڑھے میں بھروا کر ہمیشہ کے لئے اس کارروائی کو دفن کر دیا۔" "خوب" میں نے کہا۔" ہوں، تو یوں کہو ہمارا راز قدرتِ الٰہی سے ہمارے سینوں میں محفوظ ہو گیا۔" ہوں ہوں بالکل بالکل کسی کو گمان نہیں، بس ان تینوں مزدوروں کی دبے بھی ڈر کے مارے زبان بند تھی ادھر ہم نے مزید تاکید کر دی۔ میں نے کہا:"میاں اللہ کا شکر ہے۔ نقصان گراں مایہ تو ہوا ہی تھا، شماتت ہمسایہ سے بچ گئے۔

کئی روز ہم ہزیمت خفت اور رنج و حیرت کا شکار رہے ادھر اُدھر میں بھی رہے اور دوسرے ذرائع سے خبریں منگانے کی کوشش بھی کرتے رہے، ویسے یقین تھا کہ مال لے کر برٹش سرحد پار کر کے ریاست کے حدود میں گھس گئے۔ مگر چند روز بعد خاص ذرائع سے خبر ملی کہ لڈن خاں کا قافلہ پہر بھر دن چڑھتے چڑھتے بے خرخشے دھاوا مار کر ریاست کے حدود میں داخل ہو گیا تھا اور تمام دن ایک گھنے جنگل میں چھپا رہا اور شام کو نکل کے

نکل کر ریاست کے قصبہ شاہ آباد کا رخ کیا، کچھ دور چلنے کے بعد جب ربیع کے جتے ہوئے میدان میں سے گذر رہا تھا تو اسی جنگل میں سے دوسرے رُخ سے ریاست کی پولیس اور فوج نے نکل کر گھیر لیا۔ اور سب مال چھین لیا، کل سونا داخلِ خزانہ عامرہ ہوا اور سب اونٹ داخلِ اشتر خانہ شاہی۔ اور یہ موچی کے موچی رہ گئے۔ اور ان سب کو تھکوا کر پھنا کر بجائے کیس چلانے کے ریاست کی مختلف اور متضاد سرحدوں پر لے گئے اور دو لاتیں پیچھے سے رسید کر کے برٹش حدود میں دھکیل دیا۔ اور یہ کہ ریاست کی خفیہ پولیس ہمیشہ مہم جوؤں کے پیچھے لگی رہتی ہے جو ریاست کے اندر سے جستی پتروں پر کندہ بیجکوں اور پرانی سندوں پر تحریر پتہ سے دفینوں کا سراغ لگاتے کمشنری کے جنوبی اضلاع میں خصوصاً نواب دوندا خاں کی حلقہ گورنری کے علاقوں میں روہیلوں کا دفینہ کیا ہوا خزانہ ڈھونڈنے جایا کرتے ہیں اور قبریں ٹیلے کھودتے ہیں، اور اس سال تو اندھیری راتیں ہونے کے سبب بہت چوکنے تھے اور ممکن ہے کہ ہمارے چلنے ہی سے پیچھے لگے ہوں۔ اور کون جانے خود للّن خان کے گروہ میں ہی کوئی ایسا ویسا آدمی ساربان یا کھدائی کرنے والا شروع ہی سے شامل ہو۔ اور چھوٹے بھائی نے اپنی قانونی فکر اور استعداد کے مطابق گپ شپ کے طور پر ایک تیکھا نکتہ نکالا "بتایئے ریاست کے ایڈمنسٹریشن نے ان پر کسی قسم کا کیس کیوں نہ چلایا، جبکہ مانی ہوئی بات ہے کہ خاص طور پر اس ریاست کی پولیس اور ایڈمنسٹریشن ظالم کی حد تک سخت گیر ہے۔" ہم کچھ نہ سمجھے تو انہوں نے بتایا کہ انگریزی قانون کی رو سے برٹش انڈیا کی حدود میں کہیں بھی ہو زیر زمین تمام دولت خواہ دفینے ہوں یا کانیں وغیرہ تاج برطانیہ کی ملکیت مانی جائیں گی۔ یہ دفینہ اگر ریاست کے اندر بھی کہیں برآمد ہوگا، تو بھی ہز ہائینس کا مال نہ تھا، جبکہ للّن خاں اپنے باپ کا مال تصور کر کے خاص برٹش حدود سے چرا کر لا رہا تھا، ویسے قانونی طور پر ہونا یہ چاہیئے تھا کہ ریاست پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے ذریعہ یہ مال اور سب ملزم گورنمنٹ آف انڈیا کو حوالے کر کے ڈسپوزل کے لئے بھیج دیتی، مگر بد نصیب چند کے ساتھ رہزنی ہوئی، اور زبردست رہزن نے اسی طرح اپنا مال تصور کر کے ہتھیا لیا جس طرح سوا سو برس قبل دشمن سے ساز باز کر کے یہ ریاست حاصل کی تھی، اور اپنے وقت کی بہترین فوج بجائے منظم کرنے کے ڈس بینڈ کر دی تھی، اور میں للّن خان کے ہاتھوں ابھی تازہ تازہ شدید چوٹ کھائے ہوئے تھا لیکن یہ سن کر مجھے خوشی کے بجائے عبرت ہوئی۔ سوا سو برس بعد سلطنت کے ساتھ سونا بھی حافظ رحمت خان سے روگردانی کر گیا اور اسی سردار کے قبضہ میں پہنچا جس نے روگردانی کر کے سلطنت کے ایک ضلع کا رئیس بن جانے پر اکتفا کر لیا تھا اور بارہا آزمائے ہوئے سونے کے مزاج اور رویہ کے متعلق ایک اور تجربہ ہوا کہ بہتے پانی کی طرح یہ کم بخت اپنی سطح خود تلاش کرتا ہے نہ للّن خاں ہی اس کے

اہل تھے نہ ہم ہی۔ سوا صدی پھر برطانوی حدود میں ایک جعلی قبر کے اندر تاجِ برطانیہ کی قانونی ملکیت بنا آسودہ پڑا رہا اور وہاں سے جو اکھڑا تو جیسے اپنے پاؤں چل کر اسی کے خزانہ میں جا پہنچا جس نے تاج برطانیہ سے حلفِ وفاداری اٹھا کر اپنے اصل آقا سے روگردانی کی تھی۔ تاریخ کا پہیہ ایک مرتبہ پھر اسی گردش پر گھوم گیا۔ ۔ ۔ ۔

اس سے پہلے جیسا کہ اوپر اشارتاً بیان کیا حافظ للّن خاں سرقہ بالجبر کے کام میں لگے ہوئے تھے اس میں بہادری اور سختی پھرتی سے زیادہ خاموشی، عیاری اور شاطرپن سے کام لیا جاتا ہے اور یہ ان کی زبان میں داب کا کام کہلاتا۔ اور پولیس کی دفتری اصطلاح اور بول چال میں "داب کی ڈکیتی" کہتے ہیں۔ اور تعزیراتِ ہند کے ترجمہ میں مداخلتِ خانہ وسرقہ بالجبر دو جرائم سے مرکب ایک جرم ہے۔ حافظ جی شروع جوانی ہی سے اس کام پر لگ گئے تھے، بتایا کرتے تھے کہ یہ کام اکثر و بیشتر حلقہ کی پولیس کے سازباز سے کرتے رہے ہیں۔ کسی مناسب موقع اور اپنے ڈھب کے لئے اندر باہر ہر پہلو سے سازگار حالات کے گھیر میں مختصر گروہ کے ساتھ دبے پاؤں ٹکسالی چوروں کی طرح آدھی رات داخل ہوتے یہ گھر بالعموم کسی صراف، ساہوکار، مہاجن، آڑھتی بنئے کا ہوتا جنہیں نقد اور زیور پاس رکھنا ناگزیر ہوتا ہے، اور سب چھوٹے بڑے گھر والوں کو بستروں پر سوتے ہوئے دبا لیتے جس وقت آنکھ کھلتی تو کم بخت سینہ پر دس انچ لمبے خنجر کی نوک ٹکی دیکھتا اور چیخنے بولنے کا انداز بتاتا تو فوراً ہی منہ پر مٹھی آجاتی، اٹھنے کا انداز ہوتا تو پیٹ پر ایک گھٹنا ٹیک دیتے۔ اور اس صورت میں خاص کوئی یا عورت کو خنجر ٹیکے ہی ٹیکے بستر سے کھڑا کرتے، اور اب خنجر کی نوک پیٹھ پر آجاتی، تجوری الماری وغیرہ اسی سے کھلواتے اور مال حاصل کر کر کے اکٹھا کرتے جاتے اور پورا پورا تالیفہ کرکے اگر ضرورت سمجھتے تو منہ میں کپڑا ٹھونس کر یہیں چھوڑ دیتے ورنہ خنجر کی نوک پر ہنکا کر کسی ایک متداخل کمرے کی کوٹھری میں بند کرکے خراماں خراماں چلے آتے۔ اڑوس پڑوس میں بھی کہیں دن چڑھے خبر ہوا کرتی کہ رات داب کی ڈکیتی ہو گئی۔

ریاست کی پولیس نے مال ضبط کرکے انہیں متضاد سمتوں سے ریاست بدر کر دیا اور اپنے نزدیک منتشر کر دیا لیکن ہفتہ عشرہ کے اندر جیسے لوٹے کہ یہ سب کے سب ایک دوسرے سے آملے۔ اور یہ وہ زمانہ تھا جب عالمی جنگ کے سبب زرعی پیداوار کی قیمتیں یکایک دس گنی سے بیس گنی تک چڑھ گئی تھیں۔ دیہات کے اندر معمولی معمولی حیثیت کے زمینداروں اور ادنیٰ کسانوں کے گھروں میں ہر قسم کی دولت چاندی سونا نظر آتا تھا۔ شاید اتنی بڑی دولت ہاتھ میں آکر یوں بے شان گمان نکل جانے کے ردعمل میں حافظ للّن خاں کے اندر شدید کمپلکس ابھرا جس نے ہولناک جھنجھلاہٹ کا روپ دھار لیا، اس کے توریثی اور آبائی مال

پر مریکا ریاست کے ایڈمنسٹریشن نے رہزنی کی تھی۔ دماغ کے اندر جیسے غارت گری کے بگولے سنسنا پڑے، کھٹی میں پڑا ہوا سرقہ بالجبر کا چسکا پانچ سال کی نیند سے بھوت کی طرح انگڑائی لے کر پھر ابھر پڑا۔ داب کے کام میں تو لڑکپن ہی سے منجھے ہوئے تھے۔ اب دوسرے راستوں پر بھی چالو ہو گئے جو زندہ یا بندہ، اس قطار کے بھی ماہر آملے، تکنیک ضرور اک ذرا مختلف تھی مگر عمل اور نتیجہ ایک ہی تھا۔ خاصہ جتھہ بن گیا۔ پہلے انہوں نے دیہات کے اندر نسبتاً ویران راستوں پر ہاٹوں اور نخاسوں اور قصبوں کی منڈیوں سے مال بیچ کر واپس آتے ہوئے دیہاتیوں اور مال خریدنے کے لئے شہر سے دیہات جانے والے بیوپاریوں اور آڑھتیوں کے گماشتوں کو لوٹا۔ داب کا کام نسبتاً آسان تھا مگر کہیں دو تین مہینے پیچھے ایک آدھ موقع لگ پاتا تھا لیکن رہزنی میں مزہ بھی زیادہ آتا تھا اور چاہتے تو ہر رات موقع ہو سکتا تھا۔ آج اس سڑک پر کل اس لیکھ پگڈنڈی پر۔ دن چھپے چھپتے پھر مار دھاڑ تھوڑی بہت مدافعت کی کوشش الٹا سیدھا مقابلہ، اور شکست دینے کا سُرور، اسی اثنا میں فوج کے بھاگے ہوئے کچھ پرانے شناسا مل گئے جو نام بدل کر فوج میں بھرتی ہی اس لئے ہوئے تھے کہ ڈکیتی وغیرہ کے سنگین جرائم میں ماخوذ تھے اور پولیس پیچھے لگی ہوئی تھی۔ ویسے للّن خان کے گروہ کے پاس اپنی ریاست کے بنے ہوئے بھی اور ولائتی آتشیں اسلحہ کی کمی نہ تھی لیکن ان فوجیوں کے پاس کئی سروس ریوالور اور ایک خودکار برین گن اور دو تین مسکٹیں تھیں اور کارتوسوں کی کئی پیٹیاں تھیں اور یہ لوگ فوج سے بھاگے ہی اپنا پرانا دھندا کرنے کے لئے تھے۔ ان کے ساتھ مل جانے سے للّن خان کے گروہ کی قوت ایک اور ایک گیارہ ہو گئی۔ انہوں نے استعداد کے مطابق گروہ کی تھوڑی بہت فوجی اصول پر تنظیم کی اور اس طرح نظم و ضبط کی ہلکی سی جھلک ہی سے بات بن گئی جنگلوں کے اندر محفوظ پناہ گاہیں اور سپلائی کا سامان رکھنے کے لئے مناسب ٹھکانے قائم ہو گئے، ادھر للّن خاں نے اپنی جولانگاہ کے طول و عرض میں تقریباً ہر چھوٹی بڑی بستی کے اندر رفتہ رفتہ اپنے آدمی بنا لئے اس طرح ان لوگوں کے ذریعہ دیہات میں مال کی آمد اور مال والے گھروں کی نشاندہی اور رہنمائی ہونے لگی۔ ایسے لوگ بالعموم للن کے دستِ گروہ کے مخصوص لوگوں کو موقع اور ماحول، آمد، مداخلت اور فرار کے راستے دکھلا دیتے اور گھر بیٹھے اپنا حصہ پا لیتے۔ ان میں کے بعض جیالے رات کو دوش بدوش ساتھ ہو لیتے تو ڈبل حصہ پاتے کمایوں گڑھوال ڈویژنوں کا میدانی حصہ اور روہیلکھنڈ ڈویژن کا شمالی حصہ گھنے جنگلوں سے ڈھکا ہوا ہے یہ یہاں سے نکل کر سکھا شاہی اور مرہٹہ شاہی انداز کی ٹکسالی ڈکیتیاں تینوں کمشنریوں کے اضلاع میں اور ریاست کے دیہات کے اندر مارا کرتے۔ خبر رسانی کا یہ جال اتنا مربوط اور

وسیع تھا کہ پولیس کے چنگل سے بھی بچے رہے اور مہینہ میں دس پندرہ راتیں ڈکیتیاں بھی مار لیتے ویسے پولیس سے جھڑپیں بھی ہوئیں ورنہ اکثر ایسا ہوتا کہ پولیس ان کے تعاقب میں ہوتی اور یہ پولیس کے، اور بالعموم یہ لوگ اسی وقت پولیس کی کارگذاری کے پیچھے پیچھے اپنی کارروائی کرتے ہوتے۔ اس زمانہ میں جرائم کی خبریں اتنی صحافیانہ فراخدلی کے ساتھ اخباروں میں نہ چھپا کرتی تھیں۔ افواہیں دلؔی نوؔ اور نوؔ کی ننانوے ہو کر گوش بہ گوش تیرا کرتیں جس میں ہولناک مظالم کے ساتھ ساتھ پولیس کی تضحیک اور گروہ کی سرگرمیوں کا تذکرہ مثبت انداز میں ہوتا، یہاں تک افواہیں اڑتیں کہ اپنی ہانٹ کے ہر تھانے کے اسٹاف میں لڈن خان کے تنخواہ دار ایجنٹ موجود ہیں جو پولیس کے منصوبوں اور نقل و حرکت سے آگاہ رکھتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ لطیفے اور کہانیاں، ڈکیتوں کے متعلق پرانا گھسا پٹا خواہ مخواہ کا پروپیگنڈا کہ مال داروں کو لوٹ کر غریبوں کی مدد، کسی مظلوم کمزور کی دادرسی میں کسی جابر زمیندار یا بیاج خور ساہوکار کی گوشمالی، کسی تھانیدار کو پکڑ لینے کے بعد چھوٹے چھوٹے بچوں کا حوالہ دینے پر رحم کھا کر اور آئندہ کے لئے توبہ کرا کر صرف زندہ چھوڑ دینے اور پستول چھین لینے کا گڑھا ہوا واقعہ ــ وغیرہ وغیرہ یہاں تک کہ پولیس سے ایک اچھا معرکہ ہوا جس میں آرمڈ کانسٹیلری کے دو جوان مارے گئے اور کئی شدید زخمی ہوئے اور ستم یہ کہ پورا گروہ صحیح سلامت فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تصویروں کے روزناموں میں خبر چھپی اور سب کمشنریوں کے ہفت روزوں میں آرٹیکل اداریئے وغیرہ نکلے جن میں لڈن خاں اور بچو خاں کے نام نامی گروہ کے سرغنہ کی حیثیت سے نمایاں چھپے۔ ساتھ ہی ایڈمنسٹریشن کی مشنری ذرا زور کے ساتھ حرکت میں آئی۔

اور پھر ایک دن آیا جو دن ایسے ظالموں کے لئے مقدر ہے۔ کسی پرانے کھنڈر میں گروہ کے تمام رنگ لیڈر جمع تھے آرمڈ کانسٹیبلری کے ایک اچھے دستے نے سراغ لگا کر چھاپہ مارا۔ پہلی جھڑپ میں اپنی افتادِ طبع کے تقاضہ کے تحت کمان خان نے اکھڑپن سے کھل کر مقابلہ کرنا چاہا اور مارا گیا۔ کچھ دیر کھنڈر کی آڑ میں سے ہوائی فیروں کا تبادلہ ہوا اور پھر اتنے میں گھوڑ سوار پولیس کی مزید کمک آ پہنچی پورے گروہ نے ہتھیار ڈال دیئے۔ گرفتاری کے بعد کئی اضلاع کے تھانوں کے حلقوں میں گینگ کیس کا اسپیشل لا نافذ ہوا۔ پولیس نے اس گروہ میں سے دو ایک ذہین آدمیوں کو رہائی اور معافی کا سبز باغ دکھلا کر سلطانی گواہ بنایا۔ اور پولیس کی تفتیش میں چراغ سے چراغ جلتے ہی چلے جاتے ہیں بس بتی اور تیل "فدوی" فراہم کرتے ہیں۔ پورے طول و عرض میں بڑی زبردست پکڑ دھکڑ ہوئی کچھ روپوش ہو گئے بہت سے جن پر خفیف جرم عائد ہوتا تھا یا جن

کے خلاف ثبوت کمزور تھا رشوت دے کر جان بچالے گئے۔ غرض خاص خاص رنگ لیڈر ہی رہ گئے۔ گینگ کیس کے اسپیشل لا کے بموجب خاص پولیس تو تعینات تھی ہی، ایک دو اسپیشل پراسیکیوٹر ماہر مُقنن اور کیس کی ابتدائی سماعت کے لئے دو تجربہ کار اسپیشل مجسٹریٹ اور قطعی فیصلہ کے لئے ایک فاضل جج کی عدالت قائم ہوئی۔ دوران مقدمہ پھر بیسیوں غیر متعلق نئے نئے نام ہمارے کانوں میں آتے رہے۔ اور یہ سنا کہ لڈن خاں اور بجھو خاں گروہ کے سرغنہ قرار دیئے گئے ہیں اور ان دونوں پر تقریباً ڈھائی سو ڈکیتیاں اریج کرا کر ڈالنے کا الزام ہے جن کے ساتھ چودہ قتل لگے ہوئے ہیں اور بے شمار ضربات شدید، آبرو ریزی اور آتشزدگی کے جرائم ہیں۔ آرمرڈ کانسٹیبلری کے دو جوانوں کے قتل ان کے علاوہ تھے۔ درِ عدالت پر تماش بینوں کا ہجوم رہا۔ اور حیرت کی بات یہ ہے لڈن خاں اور بجھو خاں کا کوئی پیرو کار نہ پہنچا حد ہے کہ جج میں کسی وکیل نے پیروی بھی نہ کی۔ جج کو ان کے ڈیفنس میں خود ہی جرح کے سوال کرنے پڑے اور وہیں سے تماشائیوں میں چہ مگوئیاں ہونے لگیں کہ تین چار سال کے اندر علاقہ کا علاقہ لوٹ لیا وہ دولت کہاں ہے؟ لوگوں نے خیال کیا کہ ان ابتدائی عدالتوں سے چھوٹنے کی امید نہیں ہے لہذا وکیل کھڑا کرنا اور پیروی کرنا بیکار سمجھا ہائیکورٹ میں ضرور کسی بڑے بیرسٹر سے اپیل میں بحث کرائے گا۔ عدالت جج سے لڈن خان اور بجھو خان اور کئی اور کی قید با مشقت کا میزان جرائم میں سب ملا کر سو سو سوا سو برس آیا اور کئی کے ساتھ ان دونوں کو بھی سزائے موت کا ٹھپ کا بند لگا ہوا تھا۔ مگر تماش بینوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب یہ معلوم ہوا کہ ان کے اپیلوں کے ہائیکورٹ کا خرچہ بھی نادار ملزموں کے فنڈ سے گورنمنٹ نے اٹھایا اور مناسب فیس ادا کر کے ایک ہائی کورٹ کے وکیل کی فیس سرکاری خزانہ سے ادا ہوئی، اپیل میں ہائیکورٹ نے عدالت ماتحت کا فیصلہ برقرار رکھا لیکن سننے میں آیا کہ تراحم خسروانہ (MERCY PETITION) میں حافظ لڈن خان کی سزائے موت کو حبس دوام میں تبدیل کر دیا اور بقیہ سبھوں کو مع بجھو خان کے پھانسی ہو گئی۔ پھر سنا کہ حافظ لڈن خان بنارس سینٹرل جیل میں عمر قید کاٹ رہے ہیں۔ پھر افواہ سنی کہ نمازی تو خیر ہمیشہ کے تھے جیل کے اندر سچ مچ تائب ہو گئے۔ اور دل پھر گیا ہے۔ ہمہ وقت توبہ استغفار کا ورد کرتے رہتے ہیں اور پھر کچھ عرصہ بعد تماش بینوں کی دلچسپیوں میں سے لڈن خان کا باب بند ہو گیا۔ اور شاید ان مظلوموں کے ذہنوں میں بھی دھندلا گیا ہو جو ڈکیتیوں میں اس کا شکار ہوئے تھے اور اب تو ایک مدت سے پہلی نیند کی جھپکی میں اس کدال کی پھوٹی کھوپڑی نے مجھے بھی دانت نکوس نکوس کر اور آنکھوں کے گڑھے گھما گھما کر نہ ڈرایا تھا۔ اسی عرصہ میں برصغیر کے اندر

سیاسی بھونچال آ گیا اور غم جاناں اور غم دوراں تو آدمی کے ساتھ لگے ہوتے ہیں اس بھونچال نے آدمی کو سائنیت ہی سے خارج کر کے مسخ کر دیا۔ جب ابتدائی جھٹکوں کو ذرا سکون ہوا اور خال خال آدمی آدمیت بحران میں آیا تو اور بہت سوں کے ساتھ یہ افواہ بھی سنی کہ حافظ جی بنارس جیل سے وارڈروں کو جل دے کر فرار ہو گئے اور پولیس تلاش کر رہی ہے۔ تاہم اس ضمن میں شروع سے آخر تک جتنی سنتے چلے آئے تھے یہ بھی ہمارے لئے گاؤ آمد و خر رفت تھی۔

پتھر والی تبر کی کھوپڑی کے کچلنے کی ٹریجڈی کو نواں سال تھا، اس عرصہ میں سب بلائیں تمام ہو کر مرگ ناگہانی بھی باقی نہ رہی تھی۔ تاریخ کی نو پچھلی اور شاید نو ہی اگلی صدیاں سماجی بلٹا اور سیاسی بھونچال ملیامیٹ کر کے ہڑپ کر گیا تھا۔ اس رستخیز میں لاکھوں پہاڑ روئی کے گالے کی طرح اڑ کر اور اپنی جڑوں سے اکھڑ کر کرچی میں ڈھیر ہو گئے تھے اور اس ڈھیر میں ٹوٹے ہوئے ستارے کے ایک ٹھنڈے پتھر کی طرح میں بھی آ پڑا تھا اور جیکب لائنس کے ایک کوارٹر میں پڑا ہوا تھا۔ بارکوں کے درمیان میدانوں پر بے ترتیب میلی کچیلی جھگیوں کا جنگل اگا ہوا تھا۔ اور انہیں کے درمیان خاص راستہ سے ذرا ہٹ کر ایک جانب نسبتاً بلند سطح پر ایک ستھری سی نمایاں جھگی تھی۔ کبھی کبھی صدر سے واپس آتا تو یہ جھگی اپنی جانب توجہ مبذول کر لیتی۔ خصوصاً جمعہ کی شب میں روشنی مجمع اور خاص نوعیت کے وعظ اور آیاتِ قرآنی کی قرأت کے ساتھ پڑھ پڑھ کر تفسیر کی آواز سنائی پڑتی واعظ بڑا خوش الحان اور کوئی منجھا ہوا پختہ قاری تھا مگر تفسیر اور وعظ کے جو الفاظ رستہ چلتے کان میں پڑتے ان سے واعظ اور قارئین دونوں ہی کے متعلق علمی کم مائگی کا احساس ہوتا۔ پھر حسن خوش الحانی کے ساتھ آیت پڑھتا اسی ترنم کے انداز میں پہلے تقریباً گا گا کر تفسیر کرتا اور پھر وعظ کہتا۔ یہ انداز اور بھی زیادہ کم سوادی کا احساس دلاتا۔ اور میں چلتے چلتے دو ایک آیتوں کی قرأت کا لطف لیتا، سرود ہمسایہ کے انداز میں سنتا چلا آتا۔

ایک مرتبہ گذر رہا تھا تو ٹھہر گیا، قاری صاحب اس وقت خلافِ معمول لمبی قرأت کر رہے تھے غالباً مٹھائی وغیرہ پر فاتحہ پڑھ رہے تھے سورہ الحمد، قل اور الف لام میم۔ اور ؎

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

شعور کی نہری نیند میں حرکت سی ہوئی۔ جیسے یادوں کے اندر ہوش سنبھالنے سے یہ شیریں آواز میرے اندر رچی بسی چلی آ رہی ہے گویا ہمیشہ سے اس پر وجد کرتا رہا ہوں۔ اور نفسیاتی امر ہے کہ خوشبو، رنگ اور نغمگی

ماضی کو یک دم بجلی کے کوندے کی طرح یاد دلاتے ہیں۔ اور اس مانوس آواز کی کشش پر میرے پاؤں جیسے آپ آپ اُدھر کو چل پڑے اور چند قدم کے فاصلہ پر ٹھہر کر بغور دیکھنے لگا۔ اب قاری صاحب لمبی قرأت ختم کرکے اپنے معمول پر آ گئے تھے، قرأت کے ساتھ آیت اور اسی خوش گلوئی کے ساتھ اپنی قابلیت کے بقدر تفسیر اور اپنی فکر و استعداد کے مطابق وعظ۔ میں نے کچھ فاصلے پر علیحدہ کھڑے کھڑے جائزہ لیا۔ گیس کی دو لالٹینیں روشن تھیں۔ ایک خاصا طویل و عریض اور اچھا کئی سیڑھی اونچا چبوترہ جس پر سفید چاندنی لگی ہوئی تھی اور نیچے چٹائی دری وغیرہ کا دبیز فرش ہوگا۔ اوپر ٹین کا ستھرا سائبان پڑا تھا اور پیچھے کوارٹر کی صورت پختہ جگی رہائشی حصہ تھا پیچھے کی دیوار سے گراں ڈیل گاؤ تکیہ لگا تھا، جس کے سامنے سبز مخملی مسند پر قاری صاحب تشریف فرما تھے، دائیں بائیں اور سامنے معتقدین حلقہ بگوش ہمہ تن توجہ جھوم رہے تھے اگربتیوں کے دھوئیں سے فضا معطر تھی۔ ماحول نور ہی نور تھا اور قاری صاحب نور گیس کی روشنی میں قاری صاحب کا لباس، ٹوپی اور پھر خوب گھنی متناسب لمبی چوڑی جھک سفید داڑھی جیسے ٹھنڈے ملک کی کسی مسجد کے دروازے کی محراب میں آسمانی برف کا بڑا سا گالا لٹکا ہوا۔ یہ ماحول قاری صاحب پر اور قاری صاحب اس ماحول میں دونوں ہی سونے پر سہاگہ تھے۔ لمبے چوڑے مرد مشین، خوب گورے چٹے جس وقت قرأت تفسیر اور وعظ کی پُر تقدس خوبصورت، خوش آہنگ آواز بلند کرتے تو چہرہ گلِ انار ہو جاتا، سینہ تن جاتا، اور آنکھیں نیم وا ہو جاتیں، وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی، قرآن تفسیر اور وعظ کے اعجاز میں حاضرین بھی وجد کر اُٹھتے، مجھے ایک مدت سے دوری سے سن کر اس تمام سے رجعت ہوتی تھی۔ ویسے میں بچپن ہی سے قرأت سننے کا شوقین ہوں، مگر علمی کم مائگی خصوصاً وعظ اور تفسیر کی کم سواد اور شاید غلط تاویل، دور سے یہ تماشہ سنتا نکلا چلا جایا کرتا۔ اس وقت ایک دو منٹ کھڑا دیکھتا رہا۔ اور چلنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ مجمع میں سے دو بزرگ صورت آدمی نکل کر میرے دائیں بائیں آ گئے: "تشریف لائیے، تشریف لائیے، داخل حسنات ہو جئے۔" اور سر سے پاؤں تک مجھے پرتلنے لگے۔ میں چلتے چلتے ٹھہر گیا اور رسماً قاری صاحب کا تعارف چاہا: "اجی حضرت مادر زاد حافظ قرآن اور مادر زاد ولی اللہ، بڑے صاحب نسب بزرگ ہیں۔ علم دین اور علم تصوف ہر دو علم کے وہبی طور پر منتہی بنایا ہے اللہ تبارک تعالےٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے۔" اور دوسرے نے بات آگے بڑھائی: "ہمارے پیر صاحب خواجہ صاحب، صابر پیا اور بابا فرید گنج شکر تمام اولیائے کرام نے اپنے اپنے مزار سے ہاتھ نکال نکال کر بیعت کیا ہے اور دستار خلافت عطا فرمائی ہے اور سب نے متعین فرمایا ہے کہ اپنی مملکت خداداد پاکستان میں

خلقِ خدا کا بھلا کریں اور عالم الغیب کی سند عطا فرما کر یہاں بھیجا ہے۔ اور جملہ بزرگوں نے اپنے اپنے کشف منتقل کرکے سرفراز فرمایا ہے۔ خیر جاری ہیں لاکھوں نا امید مریض جنہیں معالج جواب دے چکے تھے ایک چھو میں بھلے چنگے شفایاب ہو کر ہنستے کھیلتے جاتے ہیں۔ ہزار ہا چنگیا کار دباریوں کو کڑوڑپتی بنا دیا، بڑے بڑے معرکے مقدمے جو کسی نہج کامیاب ہونے کے قابل نہ تھے نیچے سے کر ہائیکورٹ تک جتا دیئے۔ لکھوکھا لاکھ عورتوں کی کوکھیں ہری ہوئیں اور گودیں بھر گئیں۔" اور پھر سر سے پاؤں تک میرا جائزہ لیا۔ اور ایک گھونٹ لے کر فرمایا۔

"کتنے ہی بے کاروں کو قابلیت اور اہلیت سے بڑھ چڑھ کر بڑے بڑے عہدے دلا دیئے۔ اور بلا ایک عرضی کے گھر بیٹھے تقرری کے پروانے چلے آتے ہیں اور بد دماغ افسر کے سر ماتحتوں کے سامنے جھکا دیتے۔" پھر آہستہ سے سرگوشی کے انداز میں کہا ایک کرامت ہو تو بیان کروں۔ سر پھرے محبوب مجبور ماشقوں کی آغوش میں آپوں آپ چلے آتے ہیں۔" "ابھی کئی جن تابع ہیں اور بد روحوں کے خلل اور سفلی عمل کے اثر کو تو انگشت شہادت کے ایک اشارہ پر اس طرح کاٹتے ہیں جیسے گاجر مولی کو تیز چھری۔ جمعرات اور جمعہ کی درمیانی رات میں نصف شب کے بعد سلوک سے جذب میں چلے جاتے ہیں۔ معمول ہے کہ تہجد مسجد اقصیٰ میں ادا فرماتے ہیں اور وہاں سے چل کر فجر خانہ کعبہ میں اور فجر سے نماز جمعہ تک مراقبہ میں عالم بالا کی سیر فرماتے ہیں اور عصر کی نماز یہاں کراچی میں آکر ادا فرماتے ہیں۔ اور جمعہ کے روز بعد نماز عشاء عالم بالا کی رہنمائی کے مطابق تفسیر قرآن اور رشد و ہدایت وعظ فرماتے ہیں جس کی اس وقت یہ محفل ہے، پھر بڑی بات یہ ہے کہ کسی سے اپنی ذات کے لئے حبہ نہیں لیتے۔ اللہ دیتا ہے مگر اس سے اتنا ہی نکالتے ہیں کہ جسم و جان کا رشتہ برقرار رہ سکے۔" میں نے گہری نگاہ قاری صاحب پر ڈالی کچھ ایسا تو اندازہ ہوا کہ قرأت تفسیر اور وعظ میں ڈوبے ہونے کے باوجود نیم وا آنکھوں سے میری طرف متوجہ بھی ہیں۔ میں نے نام نامی اسمِ گرامی دریافت کیا تو ان میں سے ایک نے جواب دیا۔ ویسے شاہ غلام عالم الغیب کے لقب سے پکارے جاتے ہیں۔ واللہ اعلم کون ہیں۔ کوئی انسان ہیں بھی یا کیا۔ اللہ جانے اور وہ ——" ان لوگوں کے ساتھ میں بھی تماشہ بین کے طور پر ایک کونے میں جا بیٹھا اور اب مجھے صریحاً اندازہ ہوا کہ شاہ صاحب میری جانب باوجود مصروفیتِ تمام متوجہ تھے اب توجہ نمایاں اور گہری ہو گئی اور شاید انہوں نے ان دونوں کو کچھ اشارہ کیا جب میں نے اٹھنا چاہا تو ان لوگوں نے باصرار یہ کہہ کر روک لیا کہ آپ پر توجہ خاص ہے تھوڑی دیر میں تخلیہ ہوا جاتا ہے۔ بات کریں گے۔

اور اس وقت شاید معمول سے قبل محفل ختم کردی، میں نے اٹھنا چاہا تو اس عرصہ میں دو مرتبہ ان دونوں

نے اصرار کے ساتھ روکا، کچھ جز بز سا ہو گیا، کیا کشف و کرامات کا کیا مجھ پر لگائیں گے! بہر حال انداز اتنا متواضع اور نرم تھا کہ مجھے ٹھہرنا ہی پڑا، تاہم ترکی بہ ترکی مقابلہ کے لئے تیار ہو گیا۔ آن کی آن میں سائبان کے دروازوں پر تینوں جانب سے بڑی استردالی چلمیں گرا دیں۔ اور وہ دونوں بھی کھسک گئے مکمل تخلیہ ہو گیا اور قاری صاحب میرے قریب آگئے اور گردن اٹھا کر بڑی بے تکلفی سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں مجھے زبردست دھچکا سا لگا، انہوں نے جب اسی بے تکلفی کے ساتھ "سلام علیکم چودھری صاحب" یہ کہا، ارے یہ تو حافظ للّن خان ہیں۔! داڑھی تو جب سے اگی تھی رکھی ہوئی تھی، اور جب ٹھہرو والی قبر پر تیسری شب بھڑا کر گئے ہیں تو تیل چاولی کھچڑی تھی، اب جھک سفید، چہرہ و جسم پر نہایت متناسب اور انتہائی پر تقدس، رخساروں پر ایک آدھ جھری سی، جسم پر کھلی کر ختگی کے بجائے نرم فربہی اور بشرہ پر گہری طمانیت نمایاں تھی۔ میں ہکا بکا رہ گیا۔ انہوں نے اپنا وہی پرانا ایک طرفہ بیباک انداز برتتے ہوئے کہا۔ "چودھری صاحب میں نے آپ کو کراچی میں آپ کے آنے کے بعد پہلے ہفتہ کے اندر بھانپ لیا تھا۔ اور تقریباً ہر روز کسی نہ کسی وقت آپ کو دور سے اس راستے سے گزرتے ہوئے دیکھ لیتا ہوں، اور اس وقت قرأت پر جب آپ خود ہی متوجہ ہوئے تو میں نے روک لیا، ملاقات کرنا ضرور تھا، ہوں، اوں، آں، میں دولت خانہ پر حاضر ہونے کا ارادہ کر رہا تھا کوارٹر کا نمبر بھی معلوم کرا لیا تھا۔ ضروری عرض کرنا یہ ہے کہ ماضی کو ہم بھی بھول گئے اور میرا اندازہ یہ ہے کہ آپ کا بھی ساتھ ماضی چھوڑ گیا۔ آں، اوں، دُو۔ ہمارے سوء ظن کی ہم کو سزا ملی اور آپ بھی خواہ مخواہ مارے پڑے۔ اللہ اس کی روح کو نہ شرمائے بچو خان آپ نے سنا ہو گا کم بخت پھانسی پا گیا، اس نے میرے دل میں یہ وسوسہ بٹھا دیا کہ آپ لوگ اس فن کے بہت قابو یافتہ اور با اثر ہستی ہیں، سب حال یہ کر گھر میں گھس جائیں گے اور ہمیں دھتا بتائیں گے۔ اور سچ پوچھئے تو آپ کی ذات سے تو نہیں لیکن آپ کے تایا ابا بزرگوار کے تیوروں سے مجھے ہمیشہ ڈر لگتا رہا تھا اور ڈرتا تھا کہ منصوبہ کی تکمیل کے درمیان زود یا بدیر جب بھی پتہ لگ گیا جس کا ہر منٹ قوی امکان تھا یہ درگذر کرنے والے لوگ نہیں ہیں، لہٰذا جو کچھ ہم نے کیا، اس کی پاداش بھگتی، تمام روئداد آپ کے علم میں ہے اعادہ بیکار ہے آپ کو ایک لمبی سازش کے ذریعہ الجھا کر آپ کے صحن کے اندر سے سونا چرا کر لے بھاگے اور کھول کر ایک نظر دیکھ بھی نہ پائے کہ ہم سے بھی چھن گیا، اگر آپ کے ساتھ بدمعاملگی نہ کرتے تو آج ہماری اور شاید آپ کی بھی تاریخ ہی دوسری ہوتی۔ اس کے بعد بھی جو کچھ بیتی وہ بھی آپ پر روشن ہے جیل کے اندر

عمر قید میں سے چودہ سال کاٹے وہ بھی اس قرأت کے اعجاز سے بڑے آرام کے ساتھ کٹے۔ اور عملیات تعویذ
کا چسکا وہیں سے پڑا۔ قرأت اور صوم و صلوٰۃ کی گھٹی میں پڑی ہوئی عادت کے طفیل جیل کے اہلکار و قیدی
قیدی متوجہ ہوئے، دعا، اور عملیات کی ایک آدھ تُک حسنِ اتفاق سے اہلکاروں میں بیٹھ گئی۔ مسلمان تو مسلمان
جیل کے ہندو چھوٹے بڑے اہلکار تک معتقد ہو گئے۔ بڑھتے بڑھتے بات جیلر کی بیوی تک پہنچی، وہ بھی بچوں کی
سے فکرمند رہتی تھی وہاں بھی تُک لگ گئی۔ سب کے سب حافظ بابا، حافظ بابا کہتے تھے۔ غرض چودھری صاحب
جیل میں ایسی کٹی کہ باپ کے گھر میں اکلوتا بیٹا تھا ایسی نہ کٹی تھی، وہاں بھی مکتب نہ جانے پر گوشمالی ہوا کرتی
تہجد کرتا، عمامہ پہنتا، لمبی تسبیح ہاتھ میں لٹکتی رہتی، بہت سے قیدیوں اور وارڈروں کو جو مذہبی تھے
نماز وغیرہ پڑھاتا۔ رات کو قیدی پاؤں دباتے۔ جیلر کی بیوی اکثر اچھا کھانا بھیجتی۔ غرض سال اندر اتنا اثر
پیدا ہو گیا تھا کہ جس دن اور جس وقت چاہتا فرار ہو سکتا تھا۔ مگر باہر دور دور پناہ نہ تھی۔ اور آنا بھی مقصود نہ
تھا کہ بجنور کے ضلع میں جن پہاڑیوں کے غاروں میں میرا پانچ سال کا اندوختہ روپیہ اور سونا دفن ہے وہ جا
نکال سکوں۔"

"اچھا وہ جگہ تمہیں یاد تھی؟" میں نے کہا۔ انہوں نے جواب دیا کہ "اگر اس وقت بھی آنکھوں پر پٹی باندھ
دو تو سیدھا پہنچوں گا۔ ویسے افواہیں بہت اڑیں کہ پولیس کے ہاتھ آ گیا، سرکاری قبضہ ہو گیا مگر مجھے معلوم
مقدمہ حوالات کے اندر اندازہ ہوتا رہا کہ کسی کے فرشتے بھی نہیں پہنچ سکتے۔ مگر جیل سے نکلنے کے بعد ناممکن
تھا کہ یہ وہاں پہنچ کر نکال سکوں، آپ کو پتہ ہی ہے کتنا تعاقب ہوا ہوگا۔ اس زمانے میں اخبار سے پتہ
رہا کہ اپنا کھوکھرا پار کا بارڈر کھلا ہوا ہے، بس ایک روز وحشتِ دل اور جذبۂ آزادی نے اندر سے آواز
دی اور دل نے کہا "بس چل پڑا" ڈھیلی لنگی، نیچا کرتا اور عمامہ سجا کر ہاتھ میں تسبیح لیے خراماں خراماں
کچھ چھوڑ چھاڑ کے بے آگا پیچھا سوچے چل پڑا۔ اور آگرے تک تو کچھ ہراساں رہا بھی ویسے وہاں سے یہاں تک
اس وضع قطع میں کسی نے ٹکٹ بھی نہ مانگا، تاہم — اور آگرہ سے منا باؤ تک بے کھٹکے آیا اور وہاں سے
میں کھوکھرا پار کا پاک بارڈر کراس کر کے کراچی دھرا تھا۔ اور مجھے وہیں سے اندازہ تھا کہ کل پاکستان اور
خاص طور پر کراچی کی سرزمین دکھیوں اور پریشان حالوں کی بستی ہے اور ایسی زمین اپنے دھندے کے
لئے بہت سازگار ہے۔ اور درحقیقت بڑی زرخیز نکلی۔ ہاں، اور پولیس کو وہاں بھی ہر ماہ اتنا پہنچتا
کھلانا پڑتا تھا اور یہاں بھی اب چوکی کے ہیڈ کو دس روپیہ ہر ماہ دیتا ہوں۔ ڈاکو گر گئے وہاں کچھ نقصان

کمان خاں۔ اور دوسرے ہیں جو آپ کو گھسیٹ کر لائے شرافت اللہ اور کرامت اللہ۔ اللہ کا فضل ہے بڑی خیریت کا دھندا ہے۔ بڑا اطمینان ہے اچھی گذر ہو رہی ہے۔

میں نے کہا "تو پھر مجھے کیوں بلایا؟" انہوں نے جواب دیا "ماضی کو مبر گیا ہے تو بھول بھی جایئے، یہاں وہاں کا قانون تو لاگو نہیں لیکن وہاں کا اخلاق ضرور ساتھ ہے۔ میرے پچھلے قصوروں کو یہ سمجھ کر نظر انداز کر دیں کہ انتقام فطرت نے سزا پوری کر دی۔ اب میرے معتقدین میں پچھلی بات نہ پھیلے۔ میں یہاں سیّد ہوں اور اللہ کا مقرب خاص بندہ۔۔۔"

نوٹ:۔ اس تحریر کے تمام کردار اور مقام خیالی و فرضی ہیں۔ تاریخی طور پر بھی سند نہیں۔ آپ بیتی کے انداز میں افسانوی چیز ہے۔ (مصنف)

(بقیہ راکھ کی چنگاری ۱ از صفحہ ۲)

کے بعد سے میں نے گھر کے رکھ رکھاؤ کی طرف کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ ایک کمرے میں آ کر پڑ رہتا تھا جس کو اکثر قبر سے تشبیہ دیا کرتا تھا مگر اب کراچی پہونچ کر میں نے گھر کے اوپر کے حصے کو مناسب طریقہ پر فرنیچر خرید کر سجانا شروع کر دیا اور اس طرح ایک ہفتہ گزرا۔ سلیمہ کو دیکھنے کی خواہش جب ستاتی تو ایسے ہی کسی کام میں مصروف ہو جاتا مگر کام تھا ہی کیا اور جلدی ختم ہو گیا اور سلیمہ کو دیکھنے کی ہوک دل میں بڑھنے لگی۔ دل کہتا " جلو ابھی چلو۔ حیدرآباد دور کیا ہے۔ اسے دیکھ آؤ اور اس نے میرے سوال کا جواب بھی تو نہیں دیا ہے۔ صرف ہنسنے لگی تھی اور ہنستی رہی تھی۔" مگر کراچی ایسے شہر میں گھر سے باہر آتا ادھر ادھر پھرتا۔ دوستوں سے ملتا اور دن ختم ہوجاتا دن یوں ہی ٹلتے رہے راتوں کو باندھے ہوئے عزم دن کو یوں ہی ٹوٹتے رہے۔

ایک مہینہ گزر گیا ہوگا کہ دس بجے میرے زینے کے دروازے کو کھٹ کھٹانے کی آواز آئی۔ میں لپک کر آیا اور دروازہ کھولا تو کیا دیکھا کہ سلیمہ کھڑی ہے۔

"تم سلیمہ"۔ اک دم سے تعجب کے ساتھ میرے منہ سے نکلا۔

"ہاں۔ میں۔ میری ممو کے ساتھ اس کی بیوہ ماں آکر رہنے لگی ہیں۔ میں تمہارے ساتھ رہوں گی یہی تم چاہتے ہو۔"

کیا بتاؤں میری خوشی کا کیا عالم ہوا۔ میں نے بغل کر اسے چمٹا لیا۔ جو تینتیس ۳۳ برس پہلے کرنا تھا وہ اب ہو گیا۔

راجندر سنگھ بیدی

اِک باپ بِکاؤ ہے

دیکھی نہ سُنی یہ بات جو ۲۴ فروری کے ٹائمز میں چھپی۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ اخبار والوں نے چھاپ کیسے دی؟ خرید و فروخت کے کالم میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا ہی اشتہار تھا جس نے دو اشتہار دیا تھا، ارادہ یا اس کے بغیر اسے معمّے کی ایک شکل دے دی تھی۔ پتے کے سوا اس میں کوئی ایسی بات نہیں تھی، جس سے خریدنے والے کو کوئی دلچسپی ہو —— بکاؤ ہے ایک باپ، عمر اکہتّر سال، بدن اکہرا، رنگ گندمی، دمے کا مریض۔ حوالہ باکس نمبر ایل ۷۶۴، معرفت ٹائمز۔

اکہتر برس کی عمر میں باپ کہاں رہا —— دادا نانا ہو گیا وہ تو؟!

عمر بھر آدمی ہاں ہاں کرتا رہتا ہے، آخر میں نانا ہو جاتا ہے۔

باپ خرید لائے تو ماں کیا کہے گی، جو بیوہ ہے۔ عجیب بات ہے نا، ایسے ماں باپ جو میاں بیوی نہ ہوں۔

ایک آدمی نے اُلٹے پاؤں دُنیا کا سفر شروع کر دیا ہے۔ آج کی دُنیا میں سب بِکتا ہے بھائی سب بِکتا ہے۔

دمہ پھیلائے گا۔

نہیں بے۔ دمہ متعدی بیماری نہیں

ہے

نہیں

ہے

ان دو آدمیوں میں چاقو چل گئے۔۔۔۔۔ جو بھی اس اشتہار کو پڑھتے تھے، بُڈھے کی سنک

باکس ایل ۲۰۷ میں چٹھیوں کا طومار آیا پڑا تھا۔ اس میں ایک ایسی چٹھی بھی چلی آئی تھی جس میں کیرالہ کی کسی لڑکی مس اُدنی کرشنن نے لکھا تھا کہ وہ ایودھیا میں ایک نرس کا کام کرتی رہی ہے اور اس کے ایک بچہ ہے۔ وہ کسی ایسے مرد کے ساتھ شادی کی متمنی ہے جس کی آمدنی معقول ہو اور بچے کی مناسب دیکھ بھال کر سکے چاہے وہ کتنی عمر کا ہو۔ اس کا کوئی شوہر ہوگا جس نے اسے چھوڑ دیا۔ یا ویسے ہی ایودھیا کے کسی شیخ نے اُسے اُلٹا پلٹا دیا۔ چنانچہ غیر متعلق ہونے کی وجہ سے وہ عرضی ایک طرف رکھ دی گئی۔ کیونکہ اس کا بکاؤ باپ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ بہرحال ان چٹھیوں سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے پہلے چیمبرز، رابنسن، ارونگ اور اگاتھا کرسٹی کے سب پڑھنے والے اِدھر لپٹ پڑے ہیں کلاسی فائیڈ اشتہار چھاپنے والوں نے جنرل منیجر کو تجویز پیش کی کہ اشتہاروں کے نرخ بڑھا دیئے جائیں مگر نوجوان بُدھے یا بڈھے نوجوان منیجر نے تجویز کو پھاڑ کر ردّی کی ٹوکری میں پھینکتے ہوئے کہا— !SHUCHS' ایک بائیو اشتہار کی وجہ سے نرخ کیسے بڑھا دیں؟ . . . اُس کے انداز سے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی غلطی کا ازالہ کرنے کی بے سود کوشش کر رہا ہے۔

پولیس پہنچی۔ اس نے دیکھا بسند کالونی، دادر میں گاندھرو داس، جس نے اشتہار دیا تھا، موجود ہے اور صاف کہتا ہے کہ میں بکنا چاہتا ہوں۔ اگر اسمیں کوئی قانونی رخنہ ہے تو بتایئے؟ وہ پان پہ پان چباتا اور اِدھر اُدھر دیواروں پہ تھوکتا جا رہا ہے۔ مزید تفتیش سے پتہ چلا کہ گاندھرو داس ایک گائیک تھا، کسی زمانے میں جس کی گائیکی کی بڑی دھوم تھی۔ برسوں پہلے اس کی بیوی کی موت ہو گئی جس کے ساتھ اس کی ایک منٹ نہ بنتی تھی۔ دونوں میاں بیوی ایک اوندھی محبت میں بندھے ایک دوسرے کو چھوڑتے بھی نہ تھے۔ شام کو گاندھرو داس کا ٹھیک آٹھ بجے گھر پہنچنا تھا۔ بیوی کے مائیکے چلے جانے کے بعد دس ہی دن میں گاندھرو داس کا اسے واپس بلانا ضروری تھا۔ ایک دوسرے کے ساتھ کوئی لین دین نہ رہ جانے کے باوجود یہ احساس ضروری تھا کہ — وہ ہے۔ گاندھرو داس کی تان اُٹھتی ہی صرف اس لئے تھی کہ دینتی اُس کے سنگیت سے بھرپور نفرت کرنے والی بیوی گھر میں موجود تھی کہ اُس کا مرد جو پہروں سے اُسے نہیں بلاتا، ساتھ کے بستر پہ پڑا، شراب میں بدمست، خرّاٹے لے رہا ہے۔ کیونکہ خرّاٹا ہی ایک موسیقی تھی جسے گاندھرو کی بیوی سمجھ پائی تھی۔

پہ منس دیتے تھے پڑھنے کے بعد اسے ایک طرف رکھ دیتے اور پھر اٹھا کر اسے پڑھنے لگتے۔ جیسے ہی انہیں اپنا آپ احمق معلوم ہونے لگتا، وہ اس اشتہار کو اڑوسیوں پڑوسیوں کی ناک تلے ٹھونس دیتے ـــــ

ایک بات ہے۔ گھر میں چوری نہیں ہوگی

کیسے؟

ہاں، کوئی رات بھر کھانستا ہے

یہ سب سازش ہے، خواب آور گولیاں بیچنے والوں کی

پھر ـــــ ایک باپ بکاؤ ہے!

یوں لوگ ہنستے ہنستے رونے کے قریب پہنچ گئے۔

گھروں میں راستوں پہ، دفتروں میں بات ڈاک ہونے لگی، جس سے وہ اشتہار اور بھی مشتہر ہوگیا۔

جنوری فروری کے مہینے بالعموم پت جھڑ کے ہوتے ہیں۔ ایک ایک داروغے کے نیچے بیس بیس جھاڑو دینے والے سڑکوں پر گرے سوکھے سڑے، بوڑھے پتے اٹھاتے اٹھاتے تھک جاتے ہیں۔ جنہیں اُن کو گھر لے جانے کی ہی اجازت نہیں کہ انہیں جلائیں اور سردی سے خود اور اپنے بال بچوں کو بچائیں! اس پت جھڑ اور سردی کے موسم میں وہ اشتہار گرمی پیدا کرنے لگا جو آہستہ آہستہ سینک میں بدل گئی۔

کوئی بات تو ہوگی؟!

ہوسکتا ہے، پیسے جائیداد والا.....

بکواس۔ ایسے میں بکاؤ لکھتا؟

شکل سے اپنے باپ سے خلاصی پائی ہے۔ باپ کیا تھا، چنگیز بلا کو تھا سالا

تم نے پڑھا، مسز گوسوامی؟

دھت۔ ہم بچے پالیں گی، سدھا، کہ باپ؟ ایک اپنے ہی وہ کم نہیں

گوـــــ سوامی ہے! ہی..... ہی ہی

باپ بھی حرامی ہوتے ہیں.....

بیوی کے چلے جانے کے بعد گاندھرو داس کو بیوی کی تو سب زیادتیاں بھول گئیں، لیکن اپنے اُس پر کئے ہوئے اتیاچار یاد رہ گئے۔ وہ بیچ رات کے ایکا ایکی اُٹھ جاتا اور گریبان پھاڑ کر اِدھر اُدھر بھاگنے لگتا۔ بیوی کے بارے میں آخری خواب میں اس نے دیکھا کہ "دوسری عورت" کو دیکھتے ہی اس کی بیوی نے واویلا مچا دیا ہے اور روتی چلاتی ہوئی گھر سے بھاگ نکلی ہے۔ گاندھرو داس پیچھے دوڑا۔ لکڑی کی سیڑھی کے نیچے کچی زمین میں دمینتی نے اپنے آپ کو دفن کر لیا۔ مگر مٹی ہل رہی تھی اور اس میں دراڑیں سی چلی آئی تھیں، جس کا مطلب تھا کہ ابھی اس میں سانس باقی ہے۔ جوا‌س باختگی میں گاندھرو داس نے اپنی عورت کو مٹی کے نیچے سے نکالا تو دیکھا۔ اسکے دونو بازو غائب تھے۔ ناف کے نیچے بدن نہیں تھا۔ اس پر بھی وہ اپنے ٹھنٹ اپنے پتی کے گرد ڈالے اس سے چمٹ گئی اور گاندھرو داس اُسی پتلے سے پیار کرتا ہوا اسے سیڑھیوں سے اُوپر لے آیا۔

گاندھرو داس کا گانا بند ہو گیا!

گاندھرو داس کے تین بچے تھے۔ تھے کیا۔ ہیں۔ سب سے بڑا ایک نامی پلے بیک سنگر ہے، جس کے لانگ پلینگ ریکارڈ بازار میں آتے ہی ہاتھوں ہاتھ بِک جاتے ہیں۔ ایرانی ریستورانوں میں جیوک باکسوں سے جتنی فرمائش اس کے گانوں کی ہوتی ہے اور کسی کے نہیں۔ اس کے برعکس گاندھرو داس کے کلاسیکل میوزک کو کوئی گھاس بھی نہ ڈالتا تھا۔ دوسرا لڑکا اوف سیٹ پرنٹر ہے اور حسرت کی پلیٹیں بھی بناتا ہے۔ پریس سے وہ ڈیڑھ دو ہزار روپیہ مہینہ پاتا ہے اور اپنی اطالوی بیوی کے ساتھ رنگ رلیاں مناتا ہے۔ کوئی جیئے یا مرے اُسے اس بات کا خیال ہی نہیں۔ جس زمانے میں گاندھرو داس کا موسیقی کے ساز بیچنے کا کام ٹھپ ہوا تو بیٹا بھی ساتھ تھا۔ گاندھرو نے کہا ــــ چلو، ایچ ایم وی کے ریکارڈوں کی ایجنسی لیتے ہیں۔ چھوٹے نے جواب دیا ــــ ہاں، مگر آپ کے ساتھ میرا کیا مستقبل ہے؟ گاندھرو داس کو دھچکا سا لگا۔ وہ بیٹے کا مستقبل کیا بتا سکتا تھا؟ کوئی کسی کا مستقبل کیا بتا سکتا ہے؟ گاندھرو کا مطلب تھا کہ میں کھاتا ہوں تو تم بھی کھاؤ۔ میں بھوکا مرتا ہوں تو تم بھی مرو۔ تم جوان ہو، تم میں حالات سے لڑنے کی طاقت ہے۔ اسکے جواب کے بعد گاندھرو داس ہمیشہ کے لئے چُپ ہو گیا۔ رہی بیٹی تو وہ ایک اچھے مارواڑی گھر میں بیاہی گئی۔ جب وہ تینوں بہن بھائی ملتے تو اپنے

باپ کو زندہ انہیں مردہ سمجھتے اور اپنی اس اختراع پر خود ہی ہنستے رہتے۔

ایسا کیوں؟

چاترک ایک شاعر اور اکاؤنٹنٹ جو اس اشتہار کے سلسلے میں گاندھروا کے ہاں گیا تھا، کہہ رہا تھا — اس بڈھے میں ضرور کوئی خرابی ہے۔ ورنہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تین اولادوں میں سے ایک بھی اس کی دیکھ ریکھ نہ کرے۔ کیا وہ ایک دوسرے کے اتنے نزدیک تھے جو دور ہو گئے؟ بندھنوں میں الجھے رہنے کی وجہ سے کوی چاترک کے الہام اور الفاظ کے درمیان فساد پیدا ہو گیا تھا۔ وہ نہ جانتا تھا کہ ہندوستان تو کیا دنیا بھر میں کنبے کا تصور ٹوٹتا جا رہا ہے۔ بڑوں کا ادب ایک فیوڈل بات ہو کر رہ گئی ہے۔ اس لئے سب بڈھے کسی ہائیڈ پارک میں بیٹھے اتداد زمانہ کی سردی سے ٹھٹھرے ہوئے، ہر آنے جانے والے کو تکا کرتے ہیں، کہ شاید ان سے کوئی بات کرے۔ وہ یہودی ہیں جنہیں کوئی ہٹلر ایک ایک کر کے گیس چیمبر میں دھکیلتا جا رہا ہے مگر دھکیلنے سے پہلے جبر کے ساتھ ان کے دانت نکال لیتا ہے، جن پہ سونا مڑھا ہے۔ یا اگر کوئی بچ گیا ہے تو کوئی بھانجا بھتیجا اتفاقیہ طور پر اس بڈھے کو دیکھنے کے لئے اس کے مخروطی اٹیک میں پہنچ جاتا ہے تو دیکھتا ہے کہ وہ تو مرا پڑا ہے اور اس کی نلزاتی آنکھیں اب بھی دروازے پر لگی ہیں۔ نیچے کی منزل والے بدستور اپنا اخبار بیچنے کا کاروبار کر رہے ہیں کیونکہ شہر میں روز کوئی نہ کوئی واقعہ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ ڈاکٹر آکر تصدیق کرتا ہے کہ بڈھے کو مرے ہوئے پندرہ دن ہو گئے صرف سردی کی وجہ سے لاش گلی سڑی نہیں۔ پھر وہ بھانجا یا بھتیجا کمیٹی کو خبر کر کے منظر سے ٹل جاتا ہے، مبادا آخری رسوم کے اخراجات اسے بھرنے پڑیں۔

چاترک نے کہا — ہو سکتا ہے بڈھے نے کوئی اندوختہ رکھنے کی بجائے اپنا سب کچھ بچوں ہی پہ لٹا دیا ہو۔ اندوختہ ہی ایک بولی ہے، جسے دنیا کے لوگ سمجھتے ہیں اور ان سے زیادہ اپنے سگے سمبندھی، اپنے ہی بچے بالے۔ کوئی سنگیت میں تانیں توڑ لائے، نقاشی میں کمال دکھا جائے، اس سے انہیں کوئی مطلب نہیں۔ پھر اولاد ہمیشہ یہی چاہتی ہے کہ اس کا باپ وہی کرے جس سے وہ، اولاد خوش ہو۔ باپ کی خوشی کس بات میں ہے۔ اس کی کوئی بات ہی نہیں۔ اور ہمیشہ ناخوش رہنے کے لئے اپنے کوئی سا بھی بیگانہ بہانہ تراش لیتے ہیں۔

مگر گاندھروا اس تو بڑا ہنس مکھ آدمی ہے۔ ہر وقت لطیفے سناتا، خود ہنستا اور دوسروں کو

ہنساتا رہتا ہے۔ اس کے لطیفے اکثر فحش ہوتے ہیں۔ شاید وہ کوئی نقاب، مکھوٹے ہیں، جن کے پیچھے وہ اپنی جنسی ناکامیوں اور ناآسودگیوں کو چھپاتا رہتا ہے۔ یا پھر، سیدھی سی بات — بڑھاپے میں انسان ویسے ہی ٹھرکی ہو جاتا ہے اور اپنی حقیقی یا مفروضہ فتوحات کی بازگشت!

اشتہار کے سلسلے میں آنے والے کچھ لوگ اس لئے بھی بدک گئے کہ گاندھرو داس پر پچیس ہزار کا قرض بھی تھا، جو بات اس نے اشتہار میں نہیں لکھی تھی اور غالباً اس کی عیاری کا ثبوت تھی۔ اس پر طرفہ ایک جوان لڑکی سے آشنائی بھی تھی جو عمر میں اس کی اپنی بیٹی رما سے چھوٹی تھی۔ وہ لڑکی، دیوانی، گانا سیکھنا چاہتی تھی جو گوروجی نے دن رات ایک کر کے اسے سکھا دیا اور سنگیت کی دنیا کے شکھر پر پہنچا دیا۔ لیکن ان کی عمروں کے بُعد کے باوجود ان کے تعلقات میں جو ہیجانی کیفیت تھی، اسے دوسرے تو ایک طرف، خود وہ بھی نہ سمجھ سکتے تھے۔ اب بھلا ایسے چاروں عیب شرعی باپ کو کون خریدے؟

اور پھر — جو ہر وقت کھانستا ہے، کسی وقت بھی دَم اُلٹ جائے اس کا باہر جائے تو نوٹانک مار کے آئے۔ بلکہ لوٹتے وقت پوا بھی دھوتی میں چھپا کر لے آئے......

آخر — دمے کے مریض کی عمر بہت لمبی ہوتی ہے۔

گاندھرو داس سنگیت سکھاتے ہوئے یہ بھی کہہ اُٹھتا — میں پھر گاؤں گا۔ وہ تکرار کے ساتھ یہ بات شاید اس لئے بھی کہتا تھا کہ اسے خود بھی اس میں یقین نہ تھا۔ وہ سُر لگاتا بھی تو اسے اپنے سامنے اپنی مرحوم بیوی کی روح دکھائی دیتی جیسے کہہ رہی ہو — ابھی تک گائے جا رہے ہو؟

اس انوکھے مطالبے اور امتزاج کی وجہ سے لوگ گاندھرو داس کی طرف یوں دیکھتے تھے جیسے وہ کوئی بہت چمکتی دمکتی ہوئی شے ہو۔ اور جس کا نقش وہاں سے ٹل جانے کے بعد بھی کافی عرصے تک آنکھ کے اندر پردے پر برقرار رہے اور اس وقت تک پیچھا نہ چھوڑے جب تک کوئی دوسرا عنصری نظارہ پہلے کو دھندلا نہ دے۔

کسی خورشید عالم نے کہا — میں خریدنے کو تیار ہوں، بشرطیکہ آپ مسلمان ہو جائیں

مسلمان تو میں ہوں ہی

کیسے ؟

میرا ایمان خدا پہ سلم ہے۔ پھر میں نے جو پایا ہے اُستاد علاء الدین کے گھرانے سے پایا ہے۔

ہاں ہاں۔ وہ مسلمان ۔۔ کلمے والا ......

کلمہ تو سانس ہے انسان کی جو اس کے اندر باہر جاری اور ساری ہے۔ میرا دین سنگیت ہے۔ کیا استاد عبدالکریم

خاں کا باہر ی داس ہونا ضروری تھا ؟

پھر میاں خورشید عالم کا پتہ نہیں چلا۔

دو تین عورتیں بھی آئیں لیکن گانہ بردداس جس نے زندگی کو ٹوٹا ٹک بنا کے پی لیا تھا، بولا ۔۔۔ جو تم کبھی

و ہیں میں اس سے اُلٹ پا رہی ہو۔ کوئی نیا تجربہ جس سے سن سو جاتے اور رُوح جاگ اُٹھے۔ اسے کرنے کی تم میں ہمت

ہی نہیں۔ دین، دھرم، معاشرہ نہ جانے کن کن چیزوں کی آڑ ملتی ہو لیکن بدن رُوح کو شکنجے میں کس کے یوں سامنے پھینک

دیتا ہے تم پلنگ کے نیچے کے مرد سے ڈرتی ہو اور اسے ہی چاہتی ہو۔ تم ایسی کنواریاں ہو جو اپنے دماغ میں عفت ہی کی

وجہ سے اپنی عصمت گنواتی ہو اور بے مُہار ٹھواتی ہو۔ پھر گانہ برداس نے ایک شیطانی مسکراہٹ سے کہا ۔۔۔

در اصل تمہارے بچے ہی غلط ہیں !

اُن عورتوں کو یقین ہو گیا کہ وہ ازلی مائیں در اصل باپ نہیں، کسی خدا کے بیٹے کی تلاش میں ہیں۔ ورنہ

تین تین چار چار تو ان کے اپنے بیٹے ہیں۔ مجاز کی اس دُنیا میں ......

میں اُس دن کی بات کرتا ہوں، جس دن بان گنگا کے مندر سے بھگوان کی مورتی چوری ہوئی! اُس دن

پت جھڑ بہار پہ تھی۔ مندر کا پُورا احاطہ سوکھے سڑے، بوڑھے پتّوں سے بھر گیا۔ کہیں شام کو بارش کا ایک چھینٹا

پڑا اور چوری سے پہلے مندر کی جیوتیوں پہ پروانوں نے اتنی ہی فراوانی سے قربانی دی، جس فراوانی سے قدرت

انہیں پیدا کرتی اور پھر ان کی کھاد بناتی ہے۔ یہ وہی دن تھا، جس دن پجاری نے پہلے بھگوان کرشن کی رادھا

(جو عمر میں اپنے عاشق سے بڑی تھی) کی طرف دیکھا اور پھر مُسکرا کر مہترانی چھبو کی طرف (جو عمر میں پجاری کی بیٹی سے چھوٹی

تھی) اور وہ پتّے اور پھول اور بیج گھر لے گئی۔

مورتی تو خیر کسی نے سونے چاندی، ہیرے اور پتّوں کی وجہ سے چرائی لیکن گانہ برداس کو لارس اینڈ لارسن کے

دُردے نے بے وجہ خرید لیا۔ گاندھردداس اور دُردے میں کوئی بات نہیں ہوئی۔ بوڑھے نے صرف آنکھوں ہی آنکھوں میں اُسے کہہ دیا ۔۔ جیسے تیسے بھی ہو، مجھے لو بیٹے۔ بنا بیٹے کے کوئی باپ نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد دُردے کو آنکھیں ملانے، سوال کرنے کی ہمّت ہی نہ پڑی۔ سوال شرطوں کا تھا، مگر شرطوں کے ساتھ کہیں زندگی جی جاتی ہے؟ .... دُردے نے گاندھرداس کا قرض چکایا، سہارا دے کر اُسے اُٹھایا اور مالا بار ہِل کے دامن میں اپنے عالیشان بنگلے گری کُنج میں لے گیا۔ جہاں وہ اس کی تیمارداری اور خدمت کرنے لگا۔

دُردے سے اس کے ملازموں نے پوچھا ۔۔ سر آپ یہ کیا مصیبت لے آئے ہیں۔ یہ بڈھا، مطلب بابوجی آپ کو کیا دیتے ہیں؟

کچھ نہیں ۔ بیٹھے رہتے ہیں۔ آتا پالتی مارے۔ کھاتے رہتے ہیں اور یا پھر دردے تو عام دلے پان چباتے رہتے ہیں۔ جہاں جی چلے، تھوک بھی دیتے ہیں جس کی عادت مجھے اور میری صفائی پسند بیوی کو ابھی نہیں پڑی، مگر پڑ جائے گی ۔۔ دھیرے دھیرے .... مگر تم نے ان کی آنکھیں دیکھی ہیں؟

جی نہیں

جاؤ دیکھو۔ ان کی ہنستی آنکھوں میں کیا ہے۔ اُن میں کیسے کیسے سندیسے نکل کر کہاں کہاں پہنچ رہے ہیں؟ کہاں کہاں پہنچ رہے ہیں؟ ۔۔ جمناداس، دُردے کے ملازم نے غیر ارادی طور پر فضا میں دیکھتے ہوئے کہا ۔۔ آپ تو سائنس دان ہیں؟!

میں سائنس ہی کی بات کر رہا ہوں، جمنا! اگر انسان کے زندہ رہنے کے لئے پھل پھول اور پودے ضروری ہیں۔ جنگل کے جانور ضروری ہیں۔ بچے ضروری ہیں تو بوڑھے بھی ضروری ہیں ورنہ ہمارا ایکولاجیکل بیلنس تباہ ہو کر رہ جائے۔ اگر جسمانی طور پر نہیں تو روحانی طور پر انسانی نسل ہمیشہ کے لئے معدوم ہو جائے۔

جمناداس اور اتھاولے بھاؤ کچھ سمجھ نہ سکے۔

دردے نے بنگلے میں لگے اشوک پیڑ کا ایک پتہ توڑا اور جمناداس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا ۔۔ اپنی پوری امس سے کہ یہ تازگی، یہ لچک، یہ شادابی اور یہ رنگ پیدا کر کے دکھاؤ ....

اتھاولے والے رہتے اشوک کا پتہ لئے ...

ہاں ہاں ۔۔ دردے نے سر ہلاتے ہوئے ہنستے ہوئے کہا، پتہ ہی اب کے اصل۔ ان کو بتا دیں گے تو ہم دم جانے کہاں سے کہاں پہنچ جائیں گے۔

جمنا داس کے قریب ہوتے ہوئے درو بے بولے ـــ میں تمہیں کیا بتاؤں، جمنا داس میں بابو جی کے چرن چھو رہا ہوتا ہوں تو لگتا ہے کام مجھے کتنی شانتی، کتنی ٹھنڈک دیتا ہے۔ میں جو ہر وقت ایک بے نام ڈر سے کانپتا رہتا تھا اب نہیں کانپتا۔ مجھے ہر وقت اس بات کی تسلی رہتی ہے ـــ وہ تو ہیں۔ مجھے یقین ہے بابو جی کی آتما کو بھی کچھ ایسا ہی ہوتا ہوگا!

میں نہیں مانتا ـــ ... یہ سب خواہ مخواہ کی بات ہے۔

ہو سکتا تھا، درو بے بھڑک اٹھتا۔ ہو سکتا تھا وہ جمنا داس سے بیچ بازار ہی الجھ پڑتا ... لیکن باپ کی آنکھوں کے مرہم نے اسے ایسا نہ کرنے دیا۔ اس کی آواز میں کہیں سے کوئی کومل سر جاگ اٹھا اور اس نے بڑے پیار سے کہا ـــ تم کچھ بھی کہہ لو جمنا۔ پر ایک بات تو تم جانتے ہو۔ میں جہاں جاتا ہوں، لوگ مجھے سلام کرتے ہیں۔ میرے سامنے سر جھکاتے، بچھ بچھ جاتے ہیں۔

درو بے اس کے بعد ایکا ایکی چپ ہو گیا۔ اس کا گلا اور اس کی آنکھیں دھندلا گئیں

ہاں میں بھی تو یہی کہتا ہوں ـــ دنیا آپ کے سامنے سر جھکاتی ہے!

اسی لیے ..... درو بے نے اپنی آواز بدلتے ہوئے کہا ـــ کہیں میں بھی اپنا سر جھکانا چاہتا ہوں! ابھاؤ لیے جمنا داس، اب تم جاؤ۔ پلیز! میری پوجا میں وگھن نہ ڈالو۔ ہم نے پتھر سے بھی خدا پایا ہے۔

گری کنج میں لگے ہوئے آم کے پیڑوں پہ بور پڑا۔ ادھر پہلی کوئل کوکی، ادھر گاندھرو داس نے برسوں کے بعد تان اڑائی ـــ کوئیلیا بولے امبوا کی ڈار ......

وہ گانے لگے۔ کسی نے کہا ـــ آپ کا بیٹا آپ سے اچھا گاتا ہے

ایسا؟ ... گاندھرو داس نے بھبھیا بولی میں کہا ـــ آخر میرا بیٹا ہے۔ باپ نے میٹرک کیا ہے تو بیٹا ایم اے نہ کرے؟

ایسی باتیں کرتے ہوئے ناسمجھ لوگ گاندھرو داس کے چہرے کی طرف دیکھتے کہ ان کی جھریوں میں کہیں تو جلن دکھائی دے۔ جب کوئی ایسی چیز نظر نہ آئی تو کسی نے لقمہ دیا ـــ آپ کا بیٹا کہتا ہے، میرا باپ مجھ سے جلتا ہے۔

سچ؟ ـــ میرا بیٹا کہتا ہے ـــ

ہاں میں جھوٹ تھوڑے بول رہا ہوں۔

گاندھرو داس تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گئے جیسے وہ کہیں اندر عالم ارواح میں چلے گئے ہوں اور وہاں بیٹے کی شکایت کی ہو۔ بڑھیا سے کوئی جواب پا کر وہ دھیرے سے بولے ـــ اور تو کوئی بات نہیں۔ میرا بیٹا ـــ وہ بھی باپ ہے..... وہ پھر اُن دنوں کی طرف لوٹ گئے۔ جب بیٹے نے کہا تھا ـــ بابوجی! میں بھی شاستریہ سنگیت میں ایک ایسا کمال پیدا کرنا چاہتا ہوں، مگر ڈھیر سارا پیسہ کما کر۔ اور بابوجی نے بڑی شفقت سے بیٹے کے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا تھا ـــ ایسے نہیں ہوتا، راجو..... یا آدمی کمال حاصل کرتا ہے یا پیسے ہی بناتا چلا جاتا ہے۔ جب دو بڑے بڑے آنسو لڑھک کر گاندھرو داس کی داڑھی میں اٹک گئے۔ جہاں دُردے بیٹھا تھا، اُدھر سے روشنی میں وہ پر نم ہو گئے، سفید روشنی جن میں سے نکل کر سات رنگوں میں بکھر گئی.....

دُردے کو نہ جانے کیا ہوا۔ وہ اُٹھ کر زور سے چلایا ـــ گیٹ آؤٹ..... اور لوگ چوہوں کی طرح ایک دوسرے پہ گرتے پڑتے ہوئے بھاگے۔

گاندھرو داس نے اپنا ہاتھ اُٹھایا اور صرف اتنا کہا ـــ نہیں بیٹے، نہیں

ان کے ہاتھ سے کوئی برقی رو میں نکل رہی تھیں!

دُردے جب لارسن اینڈ لارسن میں گیا تو خلیپ، اس کا ورکس منیجر کمپیوٹر کو ڈیٹا فیڈ کر رہا تھا۔ کمپیوٹر سے کارڈ باہر آیا تو اس کا رنگ پیلا پڑ گیا وہ بار بار آنکھیں جھپک رہا تھا اور کارڈ کی طرف دیکھ رہا تھا..... لارسن اینڈ لارسن کو اکیاسیس لاکھ کا گھاٹا پڑنے والا ہے۔ اس گھبراہٹ میں اُس نے کارڈ دُردے کے سامنے کر دیا جسے دیکھ کر اُس کے چہرے پہ شکن تک نہ آئی۔ دُردے نے صرف اتنا کہا ـــ کوئی انفارمیشن غلط فیڈ ہو گئی ہے.....

نہیں سر..... میں نے بیسیوں بار چیک، کراس چیک کر کے اسے فیڈ کیا ہے

تو پھر..... مشین ہے۔ کوئی نقص پیدا ہو گیا ہو گا۔ آئی بی ایم والوں کو بلاؤ۔

مودک ـــ چیف انجینئر تو ساؤتھ گیا ہے

ساؤتھ کہاں؟

تردپتی کے مندر..... سنا ہے اُس نے اپنے لمبے، ہپی بال کٹوا کر مورتی کی نذر کر دیئے ہیں!

دُردے ہلکا سا مسکرایا اور بولا ـــ تم نے یہ انفارمیشن فیڈ کی ہے کہ ہمارے پیچھے ایک باپ چلا آتا ہے؟

فلپ نے کہا، ڈروے اس کا مذاق اڑا رہے ہیں یا ویسے ہی ان کا دماغ پھر گیا ہے۔ مگر ڈروے کہتا رہا
ــــ اب ہلکے سر پر کسی کا ہاتھ ہے، تحریک ہے اور اس کے نتیجے کا حوصلہ اور ہمت۔۔ ۔۔مت بھولو، یہ مشین
کسی انسان نے بنائی ہے، جس کا کوئی باپ تھا، پھر اس کا باپ۔۔۔ اور سب کا باپ ــــ جہل مرکب یا منفرد!

فلپ نے اپنی اندرونی خفگی کا منہ موڑ دیا ــ کیا دیویانی اب بھی بابوجی کے پاس آتی ہے؟

ہاں

مسز ڈروے کچھ نہیں کہتی؟

پہلے کہتی تھیں۔ اب وہ انکی پوجا کرتی ہیں۔ بابوجی دراصل عورت کی جات ہی سے پیار کرتے ہیں،
فلپ۔۔۔ معلوم ہوتا ہے انہوں نے کہیں پرکرتی کے چیتون دیکھ لئے ہیں، جن کے جواب میں وہ مسکراتے تو ہیں،
لیکن کبھی کبھی بیچ میں آنکھ بھی مار دیتے ہیں!

فلپ کا غصہ اور بڑھ گیا۔۔۔

ڈروے کہتا گیا ــــ بابوجی کو شبہ ــ بیٹی، بہو، بھابی، چاچی، للّی، میا بہت اچھے لگتے ہیں۔
وہ بہو کی کمر میں ہاتھ ڈال کر پیار سے اس کے گال بھی چوم لیتے ہیں اور یوں قید میں آزادی پا لیتے ہیں اور آزادی
میں قید۔۔۔۔

دیویانی؟

ڈروے نے حقارت سے کہا ــ تم سیکس کو اتنی ہی اہمیت دو، فلپ، جتنی کا کہ وہ مستحق ہے۔ تیتر بٹیر
بے تمیز اسے حواس پر مت چھانے دو۔۔۔۔ سنگیت شاید ایک آڑ تھی دیویانی کے لئے۔۔۔

میں سمجھا نہیں، سر؟

بابوجی نے مجھے بتایا کہ وہ لڑکی بچپن ہی میں آوارہ ہو گئی۔ اس نے اپنے باپ کو کچھ اس عالم میں دیکھ
لیا جبکہ وہ نوخیزی سے جوانی میں قدم رکھ رہی تھی۔ جب وہ ہمیشہ کے لئے آپ ہی اپنی ماں ہو گئی۔ باپ کے
مرنے پر وہ گھبرا کر ایک مرد سے دوسرے، دوسرے سے تیسرے پاس جانے لگی۔ اس کا بدن ٹوٹ ٹوٹ
جاتا تھا مگر روح [illegible] تھکتی ہی نہ تھی۔۔۔۔

کیا مطلب؟

دیویانی کو دراصل باپ ہی کی تلاش تھی!

(باقی صفحہ ۱۶۶ پر)

حیات اللہ انصاری

خلاص

"بائی خلاص"

روزانہ یہ کہہ کر بنو سلام کرتی اور چلی جاتی۔ میری بیوی کہتیں "یہ عورت ہے کہ مشین۔ دو گھنٹے میں سارے گھر میں جھاڑو دی۔ پوچھا لگایا برتن صاف کئے کپڑے دھو کر نیل اور کلف دے کر سوکھنے کو پھیلا دیئے پھر بستر درست کئے اور ایسی چاق و چوبند ہے گویا ابھی کام پر آئی ہے۔" یہ سن کر میں کہتا۔

"صورت سے بھی مشین لگتی ہے۔"

بنو کو مشین کہہ کر بھی میری تسلی نہیں ہوتی بات ادھوری لگتی۔ اس کے ہونٹ اور آنکھیں کچھ اس طرح بدمزگی سے بھینچے رہتے کہ اسے ابھی پتہ چلا ہے کہ زندگی بے حد تلخ اور ذلت آمیز زندگی کاٹنا پڑے گی۔ اور اس سے کوئی مفر نہیں۔ اس احساس کو وہ بہت ہضم کرنا چاہتی تھی مگر کر نہیں پا رہی تھی۔ مجھے اس کے چہرے کو دیکھ کر ایسی الجھن ہوتی تھی کہ اگر اس سے کوئی کام لینا ہوتا تھا تو بیوی سے کہتا تھا۔

"دیکھو میری میز بھی صاف ہو گی۔"

"دیکھو میرے جوتے میں بھی پالش لگے گی۔"

میری بیوی بنو سے میرے کام کرا دیتیں۔ لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی کہتیں کہ

"ایسا برا تو نہیں ہے اس کا منہ"

میں جو بنو سے بات نہیں کرتا تھا تو وہ بھی مجھ سے کتراتی تھی۔ اگر کام کے سلسلے میں میرے قریب سے گزرنا ہوتا تھا تو اس طرح گزرتی کہ اس کے چہرے کا زیادہ سے زیادہ حصہ آڑ میں رہتا۔ یہ اس کی طرف سے جواب تھا میری بے رخی کا۔

بنو کا سن چالیس کے لگ بھگ ہو گا۔ بدن سوکھا ہوا۔ سپاٹ سینا۔ گال پچکے مگر کسے ہوئے۔ بال پہلے

سو کھے لیکن اِکا دُکا کو چھوڑ کر سب کالے۔ وہ روزانہ صبح تڑکے آتی اور جٹ کر دو ڈھائی گھنٹے میں کام ختم کر دیتی۔ بیچ میں ایک پیالی چائے اور ایک بیڑی پینے کے لئے رک جاتی۔ پانچ منٹ رک جاتی۔ چائے پینے کے انداز میں یعنی تشتری میں انڈیل کر اور سڑپ سڑپ کر کے پیتی۔

کام ختم ہونے کے بعد کبھی میری بیوی کہتیں۔

"بنو ذرا ٹھہر جاؤ تو تم کو کچھ کھلا دوں" تو جواب ملتا۔

"نہیں بائی مجھے جگدیش سیٹھ کے بابا کو اسکول پہنچانا ہے"

اسی طرح مختلف گھرانوں میں اس کے کام کا سلسلہ صبح سے شام تک لگا رہتا تھا۔ بیوی پوچھتیں

"بنو تم آج کل شام کو کیا کرتی ہو"

"کھلونے اور گبارے بیچتی ہوں"

یا کہتی

"چاٹ کی دکان پر پکوڑے تلتی ہوں۔"

بنو کی بات سمجھنا آسان کام نہیں تھا۔ اس کے پاس مشکل سے دو سو الفاظ تھے انہیں سے وہ کام چلا لیتی تھی مثلاً ایک دن کہنے لگی۔

"رات بڑی دیر سے گھر گیا۔ کھانا سب خلاص"

ہم لوگ سمجھے کہ رات اُسے اور اس کی لڑکیوں کو کھانا نہیں ملا۔ بیوی نے ہمدردی سے کہا۔

"تم سب بھوکے رہے کیا؟

"بھوکا کیوں۔ بھوک خلاص۔ کھایا بہوت"

اس کی گفتگو میں ہر دس لفظ کے بعد خلاص ضرور آتا تھا اور ہر جگہ معنی الگ ہوتے تھے کبھی خلاص کا مطلب ہوتا کہ کامیابی ہو گئی اور کبھی یہ کہ ناکامی ہوئی۔

(۲)

ایک تقریب میں میری بیوی کو اپنے گھر جانا پڑا۔ اس طرح میرا اور بنو کا سابقہ براہِ راست پڑ گیا میں مجبور تھا اس سے بات کرنے پر۔ اتفاق سے انہی زمانے میں میں نے مولانا آزاد کی کتاب "غبارِ خاطر" پڑھی۔ اور اس میں دیکھا کہ مولانا نے ان چڑیوں سے جو ان کے کمرے میں رہتی تھیں دوستی کرنا ضروری سمجھا

میں نے دل میں کہا کہ ایک میں ہوں جو اس عورت سے جو ایک مدت سے میرے گھر میں کام کرتی ہے بات تک کرنا پسند نہیں کرتا۔ یہ سوچ کر مجھے عجیب شرمندگی ہوئی اور اسی دن میں نے پوچھا۔

"بنو تمہارے کتنے بچے ہیں"

میری طرف پیٹھ کئے کئے اس نے جواب دیا۔

"سیٹھ دو لڑکیاں۔"

"کتنی بڑی ہیں؟"

اب وہ ذرا میری طرف مڑی اور ہاتھ کے اشارے سے بتانے لگی۔

ایک اتنی اور ایک اتنی۔

"کتنے سال کی ہیں؟"

"کون جانے۔"

اتفاق کی بات ہے کہ اس وقت میرے ہاتھ گڑ کا ایک بڑا سا ٹکڑا لگ گیا میں نے کہا۔

"میری طرف سے لڑکیوں کو کھلا دینا۔"

اب تو اس نے غور سے میری طرف دیکھا۔ ایسا لگا کہ سمجھنا چاہتی ہے کہ میں نے ایسا کیوں کیا جب میں نے وہ ٹکڑا اس کو تھما دیا تو وہ اندازہ کرکے کہنے لگی کہ یہ تو بہت ہے۔ ہوگا آدھا کلو۔

"کیا حرج ہے بچے تو گڑ شوق سے کھاتے ہیں۔"

اس نے پھر میری طرف دیکھا اور اس کے چہرے پر مسرت کی ایسی کرنیں پھوٹیں کہ وہ دوسری عورت لگنے لگی مجھے ایک دم سے محسوس ہوا کہ یہ کبھی خوبصورت ہوگی۔ ستواں ناک۔ آم کی پھانکوں کی طرح آنکھیں۔ خم دار گھنی بھوئیں۔ اور بے حد مرتب اور چمکدار دانت ان خوبصورتیوں کے پس منظر میں اس کا کالا رنگ دلفریب معلوم ہوا۔ وہ بولی۔

"سیٹھ تم دل کا بڑا ہے۔"

اس کے بعد ہم دونوں کے درمیان خلیج ختم ہوگئی۔ دو چار دن کے بعد میں نے کہا۔

"کبھی اپنی لڑکیوں کو میرے گھر لاؤ۔"

"وہ کچھ نہیں جانتا ہے۔"

"اسکول نہیں بھیجتی ہو۔"

"یہ ہم باپ کا ہوتا ہے وہ گیا وہاں۔"

اس نے آسمان کی طرف اشارہ کر دیا۔

"دن بھر وہ کیا کرتی ہیں۔"

"پیسہ اُڑاتا ہے۔ جو بھی دو سب خلاص۔ کہتا ہے اور لاؤ۔"

"تم روز کتنا پیسہ دیتی ہو۔"

"ایک ایک روپیہ بھی اور دو بھی۔ مٹھائی کھاتا ہے چاٹ کھاتا ہے اور رات کو بھوکا ملتا ہے۔"

میں نے دل میں کہا کہ جب لڑکیاں اتنا خرچ کرتی ہیں تو اس گڑ سے ان کو کیا خوشی ہوئی ہوگی۔ وہ خود ہی کہنے لگی۔

"ہم گڑ دے کر کہا سیٹھ نے دیا ہے۔ بہت خوش ہوا بہت۔ دونوں بولا ہم سیٹھ سے ملے گا۔"

یہ کہہ کر بنو ہنسنے لگی۔ پھر بولی۔

"ان کو پیار سے کبھی کوئی کچھ نہیں دیا۔ تم نے دیا اور سب لوگ خلاص۔"

ایک دن میں نے پوچھا۔

"بنو تمہارا شوہر اچھا آدمی تھا۔"

اس کے چہرے پر گہری گہری یادوں کی چھاپ آگئی۔ ٹھنڈی سانس بھر کر بولی۔

"عبدل! یہ دیکھو۔"

بنو نے اپنی ساڑی دُور تک ناف کے نیچے کھسکا دی۔ یہاں ایک گہرے زخم کا نشان تھا۔ ہوگا چھ انچ۔

"ارے یہ کیونکر ہوا۔"

"چاقو چلا۔ سب کٹ گیا۔ ڈاکٹر بولا اب تم خلاص۔"

"ہم بولا نہیں ڈاکٹر۔ وہ بولا ہمت کا عورت ہے۔ پھر ہم زندہ ہے۔"

"عبدل بھی بچ گیا مگر پیسہ سب خلاص۔"

میں سمجھ گیا کہ بنو کے شوہر عبدل نے کسی موقع پر چاقو مار دیا تھا۔

"چاقو مار دیا۔ بہت بُرا کیا تم سے محبت نہیں کرتا تھا۔"

"گالی دیتا تھا۔ مارتا تھا۔ ہمارا پیسہ چھینتا تھا۔ پٹ پٹ کر روتا بھی تھا۔ پاؤں بھی پکڑتا تھا۔"

میں نے بہت سمجھنا چاہا لیکن سمجھ میں نہ آیا کہ عبدل کس مزاج کا تھا۔

بنو سے دو دو تین تین منٹ روزانہ باتیں ہوتی تھیں اور میں اس کی گذشتہ زندگی کے بارے میں پوچھتا رہتا۔ جو کچھ معلوم ہوا وہ سب میرے لئے عجیب سا تھا۔

بنو بمبئی کی فٹ پاتھ پر بسنے والی اس مخلوق سے تھی جسے اپنے ماں باپ کا کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ جب اس نے ہوش سنبھالا تو دیکھا کہ وہ فٹ پاتھ کے لوگوں سے کھانا مانگتی پھرتی ہے۔ ایک دن اس نے کسی خوانچے والے کے خونچے سے کچھ نکال لیا۔ اس پر وہ اس کو بری طرح مارنے لگا۔ یہ تڑپتی رہی بلکتی رہی لیکن وہ مارے ہی چلا گیا۔ اس کی مار کے نشان آج تک باقی تھے۔ اتفاق سے اس وقت پڑوس کے مولوی صاحب اپنی بیوی کے ساتھ کہیں سے آرہے تھے۔ انہوں نے بنو کو خونچے والے کے ہاتھ سے چھڑایا۔ اور اپنے گھر لے جا کر رکھ لیا۔ اس کو کھانا اور کپڑا دینے لگے اور گھر کا کام لینے لگے۔ وہیں رہ کر یہ بڑی ہو گئی۔ پھر مولوی صاحب بمبئی سے جانے لگے تو بنو کو ساتھ لے جانا چاہا۔ یہ اسٹیشن تک تو گئی لیکن وہاں سے بھاگ آئی اور فٹ پاتھ کی زندگی گزارنے لگی۔

"کیوں تو بھاگ آئی اسٹیشن سے۔"

"پیٹ میں بچہ تھا۔ منگلو کہتا تھا کہ تو گئی تو ریل کی پٹڑی پر لیٹ جاؤں گا۔ خلاص ہو جاؤں گا۔"

"تو تو بھی اس سے پریم کرتی تھی۔"

"تھوڑا سا۔"

"تو کیا اس سے شادی کر لی۔"

"نہیں آگے چل کر وہ کہتا تھا کہ کماؤ۔ میں کہتی تھی کہ محنت کر کے کما تو لیتی ہوں وہ کہتا تھا کہ اِمکھوا ہے، بہت پیسہ ملے گا۔ میں کہتی تھی نہیں، وہ مارنے لگتا تھا۔ میں نے دادا سے کہا کہ بچاؤ۔ دادا نے اس کو چاقو دکھایا۔ ڈرایا اور کہا کہ بنو پر ہاتھ اٹھایا تو بس خلاص۔ اس دن سے منگلو خلاص۔"

"پھر بچہ ہوا۔"

"ہوا، خلاص ہو گیا۔"

تو دادا بولا کہ تو میری بن جا۔ پھر عبدل آیا تو دادا بولا کہ وہ شادی کرتا ہے تو کرلے۔ عبدل نے کہا شادی کرلے۔ میں نے پوچھا کیوں کرلے گا۔ کہنے لگا پریم ہوگیا ہے۔ پیسہ بنالوں گا تو پھر تجھے لے کر پارکوں میں اسی طرح گاتا پھروں گا جیسا فلموں میں ہوتا ہے۔ ہم ہنسا بہت ہنسا۔ گھومے گا تو کمائے گا کیا۔ بولا کہ ایک داؤں ایسا لگے گا کسی دن کہ سب کٹھنائی خلاص"

"کماتا بھی تھا پھر جوا کھیلتا تھا۔"

پھر دادا نے کہا بنو عبدل سے شادی نہ کر۔ وہ سب جوئے میں اڑا دیتا ہے۔ تب ہم عبدل سے بولا کہ تو شادی کرے گا تو تیرا پیسہ تیرا ہمارا پیسہ ہمارا۔ دادا بولا کہ ٹھیک بات ہے۔ پھر پوچھا کہ کیوں عبدل تو مانتا ہے۔ وہ بولا کہ نہ مانوں تو تم میرا گلا خلاص"

"بنو کی باتوں سے معلوم ہوا کہ دادا اس فٹ پاتھ کا بادشاہ تھا اور سخت آدمی تھا۔ لیکن بنو کو بہت مانتا تھا۔ کہتا تھا کہ ایسا ٹکڑا۔ پر جو کماتی ہے ہاتھ سے کماتی ہے۔ ٹکڑے سے نہیں کماتی"

بنو پہلے اپنی کمائی کمر میں باندھ کر رکھتی تھی۔ مگر پندرھویں بیسویں دن جب وہ فٹ پاتھ پر سوتی ہوتی تھی تو کوئی کمر سے پیسہ اڑا دیتا تھا۔ یہ دیکھ کر بنو نے ایک پان والے کو جس کی دوکان اسی فٹ پاتھ پر تھی اپنا بھائی بنا لیا اور اس سے کہا کہ میں تیری الماری کے پیچھے پیسہ ڈال دیا کروں۔ بھائی نے اجازت دے دی۔ وہ وہاں پیسہ اکٹھا کرنے لگی۔

"مگر تو کام کیا کرتی تھی؟"

بنو نے بتایا کہ مولوی صاحب کی بیوی بڑی ہوشیار تھیں انہوں نے گھر صاف کرنا۔ برتن مانجنا۔ کپڑے دھونا۔ سب سکھا دیا تھا۔ بنو چھ سات گھروں میں کام کرتی تھی وہیں اسے چائے اور کھانا مل جاتا تھا۔ اور کپڑے بھی۔ ان سب گھروں سے ماہوار روپیہ بھی ملتا تھا اور انعام اکرام بھی۔ اس طرح روپیہ سب بچ رہتا تھا اور وہ جوڑتی جاتی تھی۔

شادی کے کچھ دنوں بعد تک تو عبدل نے وعدہ کی پابندی کی لیکن پھر وہ جوئے میں ہارنے کے بعد بنو سے پیسے مانگنے لگا۔ اور ان کے لئے مارنے پیٹنے بھی لگا۔ ساتھ ساتھ یہ بھی دھمکی دی کہ دادا سے کہا تو ناک کاٹ لوں گا۔

میں نے قصے کے بیچ میں پوچھا۔

"تیری دونوں لڑکیاں عبدل کی ہی ہیں؟"

"دوسری تو اسی کی ہے پہلی کے بارے میں پکی بات نہیں کہہ سکتی۔"

عبدل کا اپنا گروہ تھا۔ اس میں جوا چلتا تھا۔ کون سا جوا ہوتا تھا اور کس طرح یہ بنو کو نہیں معلوم۔ اس کھیل میں تیسرے چوتھے دن مار پیٹ بھی ہو جاتی اور چاقو بھی چل جاتا تھا لیکن فٹ پاتھ کی زندگی میں تو یہ باتیں روزمرہ میں شامل ہیں۔ اس لئے کسی کو بھی غیر معمولی پن محسوس نہیں ہوتا تھا البتہ یہ سب چاہتے تھے کہ پولیس کو دخل دینے کا موقع نہ ملے۔ اس لئے ایسے معاملات کا فیصلہ دادا کرتا تھا یا وہاں کے کچھ آدمی پنچایت بنا کر طے کر دیا کرتے تھے۔

عبدل کے گروہ میں ایک جوان لکھن بھی آکر شامل ہو گیا۔ اس سے اور عبدل سے روزانہ مار پیٹ ہونے لگی۔ کیونکہ وہ کھیل میں بے ایمانی کرتا تھا۔ اور عبدل کو کھیل میں بے ایمانی کی برداشت نہیں تھی۔

ایک دن رات کو پچھلے پہر عبدل نے بنو کو جگایا۔ اس کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ عبدل خون میں نہایا ہوا پاس بیٹھا ہے اور دادا اور اس کا پان والا بھائی پاس کھڑے ہیں۔ عبدل کی تو ایسی حالت تھی کہ اس کے منہ سے آواز تک نہیں نکل رہی تھی۔ دادا نے بتایا کہ عبدل نے لکھن کے چاقو مار دیا ہے وہ بے جگہ لگ گیا اور وہ مر گیا۔

بنو گھبرا کر بیٹھ گئی بولی۔

"اب کیا۔ سب خلاص؟"

عبدل بولا۔

"نہیں چاقو چلے تو کام بنتے تیار ہے تو۔"

اس موقع پر بنو نے مجھ سے آنکھیں ملائیں تو ان میں عجیب گھٹا تھی۔ وہ بہت کچھ کہنا چاہ رہی تھی لیکن نہ تو ان کے پاس الفاظ تھے اور نہ ہی موسیقی۔ بنو بولی کہ چاقو چلنا تھا اور وہ چل گیا لوک سے (پیٹ کی طرف اشارہ کر کے) یہ کھل گیا۔ بچہ دانی چلا گیا۔ ہم گر گیا گرتے گرتے کہا کہ پان والا بھائی میرا پیسہ خرچ کر دو۔ عبدل کو بچا لو۔ بس دماغ خلاص ہو گیا۔ پھر گھنٹوں بعد سنا کہ ڈاکٹر بولا۔

"بنو خلاص"

"ہم بولا کہ مرنے کا نہیں۔" ڈاکو بولا کہ تم ضرور بچے گا۔ پھر ہم بچ گیا۔ پلیس نے سب پیسے لیا۔ عبدل چھوٹ گیا۔ دادا کہتا ہے کہ سب نے الماری کے پیچھے دیکھا تو پانچ ہزار نکلا۔"

"پھر عبدل نے کیا کیا۔"

"وہ پہلے ہم کو مارتا تھا پھر پاؤں پکڑ کر روتا تھا۔ کہتا تھا کہ تو نے وہ کیا جو فلموں میں ہوتا ہے۔ اسی طرح مارتا ہوا اور روتا ہوا مر گیا۔ بہت دنوں کے بعد چار لڑکیاں پیدا ہو گیا۔

(۳)

بنو کی زبان سے پورے واقعہ کا سمجھ لینا آسان کام نہیں تھا۔ میں تو اس پر سوال کرتا اور ہر جواب پر جرح کرتا تب جاکر اتنا معاملہ سمجھ میں آیا۔ لیکن یہ بات پھر بھی سمجھ میں نہیں آئی کہ عبدل نے لکھن پر چاقو چلانے کے بعد پھر بنو پر چاقو کیوں چلا دیا۔ آخر میں میں نے یوں جرح کی۔

"دادا کے سامنے چاقو چلایا۔"

"ہاں اس نے تو کہا تھا کہ اس طرح پولس عبدل کو چھوڑ دے گی۔" کیوں چھوڑ دے گی پولس قاتل کو، یہ بات میں اب بھی نہیں سمجھا، پوچھا۔

"چاقو کس نے چلایا۔ عبدل نے یا دادا نے۔"

میری نافہمی پر وہ جھنجھلا گئی اور کہنے لگی۔

"ہم چلایا تھا اور کون چلایا تھا۔ پھر ہم بولا عبدل نہ بچاتا تو لکھن ہم کو مار ڈالتا۔ اور ہمارا پیسہ لیتا کورٹ عبدل سے بولا جاؤ۔ خلاص۔"

اب جاکر میں سمجھا کہ فٹ پاتھ والی نے اپنے جواری کو بچانے کے لئے کون سا داؤ لگایا تھا۔

قرۃ العین حیدر

پالی ہل کی ایک رات

(یک بابی تمثیل جس کے سارے کردار قطعی فرضی ہیں)

کردار

۱ ۔ مولمے اُردشیر جنگ والا

۲ ۔ روداب جنگ والا

۳ ۔ آنٹ فیروزہ

۴ ۔ آغائے داراب کاظم زادہ

۵ ۔ خانم گلچہر اسفندیاری

مقام ۔ پالی ہل ۔ بمبئی ۔ زمانہ : جولائی ۱۹۷۲ء

وقت ۔ آٹھ بجے شب ۔

وسیع اسٹیج ۔ عقبی دیوار کے وسط میں دریچہ ۔ اس کے دونوں طرف گوآ کی سیاہ تپائیوں پر بیک گلدان ۔ بائیں دیوار پر دو اکیڈیمی پورٹریٹ ۔ ان کے عین نیچے کوئن این صوفہ ۔ دو کرسیاں کونے میں کاٹیج پیانو ۔ اس کے اوپر روپہلے فریم میں ایک متبسّم خورد نوجوان کا فوٹوگراف نوجوان کے ہاتھ میں ٹینس ریکٹ ۔ اسٹیج کے دائیں حصے میں ایک گول ڈائننگ ٹیبل اور تین کرسیاں ۔ دائیں پہلو کی دیوار کے برابر وکٹورین سائیڈ بورڈ جس پر ایک شمعدان (WILLOW PATTER) کی نیلی برطانوی پلیٹیں ۔ اور ملکہ الزبتھ ، پرنس فلپ ، شہنشاہ ایران شہبانو فرح پہلوی کی تصاویر ۔ دو ٹوبی مگ (TOBY MIGS) میز پر تین افراد کے لئے پلیٹیں چھری کانٹے اور گلاس مع نیپکن سجے ہوئے ہیں ۔ فرش پر خستہ ایرانی قالین ۔ فٹ لائیٹس کے قریب اسٹیج کے بائیں کنارے پر ایک چوبی منقش چینی صندوق جس کے ڈھکن پر ایک سیاہ ایرانی بلی نخوت سے متمکن ہے ۔ کمرے کا سارا ساز و سامان بوسیدہ اور شکستہ ہے ۔ دائیں اور بائیں کی دیواروں میں

دروازے۔ دریچے کے عین اوپر کوکو کلاک جو آٹھ بجا رہا ہے۔ ریشمی کیمونو پہنے جس پر ہری، ارغوانی، گلابی اور سفید دھاگے سے ایک مہیب ڈریگن کڑھا ہے۔ ناظرین کی طرف سے پشت پر ہوائے جنگ والا دریچے میں کھڑی ہے۔
رودابہ جنگ والا انگریزی پیانو کے سامنے بیٹھی ON RICHMOND HILL THERE LIVES A LASS — بجا رہی ہے۔

ہوملائے :۔ اوہ شٹ اپ روڈی — میں دُعا میں مصروف ہوں۔ ڈسٹرب مت کرو۔
(رودابہ "TIS THE LAST ROSE OF SUMMER LEFT BLOOMING A LOVE — بجانے میں مشغول ہو جاتی ہے)
ہوملائے :۔ رُوڈی — آج پورنماشی کی رات ہے اور آج ہی میں وضو کرنے میں گڑبڑا گئی — بتاؤ۔ مُنھ دھونے سے پہلے واشم دو ہو پڑھتے ہیں نا۔ پھر کُلّی کرنا۔ پھر تین دفعہ پنجے دھونا۔ پھر تین دفعہ کہنیوں تک ہاتھ۔ ہاتھ کی طرف سے کہنیوں تک نا؟ — پھر پاؤں — ذرا سی بھول چوک میں گناہ ہوگا — (روداب منھ اُٹھا کر" لاسٹ او روز آف سمر" گانا شروع کر دیتی ہے۔ دونوں عورتوں کے چہرے تشکیلیں اب تک چھپی ہوئی ہیں۔ اب ہوملائے پہلی بار حاضرین کی طرف رُخ کرتی ہے۔ ایک معمر، پریشان صورت عورت) رُوڈی۔ بتاؤ نا۔ اسکول کی چھوکریوں کی طرح شور مت کرو۔ آج میں نے سنج گاہ کی نمازیں بھی قضا کر دیں۔ قضا پڑھنا فرض ہے نا۔؟ کل دستور جمشید جی سے پوچھوں گی۔ آج پورن ماشی میں ماہ نیالش کی تلاوت کرنا چاہتی ہوں لیکن بادلوں میں چاند نظر ہی نہیں آرہا۔ بڑے زور کی بارش آنے والی ہے۔ ہو شنگ کیسے پہنچےگا۔
(روداب سُنی اَن سُنی کر کے پیانو بجاتی رہتی ہے۔ باہر بارش شروع ہو جاتی ہے۔ بجلی چمکتی ہے۔ اوپر چھت پر سے کھٹ کھٹ کی آواز آنے لگتی ہے۔ دریچے کے نیچے اسٹیج کے عقب میں بلیاں رونا شروع کرتی ہیں۔ چینی صندوق پر بیٹھی ایرانی بلّی کالی سے اتر کر صوفے کے نیچے چلی جاتی ہے۔ بادل گرجتے ہیں۔ ہوملائے اونچی آواز میں خدا کے ایک سو نامون کا ورد شروع کر دیتی ہے۔

یزد۔ ہرو سپ توان[1]۔ ہروسپ آگاہ[2]۔ ہروسپ خدا[3]۔ اوری انجام۔ افزا۔ پرورا۔ خرد شید تم۔ پرلید۔ ہرنیک فرہ۔ فرمان کام — آزموش۔ اترس۔ افزادوم۔ آدرباد گر —
روداب :۔ (زور سے گاتی ہے)

---

[1] قادر۔ [2] علیم۔ [3] مالک کائنات

WEEP NO MORE MY LADY

O WEEP NO MORE TODAY

WE SHALL SING ONE SONG OF THE OLD

KENTUCKY HOME OF THE OLD

KENTUCKY HOME FAR AWAY

ہوماے :۔ (کانوں پر ہاتھ رکھ کر) یاآدر نگر — بادنگر۔ بادگل گر۔ اگمان ۔ انسان ۔ فیروزگر — نیافریدہ — دادار — فرہمند۔ دادر — (باہر دریچے کے نیچے قدموں کی چاپ)

رودابہ : (رک کر) کوئی آیا — دائیں دروازے کی کال بیل بجتی ہے۔

ہوماے : (کواڑ ذرا سا کھول کر باہر جھانکتی ہے۔ پھر رودابہ سے) ینگ فارنرز — !

رودابہ : ہپی — ؟

ہوماے : ہیں، ہپی ہیں۔ نہایت شاندار باعزت انگریز نوجوان۔ (دروازہ کھولتی ہے۔ ایک نوجوان لڑکا اور لڑکی ذرا جھجکتے ہوئے اندر آتے ہیں۔

نوجوان لڑکا : (اوکسفورڈ لہجے میں) تھینک یو میم۔ موسٹ کائنڈ آف یو — (برساتی اتارنے میں لڑکی کی مدد کرتا ہے پھر اپنی برساتی اتارتا ہے۔ لڑکی سنہرے بال، خوبصورت۔ بیش قیمت امریکن فراک پہنے ہے۔ دونوں بہت متمول معلوم ہوتے ہیں۔ لڑکی کے ہاتھ میں ایک پارسل ہے)۔

لڑکی : (امریکن لہجے میں) معاف کیجئے گا ہم نے آپ کو ڈسٹرب کیا۔ ہم مسز کلثوم زری والا کا بنگلہ تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ کیا آپ بتا سکیں گی؟ (ایک پرچہ دکھاتی ہے۔ ہوماے جواب نہیں دیتی۔ وہ حیرت اور رشک کے ساتھ اس نوعمر حسین اور صحت مند جوڑے کو تکے جا رہی ہے۔ جیسے دونوں کسی پرانے خوشگوار خواب میں سے اچانک نمودار ہو گئے ہوں۔

رودابہ فوراً اسٹول سے اٹھ کر آتی ہے۔ عینک لگا کر لڑکی کے پرچے پر لکھا پتہ پڑھتی ہے)۔

لڑکی : کیبی نے کہا شاید آپ کے ہاں سے معلوم ہو جائے۔ سڑک تو یہی ہے (رودابہ نفی میں سر ہلاتی ہے)

لڑکا : کتے اور بلیاں برس رہے ہیں۔ کیا ہم آپ کے ہاں چند منٹ ٹھہر سکتے ہیں؟ ٹیکسی ڈرائیور اس طوفان میں آگے جانے سے انکار کر رہا ہے۔

ہوماتے: (چونک کر) اوہ یقیناً — اندر آجاؤ — ڈیر —

(لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے کو دیکھ کر کمرے میں داخل ہوتے ہیں)

لڑکی — ... — تھینکس

ہوماتے :۔ امریکن —؟

لڑکی :۔ نو میم — ایرانین

لڑکا :۔ (جھک کر) خانم گلچہر اسفندیاری و داراب کاظم زادے

ہومائی، رودابہ :۔ ہاؤ ڈو یو ڈو —

(وہ دونوں صوفے پر بیٹھ جاتے ہیں۔ روشنی میں گلچہر کے لاکٹ پر ہیروں سے بنا "یا علیؑ" جگمگانے لگتا ہے۔ ہومائے ایک کرسی پر ٹک کر بلّی کو گود میں اُٹھا لیتی ہے۔ رودابہ سرعت اور احساسِ مصروفیت کے ساتھ بائیں دروازے سے باہر چلی جاتی ہے۔

ہومائے :۔ تم لوگ کہاں سے آرہے ہو؟

داراب کاظم زادہ :۔ آج صبح لندن سے — میں کیمبرج میں پڑھتا ہوں۔ یہ میری کزن اور منگیتر۔ گلچہر سارا لارنس میں زیرِ تعلیم ہے امریکہ میں —

گلچہر :۔ کالج میں میری ایک انڈین کلاس فیلو ہے خدیجہ زری والا — اس نے ایک پیکٹ اور خط دیا تھا کہ بمبئی میں اس کی والدہ کو دیدوں۔

داراب کاظم زادہ :۔ (کلینڈ بجا نوی لہجے میں) مس زری والا نے اپنے مکان کا فون نمبر بھی دیا تھا۔ ہم لوگ اپولو بندر پر ہوٹل سینٹور میں ٹھہرے ہیں۔ وہاں سے فون کیا مگر بارش کی وجہ سے لائن خراب تھی۔ تمام کو ٹیکسی لے کر مکان ڈھونڈنے نکلے۔ (رودابہ چائے کی ٹرے لیے کمرے میں واپس آتی ہے —) ہم دونوں — کزن گلچہر اور میں — چھٹیوں میں ہندستان کی سیاحت کے لیے آئے ہیں۔ وطن ہوتے ہوئے اپنے اپنے والدین سے مل کر مغرب واپس جائیں گے —

ہومائے :۔ وطن —؟

داراب :۔ طہران۔ ایران —

ہومائے :۔ اوہ۔ اف کورس — (داراب نظریں اُٹھا کر سائیڈ بورڈ پر ڈالتا ہے جس پر شاہ و شہبانو ایران کی تصویر رکھی ہے۔ وہ ذرا تعجب اور مسرت سے مسکراتا ہے۔ ہومائے چُپ بیٹھی ہے ایسا لگتا ہے

شاید مدتوں بعد گھر میں مہمان آئے ہیں اور اس کی سمجھ میں نہیں آرہا کہ ان سے کیا بات کرے۔

رودابہ: (چائے کی ٹرے کارڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے) ہوملے تم نے ہم لوگوں کا تعارف کرا دیا... ؟ ینگ مین۔ میرا نام رودابہ اردیش جنگ والا ہے۔ یہ میری بڑی بہن مس ہوملے جنگ والا (داراب اور گلچہر مسکرا کر سرخم کرتے ہیں)۔ اور وہ ہملے والدین — سر اردشیر کیکاؤس اور لیڈی تہمینہ جنگ والا۔

داراب: (زیرلب) ہاؤ فینسی نیٹنگ!

رودابہ: (پیانو پر رکھی ٹینس ریکٹ والے نوجوان کی تصویر کی طرف اشارہ کر کے) یہ ہوشنگ سروش یار مرزا۔ ہوملے کا منگیتر — بس یہی ہمارا خاندان ہے۔ چھوٹا سا — (ہوملے ذرا شرما کر سر جھکا لیتی ہے۔ "منگیتر" کے لفظ پر داراب کاظم زادہ اور گلچہر اسفندیاری قدرے متحیر نظر آتے ہیں۔ اوپر چھت پر کھٹ کھٹ کھٹ کی آواز۔ دونوں نووارد گھبرا کر ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ رودابہ چائے بناتی ہے)۔ داراب — تھینکس — ہاؤ ویری نائس آف یو —

رودابہ: یہ لوکیک آج ہی ہومائی نے بیک کیا ہے — اور کاٹیج چیز اور اسکونز میں نے خود بنائے ہیں۔

داراب کاظم زادہ: گڈ لارڈ — کاٹیج چیز اور اسکونز — معلوم ہوتا ہے جیسے میں ابھی انگلستان ہی میں ہوں!

ہومائے — (ہونٹ چبا کر) ہاہا — اس مکان سے باہر نکلو گے تو پتہ چلے گا یہاں کے اسٹینڈرڈ کتنے گر گئے ہیں۔ میں امید کرتی ہوں تم کو مسز لوبج کسانا والا کا بنگلہ مل جائے گا۔ اگر اب تک گرا نہ ہو —

گلچہر اسفندیاری: مسز کلثوم زری والا —

رودابہ: کارٹر روڈ — ؟

گلچہر: جی نہیں۔ ... ٹیکسی والا سالے پالی ہل پر لیے پھرا۔ ہوٹل میں کسی نے بتایا تھا کہ یہ جگہ دلیپ کمار کے بنگلے کے نزدیک ہوگی۔ ایک راہگیر بولا۔ ... نے کہا یہ دو بنگلے پالی ہل کے لینڈ مارک معلوم ہوتے ہیں تو وہ دور والا میڈیم لینڈ مارک ہے تو وہ مینا کماری رہتی تھیں۔ (ہنستی ہے) راجیش کھنہ کے بنگلے کے آگے تو یہی آپ کا مکان نظر آیا۔ ہم اس میں پہنچ گئے۔

ہوملے: (ذرا ناگواری سے) راجیش کھنہ کون ہے؟

رودابہ: ہومائے ڈیر — راجیش کھنہ ایک سینما ایکٹر ہے۔ دلیپ کمار بھی —

گلچہر اسفندیاری: (ذرا جوش سے) دلیپ کمار۔ مینا کماری۔ وجینتی مالا، میں ان سب کی موویز طہران میں دیکھ چکی ہوں اپنے بچپن میں — آئی لو انڈین موویز۔ میری ممی نے تو سنگم مووی پانچ مرتبہ دیکھی تھی اور داراب یاد ہے۔ ہمارے بچپن

میں طہران میں وہ انڈین فلم سونگ کس قدر مقبول تھے۔ دوست دوست نہ رہا۔ اور میری جان شب بخیر۔ آپ کو یہ گیت آتے ہیں ۔۔؟ رو دابہ نفی میں سر ہلاتی ہے۔

داراب :۔ گلچہر۔ میرا خیال ہے اب کل دن کی روشنی میں تمہاری سہیلی کی والدہ کا مکان تلاش کریں گے۔ اب ان مہربان میزبانوں کا شکریہ ادا کر کے چلیں۔ بارش کا زور کچھ کم ہو رہا ہے ۔۔ (شھٹھک کر) میم ۔ آپ کے ہاں چینی نوادر کا بہت عمدہ ذخیرہ موجود ہے! ہومائے (چونک کر، خوشی سے) میرے گریٹ گرینڈ فادر نے چائنا سے تجارت شروع کی تھی۔ ان کے تھے ۔۔ تجارتی جہاز ۔ جو بمبئی سے کینٹن جایا کرتے تھے۔

داراب :۔ او انٹرسٹنگ۔

ہومائے :۔ (جواب نہ ملنے کے بعد متعلق بتانے کے لیے دفعتاً بہت بے چین نظر آتی ہے) ڈپریشن سے قبل اس سڑک کے بیشتر بنگلے ہمارے خاندان کی ملکیت تھے۔ کریش کے بعد سب بک گئے۔ چین سے ٹریڈ بھی ختم ہو گئی۔

داراب :۔ اور آپ کے والدین ۔۔؟

ہومائے :۔ دونوں مر گئے۔

داراب :۔ بہن بھائی ۔؟

رودابہ :۔ وہ بھی مر گئے۔

داراب :۔ دوسرے رشتے دار ۔۔؟

رودابہ :۔ وہ بھی مر گئے۔

داراب :۔ اوہ ۔ آئی ایم سوری۔

ہومائے :۔ ٹھیک ہے۔ اس کے متعلق تم کیا کر سکتے ہو۔ (اوپر چھت پر پھر کھٹ کھٹ شروع ہو جاتی ہے)۔

گلچہر اسفندیاری : (چائے کی پیالی ختم کر کے داراب سے) اب اجازت لیں ۔؟

رودابہ :۔ نہیں نہیں۔ ابھی بیٹھو۔ ڈنر کھا کر جانا۔ میں نے آج دھن سگ بنایا ہے۔ خاص پارسی ڈش۔

داراب :۔ تھینک یو۔ شکریہ لیکن بہت رات ہو جائے گی۔ باہر ٹیکسی منتظر ہے۔ رودابہ ٹیکسی رخصت کرو۔ ابھی ہوسٹنگ آنے والا ہے۔ تم کو تمہارے ہوٹل پہنچا آئے گا۔ سانتا کروز یہاں سے زیادہ دور نہیں۔ ہومائے (چونک کر)۔ ہمارے پاس ۱۹۳۰ء ماڈل کی پیکارڈ ہے۔ پہلے میں اسے خود چلایا کرتی تھی۔ فرانٹیئر سے۔ ویک اینڈ کے لیے پونا۔ گرمیوں میں مہابلیشور۔ ماتھیران۔ زمانے سے بھرتی جاتی تھی۔ اب میرے گھٹنوں میں گٹھیا کا اثر ہوتا جا رہا ہے۔ پیکارڈ پندرہ برس سے موٹر خانے

میں بند پڑی ہے۔ ہوشنگ آ جائے میں اس سے کہوں گی تم کو اسی میں تمہارے ہوٹل پہنچا دے۔

داراب :- (گھبرا کر) جی نہیں۔ مادام۔ مادموزیل ـــــ زحمت نہ کیجیے۔ ہم ٹیکسی پر ہی چلے جائیں گے۔ (ہمارے ریکلیکٹ سکون سے) اچھا جو تمہاری مرضی۔ ہوشنگ بھی میری پیکارڈ چلانے پر راضی نہیں ہوتا ٹیکسی پر آ جاتا ہے۔

گلچہر :- (اب ذرا اکتا کر) مسٹر ہوشنگ کب آئیں گے؟ (کوکو کلاک سے پرندہ باہر نکل کر سریلی سیٹی بجاتا ہے)۔

روداب :- ابھی آتا ہی ہوگا۔ اسے تاش کی لت ہے۔ روزانہ پابندی سے ولنگڈن کلب جاتا ہے۔ پہلے ٹینس پھر کانٹریکٹ۔ دس گیارہ بجے تک یہاں آتا ہے۔ تم لوگ یہاں بمبئی میں کب تک ہو۔؟ کسی شام ہوشنگ کے ساتھ ولنگڈن کلب ہو آؤ۔ آج بھی نو دولتوں کے اس نئے بدصورت شہر میں اس کلب کا پرانا برٹش ماحول برقرار ہے۔ پرانی نسل کے چند ضعفا جنٹلمین اب بھی دستانے پہن کر چھڑی ہاتھ میں لے کر وہاں برج کھیلنے آتے ہیں۔

داراب :- ہاؤ انٹرسٹنگ۔ گلچہرہ۔ جیسے نیو انگلینڈ کے پرانے کنٹری کلب۔ ہوماۓ ـــــ یو آر رائٹ میں بھی جنگ سے پہلے چا ماما کے ساتھ امریکہ گئی تھی اس سے بھی کئی سال قبل ماما جب پہلی بار پاپا کے ساتھ امریکہ گئی تھیں ہالی ووڈ میں رڈولف ویلنٹینو نے اپنے ہاتھ سے ان کو اپنی تصویر بھی دی تھی ـــ دکھاؤں ـــ؟ (اٹھتی ہے)۔ گلچہر ـــ مائی گوڈ۔

روداب :- ہوماۓ۔ اب وہ تصویر کہاں تلاش کرو گی ـــ چھوڑو ـــ ہوماۓ (پھر بیٹھ جاتی ہے اب داراب کو مخاطب کر کے) ہم دونوں بہنوں نے سوئٹزرلینڈ میں فنشنگ اسکول کیا۔ ہوشنگ نے تمہاری طرح اوکسفرڈ میں پڑھا تھا۔

داراب :- میں کیمبرج میں ہوں۔

ہوماۓ :- نیور مائنڈ۔ اچھا ذرا میں کچن میں ہو آؤں۔ ایکسیوز می (اٹھ کر بائیں دروازے سے باہر چلی جاتی ہے روداب۔ اس کے پیچھے پیچھے جاتی ہے۔ دریچے کے باہر طوفان بادوباراں کی گرج۔ سمندر کا شور بڑھتا جا رہا ہے۔

داراب اٹھ کر دریچے سے باہر جھانکتا ہے۔ (آہستہ سے) اُوہ۔ کتنا گھپ اندھیرا ہے باہر۔ میں نے ایسی تاریک رات کبھی نہیں دیکھی۔ انڈین مونسون کی رات ـــ سمندر۔ بادل۔ اور رات سب گھل مل کر ایک ہو گئے ہیں ـــ

گلچہر ذرا خوفزدہ ہو کر داراب کے پاس جا کھڑی ہوتی ہے بلحاظ تحفظ کے لیے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیتی ہے

گلچہر :- دارایوش ـــ

داراب :- (گھبرا کر) ارے ہماری ٹیکسی غائب ہو گئی۔ گلچہر (کھڑکی سے باہر جھانک کر) نہیں نیچے پورٹیکو میں کھڑی تو ہے۔ کیا گھٹا ٹوپ اندھیرا ہے۔ (ذرا توقف کے بعد) اس طرح کے پرانے شاندار عالیشان مکان جنوبی ایشیا میں بھی موجود ہیں۔ کوئن پلانٹیشنز پر ـــ ہماری میزبان کہاں چلی گئیں ـــ؟

داراب: ۔ بے چاریاں ہمارے لیے ڈنر کا انتظام کرنے گئی ہیں۔

گلچہر: ڈیلائٹ فل اولڈ لیڈیز۔ سو کیوٹ بالکل پھدکتی ہوئی چڑیاں معلوم ہوتی ہیں۔

داراب: (افسردگی سے) گلچہر۔ بڑھاپے کا مذاق نہ اڑاؤ۔ کبھی ہم اور تم بھی بوڑھے ہوں گے۔ اگر زندہ رہے۔ گلچہر (ندامت سے) آئی ایم سوری ۔ داراب

داراب: (سوچتی ہوئی آواز میں ۔ آہستہ آہستہ) انسانوں کی طرح نسلیں بھی بوڑھی ہو جاتی ہیں ۔ کیمبرج میں ایک مرتبہ میرے ایک انڈین پارسی دوست نے بتلایا تھا کہ ساری دنیا میں پارسیوں کی تعداد السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا کی سرکولیشن سے ایک تہائی کم ہے! گلچہرہ ۔ گڈ گاڈ!

داراب: آج تیسرے پہر جب ہم لوگ سیر کرتے مالابار ہل کی ڈھلوان پر سے آ رہے تھے ۔ راستے میں ٹیکسی ڈرائیور نے ایک گھنے سرسبز جنگل کی طرف اشارہ کر کے بتایا تھا کہ اس میں پارسی لوگ کا دخمہ ہے ۔ یاد ہے ۔ ؟

گلچہر: ہاں۔

داراب: اس وقت مجھے ایک خیال آیا۔ پس ارگاد ۔ پرسی پولس ۔ طاق کسریٰ۔ اور آخر میں فقط مالابار ہل بمبئی کا دخمہ! ۔ لارڈ ۔ واٹ این اینٹی کلائمکس! گلچہر ۔ ہاؤ سیڈ

داراب: ۔ نہیں۔ رنج نہ کرو۔ ہم تو زندہ ہیں۔ اور یہ غیر معمولی لوگ بھی باقی رہیں گے۔ (بارش دفعتاً تھم چلی ہے۔ دریچے کے باہر مدھم سی دودھیا روشنی آہستہ آہستہ تیز ہوتی ہے۔ داراب۔ گلچہر ۔ دیکھو بادل ذرا سے چھٹے چاند نکل آیا۔ ماہ کامل ۔ سامنے والے بنگلے کے پیچھے بادلوں میں سے نمودار ہوتا کتنا فسوں خیز معلوم ہو رہا ہے۔ بالکل جیسے کانسٹبل کی ایک پینٹنگ ۔ کبھی یہ جگہ بیحد خوبصورت رہی ہوگی۔

گلچہر: ٹیکسی ڈرائیور کہہ رہا تھا صرف دس برس پہلے تک سارے پالی ہل پر انتہائی پکچرسک بنگلے موجود تھے۔ اب سب غائب ہوتے جا رہے ہیں انہیں گرا کر ان کی جگہ اسکائی اسکریپر بنا دیئے گئے ۔ داراب میں امریکہ سے ہندوستان یہ معمولی اسکائی اسکریپر دیکھنے تو نہیں آئی ۔ کل ہی چلو بمبئی سے۔

داراب: ڈارلنگ ۔ ہم لوگ اصل ہندوستان سیر کے لئے پرسوں سویرے ہی یہاں سے روانہ ہو جائیں گے ۔ ایلورا اجنتا ۔ جے پور ۔ آگرہ ۔ دلی کھجوراہو ۔ دی ورکس ۔ اُکتاؤ نہیں ۔ (باہر مینہ پھر برسنے لگتا ہے۔ ہوانے اور دولبہ دو کشتیاں اٹھائے کمرے میں واپس آتی ہیں کشتیاں جن میں ڈھکے ہوئے ڈونگے چنے ہیں۔ ڈائننگ ٹیبل پر رکھ کر اپنی اپنی جگہ واپس آ بیٹھی ہیں۔ داراب اور گلچہر دریچے سے ہٹ کر صوفے کی طرف آتے ہیں۔ بوڑھے اپنے

ہاتھوں کو دھیان سے دیکھ رہی ہے)

داراب :۔ مادموزیل ۔ آپ دونوں کے ہاتھ کتنے خوبصورت ہیں۔ ارسٹوکریٹک ۔ چھوٹے چھوٹے ہاتھ جنہوں نے کبھی کام نہیں کیا سوائے پیانو بجانے اور کشیدہ کاری کے ۔۔ (دونوں بہنیں تشکر آمیز نگاہوں سے داراب کاظم زادہ کو دیکھتی ہیں)

ہومائے :۔ (ذرا گھبرائی ہوئی آواز میں) پیارے نوجوان آدمی ۔ تم بہت مہربان ہو ۔ اور بہت مہذب ۔ لیکن ہمارے ٹیلر، کک، میڈ سب کب کے رخصت ہوئے ۔ عرصے سے ہم دونوں خود ہی کھانا پکاتے ہیں ۔ خود گھر کا سارا کام کرتے ہیں۔

داراب :۔ (خلوص سے) آپ ہمارے لئے تکلیف نہ اٹھائیے۔ ہم ہوٹل واپس جا کر ۔۔ ہومائے ۔ نہیں نہیں ۔ ہوشنگ آنے والا ہے ۔ ہم سب کے ساتھ ڈنر میں شریک ہوں ۔۔ پلیز ۔۔

داراب :۔ بہت خوب ۔ شکریہ ۔ وہ صوفے سے اٹھ کر کمرے میں ٹہل ٹہل کر سامان آرائش دیکھنے لگتا ہے پھر سر اردشیر اور لیڈی جنگ والا کے روغنی اکیڈمی پورٹریٹ کے سامنے جا کھڑا ہوتا ہے ۔۔ ہومائے (نخیف سے) ہمارے بابا اور ماما (رومال سے آنکھیں خشک کرتی ہے)۔

داراب :۔ جی ہاں ۔ آپ نے بتایا تھا (بیٹھ جاتا ہے)۔

ہومائے :۔ دی ایئر نائنٹین تھرٹی فور میں جب بابا دیوالیہ ہوئے ۔ انہوں نے برسات کی ایک ایسی ہی اندھیری رات اسی کمرے میں تولیہ سر پر لپیٹ کر اپنی کنپٹی پر پستول چلا دیا تھا ۔۔ (کچھ دیر خفیف سا لرز کر داراب کو دیکھتی ہے) کچھ عرصہ بعد ماما شدتِ غم سے چل بسیں ۔ دستور جمشید ہمارے فیملی پریسٹ نے ہمیں سمجھایا" روایت ۔ ہادوخت نسخ میں لکھا ہے :۔ خدا اور اس کے پیغمبر[1] کا ارشاد ہے کہ مرنے والے کی موت پر رونا گناہ ہے ۔ جب مرنے والا عالم نزع میں ہوتا ہے دیو استاگ واد اس کی روح قبض کرنے آتا ہے ۔ بالا روئے کیکاؤس جس نے آسمان پر پرواز کرنے کی کوشش کی تھی ۔ دیو استاگ واد کے پنجے سے نہ بچا ۔ نہ افراسیاب شاہ توران جس نے موت سے بچنے کی سعی میں سمندر کی تہہ میں آہنی محل بنوایا تھا ۔۔ ماما کی لاش کو بھی پہلے آبِ زر[2] اور پھر آبِ طاہر سے غسل دیا گیا ۔ زمین پر ان کا بستر بچھایا گیا ۔ سروش باج کی تلاوت ہوئی ۔ سگ دید کرائی گئی ۔ کفن پہنایا گیا ۔ دستور لوگ پشت گاہاں کے لئے تیار ہوئے ۔ دخمے میں میت چڑھا کر دروازہ مقفل کیا گیا ۔ پسماندگان نے بعد وضو نماز دخمہ ادا کی ۔ تین رات تک ہمارے گھر میں اور دخمے کے نزدیک چراغ جلا ۔ دخمہ جانتے ہو ۔ ہم اگر تین راتوں میں اوستا نہ پڑھی

---

[1] حضرت زرتشت ۔ [2] گئو جل ۔

جائے تو سروش[1] روح کی مدد نہیں کرتا۔ روح کے لئے پہلی تین راتیں بہت بھاری ہیں جو اسے خوفزدہ راتیں معلوم ہوتی ہیں۔ انگرہ دما مزہ دیو آ کر اسے ڈراتے ہیں۔ لیکن انہیں تین راتوں میں روح سروش پُل پر اس کی رہبری کرتا ہے۔ نیک روحاں کو امیشا سپند پل چنوت پر سے گزار لیجاتے ہیں۔ مقدس ارواح اور فردوس کی حوریں پُل کے سرے پر زرمایہ روغنا[2] سے اس کا خیر مقدم کرتی ہیں۔ وہ تا قیامت سرور رہتی ہے۔ چوتھے روز طلوع آفتاب سے قبل آخرنگاں کی ملاقات کی گئی تاکہ روحاں برزخ میں سے نکل جائے۔ دستور آدھی رات کو آکر گھر کی دہلیز پر کھڑے ہو کر پسماندگان کو اطلاع دیتے ہیں۔ اب متوفی کی روح فلاں فلاں مقام پر ہے۔ اب فلاں جگہ پہنچ چکی ہے ___ پاپا اور ماما کے لئے بھی انہوں نے ایسا ہی کیا (ذرا توقف سے) مجھے یقین ہے پاپا اور ماما کی روحیں فردوس میں موجود ہوں گی ___ (رومال سے پلکیں خشک کرتی ہے۔

داراب:۔ چند لمحوں بعد گہری آواز میں) مجھے بھی یقین ہے مادموزیل ___ (خاموشی کا مختصر وقفہ۔ معاً چھت پر کھٹ کھٹ شروع ہو جاتی ہے۔ دونوں ایرانی مہمان گھبرا کر اوپر دیکھتے ہیں) گلچہر (کھنکار کر) معاف کیجئے گا میم۔ کیا بالائی منزل پر کرائے دار رہتے ہیں (دونوں بہنیں متوحش ہو کر ایک دوسرے پر نظر ڈالتی ہیں۔

ہوملے:۔ (روداب سے) انہیں بتلا دوں؟ اسٹیج کے باہر ونگ میں کسی کے زینہ اترنے کی آواز۔ کھٹ۔ کھٹ۔ دائیں دروازے میں ایک بیحد ضعیف پارسن آسیب کے مانند نمودار ہوتی ہے۔ سفید لیس کا بلاؤز۔ سفید ریشمی ساری جس پر سیاہ مخملیں بیل لگی ہے۔ بیل پر کاسنی گلابی فیروزی اور سبز فیتوں اور موتیوں سے پھول بنے ہیں۔ شانے پر ہیرے کا بروچ۔ پاؤں میں سبک سینڈل کانوں میں گوشوارے گلے میں سچے موتیوں کی مالا۔ ہاتھوں میں جالی کے سفید دستانے پاؤں میں ساٹن کے سبک سفید سینڈل۔ دائیں ہاتھ میں پیراسول معلوم ہوتا ہے گویا سیدھی بکھنگم پیلس کی گارڈن پارٹی سے واپس آ رہی ہیں۔ عمر تقریباً پچانوے (۹۵) سال۔ ضعیفہ (جھرجھری آواز میں)۔ ہوملے۔ روداب ___ سروش کسی کی مدد نہیں کرتا۔ نہ بہرام یزد[3]۔ نہ خوداہرمزد ___ اس دھوکے میں کبھی نہ رہنا۔ سمجھیں ___؟ سب عالم برزخ ہی برزخ ہے۔ یا جہنم ___ فردوس کہیں نہیں ہے۔ سمجھیں ___؟ باقی یہ کہ وہ پُل پر مہرداد اب کے سامنے پہنچ چکا ہے اور اب اس کا اور میرا مقدمہ مہر یزد کے سامنے پیش ہونے ہی والا ہے۔ آدھی رات کو تمہیں یہی اطلاع دینے آئی ہوں ___ گڈ نائٹ۔ (ضعیفہ کھٹ کھٹ چلتی اسٹیج پر سے گزر کر بائیں دروازے سے باہر نکل جاتی ہے۔ گلچہر

---

[1] اوستا: پرتو۔ پہلوی: پُوہر۔ فرانسیسی: پوں۔ عربی میں یہی پُل صراط ہے۔ [2] موسم بہار میں تیار کیا ہوا مکھن۔ [3] ایک مددگار رہبر فرشتہ

سہم کر داراب سے لپٹ جاتی ہے۔ رودابہ اور ہوماتے سہم کر بیٹھی ہیں۔ باہر ونگ میں سیڑھیاں چڑھنے کی آواز کمرے میں سناٹا۔ ککو کلاک میں سے پرندہ نکل کر سُر یلی سیٹی بجاتا ہے۔ کوکو۔ کوکو۔ کوکو۔) رودابہ سنبھل کر) آئی ایم سو سوری۔ یہ بے چاری ہماری دیوانی آنٹ فیروزہ ہیں۔ سابق لیڈی فیروزہ ڈائمنڈ کٹر۔ اوپر کی منزل میں رہتی ہیں۔ بالکل سنِک۔ دماغ چل گیا ہے مگر بچانوے سال کی عمر میں کیا قابلِ رشک صحت ہے۔ سارے وقت پیراسول کی نوک سے فرش کھٹکھٹایا کرتی ہیں۔ لکڑی کی چھت ہے اس وجہ سے آواز صاف آتی ہے۔ ہمیں تنگ کرنا ان کا اصل مقصد ہے (داراب اور گلچہرہ ایک دوسرے کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے رہتے ہیں)۔

ہوماتے:۔ میرا خیال ہے ہوشنگ کے آنے سے قبل تم دونوں کو بے چاری کریزی آنٹ فیروزہ کا قصہ سنا ہی دوں۔

رودابہ:۔ (ڈانٹ کر) نہیں ہوماتے خاموش رہو۔

ہوماتے:۔ ہرگز نہیں ضرور سناؤں گی۔ (داراب اور گلچہرہ اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور سرعت سے بائیں دروازے کی جانب بڑھتے ہیں۔ ہوماتے لپک کر داراب کا بازو پکڑ لیتی ہے اور غیر معمولی طاقت سے دونوں نوجوانوں کو دھکیلتی ہوئی دریچے کے پاس لے جاتی ہے) وہ سامنے ادھ جلا بنگلہ دیکھتے ہو۔۔۔؟ ملتا س کے اُدھر۔۔۔؟

داراب:۔ (ہکلا کر) جی۔ جی ہاں۔

ہوماتے:۔ یہ آنٹ فیروزہ کا مکان تھا۔ داراب عادتاً "ہاؤ انٹرسٹنگ" کہنا چاہتا ہے مگر سہم کر رک جاتا ہے۔

ہوماتے:۔ آنٹ فیروزہ ہماری والدہ کی دور کی رشتہ دار تھیں۔ امیر کبیر۔ ماں باپ کی اکلوتی۔۔۔ دی ایٹین نائنٹیز نائٹ نائیٹو میں جب اپنے سوئس اسکول سے واپس آئیں۔ یورپ سے۔ ان کی شادی سر فریدوں جی ڈائمنڈ کٹر سے کر دی گئی۔ سر فریدوں بلجیم سے ہیروں کی تجارت کرتے تھے۔

رودابہ:۔ شادی کے اٹھارہ اُنیس سال کے بعد وہ مر گئے۔ لیڈی فیروزہ ڈائمنڈ کٹر ایک کروڑ پتی لاولد بیوہ رہ گئیں۔

ہوماتے:۔ ہوشنگ سر وشتیار مرزا میر الرحمٰن کا دوست تھا۔ مگر اس کے ماں باپ معمولی لوگ تھے۔ باپ سنٹرل بنک میں ہیڈ کلرک۔ سر اردشیر جنگ والا کی لڑکی کی شادی اس سے کس طرح ہوتی۔ وہ پارسی تعلیمی ٹرسٹ سے وظیفہ حاصل کر کے پڑھنے کے لئے ولایت چلا گیا تا کہ واپس آ کر کچھ بن سکے اور مجھے بیاہ لے جائے۔ اس دوران میں ڈپریشن ہوا۔ پاپا ماما مرے۔ ہمارا اپنا گھر تباہ ہو گیا۔

رودابہ:- دی ایرنا منٹین سنٹرلی ایٹ میں ہوشنگ ولایت سے لوٹا۔ مگر قسمت خراب تھی حسب دلخواہ ملازمت نہیں ملی تین چار سال بیکار رہا۔ ہومائے۔ تب ایک شام اسی کھڑکی میں کھڑے ہو کر اسنے مجھ سے کہا۔ ہوملتے۔ اجازت دو کہ میں لیڈی فیروزہ ڈائمنڈ کرٹ سے شادی کر لوں۔ بڑھیا بیمار رہتی ہے۔ چند سال میں لڑھک جائے گی۔ پھر ہم تم اپنا گھر بسا لیں گے اس وقت تم اور ہم دونوں افلاس کا شکار ہیں۔ اور اپنی مالی پریشانیوں سے چھٹکارا پانے کا واحد اور سہل ترین نسخہ ہے —— مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا اور میں گم سم رہ گئی۔ وہ میرے جواب کا انتظار کئے بغیر یہ زینہ اتر کر اوڈیکو سے نکلا اور لیڈی ڈائمنڈ کرٹ کے بنگلے کی سمت روانہ ہو گیا۔

رودابہ:- ٹرف کلب میں دھوم دھام کی شادی ہوئی۔ دستوروں نے پھولوں کے منڈپ میں مقدس منتر پڑھ کر دونوں کو ایک دوسرے کا کدف اور کدبانو بنایا۔ وہ ہمارا انکل ہوشنگ بن گیا۔ آنٹ فیروزہ خوشی سے پھولی نہ سمائیں۔ اس عمر میں ایسا خوبصورت نوجوان شوہر مل گیا۔ ناقابل یقین خوش نصیبی ——

ہوملتے:- بنام یزد —— ہوشنگ کتنا شکیل اور طرحدار تھا۔ اب ہم سب نے مل کر آنٹ فیروزہ کے انتقال کا انتظار شروع کیا۔ شادی کے وقت انکی عمر ساٹھ سے اوپر تھی۔ اور گلچہر! —— اس وقت میں تمہارے ہی برابر رہی ہونگی اور ہوشنگ تمہارے داراب جیسا تھا —— (گلچہر اور داراب لرز کر ایک دوسرے کا ہاتھ زیادہ مضبوطی سے تھام لیتے ہیں)

رودابہ:- لیکن آنٹ فیروزہ جیتی ہی چلی گئیں۔ پینسٹھ سال بہتر سال۔ اسی سال۔ بے چارہ ہوشنگ وفادار خادم کی طرح ساتھ ساتھ آنٹ فیروزہ کا حکم وہ چوری چھپے بھی ہم سے نہ ملے۔ ہمارے اور اس کے پیچھے پرائیویٹ جاسوس لگا دیئے تھے اور خبردار کر دیا تھا کہ اگر ہوملتے سے ملتا پایا گیا تو وہ اپنی ساری دولت اس کے بجائے کسی خیراتی ادارہ کو دے جائیں گی۔

ہوملتے:- جب عاجز آ کر بے چارے ہوشنگ نے قسمت سے انتقام لینا شروع کیا۔ وہ آنٹ فیروزہ کا روپیہ بیدردی سے اڑانے لگا۔ ریس کورس۔ جوا۔ شراب۔ سٹہ۔ وہ اسے بھاری بھاری چیک کاٹ کر دیا کرتی تھیں تاکہ وہ خوش رہے۔

رودابہ:- جب آنٹ فیروزہ اکیاسی کی ہو کر بیاسی میں لگیں ہوشنگ ان کو تقریباً کنگال کر چکا تھا۔ پھر اس نے آنٹ فیروزہ کی اکیاسی ویں سالگرہ بڑی دھوم سے منائی۔ سامنے والے بنگلے میں زوردار پارٹی ہوئی۔ کیک پر ۱۸ کے بجائے ۸۱ موم بتیاں لگائی گئیں۔ شہر کا بہترین ڈانس بینڈ آیا۔ ہم دونوں بہنیں اسی دریچے میں سے نظارہ دیکھتے رہے۔

ہوملتے:- اچانک بنگلے میں سے مہیب شعلے بلند ہوئے۔ چاروں طرف شور مچ گیا۔ آگ۔ آگ۔ ہمارے ملازم دوڑے

ل؎ ماشاءاللہ۔

ہوتے گئے۔ آکر بتایا۔ سالگرہ کیک کی ایک موم بتی سے اتفاقیہ آگ لگی۔ فائر انجن آتے آتے سہ منزلہ بنگلہ جل کر خاک ہو گیا لیکن آنٹ فیروزہ تب بھی زندہ بچ گئیں۔ آگ ہوشنگ نے لگائی تھی۔

رو دابہ :۔ وہ بھی زندہ بچ گیا فوراً رات کے اندھیرے میں بھاگ نکلا روپوش ہو گیا لیکن ڈرائینگ روم کے جلے میں پڑی، دعوت میں آئے ہوئے کسی GATE CRASHER گمنام اجنبی کی لاش کو آنٹ فیروزہ ہوشنگ سمجھیں۔ اتفاق سے وہ بد قسمت اجنبی ہوشنگ کا ہم شکل تھا۔ آنٹ فیروزہ نے فوراً جے۔ جے۔ اسکول سے ایک آرٹسٹ بلوا کر جلد از جلد اس کا ڈیتھ ماسک بنوایا۔ پھر لاش کی آخری رسوم ادا کی گئیں۔ میت کو دخمے لے جایا گیا۔ سفید پوش دستوروں اور سوگواروں کی قطار دخمے کی طویل سڑک پر چڑھی ——— اخباروں میں چھپا کہ مسٹر ہوشنگ سروشیار مرزا اس خوفناک آتشزدگی میں نہایت ٹریجک طور سے، جب وہ دھڑا دھڑ جلتے ایوان نشست سے بھاگنے کی کوشش کر رہے تھے! اور میزبان خاتون اور سارے مہمان اور ملازم بخیریت باہر نکلنے میں کامیاب رہے تھے۔ جلتے ہوئے مخملیں پردوں میں پھنس کر جاں بحق تسلیم ہوئے۔

ہوماۓ :۔ لیکن مجھے اور رودابہ کو معلوم ہے۔ وہ خبر غلط تھی۔ دُنیا کو دھوکا ہوا۔ اور آنٹ فیروزہ کو بھی۔ وہ اسی وہم میں مبتلا ہیں کہ ہوشنگ اُس رات جل کے مر گیا۔

ہوماۓ :۔ (اُنگلی اُٹھا کر رازدارانہ انداز میں) لیکن مجھے اور رودابہ کو اصلیت معلوم ہے۔ وہ خبر غلط تھی۔ دُنیا کو دھوکا ہوا۔ آنٹ فیروزہ کو دھوکا ہوا۔ وہ اسی وہم میں مبتلا ہیں کہ ہوشنگ خوفناک رات جل کر بھسم ہو گیا

رودابہ :۔ ان کا محل نما بنگلہ راکھ ہو چکا تھا اور ہم لوگوں کے سوا ان کا کوئی رشتے دار زندہ نہ تھا۔ ہوشنگ سے بیاہ کرنے کے بعد وہ پچھلے پینتیس ۳۵ سال سے ہم سے قطع تعلق کر چکی تھیں لیکن اس نازک وقت میں ہم دونوں اظہار افسوس کے لئے یہ سیڑھیاں اتر کر راکھ کے ڈھیر پر پہنچے۔ وہ املتاس کے نیچے ایک! دھ جلی کرسی پر خاموش بیٹھی تھیں اور چاروں طرف انکا آتش زدہ قیمتی ساز و سامان بکھرا پڑا تھا۔ ڈیتھ ماسک ان کی گود میں رکھا تھا۔ اس وقت وہ تقدیر کی خوفناک دیوی معلوم ہو رہی تھیں۔

ہوماۓ :۔ لیکن آخری قہقہہ ہمارا تھا۔ ہم نے بحیثیت رشتے داران سے درخواست کی کہ وہ ہمارے پاس آ جائیں۔ آنٹ فیروزہ اپنے تکبر اور نخوت کے لئے مشہور تھیں انہوں نے مغرور شعلہ بار نگاہوں سے ہمیں دیکھا۔ پھر ڈیتھ ماسک کی طرف اشارہ کر کے اپنی پر غرور جھرجھری آواز میں آہستہ سے بولیں۔ ہوماۓ! رودابہ! ——: یہ بد نصیب مجھ سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش میں جس لمحے "ہیپی برتھ ڈے" گاتے مہمانوں کی بھیڑ کے پیچھے چھپ کر

موم بتی کی لَو سے پردے کو آگ لگا رہا تھا۔ میں نے اسے دیکھ لیا تھا۔ مگر تب بھی اسے نجات نہیں ملی۔ اس کی روآن نکلتے نکلتے اپنے پیچھے اپنے نقوش چھوڑ گئی ہے۔" انہوں نے ڈیتھ ماسک ویرا اُٹھایا پھر گود میں رکھ لیا اور خاموش ہو گئیں۔

رودابہ :۔ اس کے بعد وہ مع اس ڈیتھ ماسک اور اپنے باقیماندہ سامان کے جُپ چاپ ہمارے ہاں دوسری منزل پر منتقل ہو گئیں۔ اور ہمارے ہم سے تعلقات حسبِ معمول منقطع ہر ماہ پہلی تاریخ کو کرائے کی رقم کا لفافہ دروازے کی دراز میں سے اندر سرکا دیتی ہیں۔

ہوملے :۔ کچھ عرصے بعد وہ ڈیتھ ماسک بھی ان کے بیڈ روم سے چوری ہو گیا۔ وہ عبادت کرنے کے لئے آتشکدہ گئی ہوئی تھیں۔ واپس آئیں تو ڈیتھ ماسک غائب، اس کے بعد سے وہ بالکل باؤلی ہو چکی ہیں۔

داراب :۔ مسٹر ہوشنگ اب کہاں ہیں؟

ہومائے :۔ میرا ہوشنگ بہت چالاک ہے۔ وہ بھیس بدل کر لابہ میں مقیم ہے اپنی شامیں وہ لنگڈن کلب میں گزارتا ہے سنیچر کی رات کو چپکے سے آکر ہمارے ساتھ کھانا کھاتا ہے اور پھر کولابہ واپس چلا جاتا ہے۔ آج سنیچر کی رات ہے —— آج سنیچر کی رات ہے (کوکو کلاک کا پرندہ سیٹی بجاتا ہے۔ کوکو۔ کوکو۔ کوکو —— کوکو ——) لو —— وہ آگیا —— (ہومائے فوراً بائیں دروازے سے باہر جاتی ہے۔ رودابہ پیانو کا اسٹول گھما کر ‏ ویڈنگ مارچ بجانا شروع کرتی ہے چند منٹ بعد ہومائے دائیں دروازے سے ایک وہیل ‏ ڈھکیلتی داخل ہوتی ہے۔ کرسی پر ایک ذہنی پتلا سیاہ سوٹ پہنے بیٹھا ہے۔ اس کے موم کے سفید ہاتھ دونوں گھٹنوں پر رکھے ہیں جیسے پہلے زمانے میں لوگ تصویر کھنچواتے وقت رکھتے تھے پتلے کی گردن پر خوبرو آنجہانی ہوشنگ سروشیار مرزا کا ڈیتھ ماسک فِٹ کر دیا گیا ہے۔ مرحوم کا مرتے وقت کا استہزائیہ تبسم پلاسٹر آف پیرس میں خوفناک انداز سے منجمد ہے۔ خانم گلچہر اسفندیاری آغائے داراب کاظم زادہ (دہشت زدہ ہو کر چیختے ہیں)۔ یا علیؑ (دونوں اُٹھ کر بھاگتے ہیں۔ بائیں دروازے سے سرپٹ باہر نکل جاتے ہیں۔ رودابہ پیانو کے پردوں پر سر جھکائے بڑے جوش و خروش سے "ویڈنگ مارچ" بجا رہی ہے۔ ہومائے پتلے کے گلے میں نیپکن باندھتی ہے۔ پھر سائیڈ بورڈ پر رکھے شمعدان میں موم بتیاں جلانے کے بعد شمعدان ڈائننگ ٹیبل کے وسط میں لا کر رکھ دیتی ہے۔ بجلی کی روشنی کا سوئچ آف کر دیتی ہے)۔

ہوملے :۔ (صوفے اور پیانو کی طرف سے پشت کئے پتلے کے سامنے گلاس رکھتے ہوئے) گلچہر! داراب! ڈیئر از سرورڈ مجھے امریکنوں کا یہ رواج بہت پسند ہے۔ موم بتیوں کی روشنی میں طعام شب! —— اس قدر رومینٹک —— !!

(رودابہ فوراً پیانو پر "FAERY WALTZ" شروع کر دیتی ہے۔ ہوملے پتلے کے سامنے ڈونگے

گونج رہی ہے۔ اب روداَبہ MOONLIGHT SONATA بجانے میں مصروف ہے۔ میز کی سمت آتی ہے۔ دونوں بہنیں آمنے سامنے بیٹھتی ہیں۔ پتلا بیچ میں۔ پتلا اپنی وھیل پر ذرا سا ترچھا ہو گیا ہے۔ تینوں کی پرچھائیاں شمعوں کی روشنی میں دیواروں پر پھیل گئی ہیں۔

ہوملے اور روداَبہ :۔ سر جھکا کر ایک ساتھ دعائے طعام پڑھتی ہیں) آ ایزد ماَید ے۔ اہرمزد ۔ جس نے گاؤ، اناج، درخت اور آب کی تخلیق کی اور غذا کو لذت بخشی ۔ ہر لقمے کے ساتھ خورداد اور امرداد فرشتوں کی برکت نازل ہو۔ اور یہ کھانا نوش کی مانند ہو اور عقل اور ذہانت عطا کرے۔ گنہ شکست صد ہزار بار ۔

ہوماَئے :۔ (سر اٹھا کر صوفے کی طرف مڑتی ہے) دارلب ۔ گلچہر ۔ آ ؤ ۔ ارے ۔ یہ دونوں کہاں چلے گئے ۔؟

روداَبہ ۔ (چونک کر) چلے گئے ۔؟ ۔ اب مجھے ان کے متعلق شبہ ہو رہا ہے ۔ یہ دونوں تھے کون ۔؟

ہوملے :۔ نیور مائینڈ، کوئی پاگل لوگ تھے۔ کھانے کے لئے آ نا رُکا اور اس آندھی طوفان میں نکل بھاگے۔ کریزی فارنرز ا ۔

روداَبہ :۔ ہاں۔ آجکل پاگلوں کی دُنیا میں کمی نہیں نجانے کیسے کیسے خبط الحواس آجاتے ہیں۔ ہمارا وقت ضائع کرنے ۔ (اچانک خوفناک قہقہہ لگا کر) اچانک غائب ۔ بھوت تو نہیں تھے ۔؟ ہوماَئے ۔ کریزی فارنرز ۔ پاگل ۔ خیر ۔ ہوسٹنگ ڈیئر ۔ یہ سُوپ لو ۔ (چمچے سے سُوپ نکال کر ڈیتھ ماسک کے ہونٹوں تک لے جاتی ہے۔ ڈیتھ ماسک اپنی لرزہ خیز منجمد مسکراہٹ کے ساتھ بھیانک زاویے سے پلیٹ پر آگے کو جھک آتا ہے۔ باہر بارش اور طوفان بڑھتا جا رہا ہے۔ بلیوں کے رونے کی آواز۔ بجلی چمکتی ہے۔ دریچے میں سے ہوا کا ایک تیز جھونکا اندر آتا ہے جس کی وجہ سے موم بتیاں جھلملا کر بجھ جاتی ہیں۔ اسٹیج پر اندھیرا چھا جاتا ہے۔ اس تاریکی میں ہوملے اور روداَبہ باری باری چمچوں سے ڈیتھ ماسک کے منہ میں سُوپ انڈیل رہی ہیں۔ پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے)۔

(بقیہ اِک باپ بکاؤ ہے صفحہ ۱۴۳ سے)

فلپ جو ایک کیتھولک تھا، ایک دم بھڑک اُٹھا۔ اس کے ابرو بالشت بھر اوپر اُٹھ گئے اور پھیلی ہوئی آنکھوں سے نارِ جہنم لپکنے لگی۔ اُس نے چلا کر کہا ۔ یہ فراڈ ہے، مسٹر دُردے۔ پیور، ان اڈلٹریٹڈ فراڈ . . .

دُردے نے اپنے خریدے ہوئے باپ کی نم آنکھوں کو ورثے میں لیتے، کمپیوٹر کے پس منظر میں کھڑے فلپ کی طرف دیکھا اور کہا ۔ آج ہی بابوجی نے کہا تھا، فلپ! تم انسان کو سمجھنے کی کوشش نہ کرو، صرف محسوس کرو اسے . . .

غلام عباس

اَوتار

(ہندو دیومالا کی ایک کہانی)

۱

پرتھوی گائے کا روپ دھارن کرتی ہوئی دیوتاؤں کے راجہ اندر کی سبھا میں پہنچی اور یوں فریاد کرنے لگی :

"دہائی ہے، دہائی ہے اندر مہاراج کی۔ مہاراج! سنسار سے دھرم تو اُٹھ ہی گیا ہے اور پاپ کا اندھیرا چھا گیا ہے۔ شہر شہر نگری نگری گاؤں گاؤں نردوشوں کی ہتھیا ہو رہی ہے۔ ان کی پوری بستیوں کو جلا کر راکھ کیا جا رہا ہے۔ گربھ وتی استریوں کے پیٹ سے ان جنمے بچے نکال کر انہیں بھالوں کی انیوں پر لٹکایا جاتا ہے۔ عورتوں کی چھاتیاں اور ناک کان کاٹ کر انہیں زندہ چتاؤں پر جلا دیا جاتا ہے۔ منش پشو سے بھی نیچ ہو گیا ہے۔ میں یہ اتیاچار نہیں دیکھ سکتی مہاراج۔ آگیا دیجئے کہ میں نر پور چھوڑ کر پاتال چلی جاؤں۔"

اندر مہاراج آکاش کے دیوتا ہیں۔ وہ ایک سفید ہاتھی پر سوار ہوتے ہیں جس کا نام ایراوت ہے۔ وہ مینہ برساتے اور فصلیں اگاتے ہیں۔ بجلی کا کڑکا اور دھنک ان کے ہتھیار ہیں۔ وہ پرتھوی کی یہ بات سُن کر بڑے دکھی ہوئے۔ اور دیر تک سوچ ساگر میں ڈوبے رہے۔ پھر انہوں نے گنیش جی کو بلوایا۔ گنیش جی کی ہاتھی کی سی سونڈ ہے، وہ شوجی اور پاربتی دیوی کے بیٹے ہیں۔ مشکلوں کو حل کرنے والے، فہم و فراست کے دیوتا۔

گنیش جی کے مشورے سے اندر مہاراج نے تمام دیوتاؤں کو اکھٹا کیا۔ ان میں آگ کے دیوتا اگنی، پانی کے دیوتا ورن، ہوا کے دیوتا وایو، رتوں کے دیوتا بسنت، پریت کے دیوتا مدن، سورج کے دیوتا سوریہ، چاند کے دیوتا سوم اور بہت سے اور دیوتا بھی تھے۔ پھر وہ ان سب کو ساتھ لے برہما جی کے

پاس پہنچے۔

۱۔ برہما جی نے سنسار جنم دیا۔ ان کا رنگ سرخ ہے۔ ان کے چار چہرے، آٹھ کان اور چار ہاتھ ہیں۔ انھوں نے ان ہاتھوں میں سے ایک میں کمان، دوسرے میں کھوپڑیوں کی مالا، تیسرے میں پانی کی گڑوی اور چوتھے میں وید تھام رکھے ہیں۔ علم و دانش کی دیوی سرسوتی ان ہی کی استری ہے۔

اندر مہاراج نے پرتھوی کی کتھا برہما جی کو کہہ سنائی مگر وہ بھی اس کا دکھ دور نہ کر سکے اور وہ سب کو ساتھ لے مہادیو جی کے پاس پہنچے۔

مہادیو جی کو شو جی بھی کہتے ہیں۔ ان کے پانچ چہرے چار بازو اور تین آنکھیں ہیں۔ تیسری آنکھ ماتھے کے درمیان ہے۔ وہ ایک بیل پر جس کا نام نندی ہے سوار ہوتے ہیں۔ وہ جٹا دھاری سادھو کا روپ بنائے انگوں میں مسانوں کی بھبھوت لگائے کمر پر مرگ چھالا لٹکائے، گلے میں پھنکارتا ہوا سانپ مالا کی طرح ڈالے بن بن پھرتے رہتے ہیں۔ جب کبھی وہ داروی کر اپنی استری جگدمبا کے ساتھ جوش مستی کی حالت میں تانڈو ناچ ناچتے ہیں تو بھومی ڈولنے لگتی ہے۔ وہ دکھوں کو ہرن اور پاپوں کو نشٹ کرتے ہیں مگر پرتھوی کے دکھ کا علاج ان کے پاس بھی نہ تھا، اور وہ سب دیوتاؤں کو ساتھ لیئے وہاں پہنچے جہاں چھیر سمندر میں وشنو جی اپنی پتنی لکشمی رانی کے ساتھ شیش ناگ اننت پر بسرام لے رہے تھے۔

وشنو بھگوان میں ایسی شکتی ہے کہ وہ اپنے تین ہی قدم میں دنیا کے ساتوں طبق اُلانگ لیتے ہیں۔ وہ کوہ پیکر پرند گرڑ پر سوار ہوتے ہیں۔ گنگا ندی ان ہی کے چرنوں سے نکلی ہے۔ وہ سجیلے جوان ہیں۔ ان کا دل بڑا نرم ہے۔ وہ ہمیشہ مظلوموں کی فریاد کو پہنچتے ہیں۔ وہ سو رہے تھے مگر اتنے سارے دیوتاؤں کے آنے سے ان کی نیند اچٹ گئی۔ اس پر سب دیوتا ہاتھ جوڑ کر ان کے سامنے کھڑے ہو گئے اور ان کے گن گانے لگے:

"مہاراج ادھیراج! آپ کی مہما کون کر سکے۔ مچھلی کا اوتار لے سارے سنسار کو اور ویدوں کو ڈوبنے سے بچایا۔ کچھوے کا اوتار دھار مندراچل پہاڑ کو اپنی پیٹھ پر اٹھایا جس سے سمندر بلویا گیا۔ سؤر کا اوتار لے دھرتی کو اپنے دانتوں سے اٹھا سمندر کی تہہ سے نکالا۔ نرسنگھ کا اوتار جس کا سر شیر کا اور دھڑ آدمی کا تھا پرہلاد کی جان اس کے ظالم باپ سے بچائی۔ بونے بامن کا اوتار لے راجہ بل سے چھل کیا۔ پرسورام کے روپ میں اکیس بار کشتریوں کا ناش کیا۔ اور راج برہمنوں کو دلوایا۔ رام چندر جی کا اوتار دھار کر راکھشسوں کے سردار مہا دشٹ راون کو مارا۔ کرشن بھگوان بن کر متھرا کے کٹھور راجہ کنس کو موت کے گھاٹ اتارا۔ گوتم بدھ کا اوتار

نے سنسار میں سکھ شانتی پھیلائی۔

"ناتھ جی! جب جب سنسار میں گھور تائی اور نٹھور رائی حد سے بڑھی تب تب آپ اناتھوں اور نردوشوں کی رکشا کے لئے دھرتی پر گئے۔ آج پھر سنسار پر ادھرم اور پاپ کا اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ دھرتی نرناری کے خون سے لال ہو رہی ہے۔ وہ گائے کا روپ دھار یہاں دیو لوک میں فریاد کرنے آئی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ میری چھاتی پر ان دنوں ایسی ایسی بھیانک گھٹنائیں ہو رہی ہیں کہ پہلے کبھی نہ ہوئی تھیں۔ میں اب یہ اتیا چار نہیں دیکھ سکتی۔ مجھے پاتال میں چلے جانے کی آگیا دے دیجئے۔

"ناتھ جی! ہم آپ سے بنتی کرنے آئے ہیں کہ ایک بار پھر سنسار کی سدھ لیجئے۔ پاپیوں کا ناش کیجے تاکہ نرناری آنند ہو کر رہیں۔ یہ کام آپ کے سوا کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔"

وشنو بھگوان کے کومل دل پر اس کتھا کا بڑا اثر ہوا۔ ان کے چہرے پر اُداسی چھا گئی۔ وہ ایک گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ لکشمی رانی ابھی تک شیش ناگ اننت پر بے خبر سو رہی تھیں۔ نیند میں ان کے کنول ایسے سندر مکھڑے سے بڑا سکھ چین برس رہا تھا۔ آخر وشنو جی نے ایک پریم بھری نظر اپنی پتنی پر ڈالی اور پھر ایکا ایکی وہ اپنے استھان سے غائب ہو گئے۔

۲

سنبھل ضلع مرادآباد کا ایک پرانا قصبہ ہے۔ یہ قصبہ ہندوستان کے دوسرے قصبوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ وہی گرد سے اٹی ہوئی سڑکیں، وہی تنگ بازار اور گلی کوچے۔ کہیں مٹی کے گھروندے۔ کہیں پختہ اینٹوں کے مکان۔ دیہاتی اور شہری زندگی کی آمیزش، مگر ایک بات جو اسے دوسرے قصبوں سے ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ یہاں مندروں کی کثرت ہے جو قصبے اور اس کے اطراف میں جابجا دیکھنے میں آتے ہیں۔

ملک کی تقسیم سے پہلے سنبھل میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی مخلوط آبادی تھی۔ مگر تقسیم کے بعد ہندوستان کے دوسرے شہروں اور قصبوں کی طرح یہاں بھی ہنگاموں کا طوفان اُٹھ کھڑا ہوا اور ہندو جو بھاری اکثریت میں تھے مسلمانوں کو تاخت تاراج کرنے لگے۔ ان کے مسلح جتھے مسلمانوں کے محلوں پر ٹوٹ پڑے۔ مکانوں کو آگ لگا دی گئی۔ اور ان گنت مردوں عورتوں اور بچوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ جو مسلمان اس قتل عام سے بچ رہے وہ جان بچانے کے لئے قصبے سے بھاگ نکلے۔

سنبھل سے چار پانچ کوس کے فاصلے پر ایک سنسان گھاٹی تھی جو راہ باٹ سے کٹی ہوئی تھی۔ مسلمانوں

کے لٹے پٹے گھرانوں کے کچھ افراد کسی نہ کسی طرح جان بچا کر اس گھاٹی میں پہنچ گئے۔ ان میں زیادہ تر عورتیں اور بچے تھے اور کچھ ایسے لوگ بھی جو ہندوؤں کے ہاتھوں زخمی ہو گئے تھے۔ چونکہ اس وقت سارے ملک میں آگ لگی ہوئی تھی اور مسلمانوں کو ہر طرف موت ہی موت دکھائی دیتی تھی اس لئے انہوں نے آگے بڑھنا خطرے سے خالی نہ سمجھا اور اسی گھاٹی میں چھپ کر بیٹھ رہے۔ جب ذرا کھڑکا سنتے تو گھاٹی میں نیچے اتر جاتے۔ وہ کئی دن تک وہیں چھپے رہے اور درختوں کے پتے یا گھاس کھا کر پیٹ بھرتے رہے۔ انہیں گھاٹی میں دور نیچے اتر کر ایک چھوٹے سے نالے کا سراغ مل گیا تھا جس میں پچھلی برسات کا پانی ابھی تک کچھ کچھ باقی تھا۔ وہ اس پانی سے اپنی پیاس بجھاتے رہے۔

ادھر اس عرصے میں سنبھل کے ہندوؤں کا جوش دھیما پڑ چکا تھا۔ کیونکہ مسلمانوں کی بیشتر آبادی یا تو نیست و نابود ہو چکی تھی یا قصبے سے بھاگ چکی تھی اور ان کے مکانوں، ان کی دکانوں اور دوسری املاک پر ہندو قبضہ کر چکے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی کامیابی پر مطمئن ہو کر بھاگ نے والوں کا پیچھا کرنے یا ان کی ٹوہ لگانے کا خیال چھوڑ دیا تھا۔

رفتہ رفتہ ملک کے حالات سدھرنے لگے۔ ہر مذہب و ملت کے پیشوا اور لیڈر اکٹھے ہو ہو کر شہر شہر گاؤں گاؤں دورے کرنے لگے۔ امن کمیٹیاں بننے لگیں اور ان مسلمانوں کو جو اپنے گھروں سے بھاگنے پر مجبور ہو گئے تھے دوبارہ ان کے علاقوں میں آباد کرنے کی کوششیں ہونے لگیں۔ ایسی ہی ایک جماعت گھومتی گھامتی اس گھاٹی میں بھی پہنچ گئی جہاں سنبھل کے یہ مسلمان کئی ہفتوں سے پناہ گزیں تھے۔ اس جماعت کے اراکین نے مسلمانوں کو بہتیرا سمجھایا بجھایا مگر وہ سنبھل کے ہندوؤں کے درمیان رہنے کے خیال سے ایسے خائف تھے کہ کسی طرح قصبے میں واپس جانے پر آمادہ نہ ہوئے۔ ناچار انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔

جب ان مسلمانوں کو جان کا خطرہ نہ رہا تو انہوں نے اسی گھاٹی کے آس پاس زمین صاف کر کے درختوں کی ٹہنیوں، گھاس پھونس اور مٹی سے جھونپڑیاں بنانی شروع کر دیں۔ رفتہ رفتہ مسلمانوں کے کچھ اور خاندان بھی جو ادھر ادھر مارے مارے پھرتے رہے تھے ان میں آملے اور اس طرح تھوڑے دنوں میں وہاں ایک کالونی سی آباد ہو گئی جو سو ڈیڑھ سو افراد پر مشتمل تھی۔

سنبھل کے مسلمانوں کے قتل عام کی شب کو جن لوگوں نے بھاگ کر گھاٹی میں پناہ لی تھی ان میں ابراہیم نامی ایک لوہار بھی تھا۔ بڑا محنتی اور خوش اخلاق۔ وہ اپنے باپ اور تین بھائیوں کے ساتھ قصبے کے ایک چھوٹے سے مکان میں رہتا تھا۔ وہ اپنے بڑے بھائی اسحاق کے ساتھ دکان پر کام کرتا تھا اس کے دوسرے

بھائی جو کم عمر تھے ابھی مدرسے میں پڑھتے تھے۔ جب مسلح ہندوؤں کے جتھے نے ان کے مکان میں آگ لگائی
اندان کے سب افراد گھر پر ہی تھے۔ یہ لوگ آگ سے خوفزدہ ہو کر مکان سے نکلے ہی تھے کہ ہندو بھالے برچھیاں
ان پر ٹوٹ پڑے۔ مردوں نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا اور انہیں کے ہتھیار چھین کر دو چار کو موت
گھاٹ اتار دیا۔ مگر ہندو تعداد میں زیادہ تھے یہ لوگ زیادہ دیر تک مقابلہ نہ کر سکے اور آخر کار
اہیم کا باپ، بڑا بھائی اسحاق، دونوں چھوٹے بھائی، اسحاق کی دو جوان لڑکیاں جو باپ اور چچا کے پہلو
بہلو ہندو غنڈوں کا مقابلہ کر رہی تھیں، اور ابراہیم کا چھوٹا بچہ شہید کر دیئے گئے۔ ان لوگوں کی مزاحمت
نتیجہ یہ ہوا کہ ابراہیم کی بیوی اور بھاوج کو کسی نہ کسی طرح اندھیرے میں بھاگ نکلنے کا موقع مل گیا۔

ادھر ابراہیم کو ہندوؤں سے لڑتے ہوئے زخم تو کئی آئے تھے مگر کوئی کاری نہ تھا۔ اور وہ بھی
ن بچانے میں کامیاب ہو گیا۔ اسے تھوڑی سی تلاش کے بعد دونوں عورتیں قریب ہی ایک تاریک گلی میں چھپی
ی مل گئیں۔ وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر اندھیرے میں چھپتا چھپاتا ساتوں کی آڑ لیتا انہیں قصبے سے نکال لایا
ر انہیں لے کر دوسرے مسلمانوں کے ساتھ جو اس قتل عام سے بچ نکلے تھے اسی گھاٹی کی سمت روانہ ہو گیا۔

اسحاق کی بیوی نے جس کا نام بلقیس تھا اپنی آٹھ ماہ کی بچی کو سینے سے چمٹا رکھا تھا۔ آمنہ خالی ہاتھ تھی۔
دو سالہ معصوم بچے اصغر کو اپنی آنکھوں کے سامنے ذبح ہوتے دیکھ کر غم اور دہشت سے اس کی زبان
ہو گئی تھی۔ اور وہ ہر طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی تھی۔ ان لوگوں کا صدمہ ایسا تو نہ تھا کہ آسانی سے
یا جا سکتا۔ مگر جب انہوں نے اپنے چاروں طرف ہر شخص کو اپنے ہی جیسا مظلوم اور ستم رسیدہ دیکھا
ن کے دل کو کچھ کچھ قرار آ گیا۔

اس گھاٹی کے قریب ہی پرانے وقتوں کا کوئی مندر تھا جو بڑی خستہ حالت میں تھا۔ اس کی چھت
ب تھی اور کوئی دیوار بھی سالم نہ تھی۔ اس مندر کے بت محکمہ آثار قدیمہ کے افسر مدت ہوئی کسی عجائب
نے میں رکھنے کے لئے اٹھا لے گئے تھے۔ اور اب یہاں سوائے کھنڈروں کے کچھ نہ رہا تھا۔ اس مندر
اہر ایک کنواں تھا جو مدتوں سے بند پڑا تھا۔ چمگادڑوں اور نہ جانے کن کن جانوروں اس میں مسکن بنا
ے تھے اور اس میں سخت بدبو آتی تھی۔ کالونی والوں نے درختوں کے ریشوں کو بٹ کر ایک رسی بنائی۔ پھر
کا ایک پرانا کنستر مہیا کیا گیا۔ کالونی کے زن و مرد کئی دن تک لگاتار کنوئیں کا گندہ پانی نکالتے رہے۔ آخر ان
منت ٹھکانے لگی۔ اور انہیں پینے کے لئے صاف اور میٹھا پانی مل گیا۔

ان لوگوں کے پاس نہ تو روپیہ پیسہ تھا نہ زیور یا کوئی اور قیمتی چیز، اس لئے چوروں اور ڈاکوؤں سے تو وہ محفوظ رہے۔ البتہ سنبھل کے بعض شر پسند ہندو جو ان کے اس کالونی میں اچھوتوں کی طرح رہنے کے بھی روادار نہ تھے کبھی کبھی رات کو چپکے سے آکر ان کی جھونپڑیوں میں آگ لگا جاتے۔ کالونی والے جو ہر وقت چوکنے رہتے تھے۔ اکثر جلد ہی آگ پر قابو پا لیتے تھے۔ مگر ایک مرتبہ ایسی زبردست آگ لگی کہ آدھی سے زیادہ جھونپڑیاں جل کر راکھ ہو گئیں۔ اس واقعے سے ان لوگوں کو رنج تو بہت ہوا مگر انہوں نے ضبط و تحمل سے کام لیا۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں پھر اپنی جھونپڑیاں استوار کر لیں۔ اب کے انھوں نے کالونی کے گرداگرد مٹی اور پتھروں سے ایک دیوار بھی کھینچ دی۔ اور یوں آگ لگانے والوں سے شر سے کسی قدر محفوظ ہو گئے۔

ضرورت نے ان مسلمانوں کو کئی کام سکھلائے مثلاً رسیاں بٹنا، ٹوکریاں اور جھاڑو بنانا، چٹائیاں بننا، مٹی کے برتن اور کھلونے بنانا۔ یہ چیزیں قصبہ کے نچلے طبقے کے دکاندار ان سے سستے داموں خرید لے جاتے رفتہ رفتہ انھوں نے کھدر بننے اور دریاں اور پلنگ پوش بنانے کا کام بھی شروع کر دیا۔ بعض لوگوں نے مرغیاں اور بکریاں پال لیں۔ مرغیوں کے انڈے وہ قصبے والوں کے ہاتھ بیچ دیتے اور بکریوں کے دودھ کو وہ اپنے بچوں کے استعمال میں لاتے۔

اس کالونی کی عورتوں نے جن کی ایک عمر پردے میں گذری تھی اور جن میں اب زیادہ تعداد بیواؤں کی تھی، ضرورت وقت کو دیکھتے ہوئے پردہ ترک کر دیا تھا، وہ محنت مشقت کے کاموں میں مردوں کے برابر حصہ لیتیں۔ دستکاری کا کام زیادہ تر ان ہی کے ہاتھ میں تھا۔ علاوہ ازیں کنوئیں سے پانی بھی وہی بھرتی تھیں

ابراہیم کی بیوی اور بھاوج بھی یہ سارے کام کرتیں۔ بلقیس کو اپنے شوہر اور جوان لڑکیوں کے شہید ہو جانے کے بعد جینے کی کوئی خواہش نہ رہی تھی مگر ننھی سارہ کے لئے وہ زندہ رہنے پر مجبور تھی۔ وہ کبھی کبھی اس کی قلقاریوں کی نغمگی میں گم ہو کر اپنا غم بھول جاتی۔ ادھر آمنہ کے غمزدہ دل کو بھی جلد ہی اس امید نے بہلانا شروع کر دیا کہ وہ پھر ایک بچے کی ماں بننے والی ہے۔ عجیب بات یہ تھی کہ اس حمل سے اسے کسی قسم کی تکان یا تکلیف یا بھاری پن کا احساس نہ ہوتا تھا۔ جوں جوں اس کے وضع حمل کا زمانہ قریب آتا جا رہا تھا، اس کا روپ نکھرتا آ رہا تھا، اس محنت و جفاکشی کی زندگی کے باوجود وہ ہر وقت چونچال نظر آتی تھی۔ وہ بھاری بھاری بوجھ آسانی سے اٹھا لیتی اور اس کا شوہر، اس کی بھاوج یا کالونی کی اور عورت اسے منع کرتی تو وہ کہتی:

"مجھ میں بڑی طاقت پیدا ہو گئی ہے اور یہ کام تو مجھے بڑے ہلکے پھلکے معلوم ہوتے ہیں۔"

سنبھل کے مسلمانوں کو جب اس کالونی میں آباد ہوئے نو مہینے گذر لئے تو ایک شب ابراہیم کی جھونپڑی
ب ننھی سی جان کا اضافہ ہوا۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ چودھویں کا چاند جو سرِشام ہی نمودار ہوگیا تھا۔ اپنا سفر
تا ہوا آسمان کے ایک سرے سے دوسرے پر پہنچ گیا تھا، اس کی روشنی سے اس وقت ٹوٹے پھوٹے مکان اور
ڑے تک خوش نما معلوم ہو رہے تھے اچانک ایک نئی آواز نے اس خاموشی کو توڑ دیا جو اس کالونی پر چھائی
ابراہیم جو اپنی جھونپڑی کے باہر ایک جھلنگی کھٹیا پر بے چینی سے کروٹیں بدل رہا تھا جلدی سے اٹھ کر اندر گیا۔ بجھتا
ی کہ آمنہ چٹائی پر چادر اوڑھے لیٹی ہے اور بلقیس کالونی کی ایک عورت کی مدد سے ایک خون میں لت پت بچے
م چیتھڑوں سے پونچھ رہی ہے۔

ابراہیم کو دیکھ کر بلقیس بول اٹھی :

"بھیا تمہیں بیٹا مبارک ہو!"

ابراہیم کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہوئی اس نے اپنی بیوی کے چہرے کی طرف دیکھا۔ آمنہ ہلکے ہلکے کراہ رہی تھی مگر
ں دونوں کی نظریں ملیں ایک خفیف سی مسکراہٹ آمنہ کے ہونٹوں پر پھیل گئی، ابراہیم چٹائی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا
س نے بچے کو جو تھوڑی دیر رونے کے بعد چپ ہوگیا تھا، ایک پرانے مگر صاف کپڑے میں لپیٹ کر اس کی گود میں
ال دیا۔

یہ بچہ بڑا ہی خوبصورت اور پیارا پیارا تھا، اس کے بال سنہرے اور گھونگھریالے تھے۔ اور چہرہ بھی کندن
رح دمکتا تھا، ابراہیم جوں جوں اسے دیکھتا گیا اس کی حیرت بڑھتی گئی آخر اسے اور تو کچھ نہ سوجھا اس نے بچہ
وج کو دیدیا اور خود سجدے میں گر پڑا۔

رفتہ رفتہ بچہ پرورش پانے لگا، اس کا نام حمزہ رکھا گیا، ابراہیم کی خستہ حالی، غذا کی کمی اور کالونی کے
ے ماحول کے باوجود زچہ اور بچہ دونوں بڑے تندرست تھے، آمنہ بچے کے سر پر ایک کالا کپڑا باندھ اس
وں کو چھپائے رکھتی تاکہ اڑوس پڑوس کی عورتوں کی نظر نہ لگے۔ حمزہ جلد جلد بڑا ہونے لگا، جلد ہی آس پاس
ونپڑیوں میں اس کی قلقاریاں سنائی دینے لگیں۔ چند ہی مہینوں میں اس نے چلنا شروع کردیا اور ابھی سال بھر
ہوا تھا کہ باتیں بھی کرنے لگا، وہ سارہ کے ساتھ جو اس سے ڈیڑھ سال بڑی تھی دونوں بھر کھیلتا رہتا۔ وہ بڑا
ں مزاج بچہ تھا، کبھی روتا بلکتا نہ تھا، نہ کسی چیز کے لئے ضد کرتا تھا۔

جب وہ پانچ برس کا ہوا تو مکتب جانے لگا جو ایک نیک دل مولوی صاحب نے کالونی کی ایک جھونپڑی میں کھول

رکھا تھا تاکہ کالونی کے بچے علم سے بے بہرہ نہ رہیں۔ وہ ایسا ذہین تھا کہ چند ہی ہفتوں میں اس نے بغدادی قاعدہ ختم کر کے قرآن مجید کا پہلا پارہ پڑھنا شروع کر دیا اس کی ذہانت اور شوق کو دیکھ کر مولوی صاحب بھی اسے بڑی توجہ سے پڑھانے لگے۔

اس نے بڑی فیاض طبیعت پائی تھی۔ ماں اسے کوئی اچھی سی چیز کھانے کو دیتی تو وہ مکتب میں لے آتا اور اپنے ننھے منے ہم سبقوں میں بانٹ کر کھاتا۔

آٹھ برس کی عمر میں حمزہ نے کلام مجید ختم کر لیا۔ اس خوشی میں اس کے باپ نے کالونی کی ساری جھونپڑیوں میں لڈو بانٹے۔ حمزہ پڑھنے لکھنے ہی میں نہیں کھیل کود میں بھی سب لڑکوں سے آگے رہتا تھا۔ جب وہ دس برس کا ہوا تو کالونی کا کوئی لڑکا کشتی، کبڈی یا تیز دوڑنے میں اس سے بازی نہیں لے جا سکتا تھا۔ وہ اونچے اونچے پیڑوں پر ایسی پھرتی سے چڑھ جاتا کہ اس کے ساتھی تکتے کے تکتے رہ جاتے۔

اسی زمانے میں ایک واقعہ ایسا پیش آیا جس کا کالونی میں بہت دنوں چرچا رہا۔ ہوا یہ کہ حمزہ حسب عادت ایک بہت اونچے پیڑ پر چڑھ گیا۔ اس پیڑ کی اوپر کی ٹہنیاں کمزور تھیں۔ اس نے جیسے ہی ایک ٹہنی کو پکڑنا چاہا وہ اچانک ٹوٹ گئی اور حمزہ بیس پچیس فٹ کی بلندی سے نیچے آ رہا۔ سب لڑکے خوفزدہ ہو کر بھاگ گئے مگر حمزہ کپڑے جھاڑ کر اٹھ بیٹھا اور مسکراتا ہوا اپنے ساتھیوں سے آ ملا۔ اسے کھرونچ تک نہ لگی تھی۔

جب حمزہ نے علم دین کے ساتھ ساتھ کسی قدر اردو اور ریاضی کی بھی تعلیم حاصل کر لی تو باپ نے اسے مکتب سے اٹھا لیا اور اسے اپنا آبائی پیشہ سکھانے لگا۔ ابراہیم نے اپنی جھونپڑی کے آگے پھونس کا سائبان ڈال کر ایک چھوٹی سی لوہار کی دکان کھول رکھی تھی دونوں باپ بیٹے صبح سے شام تک اس میں کام کرتے رہتے۔ حمزہ دھونکنی دھونکتا، ہتھوڑا چلاتا اور ابراہیم کھیتی باڑی کے آلات، طرح طرح اوزار اور دوسری کارآمد چیزیں بناتا۔

یہ دس بارہ سال کا زمانہ ہندوستان کے اور شہروں اور قصبوں میں تو نہیں البتہ سنبھل کی اس کالونی میں نسبتاً امن کا گذرا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمان یہاں بڑی پستی کی حالت میں تھے۔ اور وہ اسی میں رضائے الٰہی سمجھ کر صبر شکر سے گذر بسر کئے جا رہے تھے۔ وہ کالونی سے باہر شاذ ہی نکلتے۔ اور جب سنبھل یا آس پاس کے قصبوں کے ہندو بیوپاری ان سے مال خریدنے آتے تو وہ ان سے بڑی عاجزی سے بات کرتے۔ اور انہیں کبھی شکایت کا موقع نہ دیتے۔ ان کی دستکاریوں نے اب خاصی ترقی کر لی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ

انہوں نے گائے بھینسیں بھی پالنی شروع کر دی تھیں اور آس پاس کے قصبوں کو دودھ مہیا کرنے لگے تھے۔

کالونی کے مسلمانوں نے ابتک اپنے اسلامی طور طریقے قائم رکھے تھے۔ ایک بڑا سا جھونپڑا مسجد کا کام دیتا تھا جہاں پانچوں وقت نماز ادا کی جاتی تھی۔ علاوہ ازیں وہ عید بقرعید اور دوسرے تہوار بھی منایا کرتے تھے مگر خاموشی کے ساتھ۔ ایک دن ایسا ہی کوئی تہوار تھا۔ ابراہیم نے اپنی دکان بند رکھی تھی۔ حمزہ کو کوئی کام تو تھا نہیں۔ وہ گھومتا پھرتا گھوٹ سے دور نکل گیا۔ ایک سمت اُسے آبادی کے آثار نظر آئے، اور وہ بغیر کچھ سوچے سمجھے اس طرف چل دیا۔ قریب پہنچا تو دیکھا کہ ایک میدان میں بہت سے لڑکے کھیل رہے ہیں۔ کہیں گیند بلّے کا میچ ہو رہا ہے۔ تو کہیں کبڈی اور کہیں کشتی کے داؤ پیچ۔ وہ دیر تک بڑی دلچسپی سے ان لڑکوں کے کھیل دیکھتا رہا۔

یہ سنبھل کے باہر والا وہ میدان تھا جہاں قصبے کے لڑکے کھیلنے آیا کرتے تھے۔ حمزہ کی دیہاتی وضع قطع کو دیکھ کر کچھ لڑکوں نے سمجھا کہ یہ آس پاس کے کسی گاؤں سے آیا ہوگا، کیونکہ یہ تو وہ تصور بھی نہ کرسکتے تھے کہ مسلمانوں کی کالونی کے کسی لڑکے کو تن تنہا یہاں آنے کی جرأت ہوگی اور انہوں نے حمزہ کو بھی کھیلنے کو کہا جسے اُس نے فوراً منظور کر لیا۔

تھوڑی ہی دیر میں سنبھل کے ہندو لڑکوں کو بخوبی اندازہ ہوگیا کہ پھرتی، ہوشیاری، چالاکی، داؤ پیچ یا زور آزمائی میں اُن میں سے کوئی اُس کے پاسنگ بھی نہیں۔ چنانچہ پے در پے ہزیمتیں اٹھانے کے بعد وہ دھاندلی پر اُتر آئے اور ایک ہی دفعہ بہت سے لڑکوں نے اُس پر بلّہ بول دیا۔ حمزہ ذرا نہ گھبرایا۔ وہ اُنھیں اٹھا اٹھا کر یوں پٹخنے لگا جیسے وہ روئی کے گالے ہوں۔ جس لڑکے کو ایک دفعہ اس کا گھونسا پڑ جاتا پھر وہ اس کے قریب آنے کا نام نہ لیتا۔ آخر سب پٹ پٹا کر دور دور ہٹ گئے اور اُسے وہاں سے چلے جانے دیا۔

کالونی میں پہنچ کر حمزہ نے اس واقعہ کا ذکر اپنے ماں باپ یا کسی دوست سے نہیں کیا، کیونکہ اُسے ڈر تھا کہ اگر اس واقعہ کا چرچا ہوا تو ممکن ہے اس کی خبر قصبے تک پہنچ جائے اور قصبے والے بدلہ لینے کے لئے کالونی پر دھاوا بول دیں یا کسی اور طریقے سے ان لوگوں کا جینا حرام کر دیں۔

اب حمزہ اٹھارہ برس کا ہوگیا تھا۔ وہ بڑا سجیلا نوجوان تھا۔ بالا قامت، چوڑا سینہ، سڈول بازو، بھرا ہوا جسم، سر پر بال کیا تھے جیسے کسی نے سونا بکھیر دیا تھا۔ گورا رنگ، ابھرواں نقشہ بڑی بڑی

آنکھیں جیسے کنول کے ادھ کھلی کلیاں۔ کالونی کی بس لڑکی نے بھی ایک مرتبہ اس کی جھلک دیکھلی پھر وہ اس کا نقش کبھی دل سے مٹا نہ سکی اور سارہ تو اس پر جان چھڑکتی تھی۔ وہ خود بھی دبلی پتلی نازنین تھی، پھول کی طرح مسکراتا ہوا چہرہ، نشیلی نشیلی سی آنکھیں جن کی پتلیاں شربتی رنگ کی تھیں۔ یہ جوڑا بے حد موزوں تھا اور جب گھر میں ذکر چھڑتا کہ ان کے لئے دوسرے گھروں میں رشتے کی جستجو نہ کرنی پڑے گی تو سارہ شرم سے سر جھکا لیتی۔ کالونی کی ساری لڑکیاں اس کی خوش قسمتی پر رشک کرتی تھیں۔

اگرچہ حمزہ نے اس کالونی میں آنکھ کھولی تھی اور وہ بچپن ہی سے اپنے ماں باپ اور کالونی کے دوسرے مسلمانوں کو بڑی ہی پستی کی زندگی بسر کرتے دیکھتا آرہا تھا اور رفتہ رفتہ ان حالات کا عادی ہو چکا تھا۔ مگر اب جیسے ہی وہ سن بلوغت کو پہنچا۔ اُسے اپنی قوم کی تذلیل کا احساس بڑی شدت سے ہونے لگا۔ وہ سنبھل کے مسلمانوں کے قتل عام کے دہشت ناک واقعات سن چکا تھا کہ کس طرح اس کے ماں باپ اور دوسرے مسلمان ہندو غنڈوں کے ہاتھوں اپنے بھرے پُرے گھروں کو چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور کس طرح اس کا تایا اسحاق، اُس کی دو جوان تایا زاد بہنیں، اور اس کے دو کم عمر چچا ہندوؤں سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے اور کس طرح اُس کے دو سالہ معصوم بھائی اصغر کو ماں کی آنکھوں کے سامنے سفاکی کے ساتھ تہہ تیغ کر دیا گیا۔ ایسی ہی ہولناک کہانیاں اُس نے کالونی کے دوسرے گھروں کے بارے میں بھی سن رکھی تھیں۔ اب ان کو یاد کر کرکے اس کا خون کھولنے لگا۔ پھر وہ یہ بھی دیکھتا کہ اس کالونی کے مرد و زن کو اپنا اور بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے کس قدر محنت اور جفاکشی کرنی پڑتی ہے۔ اور دوسری طرف ہندو ہیں کہ ان کے یہاں اچھوتوں کی طرح رہنے کے بھی روادار نہیں اور جب مسلمان یہاں جھونپڑیاں بنا رہے تھے تو اُن میں آگ لگا لگا کے انہیں یہاں سے بھگانے کی کیسی کیسی کوششیں کی گئی تھیں۔

ان باتوں کو سوچ سوچ کر وہ اندر ہی اندر گھلنے لگا اس کا جی کسی کام میں نہ لگتا۔ وہ ہر وقت چپ چپ اور کھویا کھویا سا رہنے لگا۔ اس کا کھانا پینا چھوٹ گیا اور جب سارہ اور گھر کے دوسرے لوگ بڑی فکرمندی کے ساتھ اس تغیر کا سبب پوچھتے تو وہ کوئی جواب نہ دے پاتا۔ سارہ کڑھتی مگر کچھ نہ کر سکتی۔ اس کی محبت بھی حمزہ کا یہ دکھ دور نہ کر سکی۔

جب اسی طرح کئی دن گذر گئے تو ایک دن وہ اپنے ماں باپ کے پاس گیا اور کہنے لگا:

میرا دل یہاں رہتے رہتے اُچاٹ ہو گیا ہے، میں پردیس جانا چاہتا ہوں۔ میں اب اتنا بڑا ہو گیا ہوں کہ

اپنی دیکھ بھال خود کر سکوں۔ میں جہاں کہیں بھی جاؤں گا محنت مزدوری کر کے روزی پیدا کر لوں گا۔ میں ہندوؤں کا بھیس بنا کے جاؤں گا اس لئے مجھے کوئی نقصان نہ پہنچائے گا۔ آپ لوگ میری فکر نہ کریں۔"

ابراہیم اور اس کی بیوی حیرت سے اس کا منہ تکنے لگے۔ سارہ نے بے حیا یانہ اس کا دامن پکڑ لیا۔ اور رو رو کر کہنے لگی:

"تم مجھے چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو؟ تمہارے بغیر میں کیسے زندہ رہ سکوں گی؟"

"سارہ گھبراؤ نہیں" اس نے دل جوئی کرتے ہوتے کہا۔ "میں جلد واپس آجاؤں گا۔ میں تمہارے لئے اچھے اچھے کپڑے اور زیور لاؤں گا۔"

"مجھے نہ کپڑے چاہئیں نہ زیور، بس تم کہیں نہ جاؤ۔"

مگر اس نے ایک نہ سنی۔ اس کے ماں باپ اور بلقیس نے بھی بہتیرا روکنا چاہا مگر وہ نہ رکا۔ اسی روز وہ کچھ کپڑے اور ضروری چیزوں کی ایک گٹھڑی سی بنا سفر پر روانہ ہوگیا۔

دن پر دن گزرتے گئے مگر حمزہ واپس نہ آیا۔ جب چھ مہینے تک اس کے گھر والوں نے اس کی صورت نہ دیکھی تو انہیں یقین ہوگیا کہ ضرور کسی نے اسے پہچان کر مار ڈالا ہے۔ تینوں عورتیں اس کی یاد میں بلک بلک کر روتیں اور اس کا باپ گردن جھکائے ایک سائے کی طرح کالونی میں ادھر ادھر پھرتا رہتا، اس کی دکان سونی سونی رہتی۔ وہ نہ کسی سے بات کرتا نہ کسی کی بات کا جواب دیتا۔

جب حمزہ کو گھر سے نکلے پورے ایک سال ہوگیا۔ تو ایک رات وہ اچانک واپس آگیا۔ اس کے گھر والوں کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آتا تھا وہ اس سے لپٹ گئے۔ عورتیں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں ابراہیم نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ مگر حمزہ بت بنا کھڑا رہا۔ اپنے عزیزوں کو دیکھ کر نہ تو اس کی آنکھوں میں چمک ہی پیدا ہوئی اور نہ ہونٹوں پر مسکراہٹ ہی آئی۔

اس کے گھر والوں نے دیکھا کہ وہ سوکھ کر کانٹا ہوگیا ہے اس کی آنکھیں بجھی بجھی سی ہیں، چہرے پر مردنی سی چھائی ہے معلوم ہوتا ہے جیسے اسے کوئی سخت روگ لگ گیا ہے۔ انھوں نے اس سے طرح طرح کے سوال کرنے شروع کئے مگر اس نے کسی کا جواب نہ دیا۔ جیسے وہ سن ہی نہیں رہا تھا۔ اس کی ماں نے اس کے سامنے کھانا لا کر رکھا۔ مگر اس نے نظر اٹھا کے بھی نہ دیکھا۔ جھونپڑی میں ایک طرف ٹوٹی ہوئی کھٹیا پڑی تھی۔ وہ اس پر گیا اور تھوڑی ہی دیر سو گیا۔ اس کے گھر والے رات بھر اسے نیند میں کراہتے اور بڑبڑاتے سنا کیے۔

اگلی صبح کو وہ اٹھا تو اُس کے چہرے پر کچھ کچھ سکون کے آثار تھے۔ ماں نے اسے بکری کے تازہ دودھ کا گلاس دیا۔ جسے اس نے بلا حیل و حجت پی لیا۔ اب اس کے گھر والوں نے پھر اس پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ وہ پہلے کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور آخر اپنی کہانی یوں سنانی شروع کی:

آپ لوگوں سے رخصت ہو کر میں نے بہت سے شہروں کی سیر کی۔ میں دن بھر مزدوری کرتا اور رات کو سرائے میں یا کسی مندر کے باہر پڑا رہتا۔ میں نے ہندوانہ لباس کے ساتھ ہندی کے کچھ الفاظ بھی اپنی بول چال میں شامل کر لیے تھے۔ اس لئے کسی کو مجھ پر شک نہ گزرتا تھا۔ میں جہاں کہیں گیا میں نے مسلمانوں کو بڑی مظلومیت کس مپرسی اور بے چارگی کی حالت میں دیکھا۔ وہ ہر وقت ڈرے اور سہمے رہتے۔ ان کی مسجدوں بزرگوں کے مزاروں اور ان کے قبرستانوں کو مسمار کیا جاتا مگر وہ دم نہ مار سکتے۔ ہندوستان کا کوئی شہر ایسا نہ تھا جہاں آئے دن مسلمانوں پر بلوے نہ ہوتے رہتے۔ ان بلووں میں ہزاروں بے گناہ زن و مرد بچے بوڑھے موت کے گھاٹ اتار دیئے جاتے۔ ان کی جائیدادیں اور املاک لوٹ لی جاتیں۔ جو مسلمان زندہ بچ رہتے ان پر سخت ظلم ڈھائے جاتے اور انہیں بڑی ذلت کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا جاتا۔ خدا جانے گنگا، جمنا، راوی اور تاپتی کے پانیوں میں کتنا خون بے گناہ مسلمانوں کا مل گیا ہے!

"میں ایک دفعہ ایک بڑے شہر کے ریلوے اسٹیشن پر مزدوری کرنے گیا۔ وہاں میں نے ایک بڈھے کو دیکھا جو میری طرح مزدوری کرنے آیا تھا۔ اُس کے جبڑوں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں اور آنکھیں دھنسی ہوئی۔ میں نے اس سے زیادہ مظلوم چہرہ پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ گو اس نے ہندوؤں کی طرح دھوتی باندھ رکھی تھی مگر مجھے فوراً خیال آیا کہ کہیں یہ بھی میری طرح مسلمان ہی نہ ہو۔ چنانچہ میں نے جرأت کر کے اسلامی طریق پر اُسے سلام کیا۔ اس پر وہ بڈھا تھر تھر کانپنے اور خوفزدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ جب میں نے اس کی ڈھارس بندھائی تو اس نے اپنے مسلمان ہونے کا اقرار کر لیا۔

"یہ شخص ایک خاصا خوش حال تاجر تھا۔ اس کے کئی جوان لڑکے اور لڑکیاں تھیں۔ جب اس کے شہر میں مسلمانوں پر بلوے ہونے شروع ہوئے تو اس کے مکان کو بھی گھیر لیا گیا۔ ہندو غنڈے دروازے اور کھڑکیاں توڑ کر گھر کے اندر گھس آئے۔ اس شخص کو رسیوں سے جکڑ دیا گیا اور اس کی آنکھوں کے سامنے پہلے اس کی معصوم کنواری لڑکیوں کی آبرو لوٹی گئی۔ بعد میں ان لڑکیوں اور ان کے بھائیوں کو نہایت بے دردی کے ساتھ ذبح کر دیا گیا۔ جب اس پر بھی ہندو غنڈوں کا دل ٹھنڈا نہ ہوا تو انہوں نے مکان کے چاروں طرف مٹی کا

تیل چھڑک کر آگ لگا دی۔ دم بھر میں شعلے بلند ہونے لگے اور اس کی بیوی، اس کے بوڑھے باپ اور دوسرے لواحقین آہ و بکا در و دیوار میں گم ہو کے رہ گئی۔ یہ شخص بڑا سخت جان تھا کہ پھر بھی کسی طرح زندہ بچ رہا۔ وہ اب مزدوری کرکے پیٹ پالتا ہے۔ مگر خود کو ہندو ظاہر کرتا ہے کیونکہ اس کے بغیر اسے مزدوری نہیں مل سکتی۔

میں نے ایسے واقعات سنے ہی نہیں اپنی آنکھوں سے بھی دیکھے ہیں۔ جس کی وجہ سے ان مظلوموں کی شکلیں سوتے جاگتے میری آنکھوں کے سامنے پھرتی رہتی ہیں اور مجھ پر ہر وقت ایک اضطراب کی کیفیت طاری رہتی ہیں۔

"میں تم لوگوں کو اپنی شکل دکھانے آگیا ہوں۔ تاکہ تم کو اطمینان ہو جائے کہ میں زندہ ہوں۔ لیکن میں یہاں ٹھہر نہ سکوں گا۔ میرے دل میں کوئی بیٹھا کہہ رہا ہے کہ اٹھ اور چل۔ لیکن کہاں ؟ یہ ابھی مجھے معلوم نہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے عنقریب۔ مجھ سے کوئی بڑا اہم کام لیا جانے والا ہے۔"

ابراہیم، آمنہ، بلقیس اور سارہ چاروں مبہوت ہو کر حمزہ کی زبان سے یہ ماجرا سنتے رہے اگلی صبح جب ان کی آنکھ کھلی تو حمزہ کی کھٹیا خالی پڑی تھی۔

وہ فتنہ جو ایک عرصے سے خوابیدہ تھا اچانک بیدار ہو گیا۔ کسی نے قصبے میں یہ شوشہ چھوڑ دیا کہ کالونی کے ملیچھ مسلمان ہندوؤں کے متبرک کنوئیں سے پانی بھر کر اسے ناپاک کرتے ہیں۔ اس بات کو وہ کٹر ہندو لے اڑے جو مسلمانوں کے وجود کو کسی صورت ہندوستان کی سرزمین پر نہیں دیکھنا چاہتے تھے اور اسے ایک تحریک کی شکل دے دی گئی۔ پھر کیا تھا کئی ہندو کنوئیں پر پہنچ گئے اور مسلمان عورتوں سے جو پانی بھرنے آئی تھیں چھیڑ چھاڑ کرنے لگے۔ جب یہ بیچاری پانی بھرے بغیر چلی گئیں تو انہوں نے کنوئیں پر باقاعدہ پہرہ بٹھا دیا۔ یہ ہندو جو والنیٹر کہلاتے تھے صبح سے آدھی رات تک باری باری مندر کے آس پاس پہرہ دیتے رہے۔

کالونی والوں کے لئے یہ بڑا نازک مسئلہ تھا۔ وہ دنیا کی ہر مصیبت جھیل سکتے تھے مگر پانی کے بغیر زندہ نہ رہ سکتے تھے۔ چنانچہ جب ہندو پہرہ دار چلے جاتے تو رات کے پچھلے پہر کالونی کی عورتیں چپکے سے جا کر پانی بھر لاتیں۔ یہ سلسلہ کئی روز تک جاری رہا۔ مگر آخر ہندوؤں کے کان میں اس کی بھنک پڑ گئی اور ایک رات پچھلے پہر کے سناٹے میں جب یہ عورتیں پانی بھرنے آئیں۔ تو بہت سے ہندوؤں نے جو مسلح ہو کر آئے تھے اور مندر میں چھپے بیٹھے تھے ایکا ایکی ان پر حملہ کر دیا۔ وہ غل مچاتے اور نعرہ لگاتے بھوکے بھیڑیوں کی طرح ان پر ٹوٹ پڑے اور کیا کنواری اور کیا بیاہتا سب کی آبرو لینے لگے۔ جو ذرا مزاحمت کرتی اس کے سینے میں چھرا بھونک دیا جاتا۔

رات کی خاموشی میں جب ان عورتوں کی چیخیں غنڈوں کے قہقہوں میں ملی ہوئی کالونی میں پہنچیں تو سارے مرد جھونپڑیوں سے باہر نکل آئے اور لٹھ ڈنڈا یا کلہاڑی جو بھی ہاتھ میں آیا لے کنوئیں کی طرف دوڑے۔ ہندو پہلے تو ان کو دیکھ کر ڈرے اور بھاگنے کی سوچنے لگے۔ مگر جب دیکھا کہ ان کی تعداد پندرہ بیس سے زیادہ نہیں ہے تو اُن کے قدم رک گئے اور اپنی پوری جمعیت کے ساتھ جس کی تعداد سینکڑوں تک پہنچی تھی مسلمانوں سے مقابلے کے تیار ہو گئے۔

مسلمان بڑی بہادری سے لڑے اور بہت سے ہندوؤں کو موت کے گھاٹ اتار دیا مگر ایک ایک آدمی دس دس کا مقابلہ کب تک کر سکتا تھا۔ چنانچہ تھوڑی ہی دیر کئی مسلمان لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔ جو زندہ بچے وہ زخموں سے چور چور تھے۔ ہندوؤں نے ان پر جلد ہی قابو پا لیا۔ ابراہیم بھی ان بچے کھچے لوگوں میں تھا۔ اس کے جسم پر بہت سے زخم آئے تھے جن سے تیزی سے خون بہہ رہا تھا۔

ہندوؤں نے ان مسلمان مردوں اور عورتوں کو رسیوں سے جکڑ دیا۔ وہ جوش انتقام سے دیوانے ہو رہے تھے، کیونکہ مسلمانوں کی آٹھ دس لاشوں کے ساتھ ہندوؤں کی بیس پچیس لاشیں بھی زمین پر لوٹ رہی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے صلاح ٹھہرائی کہ ایک بہت بڑا الاؤ لگایا جائے اور ان ملیچھوں کو اس میں زندہ جلا دیا جائے۔

کئی ہندو اسی وقت دوڑے دوڑے قصبے میں گئے اور ٹال کھلوا چھکڑوں میں لکڑیاں بھر لائے تھوڑی ہی دیر میں مندر کے سامنے ایک بہت بڑا الاؤ لگا دیا گیا۔ دم بھر میں شعلے آسمان کی خبر لانے لگے۔ سارہ جو اپنی ماں اور چچی کے ساتھ رسیوں سے بندھی زمین پر پڑی تھی اس بھیانک منظر کی تاب نہ لا سکی۔ اس کی دہشت زدہ نظریں مرد قیدیوں میں جو اس سے ذرا ہٹ کے رسیوں میں جکڑے پڑے تھے، اپنے چچا کو ڈھونڈنے لگیں۔ آخر اس نے ابراہیم کو تلاش کر لیا۔ جو زخموں سے چور زمین پر پڑا سسک رہا تھا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر سارہ کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ ابراہیم نے نقاہت کے باوجود یہ چیخ سن لی اور اس نے بڑی مشکل سے گردن اٹھا کر قیدی عورتوں پر نظر ڈالا۔ آخر چچا بھتیجی کی نظریں مل گئیں اور وہ دونوں بڑی بے بسی کے ساتھ ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

اب ہندو غنڈوں نے قیدی مردوں کے جسموں میں بھالوں کی انیاں چبھو چبھو کر پہلے انہیں الاؤ کی طرف لے جانا شروع کیا۔ ابراہیم سب سے آگے تھا۔ بہت سا خون نکل جانے سے وہ ایسا نحیف ہو گیا تھا کہ

ایک قدم بھی چل نہ سکتا تھا۔ اس پر دو تین ہندو والنٹیر اسے گھسیٹتے ہوئے الاؤ کے قریب لے گئے اور آگ میں دھکا دے دیا۔ سارہ کے منہ سے ایک مرتبہ پھر چیخ نکل گئی۔ مگر یہ چیخ پہلی سے کہیں زیادہ بلند اور کرب ناک تھی۔

اس چیخ کا سنائی دینا تھا کہ یکبارگی آسمان پر بڑے زور کا کڑاکا ہوا جس سے کانپنے لگی اور اس کے ساتھ ہی الاؤ کی آگ خود بخود بجھ گئی۔ یہ دیکھ کر ہندو ایسے سراسیمہ ہوئے کہ اندھا دھند ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ اتنے ہی میں آسمان میں ایک بہت بڑا اشگاف ہوگیا اور اس میں سے دمدار تارے کی شکل کی کوئی چیز نمودار ہوئی، جس میں سے اس قدر تیز روشنی پھوٹ رہی تھی زمین و آسمان جگمگا اٹھے تھے۔

یہ چیز بڑی تیزی کے ساتھ اس مندر کی طرف آنے لگی۔ جوں جوں وہ قریب آتی جاتی تھی روشنی بڑھتی ہی جاتی تھی، یہاں تک کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ ہونے لگیں اور وہ ہاتھ اٹھا اٹھا کے اپنی آنکھوں کو چھپانے لگے۔ آن کی آن میں وہ چیز ہندوؤں کے سروں کے بالکل قریب آکر ٹھہر گئی۔

اگرچہ روشنی اس قدر تیز تھی کہ نظر اس پر نہ ٹھہرتی تھی، پھر بھی ان لوگوں نے اپنی آنکھوں کو کبھی بند کر کے اور کبھی کھول کے یہ دیکھ ہی لیا کہ یہ ایک بڑا سندر سجیلا نوجوان ہے۔ جو ایک دودھ ایسے گھوڑے پر سوار ہے، اس کے دہنے ہاتھ میں ایک لمبی تلوار ہے جس سے یہ ساری روشنی نکل رہی ہے۔ اس کے سر پر بڑا خوبصورت مکٹ ہے، جس میں جگمگاتے ہوئے لعل، ہیرے، زمرد، پکھراج، نیلم، اور ذو قیمت بے بہا جواہر جڑے ہیں۔ گلے میں بڑے بڑے موتیوں کی کئی کئی مالائیں ہیں۔ اس کے گھوڑے کا ساز و یراق بھی جواہر سے مزین ہے۔ سر پر اونچی کلغی ہے۔ گھوڑے کے سامنے کی ٹانگوں پر گردن کے قریب دو بڑے بڑے پر ہیں جو مور کے پروں سے بھی زیادہ رنگین اور خوش نما ہیں۔ یہ پر تھرتھرا رہے ہیں جس کی وجہ سے گھوڑا ہوا میں معلق ہے۔

اس عجیب غریب گھڑسوار کو دیکھ کر ہندوؤں کی گھگھی بندھ گئی۔ بعض نے اضطراری حالت میں پوجا پاٹ شروع کر دی، بعض ہاتھ جوڑ جوڑ کر اسے ڈنڈوت کرنے لگے۔ ادھر ابراہیم نے بھی جسے آگ نے ذرا گزند نہ پہنچایا تھا سر اٹھا کر اس سوار کو دیکھا اور وہ تکٹکی کا تکتا رہ گیا۔ یہی حال سارہ کا تھا جو ایک حیرت کے عالم میں کبھی اپنے چچا ابراہیم کی طرف دیکھتی تھی اور کبھی اس سندر سجیلے گھڑسوار کی طرف، اب اس سوار نے گمبھیر مگر بڑی سریلی آواز میں ہندوؤں کے مجمع سے یوں خطاب کرنا شروع کیا:

"میں ہی ہوں وہ کلکی اوتار۔ جس کے آنے کی خبر شاستروں میں دی گئی تھی۔ میں وشنو بھگوان کا دسواں اور آخری اوتار ہوں۔ مجھے کل جگ کے ختم ہونے پر ظاہر ہونا تھا جس کی مدت چار لاکھ بتیس ہزار سال ہے۔ مگر آج سنسار پر ادھرم اور پاپ کا ایسا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا ہے کہ اس سے زیادہ ممکن نہیں یہی وجہ ہے کہ مقررہ وقت سے بہت پہلے یہاں آنا پڑا ہے۔

"میں وشنو ہوں۔ جب کبھی سنسار میں نیکی گھٹ جاتی ہے اور بدی غلبہ پالیتی ہے تو میں دیولوک میں اپنے استھان کو چھوڑ کر یہاں آتا ہوں تاکہ نیکیوں کی حفاظت کروں اور بدکاروں کو ان کے کئے کی سزا دوں۔ میں نو مرتبہ مختلف اوتاروں کے روپ میں دھرتی پر آ چکا ہوں۔ مگر جیسا ظلم و ستم میں آج اس اندھیر نگری میں دیکھ رہا ہوں پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ تم انسان نہیں بھیڑیوں سے بھی بدتر ہو۔ پرتھوی جس نے تمہیں پالا ہے تمہارے کرتوتوں سے ایسی دکھیا ہے کہ وہ تمہاری صورت تک دیکھنا نہیں چاہتی۔ وہ پاتال چلی جانا چاہتی ہے۔ دھرتی تو دھرتی آکاش کے دیوتا بھی تم پر نفریں کرتے ہیں کیونکہ تم نے ان کے بھگت ہو کر ان کے نام پر کلنک کا ٹیکہ لگایا ہے۔

"تم شاستروں کے احکام کے مخالف ہو۔ تم ویدوں سے منحرف ہو گئے ہو۔ ہندو دھرم جو سب دھرموں میں بڑا اونچا درجہ رکھتا تھا تم نے اس کو بٹا لگایا ہے۔ ہندو دھرم جیو رکشک ہے کہ اس میں اس چیونٹی کی ہتیا بھی مہاپاپ ہے تم نے اس دھرم میں رہ کر لاکھوں بے گناہ انسانوں کا خون بہایا ہے۔ تم نے عورتوں کو بے آبرو کیا ہے، تم نے ان کو ننگا کر کے بازاروں میں پھرایا ہے۔ تم نے ان کی چھاتیاں اور ناک کان کاٹ کے انہیں زندہ چتاؤں میں جلایا ہے۔ تم نے ان کے بچوں کو بھالوں کی انیوں پر لٹکایا ہے۔ کیا ہندو دھرم کا یہی کرتویہ ہے؟

"اور پھر ان لاکھوں انسانوں کا قصور کیا تھا؟ محض یہ کہ انہوں نے اپنی نجات کے لئے جو راہ منتخب کی تھی وہ تمہاری راہ سے مختلف تھی۔ ان کا طریق عبادت اور طرز حیات تم سے جداگانہ تھا، کیا یہ اتنا بڑا قصور تھا کہ انہیں دائرہ انسانیت سے خارج کر کے نیست و نابود کر دیا جاتا؟

"کیا تم نہیں جانتے کہ دنیا کے تمام مذاہب ایک ہی مقصد رکھتے ہیں یعنی سفر آخرت۔ ہر شخص مسافر ہے اور اپنے اپنے طریق پر سفر کرتا ہے۔ مگر منزل سب کی ایک ہی ہے۔ اور ایک ہی روشنی ہے جو مختلف رنگوں میں نمودار ہوتی ہے مگر سب کے لئے مشعل راہ ہے۔

"مجھ سے پہلے رام چندر جی، کرشن جی اور گوتم بدھ آئے تھے جو میرے تین سروپ تھے۔ انہوں نے تم کو سچائی، دیانت، عدل و انصاف، ایثار، حلم و صبر کی تعلیم دی تھی۔ انہوں نے بتایا تھا کہ سنسار میں سکھ شانتی کس طرح حاصل کی جا سکتی ہے۔ انہوں نے تم کو نصیحت کی تھی کہ کسی کا دل نہ دکھاؤ۔ بیگانوں، یگانوں کی سیوا کرو۔ کسی سے نفرت نہ کرو۔ محبت سب چیزوں کا سرچشمہ ہے۔ عارف کی نظروں میں برہمن گائے، ہاتھی، کتا اور چنڈال برابر ہیں۔ سب سے اونچا شخص وہ ہے جو دوست و دشمن نیک و بد سب کو ایک نظر سے دیکھے۔"

"مگر تم نے ان کی تعلیمات کو بھلا دیا۔ تم جاہ و حشمت، حرص و ہوا کے بندے بن گئے۔ عناد، تعصب، نفرت و غرور تمہاری گھٹی میں پڑ گئے۔ اگیان نے تمہاری آنکھوں پر پردے ڈال دیئے۔ تم بِس کو امرت اور شعلے کو پھول سمجھنے لگے۔ تم یہ بھول گئے کہ یہ جگت کچھ بھی نہیں محض ایک سراب ہے۔ جیسے آکاش نیلے رنگ کا نظر آتا ہے مگر بچار کرنے سے یہ بھرم مٹ جاتا ہے۔"

"یہ بھی سن لو کہ تقدس، معصومیت، شرافت، خلوص اور حق شناسی کے جوہر کسی ایک قوم کو ودیعت نہیں ہوئے، بلکہ ساری کائنات کے حصے میں آئے ہیں۔ اسی طرح دیوتا بھی کسی خاص مذہب و ملت سے تعلق نہیں رکھتے، بلکہ وہ ساری انسانیت کے لئے ہیں۔ اور تمام موجودات میں ان کی ذات برتاؤ ہے۔ چنانچہ میں نے اسی بات کو ثابت کرنے کے لئے ایک کسی ہندو راج محل میں جنم نہیں لیا بلکہ ایک غریب مسلمان لوہار کے جھونپڑے میں پیدا ہوا ہوں......!"

ممتاز مفتی

ایمان : آپ میں آپ

دور اُفق پر کے پاس ۔ عزب الہند کے حسین جزیروں کے جھرمٹ میں جھول جزیرہ اپنی آتش فشاں خصلت کی وجہ سے جھول رہا تھا۔

جزیرے کے واحد باشی سمرت اور سالورو اپنے محل منش کنڈ میں بیٹھے تھے ۔

سمرت کا دھیان سالورو پر مرکوز تھا۔ اس کے دل میں محبت کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ سمرت جذبے سے بند بند جھنجھنا رہی تھی۔ سارنگی کے تار چھڑے ہوتے تھے۔ تاروں کی لرزش سرتیوں سرتیوں تک جا پہنچی تھی۔ پھر اتھاہ گہرائیوں میں کسی پراسرار روف پر ضرب پڑی۔ اس کی گنگ ابھر کر سمرت کے سینے میں گونجی دونوں پرٹے سے دھاگے ترکٹ ناگے بجنے لگے وہ گری جا رہی تھی۔ اس نے سالورو کا ہاتھ تھام لیا۔ ملتجی پر امید نگاہیں سالورو کا طواف کرنے لگیں۔

سالورو کو خبر ہی نہ تھی کہ جسمرت جھولن میں ہے ۔ بیچ رہی ہے ۔

ویسے تو وہ سمرت کے پاس بیٹھا تھا لیکن پتہ نہیں کہاں تھا۔ دور ۔ کہیں اکاش پر بھٹک رہا تھا۔

سالورو کی بے خبری دیکھ کر سارنگی اونچی سروں میں بین کرنے لگی۔ جوڑی نے توڑا مار کر سینہ پیٹ لیا۔

پھر سمرت کے روحے میں ایک شعلہ لپکا کایا پلٹ ہوتی۔ استری ناری بن گئی

سمرت اور سالورو دوساتھی تھے۔ ازلی ساتھی ۔

سمرت سارنگی سمان تھی۔ تاریں ہی تاریں۔ لرزشیں ہی لرزشیں۔

سالورو مرلی سمان تھا۔ ہوا ہی ہوا ۔ چھید ہی چھید۔

سمرت بادِ نسیم تھی.

سانورو بگولا تھا

دونوں خوابوں کے متوالے تھے. سمرت سپنے دیکھتی تھی حال کے سپنے. سانورو خواب دیکھتا تھا. فردا کے خواب.

دونوں جھولن کے متوالے تھے. سمرت پریم جھولا تھی. سانورو زلزلہ

اس کے باوجود دونوں ساتھی تھے. جنم جنم کے ساتھی. دونوں ہاتھ میں ہاتھ دے جزیرے میں گھومتے پھرتے. سمرت کے ہاتھ میں سانورو کا ہاتھ ہوتا. سانورو کا ہاتھ سمرت کے ہاتھ میں نہ ہوتا. سمرت کی نگاہیں سانورو کا طواف کرتیں. سانورو کی نگاہیں آکاش کو گھورتیں.

وہ جزیرہ اس قدر حسین تھا کہ اگر وہ اس حسن فراواں کو پورے طور پر دیکھ پاتے تو تحیّر بڑھ کر انہیں تھام لیتا اور پھر نہ بھولن رہتا نہ جزیرہ، لیکن وہ جھول جزیرے کے حسن سے بے گانہ تھے.

مانوسیت نے سانورو کی آنکھوں پر پردہ ڈال رکھا تھا اس لیے جھول جزیرہ اس کی نگاہوں میں ایک عام سا منظر تھا. سمرت کی نگاہوں کو پریم جھولن نے دھندلا رکھا تھا. اس کے لیے جزیرہ حسین تو تھا لیکن صرف اس لیے کہ وہاں سانورو تھا.

سانورو کا ہونا. سمرت کے لیے سب کچھ تھا. پھر بھی کبھی کبھار اس کا جی چاہتا کہ سانورو بھی جانے کہ سمرت ہے. چاہے کہ سمرت ہو.

اس وقت منش کنڈ کے محل میں بیٹھے سمرت کے من میں یہ آرزو جاگی کہ سانورو جانے کہ سمرت ہے. چاہے کہ سمرت ہو. لیکن سانورو آکاش کے تاروں میں کھویا ہوا تھا.

آکاش کے تارے ٹپر ٹپر جھول جزیرے کو دیکھ رہے تھے. ایک دوسرے کو آنکھیں مار رہے تھے.

جھول جزیرہ ہمیشہ سے ستاروں کی نگاہوں کا مرکز رہا تھا. جزیرہ کم کم جھول زیادہ. اس لیے وہ اس کے باشیوں کو تکتے رہتے. ویسے تو دھرتی پر سینکڑوں جزیرے تھے لیکن جھول جزیرہ سب سے زیادہ دلفریب تھا. اسے دیکھ کر ستارے مسحور ہو جاتے. ان کا جی چاہتا کہ وہ آکاش کے بجائے جھول جزیرے کے باشی ہوتے اور ہمیشہ پریم جھولنے میں پڑے رہتے. لیکن انہیں پتہ تھا کہ وہاں جانا تو ممکن ہے لیکن قیام کرنا ممکن نہیں.

چونکہ وہاں رومانی فضاؤں کا تسلّط ہے. وہاں چاروں طرف سے ایک لے ابھرتی ہے ایک رقص بیدار

ہوتا ہے اور پھر ایک مستی ایک دیوانگی ایک زلزلہ۔

پتہ نہیں اس جزیرے کی تخلیق میں کیا حکمت کارفرما تھی۔

دیکھنے میں وہ ایک عام سا ٹاپو تھا۔ ایک بہت بڑا سبز پیالہ۔ پیالے کے وسط میں نیلی جھیل جھیل کے مرکز میں سنہرے رنگ کی ایک کھوکھلی چٹان آویزاں تھی جیسے کسی مندر کا کلس ہو۔ اس پہاڑی کی کھوہ میں منش کنڈ محل تھا جس میں سانور داور سمرت رہتے تھے۔

سبز پیالے کے اوپر چاروں طرف ناریل کے درخت استادہ تھے۔ درختوں کے پیچھے زمردی چنڈامن اور ان کے پیچھے نیلگوں سمندر۔

رات کے وقت منقش آسمان جزیرے کو یوں ڈھانپ لیتا جیسے دھاتی طشت پر زرنگار سرپوش پڑا گیا ہو۔

آکاش کے تارے بھول جزیرے کے باشیوں کے دیوانے تھے۔ وہ انہیں حیرت سے دیکھتے وہ دیکھو وہ دیکھو ننھا تارا تالی بجا کر چلاتا۔ وہ اپنے نینوں سے رنگ پچکاری چلا رہی ہے، لیکن وہ بھیگتا نہیں۔

پتہ نہیں کیا بھید ہے تیسرا زیرلب گنگناتا۔ وہ خود میں نہیں رہتی اور وہ صرف خود میں قید ہے۔ پھر بھی وہ ساتھی ہیں جنم جنم کے ساتھی ہیں چوتھا ٹمٹماتا۔ دیکھو دیکھو نوجوان تارا چلاتا۔ کایا پلٹ ہو گئی۔ استری ناری بن گئی۔ اب اروا اور رت باہر نکلیں گے اور پھر ——————

مت دیکھو، مت دیکھو بڈھا ستارہ گنگناتا۔ صرف وہی دیکھ سکتا ہے جو جانتا ہے۔ جو نہیں جانتا وہ دیکھتا ہے مگر نہیں دیکھتا۔ تم دیکھو گے بھی تو نہیں دیکھ سکو گے۔

کیوں نہ دیکھیں نوجوان ستارہ مسکراتا۔ اس منظر کو دیکھ کر تو خود دیوتا اپنے کام کاج بھول جاتے ہیں۔

وہ دیکھو وہ۔ اندھی رت کھوہ سے باہر نکل آئی ہے۔

ہاں ادوسرا بولا۔ اس کا بدن یوں چمک رہا ہے جیسے آبنوس کی گھمن گھیری ہو۔

سنو سنو۔ اروکی چنگھاڑا۔ گونگا اور میدان میں آ پہنچا۔ اب اس میں اچھل جاگے گی اور وہ سروھاں تن جائے گا۔ پھر وہ رت پر جھپٹے گا اور پریم ناچ ناچے گا۔

پریم ناچ نہیں پتر یدھ ناچ بوڑھے ستارے کی آواز آئی۔

دیوتاؤں کو پتہ چلتا کہ ستارے دیکھ رہے ہیں تو وہ جزیرے پر بادلوں کا پردہ ڈال دیتے۔

جھول جزیرے میں ارد اور رت کا رقص صدیوں سے جاری تھا۔ ارد اور رت سانورد اور سمرت کے رنگی غلام تھے۔

رت سمرت کی باندھی تھی

ارد۔ سانورد کا بردا تھا

سبز پیالے کے اکھاڑے میں گونگا ارد اور اندھی سمرت لڑ لڑ کر لہو لہان ہو جاتے اور پھر پریم جھیل کے کنارے پڑے سسکیاں بھرتے مظلوم رت اور ارد کی دنیا تیرہ و تار تھی۔ ان کی کائنات الم و ایذ سے بھری تھی۔

گونگا ارد جذبات کے کوڑوں سے استادہ ہونے پر مجبور کر دیا جاتا۔ اس کا پایا ستون زنجیروں سے جکڑ کر بلو میا جاتا۔ تنا دے بند بند ٹوٹتا ایسے معلوم دیتا جیسے اہرام مصر کا کوئی حبشی معمار ہو جو کسی فرعون کے کوڑے تلے بلبلا رہا ہو یا جیسے ہمالیہ کی کسی تاریک کھوہ پر کوئی ایذا پرست یوگی تن تن کر اپنی ہڈیاں توڑ رہا ہو۔

اندھی رات عمیق گہرائیوں میں محصور تھی اس کے پاؤں میں پراسرار بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں جس طرح کھلے سمندر کی سطح پر بڑے بڑے لوایذ بظاہر آزادانہ تیرتے نظر آتے ہیں، لیکن عمیق گہرائیوں میں زنجیروں سے بندھے ہوتے ہیں۔

کوئی تیرہ و تار دھنکی اس کا بند بند دھنکتی تھی کوئی پراسرار ضرب پڑتی جس کی لرزش اسے گود میں لے کر جھلاتی حتیٰ کہ وہ جھول عذاب کی شدت اختیار کر لیتی۔

پھر کوئی خفیہ آتش فشاں پھٹ جاتا اور لاوے کا دریا بہنے لگتا جس کے کنارے ارد اور رت لہو لہان پڑے سسکتے رہتے۔ ستارے انہیں دیکھ دیکھ کر آہیں بھرتے۔

ہاں ستارے انہیں دیکھتے کبھی نہ اکتاتے تھے۔

ایک کہتا۔ رت اور ارد کا پریم ناچ کتنا جاذب ہے۔

دوسرا کہتا۔ پریم تو بہانہ ہے یہ تو بیدھ ناچ ہے۔

تیسرا کہتا۔ نہ پریم ہے نہ بیدھ یہ تو مستی کا اظہار ہے۔

چپ رہا چلاتا۔ تم تو اندھے ہو۔ تمہیں مجبوری لاچاری اور بے بسی۔ عیاشی نظر آتی ہے کیا تمہیں خبر نہیں کہ اس سنسار کو ہرا بھرا رکھنے کے لیے پریم قدرت کی ایک چال ہے۔

کچھ ستارے کہتے سالورو اور سمرت اروا اور رت کے ہاتھوں مظلوم ہیں۔ دوسرے کہتے نہیں سالورو اور سمرت اروا اور رت پر ظلم ڈھاتے ہیں۔

بوڑھا ستارہ آہ بھر کر کہتا۔ مت دیکھو مت دیکھو۔ دیوتاؤں کے بھید جانے بغیر تم دیکھ نہیں سکتے۔ پھر دیکھنے کا فائدہ۔

کوئی اس تماشے کا بھید نہیں جانتا تھا۔ دیوتا خود حیران تھے۔ انہیں صرف ظاہر کا پتہ تھا۔ بھیتر کی بات صرف پرمیشور جانتے تھے۔

دیوتاؤں کا کہنا تھا کہ جب پرمیشور نے سالورو اور سمرت کی تخلیق کی تھی تو اس وقت ان کے پاؤں میں اروا اور رت کی بیڑیاں نہ تھیں۔ اس وقت وہ صرف منش اور استری تھے منش میں ڈنک نہ تھا استری میں نار نہ تھی۔ اس وقت وہ صرف مرد اور عورت تھے مرد میں ارو نہ تھا عورت میں رت نہ تھی۔

پرمیشور نے سمرت کے جیو میں پریم جھولنا لٹکا دیا اور سالورو کے جیو میں سوئے اڑان بھر دی۔ سمرت کا دھیان سالورو سے جوڑ دیا اور سالورو کا آکاش کی طرف جوڑ دیا۔

سمرت کی سوچ کے ماتھے پر آج کی بندیا لگا دی سالورو کی سوچ میں آوارگی بھر دی۔

سالورو سے کہا۔ جا تو آکاش میں آوارہ رہ

سمرت سے کہا۔ جا تیرا کام یہ ہے کہ سالورو کو گھسیٹ کر دھرتی پر لا۔ پھر انہیں جھول جزیرے پر اتار دیا گیا۔ صدیاں بیت گئیں۔ پھر ایک دن اتفاقاً چار دیوتاؤں کا ادھر سے گزر ہوا۔ کیتو مہاراج نے حیرت سے جھول جزیرے کی طرف دیکھا۔ بولے یہ کون سی جگہ ہے۔

سندھو مہاراج نے کہا یہ جھول جزیرہ ہے۔

پرنتو یہاں آنند کا سماں نہیں۔ چندر مہاراج بولے ہاں کیتو گنگنائے یہاں سے دکھ کی باس آ رہی ہے۔ آج مہاراج ہنسنے کہنے لگے پریم جھولن میں دکھ کیسا۔

انہیں دیکھ کر سمرت اور سالورو بھاگے بھاگے آئے جے ہو مہاراج کی جے ہو دھن بھاگ

ہمارے. تم یہاں آنند سے ہو نا چندر مہاراج نے پوچھا۔

پریم جھولن میں بیٹھے ہیں تو آنند ہی ہوگا سندھو مہاراج بولے۔

پریم تو ہے مہاراج سمرت نے کہا پرنتو جھولن نہیں ہے۔

جھول جزیرے میں جھولن نہیں ہے انج مہاراج نے حیرانی سے پوچھا۔

ہاں مہاراج سمرت بولی۔ پریم چکر سمان چلتا ہے جھولن سمان نہیں۔ جو چکر سمان چلے مہاراج تو وہ کشٹ بن جاوے ہے۔

وہ جھولن سمان کیوں نہیں چلے ہے کیتو مہاراج نے پوچھا۔

مہاراج سمرت بولی جھولن سمان تو تبھی چل سکے ہے جب بڑھے رکے مڑے اور پھر سے بڑھے جس طور ہر چلے ہے۔

سچ کہتی ہے چندا مہاراج بولے اس دھرتی پر ہر شئے لہر سمان چلے ہے۔ جو چلتا ہی جائے سو کشٹ بن جاوے ہے جو رک رک چلے سو آنند۔

مہاراج سمرت ہاتھ جوڑ کر بولی۔ اس پریم چکر نے میری سدھ بدھ مار رکھی ہے اور مہاراج جب سدھ بدھ ہی نہ رہے تو آنند کیا۔

سچ کہتی ہے انج مہاراج نے کہا۔

"تو تو" کہنے والے کو جب میں کی سدھ نہ رہے تو پھر جان لو کہ نہ تو ہا نہ میں رہی۔

تو نہیں بوتا سب لورد کیتو مہاراج نے پوچھا۔ یہ کیوں بولے گا مہاراج سمرت نے جواب دیا۔

یہ تو میلا، "تو" ہے اور اپنے کارن نراس ہی میں اور مہاراج جو میں ہما ہیں ہو۔ اسے پریم چکر سے واسطہ مجھ پر دیا کر د مہاراج سمرت ہاتھ جوڑ سیس نوا کر کھڑی ہو گئی۔ انج مہاراج بولے جا تیری اکشا پوری ہوگی۔ پریم چکر پریم جھولن میں بدل جائے گا۔

جب پریم ہمارے اتنے بڑھ جائیں گے کہ گھٹن ہو جائے گی تو بھونچال آئے گا۔ لاوا بہہ نکلے گا اور تو شانت ہو جائے گی۔

دھن ہو مہاراج دھن ہو سمرت پھول سمان کھل گئی انج مہاراج نے تالی بجائی۔ ارد اور رت ہاتھ باندھے آ کھڑے ہوئے۔

یہ تمہارے بردے ہیں انج مہاراج بولے۔

ارو ——— سالوزوکا بردا ہے

رت ——— سمرت کی باندھی

جب پریم کنسٹ بنے گا تو اروا ور رت آجایا کریں گے۔ یہ پریم بدھ ناچ ناچیں گے ہر کشٹ
ند میں بدل جائیگا اور پریم چکر پریم جھولن بن جائے گا۔

دھن ہو مہاراج دھن ہو سمرت چلائی۔

پر ایک بات کا دھیان رکھنا انج مہاراج نے کہا۔ ان بردوں کو نیچ نہ جاننا ان کا اپمان نہ کرنا۔
یں پوتر تا کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ یہ سیج کے پجاری ہیں ان کی شان بڑی اونچی ہے۔ اس کارن یہ
ناسماں ہیں۔ انہیں آرتی چڑھانا۔ ان کی سجے بلانا۔ انہیں لوبھ کے لیے برتو گے۔ ان کا تماشہ بناؤ گے
پمان ہو جائے گا پھر ارو میں اچھال نہیں رہے گی۔ اس کا سر نیچا ہو گیا تو پریم جھولن ٹوٹ جائے
اور لوبھ چکر چل پڑے گا۔ چل پڑے تو جان لینا وہ دھرتی کے آخری دن ہوں گے۔

نیویارک کی نیوڈ۔ نیوڈ کلب میں ہال تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ تماشائی آخری منظر
ینے کے لیے بے چین تھے۔ حرص و ہوس سے چہرے سوجے ہوئے تھے۔ آنکھیں ابل کر باہر نکل آئی
یں۔ نسیں تن تن کر بجنے لگی تھیں۔

تماشائیوں کے جسم لٹے پٹے تھے۔ جنس کے عفریت کے روندے ہوئے لتاڑے ہوئے جسم
ریہ محبت شہوت کے گاڑھے ملبے میں بدل چکا تھا۔ خواہش جسم سے چھو چھو کر ذہن میں آ جمع ہوئی۔
ہن بھڑوں کے چھتے کی طرح ہوس سے بھن بھن کر رہے تھے۔

آخری سین ارو اور رت کا ناچ تھا دفعتاً پردہ اٹھ گیا۔

سٹیج پر اندھی رت انگڑائیاں لے لے کر اپنی ہڈیاں توڑ رہی تھی۔ اس کے بند بند کی تاریں جھن
بن کر رہی تھیں۔ سرتیاں سمرتیاں بج رہی تھیں پھر آرکسٹرا سے دف کی آواز ابھری۔ آدم خور جبشیوں
یسی۔ سمرت کے سینے کے دونوں پڑے دھاگے تر گٹ ناگے بجنے لگے۔

پھر اس کے جسم سے جنس کا خوف ناک بلاوا گونجا ——— ہال میں ایک زلزلہ آگیا۔ دور
یسج کے ونگ سے گونگے ارو کی چنگھاڑ سنائی دی۔ زخمی چنگھاڑ۔ جیسے رنگ میں داخل ہونے

(باقی ص ۲۱۴ پر)

قاضی عبدالستّار

مُجرئ

حضرت پور کی چھوٹی گڑھی پر سُورج کی کرنیں اتر رہی تھیں جیسے ٹوٹے دلوں پر یادیں اترتی ہیں۔ بستی کے زانو پر لیٹی ہوئی سڑک کے کنارے چھدرے کھیتوں اور گنجے درختوں کے اس پار دُور تک لکھوری اینٹوں کا کھنڈر چلا گیا تھا۔ دو زانو بیٹھی ہوئی دیواروں، رکوع میں کھڑی ہوئی محرابوں اور سجدے میں پڑے ہوئے ستونوں پر نمازِ میت کی سی ہولناک خاموشی برس رہی تھی۔ یہ عمارتیں خوش نصیب انسانوں کی طرح اچانک مر کیوں نہیں جاتیں۔ بدنصیب زبانوں اور اداروں اور مریضوں کی طرح کیوں سسکتی رہتی ہیں۔

دروازوں کی جگہ اینٹوں کے ڈھیر کی چھوٹی سی پہاڑی جو پردے کی دیوار کی "بیگار" بھگت رہی تھی اس کا چکّر کاٹ کر اکھڑے ہوئے کھرنجے کے نیچے نیچے فرش پر جوتے بجاتا ہوا چبوترے کی سیڑھیوں پر کھڑا ہوا، جوتے اتارے اور دالان کی طرف کھسکنے لگا۔

"جے ہو سرکار کی ..... راج پاٹ بنا رہے۔"

جمعدار کے منہ سے یہ جملہ اس طرح نکلا جیسے میونسپلٹی کے نل سے پانی نکلتا ہے۔ میکانکی، مردار الفاظ، کھوٹے سکے، میلی آواز کی کبڑی پرچھائیاں "کیا ہے منگو" مدتوں دیواروں میں جڑے ہوئے برد ص کواڑوں سے آواز آئی۔ ایسی آواز کانوں کے ساتھ وہی سلوک کرتی ہے جو آنکھوں کے ساتھ عریاں بدن کرتا ہے۔

"درجن پور والے آئے ہیں۔ سرکار سے ملنے۔"

شیطان کی آنت کی طرح لمبے کمرے کے جہازی پلنگ پر پڑے ہوئے آدمی نے سنا کر سر اٹھایا۔ اپنے ڈھلے گوشت سے بھرے بدن پر جھولتی بنیان، اور چارخانے کے تہبند کو دیکھا اور آواز دی۔

" بیگم ۔ مجھے کپڑے پہنادو . . . . . اندر دھ سنگھ آئے ہیں ۔"

بیگم نے تخت پر چڑھ کر کھونٹی سے تنزیب کا کرتا اور کلفت کیا پائجامہ اتار لیا " کیوں آئے ہیں ؟"

اور ادھیڑ عورت کے سفید چہرے پر دھوئیں کا سایہ لرز گیا اور ازاربند کے نیفے میں اٹک گئی ۔ میاں نے صرف شانے ہلا دئیے کہ ایک زمانے سے پیسوں کی طرح آواز بھی کفایت سے خرچ کرنے لگے تھے ۔ گلے میں کرتا ڈال کر پرانے دھندلے آئینے کے سامنے کھڑے ہو گئے ۔ سفید مونچھوں کی نوکیں مروڑ مروڑ کر سیدھی کیں ۔ ایک پرانی بوتل سے بہوے کی شراب کے چند قطرے ہتھیلی پر لے کر مونچھیں سینچ لیں ۔ بیگم نے دالان کی چوکی پر ایرانی جانماز بچھا کر تکیہ لگا دیا تھا اور پاس ہی آبنوس کی ٹوٹی ہوئی اکلوتی کرسی رکھ دی تھی ۔ ٹھاکر اندر دھ سنگھ کے دالان میں قدم رکھتے ہی وہ برآمد ہوئے ۔ بغلگیر ہو کر ان کے منہ سے گانجے کی خوشبو سونگھی اور ان کی ناک پر اپنی مونچھوں سے پھریری کی اور کرسی پر بیٹھا دیا ۔

دونوں ایک دوسرے کے چہرے پڑھتے رہے ۔ ایک دوسرے کی تباہی کی حد کا اندازہ لگاتے رہے اور دونوں کی نگاہوں کے نیچے سے بیس بائیس سال پرانی عیاشیوں اور بدمعاشیوں، ناکامیوں اور کامیابیوں کے رو پہلے سنہرے قافلے گذرتے رہے ۔

" یار شیخ تم بھی اپنی طرح بالکل بوڑھے ہو گئے ۔"

" بوڑھے ؟ بادشاہ اور بندر کبھی بوڑھے نہیں ہوتے ۔"

اور دونوں دیر تک ہنسنے کی کوشش کرتے رہے ۔

" اچھا جلدی سے یہ بتاؤ کہ سب خیریت ہے ۔"

" خیریت تو ۱۹۵۲ء تک ہوا کرتی تھی اور اب تو مدتوں سے ۔ پھر بھی تم اچانک بغیر اطلاع کے کیسے سوار ہو گئے ۔"

" کوئی کسی کے پاس کیوں آتا ہے کچھ دیکھنے اور دکھانے یا کچھ سننے اور سنانے کو آتا ہے اور ہمارے تمہارے پاس اب دیکھنے دکھانے اور سننے سنانے کو بچا ہی کیا ہے ۔"

" سچ کہتے ہو . . . . . سچ کہتے ہو "

" تمہارا بھتیجہ ہے نا . . . . . بابو سنگھ ۔"

" ہاں، ہاں، اس کے ۔"

"اِس کے لڑکے کا گونا ہے۔"

"اتنا بڑا ہو گیا ..... بابو نگھ۔"

"نہیں اِس کا لڑکا اتنا بڑا ہو گیا ہے۔"

"مبارک ہو ..... مبارک ..... نیوتہ آیا تھا۔"

"نیوتہ تو غیروں کے پاس آتا ہے۔ تمہارے پاس "ڈالی" آئی ہوگی۔"

"ہاں، ہاں۔ ڈالی ہی آئی تھی۔"

"تو خواہش ہوئی کہ مرنے سے پہلے ہم تم آخری بار ایک اچھا سا گانا سن لیں ایک اچھا ناچ دیکھ لیں۔"

"بائیس سال ہو گئے۔ کان صرف گالیاں سنتے ہیں آنکھیں صرف دیکھتی ہیں۔ بقول تمہارے اب دیکھنے سننے کو رہا ہی کیا۔"

"سو تو ہے ..... لیکن میں بھی بائیس سال میں پہلی بار آیا ہوں تمہارے پاس۔ بلکہ شاید آخری بار۔"

"کیا بات کرتے ہو یار۔ اگر تم نے سپاہی بھیج کر سر منگوایا ہوتا تو کاٹ کر بھجوا دیتا۔"

پھر دیر تک دونوں ایک دوسرے سے آنکھیں چھپاتے بیٹھے رہے۔

"بیگم ..... اگر کچھ بھی نہیں ہے تو پانی ہی بھجوا دو۔"

"کیا بکس بکتے ہو یار ..... ہاں تم فکر مندمت ہونا۔ میں سواری بھیج دوں گا۔ تمہارے لئے۔"

"چلنے سے پہلے تم نے بھنگ کھائی تھی۔"

"کیا مطلب۔"

"تم بھول گئے کہ ہم عمر بھر ریل پر اِس لئے نہیں بیٹھے کہ وہ سواری ہماری نہیں تھی۔"

"ہاں ..... سچ مچ بھول ہی گیا تھا ..... اچھا یہ تو ہو سکتا ہے کہ تم رات بھر کے لئے میری سواری خرید لو۔"

"رات بھر کے لئے سواریاں نہیں عورتیں خریدی جاتی ہیں۔ جب سے وقت خراب ہوا ہے ہم نے اپنی اصلاح کر لی۔ شکار اِس طرح چھوڑ دیا کہ چڑیوں کے نام بھول گئے۔ دستر خوان اٹھا دیا کہ اکیلے بیٹھ کر دال

روٹی کھانے کے لئے اس تکلف کی کیا ضرورت ہے۔ انتہا ہے کہ کچوان کا حقہ ختم ہو چکا ہے۔ سواری کے نام پر صرف اپنی ٹانگیں رہ گئی ہیں لیکن تم فکر مت کرو۔ رام باغ کون سا بارہ کوس پر ہے۔ ..... میں اپنی سواری پر آجاؤں گا۔"

"تم معلوم نہیں کیا سوچ رہے ہوگے ..... یہ سب کچھ باؤ سنگھ کر رہا ہے اور اس کی آرزو ہے کہ حضرت پور والے باباضرور بدحال رہیں۔ نہیں تو اپنا حال بھی۔

"چلو خوش نصیب ہو کہ ایک باؤ سنگھ تو ہے، یہاں تو کوئی کنک سنگھ اور پیر خان بھی نہیں۔"

"کچھ نہیں کہا جا سکتا، کون خوش نصیب ہے تم یا ہم۔"

جب سورج چڑھنے لگا، اور ان کا حساب معدوم ہندسوں کی بھول بھلیوں سے باہر نہ نکل سکا اور بیگم کھانا لئے بیٹھے بیٹھے اوب گئیں تو چپٹیاں گھستی ہوئی دالان میں آئیں دیکھا کہ میاں گاؤ سے لگے دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھے ہیں۔ تھوڑی دیر کھڑی رہیں۔ پھر ان کے پاس ہی چوکی کے کونے پر ٹک گئیں۔

"کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"

"کھانا کہاں بیگم ..... روٹی کہا کرو روٹی ..... کھانا کھائے تو مدتیں ہوگئیں ..... زبان ذائقہ بھول گئی۔"

"جو بھی ہے اس کا شکر ہے۔"

"ایک بات کہوں۔"

"فرمائیے۔"

"تمہارے پاس کچھ ہے؟"

"ہوں۔ نکاح کی نتھ اور انگوٹھی بچ رہی ہے۔"

"لے آؤ۔"

"لے تو آؤں گی لیکن ....."

"مجھے امر سنگھ کے یہاں جانا ہے اور جس طرح جایا کرتا تھا، اسی طرح جانا ہے۔"

"ہوں۔"

"ذرا یہ الیکشن وغیرہ کا چکر ختم ہو لے تو زمین کی قیمت چڑھے گی اور مجھے اس کی ضرورت نہیں۔"

"لیکن ایک بات آج میں بھی کہوں گی۔"

"کہو۔"

"میں مالکھن سنار کے ہاتھ نہیں بیچوں گی۔ . . . . بیچوں گی تو دین دیال کے ہاتھ۔"

"دین دیال گپتا۔"

"ہاں..... اور اپنے ہاتھ سے بیچوں گی۔"

"وہی گپتا جو ہمارے نکاح میں آنے سے پہلے کوٹھے کے چکر لگایا کرتا تھا۔"

"میرے کوٹھے کے تو ایک دنیا چکر لگایا کرتی تھی لیکن اب اس کا ذکر کیا۔ وہ کھیت اجڑ گیا۔ وہ چڑیاں اڑ گئیں۔"

"لیکن ایک شرط۔"

"اسے علم نہ ہو کہ سودا کا حال مجھے معلوم ہے۔"

"اتنی سی عقل تو خدا نے مجھے بھی دی ہے۔"

"درمیان میں صرف آج کی رات ہے۔"

"ابھی جمعدارن کو بھیجتی ہوں۔"

جاننے والے جانتے ہیں کہ دیہات کی بڑی بڑی کہانیوں میں نائنوں اور میراثیوں کا وہی رول ہوا کرتا تھا جو آج سینما اور فون کا ہوتا ہے۔"

دروازے کے پاس بچھی ہوئی سیاہ لمبی کرسی پر دین دیال گپتا بیٹھے ہی تھے کہ کواڑوں کے درمیان سیاہ چوڑیوں سے بھری ہوئی ایک کلائی جگمگانے لگی۔

"ذرا انہیں آنکئے سیٹھ جی۔"

"آنکھوں کی طرح ان کے کان بھی چوندھیا گئے..... ڈرتے سورج کی گلابی روشنی میں نگینوں کو غور سے دیکھنے لگے۔

"میرے نکاح کے زیور ہیں۔"

"انمول ہیں۔"

"انہیں نکالنا چاہتی ہوں۔ آپ کو اس لئے تکلیف دی گئی کہ آپ ہی سے کہہ سکتی ہوں کہ سرکار

کو اس راز کا علم نہ ہونے پائے۔"

اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔

"میری پہونچ سے باہر ہے۔"

"نہیں چاہتی کہ جن زیوروں پر میرا نکاح پڑھا گیا ان پر آپ کے علاوہ کسی دوسرے کی پرچھائیں بھی پڑے۔"

دیر تک وہ اپنے اعصاب کو سمیٹتا رہا۔ اپنے حواس سنبھالتا رہا تب کہیں بولنے کے قابل ہو سکا۔

"کہاں تشریف لے گئے ہیں؟"

"قبرستان تک گئے ہیں...... فاتحہ پڑھنے۔"

"آپ کی بات سن کر ہمت پڑی کہ آج میں بھی اپنے جی کی بات کہہ دوں اگر آپ حکم دیں۔"

"کہہ ڈالو۔"

"اس انگوٹھی کا اگر کوئی مول ہو سکتا تو اتنا کہ آپ ہاتھ نکالیں اور میں پہنا دوں۔"

اور وہ دیر تک انگوٹھی پکڑے دروازے کے پاس کھڑا کانپتا رہا اور دبی دبی سسکیوں کی گھٹی گھٹی آوازیں سنتا رہا..... آخر کار دروازے کی طرف گردن بڑھائی۔

"میرے لئے کیا حکم؟"

"میں کبھی تھی..... تم بھول چکے ہو۔ چلے جاؤ یہاں سے۔"

الفاظ اس طرح نکلے جس طرح زنبور جبڑے سے کچی داڑھیں نکالتا ہے۔

"بھولنے بسرنے کی جو چیز ہے وہ بھلا چکا..... صرف آپ کے حکم کا پالن باقی ہے جو چوتھائی صدی سے نبھا رہا ہوں۔ جب تک جیتا ہوں نبھاتا رہوں گا۔"

کرتے کی اندرونی جیب سے سبز نوٹوں کی ایک گڈی نکالی اور پر رکھی اور اس کے بیچ انگوٹھی سجائی۔ اچانک محسوس ہوا کہ اس کے ہاتھ کی پشت پر آنکھیں جڑی ہوئی ہیں۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟"

"دکھشنا رکھ رہا ہوں..... تمہاری انگوٹھی چھونے کی دکھشنا!"

اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا اینٹوں کی پہاڑی کے پیچھے کھو گیا۔

مدتوں کے بعد لکھنؤ کے اجلی ممزی کا سلا ہوا چوڑی دار پائجامہ پہنا تو پنڈلیوں پر جھول گیا۔ بیگم نے بھیگے ہوئے بہی دانے کی پیالی بڑھائی جس میں انگلیاں ڈبو ڈبو دیر تک آئینے کے سامنے مونچھوں کے ڈنک بناتے رہے۔ عطر مجموعہ میں بسا ہوا جامدانی کا انگرکھا پہنا تو بند لٹک گئے۔ مد لینت کے جوتے میں پاؤں ڈالا تو محسوس ہوا کہ جوتا چھوٹا ہو گیا ہے۔ آنکھ اٹھا کر بیگم کو دیکھا تو دیکھتے رہے۔ سنبھال کر رکھا ہوا سنوارا سجایا جسم دمک رہا تھا جیسے پرانی اصیل تلوار کا مورچہ کھرچ کر چمکا دیا گیا ہو۔ اور مدتوں بعد ان کی دراز باہوں کے گھٹیلے حصار میں کسمسانے لگیں۔

"اتنے دنوں تک کہاں چھپی رہیں بیگم تم تو پہچانی نہیں جا رہی ہو۔"

"اللہ بخشے، امی جان کہا کرتی تھیں کہ جوانی میں تو کتیاں بھی حسین ہوتی ہیں۔ جو بڑھاپے میں بھی حسین رہے وہ حسین۔"

"جیسے تم؟"

"نہیں جیسے آپ۔"

کھلائے ہوئے سرخ و سفید پھولوں کے قد آدم گلدستے سے باہیں نکال کر اپنے سفید پٹے برابر کئے پلنگ کو ترچھا کیا۔ بیگم کے ہاتھ کی گلوری منہ میں رکھی اور باہر نکل آئے۔ نکلتے ہی کہاروں کے ہجوم نے گھیر لیا۔

"کیا بات ہے..... تم لوگ کیسے آئے؟"

کہاروں کے مہتا نے پاؤں چھو کر ہاتھ جوڑ لئے۔

"سرکار رام باغ جا رہے ہیں اور ہم کو حکم نہیں ملا۔"

"تم..... تم لوگ..... تمہارا حساب کئے بیس سال ہو گئے۔"

"لیکن ہمارا حساب تو ابھی باقی ہے سرکار۔"

"کیا مطلب؟"

"ہمارے ہوتے ــــ آپ رام باغ پیدل نہیں جا سکتے۔"

"تمہیں دینے کو اب میرے پاس کچھ نہیں رہا۔ کچھ نہیں بچا۔"

"ہمارے پاس آپ کا دیا بہت کچھ ہے.. اب آپ اجازت دیا کیجئے۔"

"مہتا نے حق خدمت میں ملی ہوئی پالکی لگا اور سولہ کہاروں کا ہجوم اپنا دم کھینچ کر گاتا ہوا چلا جو

صدیوں سے ان کی برادری میں رائج ہے۔

گاؤں سے پشت لگاتے ہی محسوس ہوا جیسے وہ جوان ہو گئے ہوں۔ ان کی ریاست ان کو واپس مل گئی ہو اور انہوں نے دونوں ہتھیلیوں سے اپنی آنکھ پونچھ لیں۔ اور جیسے آنکھ جھپکتے ہی رام باغ آگیا۔ خوبصورت وقت کتنی تیزی سے گذرتا ہے۔ باؤ سنگھ پاؤں چھو کر ان کے جوتے سیدھے کرنے لگا تو انہوں نے اسے کلیجے سے لگا لیا۔ انرودھ سنگھ کے ساتھ ان گنت سلام لیتے۔ وہ کوٹھی کے ہال میں پہونچے تو جیسے دیواریں تک کھڑی ہو گئیں۔

مسند سے پشت لگاتے ہی ٹھاکر نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ اور سازندوں کی انگلیاں سازوں پر تڑپنے لگیں۔ ابھی ان کی رچی ہوئی کراھتی ہوئی سماعت انگڑائیاں لے رہی تھی۔ اور آنکھیں مل رہی تھی کہ ایک طرف سے ایک عورت پشواز پہنے طلوع ہوئی اور ان کے قدموں میں کھڑی ہو کر مجرئی کرنے لگی۔ زانو کے نیچے سے سرخ بٹوہ نکالا اور ایک سبز نوٹ ان کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ اب ان کی نگاہ جسم کی بارکھ نگاہ نے اس کے بدن کا طواف کیا تو وہ سر سے پاؤں تک آشنا معلوم ہوئی۔ وہ ایک ایسا مرصع طغریٰ نظر آئی جس کے ایک ایک دائرے ایک ایک زاویئے، ایک ایک کشش اور ایک ایک نقطے سے ان کے حواس سیراب رہ چکے ہوں۔ سازندوں کی چوکی پر نگاہ پڑی تو ایک بھاری بھرکم شاندار عورت نے کھڑی ہو کر اور بڑی قدر تک سر جھکا کر آداب پیش کیا اور کسی نے ان کے کان میں کہا۔

"مشتری"

کیسی کیسی قاتل راتوں اور جان لیوا محفلوں کا جلوس ان کے سامنے سے گذرنے لگا۔ پھر انہوں نے محفل کا جائزہ لیا جس میں عجیب عجیب قسم کی پتلونیں اور انہوں نے قمیصیں پہنے کچھ نوجوان اس طرح بیٹھے تھے کہ ان کی کوئی کل سیدھی نہ تھی ان کی ایک آستین سے جوانی اور دوسری سے شراب کا نشہ ٹپک رہا تھا بلکہ ٹپکایا جارہا تھا۔ شراب کی ایسی اور اتنی بے حرمتی پہلی بار دیکھی تھی۔ ان کی نگاہیں اور قہقہے اتنے بے ادب تھے اور ہاتھوں اور ہونٹوں اور ابروؤں کے اشارے اتنے گستاخ تھے کہ وہ نظریں نیچی کر کے مسند کی مہنال سے کھیلنے لگے۔ سوچنے لگے کہ ہمارے یار انرودھ سنگھ کے جلال و اقبال کو کیا ہوا کہ اس طرح خاموش ہے۔ پھر اچانک انہوں نے ساری محفل میں دین دیال گپتا کی جستجو کر ڈالی۔ پھر بے قرار ہو کر ٹھاکر سے پوچھ ہی لیا

"تم نے دین دیال گپتا کو نہیں بلایا۔

"بلایا تھا لیکن وہ لکھنؤ گیا ہے کسی مقدمے میں۔"

"مقدمہ کا ہے کا رہن بیع کا کوئی چقدمہ ہوگا۔"

"اور کیا، مقدمے تو ہم تم لڑتے تھے کہ پورے پورے ضلع ہلنے لگے تھے۔ خیر چھوڑو۔ کچھ لوگے۔"

"ان لونڈوں کے سامنے۔"

"اس کا انتظام اندر ہے۔"

لیکن دین دیال کے خیال سے ان کا دل اس طرح دھڑکا کہ بے قرار ہو گئے۔ ایک ہی دو ہاتھ میں بٹوہ خالی کیا اور کھڑے ہو گئے۔ ٹھاکر لپک کر سامنے آئے۔

"تمہاری بھاوج کی طبیعت اچھی نہیں ہے ..... میں ذرا دیکھ آؤں۔"

"وعدہ۔"

"وعدہ۔"

پالکی سڑک پر چھوڑ دی گئی۔

ٹوٹی ہوئی دیواروں کے بیچوں سے اندر پہنچے۔ پیش دالان میں لالٹین کے بجائے لیمپ جل رہا تھا۔ کرسی پر دین دیال گیتا میٹھا تھا۔ سامنے چوکی کے کونے پر چھوٹا سا بکس کھلا رکھا تھا۔ پھر کواڑوں کی درز سے بیگم کا ہاتھ ایک بڑی سی تھیلی سنبھالے برآمد ہوا۔

"ہاں..... یہ زیورات میرے ہیں..... لیکن تم کو کیسے ملے۔"

"آپ کے زیور بارہ برس سے بک رہے ہیں اور میں خرید رہا ہوں۔"

"تم۔"

"ہاں میں۔"

"کیسے۔"

"چودہ برس ہوئے میں نے ماکھن سنار سے سودا کیا تھا کہ بیگم کا جو زیور وہ خریدے سو فیصد منافع پر میرے ہاتھ بیچ دے۔ اس طرح آپ کا تار تار امانت ہو گیا۔"

"لیکن کیوں۔"

"تمہارے نکاح کے زیوروں پر میرے علاوہ کسی کی پرچھائیں بھی تم کو پسند نہیں۔ میں جانتا تھا کہ تم ایک

دن یہی مجھ سے کہو گی، سو بھاگیہ سے آج وہ دن آگیا۔ جینے میں مزہ تو مدت سے نہیں تھا، لیکن .... تھوڑے دنوں سے بیمار بھی رہنے لگا ہوں۔ معلوم نہیں میرے بعد کس لڑکے کے ہاتھ لگ جاؤ اور وہ کیا سلوک کرے........ اس لئے اب تمہیں انہیں سونپ کر لو......... قبول کرلو۔

اور وہ چپ چاپ سر جھکاتے ہوئے باہر چلا گیا اور رمیا نے سندرہ کو اپنی باہوں میں کھینچ لیا۔ گویا وہ ستون نہیں دین دیال گپتا ہے۔

(بقیہ ایمان صفحہ ۱۹۲ سے) سے ہچکچانے والا شیر دھاڑتا ہے۔ پھر کوڑوں کی آوازیں آئیں۔ دو چار سات اور آخر کار گونگا اردو چیختا چلاتا ہوا سٹیج پر کھڑا ہوا۔ اس کے آبنوسی جسم پر کوڑوں کی سنگرفی دھاریاں پڑی ہوتی تھیں جن سے خون رس رہا تھا۔ اس نے رت کی طرف دیکھا اور جھجھک کر پیچھے ہٹ گیا۔

تڑاخ سٹیج کے اندر سے ایک کوڑا لہرایا، اچھل اچھل ایک زیر لبی آواز گونجی اردو درد سے بلبلا اٹھا اس نے ایک جست بھری لیکن اس میں اچھل پیدا نہ ہو سکی اور وہ منہ کے بل سٹیج پر گر گیا۔

تماشائیوں کے منہ سے غیض و غضب بھری آوازیں نکلیں اور وہ اٹھ بیٹھے۔

رنگ ماسٹر رنگ اسٹریٹیجی کا نائب منیجر کی طرف بھاگا۔ سر آج پھر اردو میں اچھل پیدا نہیں ہو سکی وہ سٹیج پر منہ کے بل گر پڑا ہے۔ شو رک گیا ہے، تماشائی توڑ پھوڑ پر آمادہ ہیں، منیجر اٹھ بیٹھا چلا کر بولا، پردہ گرا دو۔ انتظار فرمائیے (Caption precaution) کا کیپشن لگا دو۔ تم نے شو سے پہلے پریکاشن لئے تھے کیا اس نے نائب سے پوچھا

سر ہم نے کوڑے لگائے تھے، بجلی کے کوڑے

او نہوں منیجر غرایا اب کوڑے ہی کام نہیں دیتے، ڈاکٹر کہاں ہے۔ اسے کہو فوراً انجکشن لے کر آجائے۔ ڈبل انجکشن

سٹیج پر پہنچکر منیجر نے زخمی اردو کو جھنجھوڑا، آپ میں آپ وہ بولا دی شو مسٹ گو آن۔

انور عظیم

گورستان سے پرے

ابھی قبر کا منہ کھلا ہوا تھا۔

مٹی کے ساتھ شام کا سُرمئی رنگ بھی قبر کے کھلے منہ میں اتر رہا تھا۔

سرد ہوا سرسرا رہی تھی اور بھیگی مٹی بھی۔

جھکے ہوئے لوگوں کے ہاتھ۔ دیو قامت سیاہ کیکڑوں کے پیروں کی طرح، مٹی کو قبر میں دھکیل رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں مٹی گولاں کی طرح اوپر اٹھنے لگیں۔ گورکنوں نے کدالیں پھینک دیں۔ اور پانی کا چھڑکا کیا۔ مٹی کی خوشبو ہوا میں بکھر گئی۔ ہزار پایہ سائے پیچھے ہٹنے لگے۔ درختوں کے جھنڈوں میں تاریکی روشنی کے جال لرز کر بجھ گئے۔ اور گورستان کی فصیل کے باہر قدموں کی آہٹ ہوا کو شہر کی طرف لے چلی۔ ہوا کے ساتھ کافور اور لوبان کی خوشبو سفر کر رہی تھی اور کفن کی سفیدی بھی۔

شہر میں روشنیاں جھلملانے لگیں۔

ہوا دُور تھی

روشنیاں دُور تھیں۔

آہٹیں دُور تھیں۔

اب سب کچھ دُور تھا۔

وہ فصیل کے پاس بڑے سے کائی زدہ پتھر پر بیٹھ گیا۔ اُس نے جوتے ہوا میں اُچھال دیئے۔ اس کی کالی جرسی، کالی کھانسی کی طرح، بدن سے چپکی ہوئی تھی۔ جیکٹ وہ پہلے ہی کہیں اتار کر پھینک چکا تھا۔ اس نے جیب سے سگریٹ نکالی جو ماں کے پرس سے چرائی گئی تھی۔ پہلے کش کے بعد وہ رُکا ہی نہیں۔ دھواں پیتا چلا گیا۔ جب، جلد ہی، سگریٹ جل گئی اور اس کی انگلیوں میں ایک چھوٹی سی چنگاری دم توڑنے

لگی تو اس نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر سگریٹ کی چنگاری کو بھی ہوا میں اچھال دیا۔ شیشے کی طرح شفاف سیاہی کی وسعتوں میں چنگاری تیرتی چلی گئی۔

تاریکی کا پگھلا پگھلا شیشہ ہوا کے ساتھ بہہ رہا تھا۔

ہوا کے سیاہ ہاتھ اس کے چہرے کو چھو رہے تھے۔

اسے ابکائی آ رہی تھی۔

اس کا سر جھک گیا۔

جُھکا رہا۔

وہ صدیوں بعد آہستہ آہستہ اُٹھا اور پتھر پر کھڑا ہو گیا۔ اس نے مڑ کر فصیل کے اس پار دیکھا۔ قبریں اُبھر اُبھر کر درخت بن گئی تھیں جن میں ہوا پھڑپھڑا رہی تھی۔ سیاہ درخت آسمان کی طرف اُڑ رہے تھے اور ان کے پتوں اور شاخوں کے اس پار ستارے جھلملا رہے تھے۔

سب کچھ دُور تھا۔

آدھا چاند بھی، تارے بھی۔

صرف قدموں کے نشان چمک رہے تھے۔ یہ جنازہ لانے والوں کے قدموں کے نشان تھے۔ جب وہ آئے تھے تو ان کے کندھوں پر بوجھ تھا۔ جب واپس گئے تو ان کے ہاتھ خالی تھے۔ کندھوں پر ہوا کے سوا اور کسی چیز کا بوجھ نہیں تھا۔

دھوپ تیز ہو گئی تو موسم ہی بدل گیا۔

اس کے قدم تیز ہو گئے۔

شہر اب بھی دُور تھا۔

البتہ گھر نظر آ رہا تھا۔

بڑا سا پھاٹک کھلا ہوا تھا اور سوگ منانے والے، جو دوسرے شہروں سے آئے تھے، رخصت ہو رہے تھے۔ وہ ان کے پاس سے گزر گیا۔ اس نے کسی کو نہیں پہچانا۔ کسی نے اس کو نہیں دیکھا۔

خدا حافظ!

خدا حافظ!

صدائیں کہیں کھو گئیں۔

وہ باہر والے برآمدے میں کھڑا تھا۔ وہ جلتی آنکھوں سے ڈرائنگ روم کے آدھے کھلے ہوئے دروازے کے اندر دھوپ چھاؤں میں لحافوں کی دھند کو پھیلتے اور مٹتے دیکھ رہا تھا۔

یکایک دروازہ پورا کھل گیا۔ دروازے میں ماں کھڑی تھی۔ اس کے خضاب سے رنگے ہوئے سیاہ چمکتے بال سڈول شانوں پر جھول رہے تھے۔ وہ مسکرائی اور اس کی آنکھوں سے روشنی چھلک پڑی۔

"اچھا تو تم جاگ گئے! اتنا سویرے؟"

ماں کتنی خوبصورت ہے!

اس کی آنکھوں میں چنگاریاں تڑپیں۔ ہونٹ آہستہ آہستہ پھیلے۔ پپڑیاں پھٹ گئیں۔ اور زبان پر نمک کا مزا مری ہوئی چیونٹیوں کی طرح چپک کر رہ گیا۔

کسی ماتم گسار نے پاس سے گزرتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور کچھ پھنکارنے کے انداز میں کہا

"باپ مر جاتا ہے۔ بیٹا زندہ رہتا ہے۔ یہی ہوتا آیا ہے۔"

ماں نے جانے والے کو بڑی شکرگزار نظر سے دیکھا اور مسکرائی۔ اس کی آنکھیں اب بھی روشن تھیں۔ "کبھی کبھی لگتا ہے کہ زندگی یہاں ختم ہو گئی۔ لیکن زندگی جہاں ختم ہوتی ہے وہاں ختم نہیں ہوتی۔ اس سے آگے جاتی ہے۔"

ماں نے اس کے گال پر ہاتھ پھیرا اور کہا "اوپر جاؤ۔ جا کر شیو کر لو۔"

وہ اوپر گیا اور اپنے باپ کے سیفٹی ریزر سے، جو ہفتوں سے استعمال نہیں ہوا تھا۔ اور جس پر پرانا بلیڈ چڑھا ہوا تھا۔ ہفتوں کی داڑھی کو کھرچنا شروع کر دیا۔

"میرا باپ خدا کا بیٹا تھا۔ میں خدا کا پوتا ہوں۔"

اس کے ہونٹ پھیل گئے۔ پپڑیوں سے رستا ہوا خون شیونگ کریم کے خوشبودار جھاگ میں گھلنے لگا۔

ماں نہا کر باتھ روم سے نکلی تو نیلا ٹرکش باتھ تولیہ اس کے بھیگے ہوئے جسم سے چپکا ہوا تھا۔ وہ پنجوں کے بل چلتی ہوئی کمرے کے دروازے تک گئی۔ دروازہ بند کرنے سے پہلے چند لمحے کو رکی۔ دور کے کمرے سے گٹار کی گونج اور پھنسا پھنسا مدہوش لحن سنائی دے رہا تھا۔ اس نے ہونٹ بھینچ لئے۔ اور دروازہ بند کر دیا۔ سنگار میز

کے سامنے تولیہ اس کے شانوں سے سرک گیا۔ وہ تھوڑی دیر آئینے کے سامنے ششدر کھڑی رہی۔ وہ بار بار نظر کو چہرے پر جمانا چاہتی تھی۔ اور بار بار اس کی نظر پھسل کر اپنی ناف کے نیچے جھریوں سے منڈھے ہوئے ڈھیلے ابھار پر جم جاتی تھی۔ کبھی یہ لڑکا اسی چھوٹے سے جال میں بند تھا۔ مگر اب دیکھو! اس نے جھک کر ولایتی برش اٹھایا۔ اور بھیگے ہوئے لمبے بالوں کو سر کیا۔ ولائتی خوشبو کے چھڑکاؤ سے جسم کے نازک گوشوں کو مہکایا۔ جب اس نے کپڑے پہنے تو گدے دار نکیلے بریسیرز کا گہرا گلابی رنگ ہلکے گلابی بلاؤز سے چھن رہا تھا۔ چہرے پر ولائتی پاؤڈر کی تہیں جب گہری ہو گئیں تو آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے بھی غائب ہو گئے اور بے نیند آنکھوں کی تھکن بھی۔ ہونٹوں پر سرخی پھیر کر اس نے کئی بار ہونٹ چپکائے اور کھولے۔ اور ایڑیوں سے ساری کے کنارے کو دبا کر کئی بار آئینے میں دیکھا۔ مسکرائی۔ چہرہ دمک اٹھا۔ نچلا ہونٹ دانتوں میں دبانے ہی اس کی عمر کوئی پندرہ سال کم ہو گئی۔ اور وہ یہ جانتی تھی۔ جلدی جلدی عینک اٹھائی۔ وہ تین کاپیاں سمیٹیں اور زینے سے ہوا کی طرح اتری۔ کار میں بیٹھتے ہوئے ایک بار دور کے کمرے کی طرف دیکھا جہاں سے گٹار کی دھن سنائی دے رہی تھی۔

"جانے یہ بدکا ہوا گھوڑا کب قابو میں آئے گا۔"

کار کی دور جاتی ہوئی غراہٹ کے ساتھ ساتھ ٹیپو کی نسوں کا تناؤ کم ہونے لگا۔ اس نے اپنے آپ سے کہا "چلو چھٹی!" اور گٹار ایک طرف رکھ دیا۔ اس کے ننگے جسم پر پسینہ چیونٹیوں کی طرح دوڑ رہا تھا۔ میلے لمبے ناخنوں سے اس نے میلی ناک کو کریدا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ لمبے لمبے قدم سے کھڑکی کے پاس پہنچا۔ آہستہ سے کھڑکی کا پٹ کھولا۔ نیم وا آنکھوں کو چھوتی ہوئی دھوپ کی لہر کھڑکی سے باہر چھننے لگی۔ دھندلکے میں دیوار پر اس کے ہاتھ کے ابھارے ہوئے نقوش کچھ گڈمڈ سے ہونے لگے۔ اس کے جسم کا پسینہ فرش پر اس کے قدموں کے نشان چھوڑتا ہوا پھیل رہا تھا۔

دیواریں طرح طرح کے نقوش اور خاکوں سے چنی ہوئی تھیں۔ جیسے جیسے کمرے میں دن کی روشنی رسنے لگی، ویسے ویسے ان میں جان پڑنے لگی۔

رنگو۔ تم بھی رنگو۔ دھوپ بھی رنگتی ہے۔ بوکھی۔

مونالیزا کی بچی۔

وہ آہستہ آہستہ انگلیوں کو مسلتا ہے۔ رانوں کو سہلاتا ہے۔ اور ناچتا ہے۔ جیسے اس کے پاؤں زمین

پہ رہی ہوں۔ خود اس کے ہاتھوں کے کھینچے ہوئے نقوش بھی ناچتے ہیں۔ چہرے، ٹانگیں، پھیلی ہوئی، گتھی ہوئی، اکڑی ہوئی، مڑی ہوئی۔ جیسے جن پریکٹس کے کانٹے آگے ہوئے ہیں۔ پھیلی ہوئی ٹانگوں کے درمیان ایٹم بم طلوع ہو رہا ہے۔ بے تاروں پر چیل جیسے پتنگوں کی طرح اڑ رہے ہیں۔ کتا ایک ٹانگ اٹھائے ہوئے ہے اور زمین پر کیڑوں کے جالے ہوئے پھول جھڑ رہے ہیں۔

مونالیزا کی بچی!

اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا ہے۔ وہ رانوں کو سہلاتا ہے اور آہستہ آہستہ جھکتا ہے، جھکتا ہے، بھیگے ہوئے درخت کی شاخ کی طرح۔ ہتھیلیوں پر تھوکتا ہے اور ناف کے نیچے گدگداتا ہے۔ اس کا جسم جلنے لگتا ہے۔ وہ ماں کے چھوٹے سے کیبنٹ میں ایک کیسیٹ ڈالتا ہے اور بٹن دباتا ہے۔ ٹھنڈی سانسوں کی آہنگ میں پاگل بنا دینے والا اضطراب ہے۔ وہ ناچ رہا ہے اور اس کی بانہوں میں کوئی لچک رہا ہے۔

آجا

آ

لے دے۔

دے لے۔

ہائے

بس

بس

بس

وہ افریقہ کی جنگلی دھن پر ناچ رہا ہے۔ اس کا تپا چہرہ مسخ ہو رہا ہے۔ اس کے جسم میں بے شرم جارحیت پیدا ہو رہی ہے۔ تناؤ۔ لعاب سے بھیگی ہوئی مٹھی اس دھن پر گدگدی کا میٹھا زہر نچوڑ رہی ہے۔ ایک ایک روئیں سے۔ آنکھیں بند ہوئی جا رہی ہیں۔ جسم کی حرکتوں کا آہنگ سورج کی طرح اتر رہا ہے۔ اپنے جلتے پروں سے۔ اور سورج مٹھی میں بند ہے۔ وجود کی ساری آگ نکلنے کو بے قرار۔ کوئی اس کے جسم سے چپک رہا ہے۔ اس کا دوسرا ہاتھ ہونٹ کھولتا ہے اور آگ کے پیکر کو چومتا ہے۔ یہاں۔ یہاں۔ یہاں، یہاں۔ مونالیزا کی بچی۔! وہ آگ کی لپٹوں کی باہوں میں بھیگے ہوئے فرش پر گر جاتا ہے۔ نڈھال۔ خاموش۔ وہ اب بھی ایک جسم کو سہلا رہا ہے جو فرش کی طرح ٹھنڈا ہے۔

اس کی ہتھیلیاں بھی ٹھنڈی ہیں جو ایک ٹھنڈی کمر کو سہلا رہی ہیں۔ بازو بھی ٹھنڈے ہیں جو ٹھنڈی ہڈیوں کو توڑ رہے ہیں۔ رفتہ رفتہ ہر چیز ٹھنڈک میں لپٹ کر سو جاتی ہے۔

جانے کب سے میں اسی طرح سو رہا ہوں۔ آنکھیں کھلی ہوئی ہیں اور میں سو رہا ہوں۔ دیواریں مجھ پر اپنا ٹھنڈا دباؤ ڈال رہی ہیں۔ دیواریں اور دیواروں پر میرے ہاتھوں کے ابھارے ہوئے پیکر سب مجھے کاٹ رہے ہیں۔ ٹھنڈے ٹھنڈے ڈنک، ٹھنڈی ٹھنڈی سرسراہٹ، ٹھنڈی ٹھنڈی رگیں، ٹھنڈی ٹھنڈی خاموشی، ٹھنڈی ٹھنڈی روشنی، ٹھنڈے ٹھنڈے سائے، ٹھنڈی ٹھنڈی کاٹ، ٹھنڈی ٹھنڈی ٹیس ــــ سب کچھ ٹھنڈا، سب کچھ مرا ہوا۔ میں یہ سب محسوس کر سکتا ہوں۔ اور وہ؟ جس کی ٹھنڈک نے مجھے جینے پر مجبور کیا۔ وہ ہزاروں من مٹی کے نیچے کیا کر رہا ہے؟ وقت کے کیڑوں نے کچھ چھوڑا ہے ــــ بے ہنگم، لحیم شحیم ہڈیوں کے سوا؟ لو یہ ہڈیاں ہیں۔ ٹیڑھی میڑھی۔ لو۔ مٹی کھائی ہوئی۔ ٹوٹی پھوٹی۔ چاہو تو تم ان ہڈیوں کو اپنے سوٹ کیس میں رکھ کر دنیا کے سفر پر نکل سکتے ہو۔ میرے باپ نے یہ سوٹ کیس اپنی ہڈیوں کے لئے نہیں دیا تھا۔ جانتا ہوں۔ میں تو ایک بات کہہ رہا ہوں۔ سوٹ کیس خالی ہے۔ میں بھی۔ اور سوٹ کیس کو یا اپنے آپ کو ہڈیوں سے بھرنے سے فائدہ؟ اٹھنا چاہیئے۔ نکلنا چاہیئے۔ دیکھنا چاہیئے۔ کیا سب کچھ ویسا ہی ہے جیسا تھا، کیا کچھ بدلا بھی ہے۔ کتنی عجیب بات ہے سب کچھ میں، میں بھی شامل ہوں جیسے میں کوئی کمبل ہوں۔ کوئی جوتا، کوئی توتھ پیسٹ، کوئی درخت، کوئی ہوا کا جھونکا۔ یا کوئی فوٹو کا ہوا البم۔ گاڈ! اٹھنا ہے۔ کھڑا ہونا ہے۔ باہر نکلنا ہے۔

اس نے پھر شیو نہیں کیا۔ وہ پھر نہیں نہایا۔ نیکر پہنا اور کندھے پر تولیہ رکھا، لیکن اس سے آگے جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ ماں کے کمرے کے باہر مستطیل برآمدے میں، جس کا رخ کھلی ہوئی چھت کی طرف تھا۔ چھوٹی سی میز پر اس کا ناشتہ روز کی طرح رکھا ہوا تھا۔ دودھ کے ٹھنڈے گلاس کے کنارے پر مکھیاں ٹوٹ رہی تھیں۔ توس پر مکھن پھیل کر گھی کی طرح چکنا ہو گیا تھا۔ ایسی ہی چکناہٹ اسے اپنی ماں کے میک اپ کئے ہوئے چہرے پر نظر آئی تھی۔ توس اور ماں کا چہرہ! وہ دبے پاؤں فریج کے پاس گیا۔ ادھر ادھر دیکھا کوئی اور نہیں تھا گھر میں۔ دور سے جھاڑو کی آوازیں سنائی دے رہی تھی جیسے کوئی سسکیاں بھر رہا ہو۔ اس نے فریج سے پانی کی ٹھنڈی بوتل نکالی اور کھڑا کھڑا پی گیا۔ جیسے جیسے اس کی پیاس بجھ رہی تھی اس کی گردن کی رگیں پھولتی جا رہی تھیں۔ وہ میز کے پاس کرسی پر بیٹھ گیا۔ ٹانگیں اٹھا کر اس نے میز پر رکھ لیں۔ اس کے کالے میلے ناخنوں کی قربت سے مکھیاں اڑ گئیں اس کا لمبا ہاتھ اور لمبا ہو گیا اور وہ بغیر منہ دھوئے دودھ پینے لگا۔ توس کو اس نے چھوا بھی نہیں۔ اسے بالکل اندازہ

نہیں تھا کہ وہ بہت دیر سے تو سوں پر مکھیوں کو اترتے اور پھر لمبے کالے ناخنوں کی جنبش سے اڑتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں جل رہی تھیں اور گلا خشک ہوا جا رہا تھا۔ دُور بڑے بڑے درختوں کو ہوا جھنجھوڑ رہی تھی۔ جھاڑو کی آواز دوپہر کے سناٹے میں کھو چکی تھی۔

کب تک میں پیچھے کے زینے سے آتا جاتا رہوں گا۔ اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔

"ٹیپو آؤ" "میرے پاس آؤ۔ مجھے دیکھو۔ میں کہیں نہیں گیا۔ میں یہیں ہوں۔ بھاری آواز سے دوپہر کا گھر بھر گیا۔ اسے لگا کہ اس کے سینے میں کوئی بڑی سی چٹان چیخ گئی۔ وہ کھڑا ہوا تو ہانپ رہا تھا۔ گلاس لڑکھڑاتا ہوا گلدان سے ٹکرایا۔ مکھیاں بے خبر رہیں۔ اس کا پورا جسم کانپ رہا تھا۔

نہیں یہ سب . . . . . نہیں میں اس آواز کو پہچانتا ہوں۔

اس کا پورا جسم پسینے میں شرابور تھا۔

بھری دوپہر کو اس کا گھر رات کے اندھیرے میں ڈوب گیا۔ سارے سایوں میں ڈوب رہے تھے۔ ہوا اتنی تیز تھی کہ دیواریں دیواروں سے ٹکرا رہی تھیں۔

وہ کھڑا ہو گیا اور راستے ڈھونڈنے لگا۔

کدھر جاؤں۔ کہاں جاؤں

سایوں میں ایک سیاہ ہیولا ذرا خم کھائے ہوئے زینے کے نیچے کھڑا تھا اور اس کو اشارے سے بلا رہا تھا۔ ڈراکولا!

ماں نے کہا تھا ڈراکولا اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ وہ بھاگتی ہے اور یہ سیاہ ہیولا ہاتھ بڑھا کر اسے دبوچ لیتا ہے۔ اور اپنے دانت اس کی گردن میں پیوست کر دیتا ہے۔ ماں اس کے دانت کہاں ہیں۔ یہی تو بات ہے اس کے دانت دکھائی نہیں دیتے۔ لیکن میں جانتی ہوں یہ دانت کتنے لمبے اور کتنے تیز ہیں۔ اور جتنی بار یہ دانت میری گردن میں ڈوبتے ہیں کھولتے ہوئے زہر کی زنابیں خون میں لپکتی ہیں۔ یہ ڈراکولا مجھے کھا گیا ماں۔ ماں مجھے یاد ہے جب میں بہت چھوٹا تھا تو میں نے اس لحیم شحیم ڈراکولا کو تمہارے بستر پر دیکھا تھا۔ وہ سو رہا تھا۔ چھت پر دھوپ چمک رہی تھی اور تم اسے چاٹ رہی تھیں اور وہ سو رہا تھا اور تمہارے دو دانت اس کی گردن میں چبھے ہوئے تھے۔ تم سو رہی تھیں اور وہ مزے میں سو رہا تھا۔ میں بھاگ کھڑا ہوا۔

آواز بہت قریب آ گئی تھی۔ وہ تھرتھراتی ہوئی ٹانگوں سے اترا۔ وہ اتر رہا تھا اور زینہ بڑھتا جا رہا تھا۔

اور جہاں زینہ ختم ہوتا تھا۔ وہیں وہ کھڑا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ زینے کی ریلنگ پر تھا۔ اور دوسرا عینک کی کمانی پر۔

آؤ آؤ۔ بیٹے آؤ۔ مجھے پہچانو۔

میں تیزی سے اترنے لگتا ہوں۔ میں زینے کا فاصلہ کم کرنا چاہتا ہوں۔ مہینوں بعد اس زینے سے اتر رہا ہوں جو گھر کے اندر اترتا ہے اس کمرے کے پاس جو موت کا کمرہ ہے۔ جب بھی کوئی مرنے لگتا ہے اس کمرے میں ڈال دیا جاتا ہے۔ ڈراکولا بھی اسی کمرے میں ڈال دیا گیا تھا۔ لیکن اب مجھے کچھ یاد نہیں۔ وہ پیپر کا سناٹا رینگ رہا ہے! میں سر سرا رہا ہے۔ اور اب میں نیچے آ گیا ہوں۔ میرا مہینوں کا پالا ہوا خوف میرے سینے میں کتے کی طرح بھونک رہا ہے۔ ریلنگ پر سے ہاتھ ہٹا۔ عینک ناک پر سے پھسل اور ہیولا سیدھا پشت کی طرف آن پڑا۔ اور ہوا میں تیرتا ہوا موت کے کمرے میں غائب ہو گیا۔ میں کمرے کے اندر دیکھ رہا ہوں۔ قبر کا منہ کھلا ہوا ہے۔ اور وہ چت لیٹا ہوا ہے۔ کمرے میں روشنی بھی ہے۔ اور اندھیرا بھی۔ دونوں ایک دوسرے کو چاٹ رہے ہیں۔ روزن بند ہے۔ ہوا بند ہے۔ اس کا گنجا سر چمک رہا ہے جس پر پسینے کی بوندیں تیر رہی ہیں۔ اس کا پورا جسم بے حرکت ہے لیکن خون اس کے منہ سے ابل رہا ہے اور اس کی گردن پر پڑی ہوئی چادر کو بھگو دیتا ہے۔ وہ آنکھ کھولے بنا مجھے دیکھتا ہے۔ ہونٹ جمے ہوئے خون سے چپک گئے ہیں۔ مگر وہ ہونٹوں کو کھولے بنا مسکراتا ہے۔ ماں ڈرائنگ روم میں بیٹھی رہی ہے اور کہہ رہی ہے۔ میں ایک ایسے آدمی پر سب کچھ لٹا دوں جو مر رہا ہے؟ اسے تو مرنا ہے مگر ان کا کیا ہوگا جو زندہ ہیں اور جو زندہ رہیں گے۔ I AM NOTA SENTIMENTAL FOOL اور ہیولا جو اب ہڈیوں پر لپٹی ہوئی بے رنگ کھال کے سوا اور کچھ نہیں، آنکھیں کھول رہا ہے۔ وہ مجھے دیکھتا ہے۔ اس کے دیدے گہرائیوں میں غرق ہیں۔ ان میں چنگاریاں جھلملاتی ہیں۔ پھر منہ خون سے بھر جاتا ہے اور ٹپکتے ہوئے چھوٹے چنگاریوں کو بجھا دیتے ہیں۔ گھر میں اطمینان کی لہر سی دوڑ جاتی ہے۔ عذاب کٹا۔

ٹیپو ۔۔۔ تم کہاں ہو؟ ماں پکار رہی ہے۔ بہت دور سے آواز دے رہی ہے۔ شاید کسی جنگل میں کھو گئی ہے اور اب ڈر رہی ہے۔ اسے راستہ نہیں مل رہا ہے۔ بڑی موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ درخت پانی کے بوجھ سے زمین پر گر پڑے ہیں۔

"ٹیپو ۔۔۔ تم کہاں ہو؟"

میں کہیں نہیں ہوں۔ میں جاگتا ہوں اور گھر کے سارے دروازے بند کر دیتا ہوں۔ اور بھاگ کر زینے کے پاس لوٹ آیا ہوں اور موت کے کمرے کی طرف گیا ہوں۔ ڈرائنگ روم سے شراب کی بوتلوں کی گرج کے

ساتھ آرہی ہے۔ زندگی کب کسی کا غم کھاتی ہے۔ کوئی خون تھوکتا ہے۔ کوئی وسکی پیتا ہے۔

"اس کی گردن موٹی ہی نہیں ربڑ کی بنی ہوئی ہے۔ بہت سارے ربڑ کی۔ اور وہ اس پر ٹائی باندھتا ہے۔"

ڈراکولا کا منہ کھلتا ہے مگر دانت دکھائی نہیں دیتے۔ وہ آہستہ آہستہ کالر کو سہلاتا ہے اور ٹائی کی موٹی گرہ کو ٹٹولتا ہے۔

"میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

میں سہم جاتا ہوں۔

"میں مردہ بادشاہ کا بھوت نہیں ہوں اور تم ہیملٹ نہیں ہو۔ پھر بھی مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔"

میرا گلا خشک ہو جاتا ہے اور میں چیخنا چاہتا ہوں۔ بچاؤ! بچاؤ! اس کا ہاتھ بڑھتا ہے اور میرے پاؤں زمین میں گڑ گئے ہیں۔

یہ کس کا ڈراکولا ہے۔ بھاری بھرکم معیار، نرم ہاتھ، بے مزا مسکراہٹ، بڑا سا چہرہ، بڑا سا سر — میں جا رہا ہوں۔ میرا کچھ نہیں ہے۔ نہ وہ عورت، نہ یہ گھر، نہ یہ کار، نہ وہ باغ، جہاں کیاریوں کے پاس جھولتی ہوئی شاخوں پر چڑیاں چہچہا رہی ہیں، نہ وہ گملے جن میں میں پانی ڈالتا رہا ہوں، نہ یہ چقیں جن کو میں گرمیوں میں گرا دیتا تھا اور جاڑوں میں اٹھا لیتا تھا، نہ یہ ڈرائنگ روم جہاں تمہاری ماں کے دوست وہسکی پی رہے ہیں اور اپنے کیریئر کو نکھارنے کے لیے اپنے حریفوں کے خلاف زہر اگل رہے ہیں، مجھ پر جملے چست کر رہے ہیں اور تمہاری ماں کی آنکھوں میں اپنا اپنا عکس دیکھ رہے ہیں، بڑے اچھے لوگ ہیں، جو یہاں سے نکلتے ہی اپنی یا کسی اور کی بیوی کی کمر میں ہاتھ ڈالیں گے اور رکشا میں چپک کر بیٹھیں گے اور کہیں گے "کیا مردمار عورت ہے — مجھے تو اس آدمی پر بڑا ترس آتا ہے، جس میں اتنی سی خود داری نہیں، میں ہوتا اس کی جگہ ..... یہی تو بات ہے کہ تم سب کم بخت اس کی جگہ ہونا چاہتے ہو حالانکہ وہ کم بخت خود اپنی جگہ پر نہیں ہے۔ وہ سالی عورت ہی کچھ ایسی ہے۔ چھلکتی ہوئی۔ چھوٹے سے گلاس میں شراب بہت زیادہ انڈیل دی گئی ہے۔ نہ وہ طوطے جو کب کا پنجرہ کھول کر کھلی ہوائوں میں اڑ گئے، نہ وہ بلیاں جو ہر وقت جمائیاں لیتی رہتی ہیں، اور نہ وہ کتے جو میری طرح مر رہے ہیں۔ ان کے کیڑے بھی دکھائی دیتے ہیں اور زخم بھی۔ میرے نہیں دکھائی دیتے۔ یہی تو فرق ہے۔ ویسے یہ کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ چائے کی وہ ٹرے بھی نہیں جو میں ہر صبح نماز کے بعد اوپر لے جاتا ہوں۔ جہاں وہ عورت اپنی بسین دوست کی آغوش میں دبی دبائی پڑی رہتی ہے۔ ریشمین نائٹی نہ وہ میٹھی تھکن جو بیس کی کچھ سوتی کچھ جاگتی آنکھوں

، دیکھتا ہوں۔ نہ وہ سڑک جس کے آخر میں ایک پھاٹک ہے اور جسے میں روز صبح کھولتا ہوں اور رات کو بند کر
بتا ہوں تاکہ صبح کو اس عورت کی کار گردڑاتی ہوئی نکل جائے اور رات کو کوئی چور نہ آنے پائے۔ حالاں کہ
ار پھاٹک سے نکلنے سے پہلے پھر بھی غراتی ہے اور چور پھر بھی آتے ہیں۔ یہ کتے مجھے کچھ عجیب نظر سے دیکھ رہے
یا جیسے یہ معلوم ہو گیا ہو کہ میں اب کے جاؤں گا تو لوٹ کر نہیں آؤں گا۔ ان کے سوا کسی کو بھی میرے سفر کا احساس
نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ میرا سفر اتنا آسان ہو گیا ہے۔ رات بھیانک ہے اور کتے رو رہے ہیں۔ وفاداری کتوں
لورلائی ہے۔ مجھے غم اس کا ہے کہ تم سب مجھے قبر میں ڈالتے ہی بھول جاؤ گے لیکن یہ کتے مجھے یاد کریں گے اور رو
ذکر مر جائیں گے THEY ARE SUCH SENTIMENTAFOOLS . تمہاری
نکھیں پھیل رہی ہیں۔ تم پہلی بار مجھے پہچان رہے ہو۔ میں سو نہیں رہا ہوں۔ اور تم حرص کے نشے میں نہیں ہو۔ اس
کو موت کے کمرے میں پڑے پڑے بہت دیر ہو چکی ہے اس کی لاش سر سے پاؤں تک سفید چادر سے ڈھکی ہوئی ہے
آنگن میں میت کو نہلانے کا انتظام ہو رہا ہے۔ خدا ترس لوگ بہت مصروف ہیں۔ اتنے سارے لوگ کہاں سے آگئے
ہیں۔ پورا لان بھر گیا ہے۔ وہ تو بڑا گمنام سا شخص تھا۔ لوگ تو اس کو محض اس عورت کے دُم چھلے یا غلام کی حیثیت
سے جانتے تھے۔ پھر بھی کچھ لوگ رو رہے ہیں۔ کتنی عجیب بات ہے۔ خود عورت کتنی حیرت زدہ ہے۔ سب ایک دوسرے
کے کان میں منہ ڈال کر کچھ کہہ رہے ہیں۔ مُردہ یہ سب دیکھ اور سن رہا ہے اور لہولہان، خشک، ٹھنڈے ہونٹوں سے
سکرا رہا ہے، اب اس مسکراہٹ پر کسی قسم کا بوجھ نہیں ہے۔ مُردہ اٹھتا ہے اور سب کی نظر بچا کر پورے گھر کے
چکر لگاتا ہے۔ ویسے جب وہ زندہ تھا تب بھی سب کی نظر بچا کر ہی جیتا تھا۔ مگر وہ اب ان سب کمروں میں
جا رہا ہے۔ جہاں وہ برسوں سے نہیں گیا تھا۔ اور سنگار میز پر کنگھے میں الجھے ہوئے بالوں کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔
آئینے میں اُس نے اپنا عکس دیکھنا چاہا۔ لیکن اب اس کا کوئی عکس نہیں تھا۔ پہلی بار اسے اس تبدیلی کا احساس
ہوا۔ اس کا وجود اب زندگی کے ہر آئینے سے اپنا عکس چھوڑے بنا چھو رہا تھا۔ ساری کتابیں سجی ہوئی تھیں۔
بہت سی ان میں ایسی تھیں جو کبھی کھلی ہی نہیں تھیں۔ مگر تھیں۔ اسکاچ کی ایک خالی بوتل سنگار میز کے پاس
کونے میں رکھی تھی۔ وہ دیر تک اس بوتل کو دیکھتا رہا۔ جیسے اپنے آپ کو دیکھ رہا ہو۔ ماضی سے ایک قہقہہ
ڑتا ہوا آیا اور اس پر پھٹ پڑا۔ یہ ماں کا قہقہہ تھا۔ ڈرائنگ روم سے اُڑ کر آیا تھا۔ "جب اسکاچ سامنے
ہو تو ٹھہرا کون ہے؟" اس نے سرخ ڈوروں بھری سوجی ہوئی آنکھوں سے ڈرا کولا کی طرف دیکھا تھا۔ اس شخص
میں اتنا سائنس آف ہیومر" نہیں ہے۔ بے عرق مُڑا ہوا ٹیبو جب دیکھو جب مٹانے کی بات، جب دیکھو

جب ان چھوٹی چھوٹی حکایتوں کا قصہ جو اُس نے بچوں کی ہدایت کے لئے لکھی تھیں۔ یا یہ ذکر کہ خانصاحب کے بیٹے کی شادی میں قورمہ مغلئی شان کا تھا اور زردے میں خوشبو واجد شاہی پان کی تھی۔ آم تو اصل رام پور میں ہوتے ہیں گٹھلیاں برائے نام اور مزا ثمر بہشت کا۔ جب دیکھو جب دوسروں کی عقیقہ یا ختنہ کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ یہ جوش کبھی اپنی شادی میں نظر نہیں آیا۔ ساری سرگرمی خفوت ہیں۔ سارا خون لینہ بستر پر۔ باہر وہی جا نماز۔ وہی تسبیح، وہی وظیفہ خوانی۔ آدمی ہے یا گھن چکر۔ اور میں زندگی سے ایک ایک بوند نچوڑ لینا چاہتی ہوں۔ میں تمام روایتوں کو توڑ کر زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ اور یہ شخص ایک بھاری چٹان کی طرح میری گردن میں بندھا ہوا ہے۔ اگر میں چٹان ہوں تو مجھے پھینک دو دُھتکار اپنے وجود کی حدوں سے باہر۔ حرام زادے پھینک تو دوں۔ اپنی پرانی سینڈل کی طرح۔ مگر میرے کیریر کا کیا ہوگا۔ بدنام ہو جاؤں گی۔ چلو تمہاری یہ بزدلی مجھے سوٹ کرتی ہے۔ اس چٹان کو گردن سے لٹکنے دو۔ میں تیل چٹے کی طرح رات کے اندھیرے میں تمہارے وجود کے ارد گرد رینگتا رہوں گا۔ میرے لئے یہی بہت ہے۔ اور تم یوں بوکھلائے کیوں کھڑے ہو بیٹے۔ تم جانتے ہو یا شاید نہیں جانتے۔ میں جانتا ہوں۔ اکیلے تم ہو جس کو چھوڑنے کا مجھے غم ہے۔ تم میں کوئی ایسی بات ہے جو مجھے جینے پر مجبور کرتی ہے۔ تمہاری نرمی اور سفاکی۔ کیا تم نے اس وقت بھی چرس چڑھا رکھی ہے۔ تمہاری آنکھیں میرے چہرے پر کچھ عجیب طرح سے گڑی ہوئی ہیں۔ تمہارے الجھے ہوئے بال مجھے بہت اچھے لگ رہے ہیں۔ میں کہتا ہوں اس لئے گھنے بال میری کمزوری ہیں۔ کبھی میرے بال بھی بڑے گھنے تھے۔ مگر زندگی نے چپت مار مار کر صفایا کر دیا۔ تم اتنے لمبے ہو، میری طرح۔ اور چھریرے، جیسا میں کبھی نہیں تھا۔ میری سیاہی اور تمہاری ماں کی دمک نے مل کر تمہارا رنگ کتنا نکھار دیا ہے! اور میں حیران ہوں کہ اگر زندگی میں پہلی اور آخری بار میں نے تمہاری ماں سے بغاوت نہ کی ہوتی تو تم کہاں ہوتے۔ میں مرتا تو یہ جلنے بنا مرتا کہ کوئی مجھ سے محبت کرتا ہے۔ میں نے زندگی میں ایک ہی سازش کی ہے۔ تب تم خون کی جیلی بن چکے تھے اور تمہیں آپریشن ٹیبل پر قتل کرنے کا انتظام ہو چکا تھا۔ اور تب میں نے ڈاکٹر کو رشوت دی تھی۔ اور تمہاری ماں کو شکست۔ خون کی جیلی کو جاگنا تھا۔ باہر آنا تھا۔ دھوپ میں۔ اب میں اس دھوپ کو چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں تم کیوں چرس کے کش اڑاتے ہو۔ تمہیں یہ سب اچھا نہیں لگتا۔ یہ سب بھول جاؤ۔ میں چلا جاؤں گا۔ پھر نہیں آؤں گا۔ پر جاتے جاتے ایک بات بتانا چاہتا ہوں۔ تم ان سب باتوں سے بھاگتے بھاگتے اب اپنے آپ سے بھاگ رہے ہو۔ کوئی اپنے آپ سے بھاگ کر کہاں جا سکتا ہے۔ ڈراکولا کی آواز بھرا جاتی ہے۔ بہت عمدہ کاک ٹیل ہے۔ مائی ڈیئر۔ آہستہ آہستہ پیو۔ گھونٹ گھونٹ۔ اس کو لیکچر دینے میں مزا آتا ہے۔ اس لیکچر میں

وہ اپنا سارا فرسٹریشن نچوڑ دیتا ہے۔ کٹس کہیں کہ آپ کس سے ولیونز کی بات کر رہے ہیں جناب؟ آپ کا چہرہ ڈوبتے چاند کی طرح سفید ہو گیا ہے۔ سفید یا سرخ، چڑھ رہی ہے۔ چڑھنے دو۔ تھوڑی اور۔ بس ذرا سی۔ دیکھیے آپ چوٹ کر رہے ہیں۔ میں روائتی ولیونز کو گرد سمجھتی ہوں۔ میری ولیونز میں وہ لمحے جو میں جیتی ہوں جن کا میں تجربہ کرتی ہوں۔ جو میرے وجود میں ڈھل جاتے ہیں۔ اس شراب کی طرح، جی ہاں۔ بڑے اسمارٹ ہیں آپ۔ آپ کو پائریا تو نہیں؟ وہاٹ اے بور اِڈیم اِٹ۔ پھر وہی ولیونز کا قصہ۔ مادام۔ آپ تو ذرا سی بات پر بپھر جاتی ہیں۔ دیکھیے نا پینے کے بعد EXHIBITIONS ختم ہو جاتی ہیں۔ اور اوقات سوال، مُردوں کی طرح، قبر سے نکل پڑتے ہیں۔ ہاہا! قیامت کے دن بھی ہوگا۔ قیامت کا کوئی دن مقرر نہیں ہے۔ ویسے یہ قیامت اصل میں آپ کا ضمیر ہے۔ اتر آئیے نا کلیشے پر۔ ساس کی آنکھیں چڑھ رہی ہیں۔ ہونٹ بھیگے بھیگے، سوچ سوچ دکھائی دے رہے ہیں۔ میں تو صرف یہ سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ ـــــ باقی سارے کام تو آپ اُسی طرح کرتی ہیں جس طرح دوسرے لوگ کرتے ہیں، مگر جیتی ہیں آپ بالکل دوسری طرح ـــــ کیریئر، عشق، جائیداد، جھوٹ۔ کیا یہ سب وہی لمحہ لمحہ، میرا مطلب ہے۔ چڑھ گئی۔ تم گھر جاؤ۔ اس کے ہونٹ چپک گئے ہیں۔ بلاؤز کے گول گریبان میں سنہرا تلاطم پیدا ہو گیا ہے۔ سب خوش ہیں۔ لطیفوں پر ہاتھ ملا رہے ہیں۔ صرف وہ اکیلا کھڑا ہے۔ سہما ہوا، خوف زدہ۔ اتنا لحیم شحیم جسم اور موجودگی اتنی منحنی۔ ڈراکولا کونے میں ہے اور اس کا منہ دیوار کی طرف ہے۔ دُور سے کار کی غراہٹ سنائی دیتی ہے۔ ڈراکولا ہوا میں پگھل جاتا ہے۔ میں موت کے کمرے میں جھانک کر دیکھتا ہوں۔ وہاں نہ وہ پلنگ ہے، نہ خون سے بھری ہوئی سلفی، نہ دوائیں، نہ اکتائی ہوئی آنکھیں، نہ موت کا خاموش انتظار، وہاں کچھ نہیں۔ کم از کم مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ باہر کے برآمدے میں اونچی ایڑیوں کی کھٹ کھٹ ابھرتی ہے۔ اور میں زینے پر اُوپر بھاگتا ہوں۔ یکایک میں کتنے خطروں میں گھر گیا ہوں۔ اب ہر طرف سے دھوپ حملہ کر رہی ہے۔ دروازے میں کنجی گھومتی ہے اور دروازہ چرچراتا ہے۔ مجھ پر لرزہ طاری ہوتا ہے اور میں لرزے کو دبانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں اپنے کمرے میں بند ہو جاتا ہوں۔ کمرے میں بند ہوتے ہی میں ہر خطرے سے محفوظ ہو جاتا ہوں۔ یہاں بہت مانوس بو بسی ہوتی ہے۔ دیواروں پر میرے بنائے ہوئے ڈرائنگ اپنی تمام خباثتوں اور بھیانک پن کے ساتھ اینٹھتے جکڑتے ہیں اور مجھے گلے لگا لیتے ہیں۔ I'M AT HOME وہ سب منڈلا رہے ہیں اور ہنس رہے ہیں۔ وہ بکھر رہے ہیں اور چیخ رہے ہیں آنکھیں، جو نیزوں اور سانپوں سے بھرے ہوئے پاتال کی طرح ہیں ہواؤں میں اپنے سیاہ پپوٹوں سے اُڑ رہی ہیں۔ کٹے ہوئے بازو، کٹے ہوئے سر، بہتی ہوئی ناکیں، اندام نہانی میں ڈنک مارتے ہوئے بچھو، سب ہواؤں میں اڑ رہے ہیں، ایک

دوسرے سے ٹکرا رہے ہیں اور ہنس رہے ہیں۔ میں گٹار اٹھا لیتا ہوں۔ میری انگلیاں چلنے لگتی ہیں۔ میری انگلیوں سے آگ ٹپکتی ہے، بوند بوند اور گٹار کے جلتے ہوئے تاروں پر دوڑتی ہے۔ بوند بوند!

اونچی ایڑیاں بہت قریب آگئی ہیں۔ یہ کھٹ کھٹ مجھے ڈراتی ہے اور میں گٹار کے تاروں کی گونج کو بڑھا دیتا ہوں۔ اونچی ایڑیاں اپنے کمرے میں جاتی ہیں۔ پھر باتھ روم۔ پھر کمرے میں۔ پھر میرے دروازے پر دستک۔ دستک۔ روز دستک۔ میں دروازہ نہیں کھولوں گا۔

"ٹیپو۔ جانتے ہو تم کتنے دنوں سے کمرے سے نہیں نکلے ہو؟

میں اپنی انگلیوں کو اور تیز کر دیتا ہوں۔ لیکن اب اور زیادہ تیز گونج ممکن نہیں۔ میں گٹار پر جھک جاتا ہوں۔ اور کمرے میں اڑتے ہوئے ڈراپنگ بھی اپنی اپنی جگہ دیواروں پر چپک جاتے ہیں۔

"ٹیپو دروازہ کھول دو۔"

ٹیپو اٹھتا ہے۔ ہانپتا ہوا۔ اس کا رنگ زرد ہے۔ وہ ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھول دیتا ہے۔

دیکھتے ہو تمہارا کیا حال ہو گیا ہے۔ کیا اسی لئے میں اتنا دکھ جھیلتی ہوں۔ کتنا دکھ ماں؟ کیا دکھ کو کبھی ناپا اور تولا جا سکتا ہے؟ تم پوچھتے ہو کتنا دکھ۔ نو مہینے میں جب خون کی جیلی انسان کا دل بن کر دھڑکتی ہے تو جانتے ہو ماں پر کیا بیتتی ہے۔ ماں مجھے ڈرا کولا نے بائیولوجی پڑھائی ہے۔ کون ڈرا کولا۔ کیا بتایا ہے اس نے؟ ماں کی آنکھیں کاجل سے بھر گئی ہیں اور اب پتلیوں میں کسی چیز کا عکس نہیں ہے۔ ٹیپو چیونگ گم چبا رہا ہے۔ اس کا منہ ٹیڑھا ہو گیا ہے۔ اس کی کمر میں خم پیدا ہو گیا ہے۔ ٹانگوں اور سینے پر گھنے بال پسینے میں شرابور ہیں۔ وہ چنگھاڑنے کے انداز میں ہنس رہا ہے۔ تم ہنستے ہو۔ تم کتنا گر گئے ہو۔ کچھ اندازہ ہے تمہیں۔ سب کچھ بکھر کر رہ گیا ہے۔ سب کچھ کس نے بکھیر دیا ہے، ماں! وہ کاجل بھری آنکھوں سے جس میں کسی چیز کا عکس نہیں ہے ٹیپو کو گھورتی ہے۔ اس کے جبڑے لٹکے ہوئے مینڈک کی طرح جلدی جلدی سانس لے رہے ہیں۔ وہ چباتے ہوئے چیونگ گم کو اپنی ہتھیلی پر تھوکتا ہے۔ پھر گلا پھاڑ پھاڑ کر گانے لگتا ہے۔ فریڈم! فریڈم!
چیونگ گم کی گولی بناتا ہے اور پھر منہ میں رکھ لیتا ہے۔ گھن آتی ہے ٹیپو! تمہارے دل میں گرہ پڑ گئی ہے میں اسے کھولنا چاہتی ہوں۔ تم جانتے ہو سب مجھے چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ میں اکیلی ہوں۔ اور جب تک یہ گرہ نہ کھل جائے تم نہیں کھل سکتے۔ ٹیپو دیوانوں کی طرح قہقہے لگاتا ہے اور دیواروں سے ٹکراتا ہے۔ وہ ایک بڑی سی پنسل اٹھاتا ہے۔ اس کی لکڑی کو دانت سے نوچتا ہے، سیاہ نوک پر تھوکتا ہے اور سامنے کی دیوار پر

تیزی سے ایک لمبی سی ناک بناتا ہے۔ میلوں لمبی ناک۔ بار بار خطوط پر پنسل دوڑتا ہے۔ ناک الجھتی جاتی ہے اور الجھی ہوئی لکیروں سے ایک خوف زدہ شکل ابھرتی ہے جس طرح منہ کھلا ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے جیسے کانٹے دار گیند کی طرح گلے میں پھنس گئی ہے۔ پن کشن ایک بار گلے میں پھنس جائے تو نہ اگلا جائے نہ نگلا جائے۔ لیکن پن کشن گلے میں پھنسے کیوں۔ وہ صبح سے شام تک لکیریں کھینچتا رہتا ہے اور لکیروں پر لکیریں ڈالتا رہتا ہے۔ اور وقت ان لکیروں کے جال میں نہیں آتا۔ ماں دروازے پر کھڑی انتظار کرتی رہتی ہے۔ اس کے انڈرویر سے کیسی بدبو اٹھ رہی ہے۔ مگر وہ انتظار کرتی رہتی ہے۔ وہ جائے گا اور نہائے گا۔ وارڈروب سے صاف چمکتی ہوئی لندن والی قمیص نکالے گا۔ نیا انڈرویر پہنے گا اور اس پر نیلی پتلون کا زیپ زن سے کھینچے گا۔ گھنگھریالے بالوں کو چوڑے کنگھے سے گردن تک سجائے گا۔ قیمتی سگریٹ کو ہونٹوں میں دبائے گا۔ صبح کو کالج جائے گا اور شام کو بیڈمنٹن کھیلے گا۔ ماں کے ساتھ کافی پیئے گا۔ اور جب اس خوبصورت ادھیڑ عورت کے دوست ڈرائنگ روم میں اسے بھی وسکی آفر کریں گے تو وہ ایڑیوں پر گھومے گا اور بڑی فراخ دلی سے انکار کر دے گا۔ اور پڑوس کے گھر میں جا کر امیر خاندان کی بد دماغ لڑکی کو شیشے میں اتارے گا۔ رات کو سونے سے پہلے ماں کو غیر ملکی رسالوں میں پڑھے ہوئے جوک سنائے گا۔ دونوں ہنسیں گے۔ پھر ماں کو جمائیاں آئیں گی۔ ٹیپو اشارے کو سمجھ جائے گا۔ اور بڈلیمپ کا بٹن دبا کر اپنے کمرے میں چلا جائے گا۔ اور رات گئے تک نورس کی کتابیں پڑھتا رہے گا اور خوبصورت ادھیڑ عورت دوبارہ بڈلیمپ روشن کرے گی اور اپنے عاشق کے تازہ خطوط پڑھے گی اور سر دھنے گی۔ تھک رہا ہے۔ خبیث تھک رہا ہے۔ لیکن بے چارہ کیا کرے۔ مجبور ہے۔ اس کی بھی اجنبی وابستگیاں ہیں۔ ہم دونوں انوکھی ہستیاں ہیں لیکن زمانہ انوکھی ہستی کو کسی نہ کسی ڈراکولا کے حوالے کر دیتا ہے۔ مگر اب کیا ہو سکتا ہے جھک مارو۔ دو چار ہم آغوشیاں' دو چار بغل گیریاں' دو چار ہوٹل بازیاں' جھیل میں دو چار کشتی رانیاں' جھولوں میں دو چار پینگیں' دو چار بوتلیں شراب کی' پھر تھکن' پھر فرار۔ اور کیا' اور کیا۔ قصہ ختم۔ بڈلیمپ جلتا رہتا ہے۔ آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔ نیند آتی ہے تو گہری نیند آتی ہے۔ اور سفر میں زندگی کا لمبا سفر طے ہو جاتا ہے۔

جانتا ہوں' ماں' کس بات کا انتظار ہے تمہیں۔ ہوا یہ ہے کہ ڈراکولا نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ اور میں صاف دیکھ سکتا ہوں۔ سفید آپریشن ٹیبل پر تم پڑی ہو۔ یہ سفیدی مجھے اپنے باپ کے کفن کی یاد دلاتی ہے۔ ایک خوبصورت عورت آپریشن ٹیبل پر پڑی ہے۔ اس کی ٹانگیں پھیلی ہوئی ہیں۔ اور سرخ سرخ جیلی بہہ رہی ہے۔ میں بہہ رہا ہوں۔ یکایک جیلی کی آنکھ کھل جاتی ہے اور ڈراکولا ڈاکٹر کے کان میں کچھ کہتا نظر آتا ہے۔ ڈراکولا اپنی لکیردار

پیشانی سے پسینہ پونچھ رہا ہے۔ اس کے ہونٹ سوکھے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر اپنے دستانے اتار دیتا ہے اور سرخ جیلی واپس ناف کے جال میں چلی جاتی ہے اور حبیب صدیوں سے۔ میں روشنی میں تیرتا ہوں تو روتا ہوں۔ اور ہنستا ہوں۔ ہنستا ہوں اور روتا ہوں SO YOU KNOW MOM میں کیوں روتا ہوں، میں کیوں ہنستا ہوں۔ تم انتظار کر رہی ہو۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ تم تھک رہی ہو۔ پہلے کبھی تم نے کسی کا، کسی چیز کا انتظار نہیں کیا۔ تمہیں فرصت ہی کہاں تھی۔

گھر پر رات کا سناٹا چھا گیا ہے۔ بلیاں بوڑھی ہو گئی ہیں۔ کتنے اپنی کھال نوچ نوچ کر مر چکے ہیں خوبصورت ادھیڑ عورت، لیمپ کی جھریوں بھری روشنی میں لیٹی ہوئی ہے۔ سگریٹ پی رہی ہے اور پلان بنا رہی ہے۔ اگر میں پلان نہ بناتی تو یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ میں نے وقت کے دریا کو اپنی پلاننگ سے نہ باندھا ہوتا تو مجھے اس طرح سگریٹ کے مرغولے بنانے کی، ٹھنڈی آہیں بھرنے کی فرصت ہی کہاں ملتی۔ اب چین ہی چین ہے۔ جو کچھ زندگی نے مجھے دینے سے انکار کیا میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ میں نے پلاننگ کی اور ڈرا کولا کے دانت توڑے۔ کسی ڈنٹسٹ کے یہاں جانے کی ضرورت بھی نہیں پڑی۔ میں نے پلاننگ کی اور عشق کیا۔ میں نے پلاننگ کی اور سب کو اپنے اپنے راستے پر ڈالا، سب اپنے اپنے راستے پر چل پڑے اور اب میں چپ چاپ رات کی خوشبو بھرے سناٹے میں اپنی خوشبو کے بارے سوچ سوچ کر جگالی کر رہی ہوں۔ سارے بے وقوف مجھ سے جل رہے ہیں۔ ایک تم ہو جو مجھ پر ترس کھا رہے ہو۔

کچھ ہو رہا ہے۔ رات ہے سناٹا ہے۔ جیسا ہر رات ہوتا ہے۔ پھر بھی کچھ ایسا لگتا ہے کہ آج کی رات باقی تمام راتوں سے الگ ہے۔ آؤ چلیں۔ نیچے چلیں۔ رات ڈھل چکی ہے۔ اب کون ہوگا۔ موت کے کمرے میں جھانک کر دیکھ چکا ہوں۔ جنازہ جا چکا ہے اور وہاں کچھ نہیں ہے۔ کوئی نہیں۔ لاش بھی نہیں۔ ماں کے کمرے میں بڈ لیمپ بجھ چکا ہے۔ جانی واکر اپنا کام کر رہی ہے۔ اب کوئی نہیں جاگے گا۔ صبح تک کسی کی آنکھ نہیں کھلے گی۔ زینہ کتنا لمبا ہو گیا ہے۔ اترتا ہی چلا جا رہا ہے۔ میری ٹانگوں کو گرم ہوائیں چاٹ رہی ہیں اور کوئی ٹھنڈے ناخنوں سے میرے سینے کے بالوں کو کھرچ رہا ہے۔ سوکھی ہوئی گھاس کی طرح۔ مارو گولی۔ چلتے ہیں اور نیچے چلتے ہیں۔ ڈرائنگ روم میں تو بڑی ہلچل ہے۔ دیکھیں۔ کونے میں فریج پہ بیٹھی بلیاں جمائیاں لے رہی ہیں سالے ایک دوسرے میں مدغم ہو رہے ہیں۔ میز پہ کھانا لگا ہوا ہے۔ سب آخری گھونٹ پیتے ہیں اور میز کی طرف آتے ہیں، مدھم روشنی میں بلیاں جمائیاں لیتی رہتی ہیں اور کتے میز کے نیچے بیٹھے دُم ہلا رہے ہیں۔ کوئی انہیں نہیں دیکھتا۔ سب اپنی

زم ملا رہے ہیں۔ اور کھار رہے ہیں۔ خوبصورت عورت، حسن نے دھندلکے میں جھریوں کو مٹا کر اپنی دلربائی بڑھا لی ہے، موم بتی کی طرح جل رہی ہے۔ ڈراکولا چپ چاپ کونے میں کھڑا ہے۔ آج اس نے پوری شام نہ ملنے کی بات کی ہے۔ نہ حاکم اعلیٰ کی مہربانیوں کی، اور نہ شادی کی دعوت کی۔ وہ چپ چاپ بیٹھا ان لوگوں کو دیکھتا رہا ہے جنہوں نے اس کی طرف نہیں دیکھا۔ اور اب خوبصورت عورت ہر بار پلیٹ اس کے ہاتھ سے لے لیتی ہے اور کہتی ہے "تم کو کھانے کی کیا ضرورت ہے۔ تم ویسے ہی بہت موٹے ہو" وہ مسکراتا ہے اور پھر کونے میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ دائیں پاؤں کا جوتا اسے کاٹ رہا ہے، کیوں کہ یہ اس کے بیٹے کا جوتا ہے جو اس نے اس دعوت کے لئے چپکے سے پہن لیا ہے لیکن ڈرائنگ روم میں چلنا ہی کتنا پڑتا ہے۔ اور جب نہ چلتا ہے تو جوتے نہیں کاٹتے۔ سب کھانا کھا کر اور خوبصورت عورت کا ہاتھ دبا کر اور پھر ملنے کا وعدہ کرکے جا چکے ہیں۔ اب سناٹا ہے اور چاندنی کھڑکیوں سے اندر آرہی ہے اور قالین پر پھیل رہی ہے۔ اس نے اب تک کھانا نہیں کھایا ہے۔ وہ سب کی پلیٹیں جمع کرتا ہے اور سب کی پلیٹوں سے ہڈیاں چھانٹتا ہے اور میز کے نیچے پھینک دیتا ہے۔ کتوں کے جبڑوں میں ہڈیاں ٹوٹ رہی ہیں اور خوبصورت عورت میوزک سن رہی ہے۔ خمار سے آنکھیں بند ہوئی جا رہی ہیں۔ تم ہڈیاں چبا رہے ہو؟ نہیں تو۔ تو پھر یہ آواز کہاں سے آرہی ہے؟ کتے ہڈیاں چبا رہے ہیں۔ خوش ہیں۔ اتنی بڑی دعوت اور اتنی ساری ہڈیاں۔ میں میوزک سن رہی ہوں اور تم کتوں کو ہڈیاں دے رہے ہو۔ ڈراکولا تم بہت احمق ہو۔ وہ تو ہوں۔ لیکن میں کیا کروں۔ میں چھوٹی ہڈیاں تو نہیں چاٹ سکتا۔ جو ہڈیاں میں نہیں چاٹ سکتا وہ کتے کیوں نہ چاٹیں۔ جب کتے چھوٹی ہڈیاں چاٹتے ہیں تو مجھے بے حد خوشی ہوتی ہے۔ بکو اس! مجھے میوزک سننے دو۔ تم جاؤ اور اپنے کتے بھی لے جاؤ۔ یہ کتے تو تمہارے ہیں۔ میں تو صرف ان کی دیکھ بھال کرتا ہوں۔ ماں کی سرخ ڈوروں والی آنکھیں خمار کے جالے میں چمکتی ہیں۔ وہ اٹھتی ہے اور اوپر چلی جاتی ہے۔ میں احتیاطاً موت کے کمرے میں جھانک کر دیکھتا ہوں۔ وہاں کوئی نہیں ہے۔ وہاں نہ اندھیرا ہے نہ اجالا۔ ڈراکولا سر جھکا کر اور تحریمہ باندھ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

بیٹا اور ماں، صدیوں بعد، رات کے کھانے پر میز کے دوسروں پر بیٹھے خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

ماں نے سوپ کا پیالہ جس سے کچھ دار بھاپ اٹھ رہی تھی، بیٹے کی طرف بڑھایا۔ بیٹے نے پیالہ اس کے ہاتھ سے نہیں لیا۔ ماں کی تیوریاں چڑھ گئیں لیکن اس نے کچھ نہیں کہا۔

ماں نے سوپ کا چمچہ منہ میں لیا اور کہا۔

"کتنے عرصہ بعد ہم انسانوں کی طرح ایک ہی میز پر کھانا کھا رہے ہیں۔"

ٹیپو نے تھوڑی کھائی اور کوئی جواب نہیں دیا۔

"تم کم عمر ہو۔ مگر گہرے ہو۔ تم جینیس ہو میری طرح۔ باقی سب گھاس نگل گئے۔"

ٹیپو نے تھوڑی کھائی اور کوئی جواب نہیں دیا۔ سوپ کے پیالے کو اور دُور رکھ دیا۔

"کیوں تم سوپ کیوں نہیں پیتے ؟"

"بُو آتی ہے۔"

"بُو ؟ کاہے کی بُو ؟"

"تازہ خون کی۔"

"پگلے۔ مُرغی کا سُوپ ہے۔"

"مرغی کا خون تازہ نہیں ہوتا کیا ؟"

ماں اور بیٹے کی آنکھیں اوپر اٹھیں۔

"ماں جب ڈراکولا مر رہا تھا تو تم کہاں تھیں ؟"

ماں کی آنکھیں بجھ جاتی ہیں اور ہونٹ کھنچ جاتے ہیں اور چمچہ ہاتھ سے جاتا ہے۔

PIG! YOU'RE A BLOODY PIG"

"ماں تم کتنی نرم دل ہو۔ تمہارے ہونٹوں سے شہد ٹپکتا ہے۔ یہ ساری روشنی سورج کی نہیں۔ تمہاری ہے۔"

FOR ME, YOU'RE TELLING THE TRUTH.

"ماں! ڈراکولا بالکل گدھا تھا۔"

"تھا۔"

"اچھا ہوا ہم نے اسے دفن کر دیا۔"

ماں کھانے کی میز سے اٹھ جاتی ہے اور ڈرائنگ اور ڈائننگ روم کے درمیان ٹہلنے لگتی ہے۔ کبھی قالین پر، کبھی ننگے فرش پر۔

وہ یونہی اپنے طوفان کو دبانے کی کوشش کرتی رہے گی۔ پنڈولم بائیں سے دائیں اور دائیں سے بائیں ڈول

رہا ہے۔ وقت گزرتا جا رہا ہے۔ اور اب میں کمرے میں زیادہ دیر نہیں رہ سکتا۔ میں نے سب کچھ دیکھ لیا۔ بات نہیں بنتی کسی چیز سے۔ میں جتنا ہاتھ پاؤں مارتا ہوں دلدل میں دھنستا چلا جاتا ہوں۔ وہ یکا یک رک جاتی ہے۔ جیسے اس نے بیٹے کے دل کی گونج سن لی تھی۔

تم چرس، بھنگ، ایل ایس ڈی، سب مزے چکھ چکے۔ ہاں ٹھیک ہے۔ چکھ چکا۔ اور اب تم تھک چکے لیکن موم تمہیں یاد ہے جب میں نیپال جا رہا تھا تو تم نے کیا کہا تھا میرے لئے بھی لانا کوئی چیز۔ تب ہم دونوں ساتھ جائیں گے ٹرپ پر۔ اور ہم گئے تھے ایک ساتھ ٹرپ پر، اور ڈراکولا رات بھر ہماری نجات کے لئے دعا مانگتا رہا تھا اور روتا رہا تھا۔ جب میں گیا تھا تو تم نے کیا کہا تھا اور سچ کہتا ہوں میں تمہارا مشورہ نہیں بھولا۔ وہ وہاں کا ٹھنڈا ساحل اور بیئر کی بوتلیں۔ میں جا رہا تھا تو تم نے کیا کہا تھا۔ GOD BLESS YOU, MOM! اور میں نے کہا تھا GO, MY BOY ENJOY YOURSLF. کیا میں نے تمہیں مایوس کیا تھا؟ نہیں بیٹے تم نے کبھی مایوس نہیں کیا۔ مگر اب کر رہے ہو۔ وہ کیسے؟ تم اس دنبے کو ڈراکولا کیوں کہتے ہو؟ وہ تھس بکرا۔ موم، تم میں ٹرا سنس آف ہیومر ہے۔ تم نے اس کو پہچاننے میں بہت دیر کر دی۔ موم، لیکن تم نے نہ جانے کتنی بار رو رو کر اپنے جسم اور روح پر جو زخموں کے نشان دکھائے ہیں، وہ سب لمبے لمبے خون آلود دانتوں کے لگائے ہوئے تھے۔ ایسے دانت صرف ڈراکولا کے ہوتے ہیں۔

وہ پھر کبھی قالین پر اور کبھی ننگے فرش پر ٹہل رہی تھی اور ہاتھ مل رہی تھی۔ ٹیپو اٹھا اس نے ماں کے سگریٹ کے پیکٹ سے سگریٹ نکالی، سلگائی اور ماں کے ہونٹوں میں تھما دی۔ ماں کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ وہ پھر ٹہلنے لگی جب رکی تو اس نے دیکھا کہ وہاں ٹیپو نہیں ہے۔ وہ آہستہ آہستہ، جھکے جھکے قدموں سے اوپر چڑھی۔ کمرے میں پہنچ کر اس نے بڈلیمپ جلایا۔ پرانے خط پڑھتے پڑھتے اس کی آنکھیں بوجھل ہو گئیں۔ ان باتوں میں کچھ نہیں ہے۔ بہلاوے کی باتیں۔ اس نے بڈلیمپ بجھا دیا۔ اور اندھیرے میں آنکھیں کھولے پڑی رہی۔ بیر سے بیر کو ملتی رہی۔ اس کی پیشانی پسینے سے بھیگ رہی تھی۔ اور گلا خشک ہوا جا رہا تھا۔ کوئی پرندہ دھڑ کر چھت پر گرا۔ تھوڑی دیر تو پھڑپھڑایا پھر خاموش ہو گیا۔ بلی نے دبوچا ہوگا کبوتر۔ بے چارا۔ اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں اور سینہ پھنک رہا تھا۔ کبوتر۔ بے چارا۔ سیانی بلی۔ بڑھیا، چڑیل۔

وہ اٹھی اور کھڑکی پر گئی دور دور تک اندھیرے میں خاموشی کے جال چمک رہے تھے۔ ریلوے اسٹیشن

(باقی صفحہ ۲۲۳ پر)

جیلانی بانو

میں اور میرا خدا

تم مجھے نہیں دیکھ سکو گے

خدا نے موسیٰ سے کہا تھا تو پوری کائنات لرز اٹھی تھی۔ اس کی تجلی کے سائے سے کوہ طور سیاہ پڑ گیا تھا۔ دور تک آسمانوں کے سلسلے دہل اٹھے تھے۔

موسیٰ ——— موسیٰ کہاں ہے ———؟

کوئی مجھے دور سے پکار رہا ہے ——— شاید یہ خدائی آواز ہے۔ ہاں اس کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں ہے۔ آج اس نے مجھے یاد کیا ہے۔ کیونکہ میری اور خدا کی دوستی بہت پرانی ہے۔ وہ میری رگوں میں خون کی طرح دوڑ رہا ہے۔ وہ میرے چاروں طرف خوشبو کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ میں اسے ہر سو محسوس کر سکتا ہوں وہ موسیٰ کو پکار رہا ہے ——— لو ——— میری نجات کا دن آگیا۔ آج مجھے نروان ملے گا۔

آج جب سات دن کے بعد میرے ہاتھ میں ایک روٹی آگئی ہے تو میں ہر سزا بھگتنے کو تیار ہوں۔ کیونکہ آج میں نے چوری کی ہے۔ ایک بھوکے بچے سے روٹی چھین کر بھاگا ہوں۔ شاید اسی خوف سے میں کانپ رہا ہوں یا پھر میرے زخموں سے بہنے والا لہو مجھے دہلائے دے رہا ہے، لیکن روٹی پانے کے بعد میں ہر وار سہہ گیا۔ میں تو اپنی انگلیوں میں الجھی ہوئی اپنی آنتیں بھی دیکھنا بھول گیا۔ کیونکہ جب انسان کے ہاتھ میں روٹی آجائے تو اس کے فرعون بن جانے کا اندیشہ ہے۔ ہاں، میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے روٹی والوں کو فرعون بنتے۔

موسیٰ ——— موسیٰ ——— کیا تم مجھے دیکھنے کی تاب لا سکو گے ———!

نہیں نہیں۔ آج مجھے مت پکارو ——— آج میں خدا کی آواز سے ——— اس کے سائے سے دور بھاگنا چاہتا ہوں۔ اس روٹی کو کھانے کے لیے۔ مگر روٹی کھانے سے کیا میرا پیٹ بھر جائے گا۔ میرا پیٹ

تو میری آنتوں سے خالی ہو چکا ہے۔

آج انہوں نے میرے اوپر ہر طرف سے وار کیے۔ میں چاہتا تھا وہ میرے ہاتھ کاٹ دیں، مگر میرے پیٹ پر نہ ماریں، کیونکہ وہ خالی ہے اور بھوک کے مارے میری جان نکلی جا رہی تھی۔ ایک روٹی کھانے کے لیے میں بیتاب تھا، مگر وہ نہ ملنے۔ انہوں نے میرے پیٹ پر وار کیا اور میری آنتیں میرے سامنے آ گریں۔ میں نے اسی روٹی سے اپنی الجھی ہوئی آنتوں کو تھاما اور بھاگنے لگا ——— اس وقت جانے خدا کہاں تھا۔ وہ ہزار آنکھوں والا وجود، جو میرے وجود کا ایک حصہ تھا۔ میں نے ہمیشہ اسے اپنے دل کے قریب محسوس کیا تھا۔ وہ میرا رازدار تھا میرے تمام گناہوں اور نیکیوں کا حساب رکھنے والا خدا۔ وہ خدا جو ڈوبے ہوؤں کی ناؤ تیراتا ہے۔ جو سمندر کی تہہ میں مچھلی کو غذا پہنچاتا ہے، جانے کیسے آج مجھ جیسے چھ فٹ کے انسان کو آج بھول گیا۔ ضرور اس میں فرشتوں کی غلطی ہوگی۔ ضرور مجھے روٹی پہنچانے کے احکام والے کاغذ اللہ میاں کے آفس میں چوہے لے گئے ہوں گے۔ اسی لیے تو اب جب بھی میں آسمان کی طرف ترسی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہوں اس کی آواز پہاڑوں میں گونجنے لگتی ہے ——— تم مجھے نہیں دیکھ سکو گے ———۔

میں دیکھوں گا ——— میں ضرور دیکھوں گا ——— میں اس کی تلاش میں بھاگنے لگا۔ خواہشوں آرزوؤں اور امیدوں کو جھٹک کر بھاگ گیا۔ بھوک سے تلملا کر میں نے جب بھی ہاتھ پھیلائے کسی کے آگے تو لوگوں نے مجھے نفرت سے دیکھا۔

اونہہ، ان بھکاریوں سے کہیں نجات نہیں ملتی!۔

لوگ تم سے پناہ مانگیں تو ان سے دور بھاگو۔ مہاتما بدھ نے کہا تھا کہ اپنے بدن کی خواہشوں کو تیاگ دو۔ پھر تم خدا سے قریب ہو جاؤ گے۔ یہ مہاتماؤں کی بڑی بڑی باتیں ہیں جو صرف سونے کے حروف میں لکھی جانے کے قابل ہیں۔ میری خواہش نیلان کی نائیٹی تو نہیں تھی کہ آسانی سے اتار پھینکوں، مگر میں نے مہاتما بدھ کی بات بھی مان لی اور میں نے اپنی کھال کی طرح اپنی خواہشوں کو اتار ڈالا۔

ننگا ——— ننگا ——— لوگ مجھے سڑکوں پر دیکھ کر ہنسنے لگے۔

کوئی کہتا ہے۔ بے حیا ——— بے شرم ——— وہ میرے اوپر پتھر پھینکنے لگے ہیں۔ مجھے اس بات پر بڑا تعجب ہوتا ہے کہ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے پھر وہ لوگ مجھے صرف بے شرم ہی کیوں کہتے ہیں ——!
اب میرے سامنے سے لوگوں کا ہجوم دیمک کی طرح دھندلانے لگا ہے۔ کیونکہ میں اپنی آنتوں کو اس روٹی

سے وہاں ایک بلند و بالا پہاڑ کے نیچے آگیا ہوں۔ اونچی بلڈنگوں، رنگین بادلوں اور پانی کی طرح پھیلانے والے سرابوں کو پیچھے چھوڑ آیا ہوں۔ اب مجھے دنیا کی گھومتی ہوئی نارنگی ایک پینٹنگ کی طرح نظر آرہی ہے۔

اندھیرا، خون اور انتقام بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ اب اس روٹی کو چبانے اور نگلنے کی خواہش میرے سارے بدن میں سلگ رہی ہے۔ جانے کیوں خدا نے میرے وجود کو ایک ایسے تشنہ بدن میں اتارا تھا جو ساری زندگی بھوک کی آنچ میں سلگتا رہا۔ اور آج روٹی ملی تو کب ——— جب میری آنتیں میری انگلیوں میں الجھی ہوتی ہیں۔

آج اس سیاہ رات نے مجھے تنہا دیکھ کر مجھ پر وار کر دیا ہے ——— جب تک میں لڑتا رہا وہ مجھے ڈراتے رہے اور جب میں گر گیا تو وہ بھاگ گئے کیونکہ انہیں اپنی جیت اور میری ہار کا یقین ہو گیا تھا لیکن خدا کا سہارا مجھے گرنے نہیں دیتا ہے۔ میں پھر اٹھ گیا۔ بھاگتا ہوا کائنات کے اس آخری کونے میں آگیا ہوں اور میرے دشمن سارے ارض و سما میں مجھے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔

آج تو ساری کائنات تہہ و بالا ہو رہی ہے۔ لگتا ہے آج آسمانوں پر ضرور کوئی ایسی بات ہوگی جو پہلے کبھی نہیں ہوئی۔

میری زبان پیاس کی شدت سے باہر لٹک رہی ہے اور میرے آگے پیاس کا کربلا پھیلا ہوا ہے۔ جیسے دنیا کے تمام یزیدوں نے طے کر لیا ہے کہ وہ مجھے ——— ہی ماریں گے۔ اصولوں کی خاطر ——— سچائی کی خاطر پیاسے رہ کر جان دے دینے کی کہانی مجھے اس وقت یاد آرہی ہے۔ میرا بدن ان زخموں سے چور ہے جو کربلا کے میدان میں شہیدوں کو لگے تھے۔ میرے دل میں وہ شمع جل اٹھی ہے جو صلیب پر چڑھنے کے بعد عیسیٰ کے دل میں جلی تھی اور میرے آگے تنہائی کا بن باس پھیلا ہوا ہے۔

کون سی جگہ ہے؟ میں پہچاننے کی کوشش کرتا ہوں۔ یہاں ہواؤں میں خنکی کا احساس ہے نہ روشنی کی رفاقت۔ رام کے بن باس کی پہلی رات جیسا اندھیرا اور کربلا میں شہادت کی رات جیسی اداسی ہر طرف پھیلی ہوئی ہے کیونکہ آج ایک عظیم انسان پھر شہید ہونے والا ہے۔ ساتوں آسمانوں پر اس کی آمد کا شور ہے۔ ہزار آنکھوں والا، تید و رحم کے جلوے دکھانے والا خدا جیسے آج خود ساری کائنات کی نگرانی کر رہا ہے۔

میں نے کئی بار سوچا کہ میں موسیٰ ہوں تو کیوں نہ ایک بار پھر خدا کے جلوے کی خواہش کروں۔ یہ کیا ضروری ہے کہ سب کو ایک ہی سا جواب ملے ——— میں نے اسے بار بار پکارا اور ہزار پردوں میں چھپنے والے مجرد

کے مالک، آج تو مجھے اپنے سائے کی روشنی سے سرفراز کر دے۔ میں بھی موسیٰ ہوں اور ہزاروں سال سے تیری دید کی آس میں کھڑا ہوں۔

موسیٰ ـــــ موسیٰ ـــــ مجھے کوئی راتوں کو خوابوں کی وادیوں سے پکارتا ہے۔

تم مجھے دیکھنے کی تاب نہیں لا سکو گے۔

ہاں، آج تو میں کسی بات کی تاب نہیں لا سکتا، کیونکہ میرا بدن زخموں سے چور چور ہے۔ رات میرے تعاقب میں ہے۔ پولیس والے خطرے کی گھنٹیاں بجا رہے ہیں اور کالے بادلوں نے سارے آسمان کو ڈھانپ لیا ہے۔ آج سے پہلے ایسا غضبناک اندھیرا میں نے نہیں دیکھا تھا۔ اب میرے بچ نکلنے کے تمام راستے مسدود ہو چکے ہیں۔ میرے پاؤں لہو لہان ہیں۔ میری آنکھیں دوست اور دشمن کی پہچان بھول گئی ہیں اور میرا دل ہر خواہش سے خالی ہو چکا ہے۔ جینے کی چاہ سے، محبت کی طلب سے، نجات کا احساس میرا قد اونچا کر رہا ہے۔ جیسے میں اجنٹا میں رکھا ہوا مہاتما بدھ کا سب سے بڑا مجسمہ بن گیا ہوں، کیونکہ گھر سے چلتے وقت میں نے بھی مہاتما سدھارت کی طرح قسیہ کی چاہت اور ملنے کے پیار کو توڑ کر قسیہ کے سرہانے رکھ دیا تھا، لیکن میں نے قسیہ کے نام کوئی چھٹی نہیں چھوڑی تھی میں لکھنا جو بھول گیا تھا۔ قسیہ کی طرح اب الفاظ بھی مجھے دھوکا دینے لگے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ پہلی بار جب میں نے قسیہ کا نام لکھا تھا تو کاغذ پر صرف پیار لکھا ہوا تھا۔ قسیہ کا نام کہاں گیا اور گھر سے چلتے وقت جب میں نے قسیہ کو خط لکھنا چاہا تو کاغذ پر صرف نفرت کی سیاہی پھیل گئی تھی۔

شاید وہ اب سوچتی ہو کہ وہ پاگل موسیٰ کہاں چلا گیا ـــــ اور وہ پاگل موسیٰ آج اس پیغامبر والی رات کے کنارے کھڑا ہے اور سوچ رہا ہے کہ اس نے قسیہ اور ملنے کے لیے کوئی ورثہ نہیں چھوڑا۔ اپنا غم بھی نہیں ـــــ اور شاید اسی جرم کی پاداش میں مجھے عمر قید کی سزا ملی ـــــ مگر آج یوم نجات آگیا ہے۔ آج میرے بدن کا سارا لہو زمین کی طرح رواں ہے، لیکن میں گروں گا نہیں۔ مجھے ابھی چرائی ہوئی روٹی کھانا ہے۔

پہلے میں اتنا برا نہیں تھا۔ یہ برائی تو مجھے روٹی کی جستجو نے سکھائی ہے۔ مجھے اتنا خود غرض بنا دیا ـــــ کمینہ ـــــ چور ـــــ اور میرے خدا ـــــ میرے وجود میں سمانے والے ـــــ مجھے بتا کہ کون برا ہے ـــــ میں یا سارا خدائی ـــــ آ ـــــ میرے قریب آ ـــــ میں تجھے نہیں دیکھ سکتا، لیکن تو میری ایک جھلک دیکھ لے آج ـــــ ہاں ـــــ آج یہ ان ہونی ہو کر رہے گی۔

ساری کائنات تہ و بالا ہو رہی ہے ـــــ آسمانوں پر بڑا اہتمام شروع ہو چکا ہے۔ فرشتے کہکشاں

گے راستے سنوارنے میں لگے ہوتے ہیں ـــــ ہوائیں سہم گئی ہیں۔ میرا سارا وجود لرزنے لگا ہے۔

میرے اندر ایک گونج اٹھی ـــــ پھر سیاہ پہاڑیوں کے پیچھے سے روشنی کا ایک واہمہ سا چھلکا اور دیکھتے ہی دیکھتے اندھیرے میں چھپ گیا۔

میں جانتا تھا ـــــ میں نے زمین کی طرف جھکے ہوئے آسمان کو مخاطب کیا۔

تم بھی مجھے دیکھنے کی تاب نہیں لاسکو گے۔

(بقیہ گورستان سے پرے صفحہ ۲۱۸ سے)

روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ گورستان کے درختوں میں بھی سناٹا تھا۔ کہیں دور الو چیخ رہا تھا۔ گھر کا پہلو والا دروازہ کھلا اور کوئی نکلا۔ سائے نے احتیاط سے دروازہ بند کیا۔ کھڑا کھڑا کچھ سوچتا رہا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا پھاٹک سے نکلا اور گورستان کی طرف مڑ گیا۔

یہ ڈراکولا کے لئے جان دے رہا ہے۔

آہستہ آہستہ سایہ گورستان کے سایوں میں کھو گیا۔ وہ اس طرح کھڑی اس کے واپس آنے کا انتظار کرتی رہی۔ سایہ واپس نہیں آیا۔ کمرے میں روشنی بھر گئی۔ اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھایا رہا۔ دور ٹیلے پر سایہ ابھرا اور اس راستے پر غائب ہو گیا جو اسٹیشن کی طرف جاتا تھا۔

اس نے زور سے کھڑکی بند کر دی۔ اسے اپنے بیڈ لیمپ کے پاس وان گوخ کے ایک کارڈ پر جس پر پل کی تصویر چھپی ہوئی تھی، کچھ لکھا ہوا نظر آیا۔

ٹیپو کی آواز گونج رہی تھی۔

"موم۔ گورستان سے گورستان تک کا فاصلہ بہت کم ہے۔ ایک قدم، میں نے جو راستہ چنا ہے، بہت لمبا ہے، بہت دور جاتا ہے۔"

ماں دیر تک کارڈ کو دیکھتی رہی۔ سامنے کا کمرہ کھلا ہوا تھا۔ کھڑکی بھی۔ اس میں دھوپ بھری ہوئی تھی اور دیواروں پر بنائے ہوئے ڈرائنگ لکیروں کے جال میں سانس لے رہے تھے۔

"جاؤ جاؤ، لوٹ کر تم یہیں آؤ گے۔"

ٹیپو نے بھاگتی ہوئی گاڑی کی کھڑکی پر سر رکھ دیا۔ ہوا اس کے بالوں کو نوچنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد اسے محسوس ہوا کہ اس کا سر کٹ کر ہوا میں اڑا چلا جا رہا ہے۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور صدیوں بعد اس کے ہونٹوں پر جو مسکراہٹ ابھری اس کا بوجھ اسے محسوس نہیں ہوا۔

دیویندر ستیارتھی

ٹھنڈی چائے کا دھواں

"او ہرے رنگ کی گڑیا منہ سے بول۔ رویم نے چائے کی پیالی منہ سے لگاتے ہوئے سامنے بیٹھی ہرے رنگ کی گڑیا سے کہا آج اسے ایک مدت کے بعد اپنی ہرے رنگ کی گڑیا کی جھلک دیکھنے کو ملی تھی نہ ہی لباس وہی چہرہ وہی ناک نقشہ۔ وہ مسکرا رہی تھی اور چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھر رہی تھی ایک قہقہہ بلند ہوا۔ رویم نے جیسے سپنے کی پگڈنڈی پر ڈگ بھرتے بھرتے اپنی ماضی میں جھانکا کئی بار پوچھ بیٹھی "ہرے رنگ کی گڑیا کیا میری روح اڑکر ہونو لولو کو چھولے گی ؟

ہونو لولو کے بارے میں رویم کا علم زیادہ تو نہ تھا لیکن وہ اگنی مترکو بتلا چکا تھا کہ ہونو لولو کی راتیں مشہور ہیں جن کا لطف لینے کے لئے دُنیا بھر کے ٹورسٹ وہاں پہنچتے ہیں اور لوٹ کر ہوائی کی عورتوں کی سندرتا کا بکھان کرتے نہیں تھکتے۔ وہ ہرے رنگ کی گڑیا ہونو لولو میں پیدا ہوئی تھی اور ہوائی سندرتا کی مورتی تھی جون کا مہینہ اور ہوائی کی چاندنی رات اور شام سے صبح تک کھلنے والے پھول اور ان پھولوں کی خوشبو جسے وہ ہرے رنگ کی گڑیا کبھی نہ بھول سکی ہوائی کے اس ماحول کا تذکرہ رویم ایک ہی سانس میں کر جاتا' لیکن' اگنی متر تو اس ہرے رنگ کی گڑیا کی داستان سننے کو ترس گیا تھا وہ بولا" یہ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔"

"میری چائے گرم ہے" رویم بولا اور پھر ایک قہقہہ بلند ہوا اگنی متر نے جیسے مکھر تال پر ٹھیکہ دیا' بات ہرے رنگ کی گڑیا کی ہو رہی تھی۔"

"صاحب"

بیرا آگیا وہ ہرے رنگ کی گڑیا اور رویم کی کہانی جانتا تھا ہری پتی اور ٹھنڈے پانی کی بات سمجھتا تھا۔

اگنی متر نے دوبارہ گرین ٹی سیٹ میں چائے کا آرڈر دیتے ہوئے رویم کا دھیان سامنے والے صوفے کی

طرف دیکھا جہاں ایک سخ بیاہی بیٹھی تھی ہلکی سبز ساڑھی کے ساتھ گہرا سبز بلاؤز۔ کانوں کے آویزے سبز ہیروں میں سینڈل بھی سبز کلائیوں میں ہاتھی دانت کا سرخ جوڑا الگ دکھائی دے رہا تھا جیسے وہ اس کے ہونٹوں کی طرف اشارہ کر رہا ہو وہ اپنے شوہر سے کہہ رہی تھی " ڈارلنگ آج ایوننگ شو ہو جائے " انہوں نے دو بارہ چائے منگوائی تھی اور سخ بیاہی ہونٹ جلنے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے گرم چائے کی چسکی بھر رہی تھی۔

اگنی متر نے مسکرا کر کہا " آج ہو جائے وہ قصہ "۔ "کبھی پھر سہی " رو پم نے ٹالنا چاہا۔

ریستوران میں بہت شور نہ تھا دوپہر کے سناٹے میں ہر میز پر ایک نہ ایک کہانی دھیرے دھیرے جاگ رہی تھی۔ سخ بیاہی کا شوہر اس کے کان میں کچھ کہہ رہا تھا اس کے چہرے پر ایک خاص طرح کی دمک اور آنکھوں میں اچھوتی سی چمک آتی گئی اور اس نے اپنا سر صوفے کی پشت پر ٹیک دیا۔

" مس نورا بھی ایسے ہی صوفے کی پشت پر سر ٹیک کر بیٹھی تھی " رو پم نے کہنا شروع کر دیا " لیکن گرم چائے تو وہ اپنے ساتھ ہی لے گئی اور میری زبان ٹھنڈی چائے ہی سے جل گئی " ٹھنڈی چائے حلق میں انڈیل کر رو پم آرام سے بیٹھ گیا۔ بیرا گرم چائے لے آیا اگنی متر نے پیالیوں میں گرم چائے ڈالتے ہوئے کہا " ایسے لوگ بھی ہیں جو نرسخ نہیں جانتے لیکن بالزک کا وہ خوب صورت خیال انگریزی میں ہی پڑھا ہوگا کہ دنیا میں خوبصورت ترین چیزیں تین ہیں کھلے بادبانوں والی تیز رفتار کشتی سرپٹ دوڑتا ہوا گھوڑا اور ڈانس کرتی ہوئی عورت۔ بھئی یہ بتاؤ مس نورا ڈانس کرتے کرتے تمہارے ہاتھ سے گرم چائے کی پیالی کیسے چھین لے گئی " رو پم کی چائے میز پر ٹھنڈی ہوتی جا رہی تھی۔ اگنی متر کے بار بار کہنے پر بھی وہ گرم چائے کی چسکی بھرنے کو راضی نہ ہوا۔

" وہ بھی کیا دن تھے جب مجھے مس نورا کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہ تھا " رو پم مسکرایا " اور اس نے مجھے اپنے سپنوں کا ہمرومان لیا تھا اس کے سپنوں میں سات ساگر ناچتے تھے اور وہاں جو ہوا چلتی تھی اس میں نمک کا ذائقہ ضرور رہتا تھا اس نے اپنی ڈائری میں ایک دنیا کے پتے نوٹ کر رکھے تھے لیکن وہ لوگ خزاں کے پتوں کی طرح نہ جانے کہاں اڑ گئے تھے کسی کے ساتھ اس کی خط و کتابت نہ تھی وہ ایک ویران بندرگاہ تھی جہاں ایک مدت سے کوئی جہاز آکر نہیں لگا تھا " " اب اس بات کو یہیں رہنے دو ہم سمجھ لیں گے کہ کہانی کے دروازے تک پہنچ کر بھی خالی ہاتھ لوٹ آئے " اگنی متر مسکرایا۔

" اچھا تو سنو " رو پم نے سخ بیاہی کی طرف سے نظریں ہٹا کر کہنا شروع کیا " جب مس نورا سر سے پیر تک سبز لباس پہن لیتی تو وہ ہرے رنگ کی گڑیا ہی تو دکھائی دیتی تھی کسی کی نقل اتارتے ہوئے ہاتھ پر ہاتھ رکھ

لیتی وہ مجھے اپنے ساتھ ہونولولو لے جانا چاہتی تھی وہ کئی بار زور دے کر کہتی جب ہم سو رہے ہوتے ہیں تو قسمت ہماری باری کرتی ہے میں کہتا مس نورا ہماری ملاقات بھی تو کچھ اس طرح ہوئی۔"

اگنی متر مسکرایا۔

"غم روشنی دیتا ہے غم کی سمتوں میں جو سپنے لگتے ہیں ان میں تم ہرے رنگ کی کانا باتی سن لیتے ہو اور وہ ہرے رنگ کی گڑیا۔"

"بات کرتے کرتے وہ ایک دم خاموش ہو جاتی" رویم نے زور دے کر کہا" جیسے کسی یاد کے ٹھنڈے دھوئیں نے اسے ایک دم ٹھنڈا کر دیا ہو وہ دن وہ تاریخ وہ وقت مجھے پوری طرح یاد ہے جب راجدھانی کے ایک سرکاری انسٹی ٹیوٹ میں پروفیسر جان نثار نے ہماری ملاقات کروائی وہ اس انسٹی ٹیوٹ میں بچوں کے آرٹ سیکشن کی انچارج تھی پہلی ہی ملاقات کے بعد ہم گھومنے نکلے تو میں نے پوچھا" تم سبز لباس کیوں پہنتی ہو" وہ بولی دوسرا کوئی رنگ تو میرے دماغ کی چوکھٹ تک آ ہی نہیں پاتا۔ سیر کے بعد وہ مجھے اپنے گھر لے گئی اس کے ڈرائنگ روم کا قالین سبز رنگ کا تھا پردے بھی سبز تینوں لائٹ شیڈ بھی سبز۔ پھول دان کو بھی کچھ اس طرح سجایا تھا کہ پھول تو نظر ہی نہ آتے تھے محض سبز پتے ہی اپنی قسمت پر مسکرا رہے تھے۔

میں نے کہا" کمال ہو گیا سب سبز ہی سبز اس کا نوکر اس کے پینے کی جو چیز لایا وہ بھی سبز رنگ کی تھی میں نے معذرت کی" میرا یہ ٹیسٹ نہیں" وہ مسکرائی اس نے پہلا گھونٹ بھرا، بولی" بہت سویٹ ڈرنک ہے فرنچ وائن 'کریمو دی مو'" "میری آنکھوں میں تو سبز رنگ کا وہ جادو دیکھ کر ویسے ہی نشہ چڑھ گیا۔" لوٹتے ہوئے کئی بار راستے میں میں نے اس فرنچ وائن کا نام دہرایا۔" کریمو دی مو" یہ کہہ کر رویم ایک لمحہ کے لئے رک گیا۔

" ہر گڑیا کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اس کی محبت کا کون سا رنگ ہے۔" اگنی متر مسکرایا۔" مس نورا طرح طرح کی گڑیا تھیں۔"

رویم کی آواز میں گہرائی آ گئی" ان میں ہرے رنگ کی گڑیاں ہی زیادہ تھیں جاپانی بچوں کا یہ عقیدہ اسے بے حد پسند تھا کہ اگر گڑیوں سے پیار کیا جائے تو وہ بھی بولنے لگیں اس کی کلاس میں جو بچے آرٹ سیکھنے آتے انہیں مس نورا گڑیوں کے ساتھ کھیلنے کے نئے نئے طریقے سکھاتی یہ گڑیوں کا ڈرامہ ہوتا۔ کے لڑکیوں زندہ کرداروں سے ابھر کر کچھ اس طرح سامنے آتا کہ مس نورا پیچھے ہٹتے ہٹتے پس منظر میں چلی جاتی جان نثار

کا بیان تھا کہ مس نورا انہیں گڑیوں کے ڈرامے کے کسی کردار سے بڑھ کر نہیں سمجھتی اور اب میرے لئے یہ دیکھنا باقی تھا کہ اس ڈرامے میں مجھے کون سا رول دیا جاتا ہے۔

"کیا اس کی محبت گڑیوں کی حدود سے تجاوز نہیں کر پائی تھی" اگنی مترنے کہانی کو گرفت میں لینے کی کوشش کی۔ "ایک دن اس نے مجھے ڈنر پر بلایا محبت ایسی ہی چیز ہے کبھی ماس کے پیسے کی طرح ابھرتی ہے کبھی پھول کے پتے پر محبت کا آبدار موتی بن کر چمکتی ہے اس نے صاف کہہ ڈالا تم میری زندگی کی پہلی بہار ہو بہار کا پہلا پھول ساتھ ہی اس نے یہ بتایا کہ ہر گڑیا فوجی سپاہی کو دیکھ کر ڈر جاتی ہے وہ کہتی رہی کہ گڑیا بھی لوک کتھا کی راج کماری کی طرح سو سال تک سوتی رہتی ہے پھر کوئی راجکمار اسے جگاتا ہے اس کی نظروں میں وہ راج کمار جان نثار نہیں میں تھا۔

"محبت میں ایسا ہی ہوتا ہے" اگنی متر مسکرایا "عورت اسی کو چاہتی ہے جس سے وہ پہلی بار محبت کرتی ہے بہت دور چلے جانے پر بھی اسی کی طرف لوٹنے میں اسے تسکین ملتی ہے چاہے آگ کا دریا ہی کیوں نہ پار کرنا پڑے مرد اسے چاہتا ہے جسے وہ اپنی آخری محبوبہ سمجھتا ہے۔"

"ایک دن میں نے اس کے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی چوم لی" رودیم کی آواز میں اور بھی گہرائی آگئی "عمر کا تقاضا موسم کی بات اس کی آنکھوں میں چمک آگئی اس کی انگلیاں میری کمر پر چلنے لگیں میں نے بھی اس کی نقل اتاری میری انگلیاں گویا ڈھولک کے چھلے گننے لگیں وہ یوں بیٹھی تھی جیسے اس پر کوئی اثر نہیں ہو رہا اس نے گھڑے میں منہ ڈال کر وہی گیت گایا جس کے پہلے بول کا مطلب کچھ ایسا ہی تھا او ہرے رنگ کی گڑیا منہ سے بول۔ میری باری آنے پر میں گھڑے میں منہ ڈال کر جھونا جھلاؤ والا گیت گانے لگا اس کے ہونٹ میری گردن پر اٹکے جیسے لوکاٹوں کا گچھا اپنے ہی بوجھ سے نیچے کو ڈھلک آیا ہو جب میں نے گھڑے سے منہ نکالا تو لوکاٹوں کا گچھا اپنے مقام پر جا چکا تھا جیسے یہ فاصلہ اب بھی اتنا ہی ضروری ہو۔"

"تم ہرے رنگ کی مار کھائے بیٹھے ہو پیارے" اگنی مترنے قہقہہ لگایا "محبت بھی شراب کی طرح مزہ دیتی ہے۔" رودیم نے گرمجوشی سے کہا "اور یہ سنسنا کے چڑھتی ہے ایک دن نورا بولی تمہارے بال تو جنگلی گھاس کی طرح بڑھ گئے وہ مجھے ایک باربر کے ہاں لے گئی اسے بتاتی رہی ایسے کاٹو پیسے بھی اسی نے دیئے اس رات مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے میں اندھیرے میں ہی کچھ ٹٹول رہا ہوں اندھیرے میں تو سب رنگ ایک ہو جاتے ہیں لیکن مجھے یوں لگا جیسے اندھیرے میں بھی سبز رنگ میرے کان میں کانا پھوسی کر رہا ہے۔ ہم نے کہیں کماری کی جاترا کی باتیں

میں بہت سے مندر دیکھے ہیں اسے دیوی دیوتاؤں کی کہانی سناتا وہ چپ چاپ سنتی رہتی۔ کنیا کماری کے پوتر جل میں اشنان کرکے ہم گھنٹوں سمندر کے کنارے بیٹھے پیار و محبت کی باتیں کرتے رہتے وہ مجھے دیولزوار چاہتی جب بہت خوش ہوتی تو کہتی میرے ساتھ ہونولولو چلو۔ مس نورا نے بہت سا سوا: قلم بند کیا وہ اپنے اور میرے کردار کو لے کر ایک ناول لکھنا چاہتی تھی کینا کماری کی جاترا میں یہ معلوم ہوتے میں دیر نہ لگی کہ اس کا پیار دائیں ہاتھ کی ہتھیلی میں ہی بستا ہے کئی بار وہ اس گرین ڈرنک کی بات سے بیٹھتی اس کے سویٹ ٹیسٹ کی تعریف کرتی بات کرتے کرتے ایک دن اس کا رنگ زرد پڑ گیا وہ کینا کماری کی ریت پر ایک بھیانک چیخ مار کر گر پڑی اور جب اسے ہوش آیا تو بولی " وہ فوجی سپاہی کہاں گیا۔"

میں نے کہا کون سا فوجی سپاہی ! وہ یہ بات ٹال گئی میں نے بھی چھان بین مناسب نہ سمجھی میں دیر تک اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہا۔

" مجھے تو معلوم ہوتا ہے میرے ہاتھ آج بھی نورا کے بالوں سے کھیل رہے ہیں وہ مجھے ضرور ہونولولو لیجاتی اگر وہ انہونی بات نہ ہو گئی ہوتی نورا کے قصّے کی بھنک میری اس سونے کی گڑیا کے کان میں پڑی اور وہ ملتان سے یہاں چلی آئی جب میں اسے ساتھ لے کر نورا کے یہاں پہنچا تو جاں نثار کا ایک دوست اس کے ساتھ بیٹھا سویرے کی چائے پی رہا تھا ہرے رنگ کی گڑیا سمجھ گئی کہ میں نے اس کے سامنے جھوٹ بولا تھا پھر بھی ہرے رنگ کی گڑیا نے میری سونے کی گڑیا سے ہرے رنگ کی معافی مانگی اور ہم چلے آئے۔

اگلے ہی روز وہ مجھے جاں نثار کے اسی دوست کے ہاں ملنے آئی اور وہ ملاقات مجھے رہتی دُنیا تک یاد رہے گی وہ کچھ اس طرح مسکرائی کہ مجھے کہنا پڑا نورا تم کتنی پاکیزہ ہو وہ ہنس کر بولی " تو تم مجھے دیوی کی طرح پوجنے لگے ہو " میں نے کہا تم چندن کی خوشبودار لکڑی سے گھڑی گئی مورتی ہو تم نے آکر میری زندگی میں خوشبو بھر دی اور اس کے جواب میں نورا اس پیڑ کا قصہ لے بیٹھی جس میں پھولوں کی پتیاں جھڑنے سے پہلے ہی پھل آجاتے تھے میں نے کہا۔ میں نے وہ پیڑ نہیں دیکھا میں تو تمہیں بھی ویسا ہی پیڑ سمجھتا ہوں نورا لیکن میں ابھاگا ہوں کہ میری سونے کی گڑیا بہت سخت ہے ہم پہلے کی طرح آزادی سے نہیں مل سکیں گے۔

آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش۔ گویم مشکل وگر نہ گویم مشکل اس نے بڑی مشکل سے کینا کماری میں بیہوش ہونے کا پس منظر سمجھایا وہ ابھی کمسن ہی تھی کہ ہونولولو کے ساحل پر اسے تن تنہا پاکر ایک فوجی نے ہرے رنگ کا ڈرنک پلا کر اس کا دل بہلایا اور ابھی پھول کھلنے بھی نہ پائے تھے کہ وہ ادھ کھلی کلیاں ہی نوچ کر لے گیا اور

اس حادثے کی چھاپ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کے من پر لگ گئی ابھی ہنس رہی ہے ابھی رونے لگی بات کرتے کرتے ڈر گئی جیسے سامنے والا شخص وہی فوجی سپاہی ہے اور نقلی چہرہ لگا کر اس کے پاس آبیٹھا ہو وہ ہمیشہ ایک خاص طرح کی چیخ مار کر بے ہوش ہوتی جس نے اس سے ازدواجی زندگی کی راحتیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھین لی تھیں کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ زینے میں نیچے کا بلب فیوز ہو جائے اور اوپر والا بلب ٹھیک جل سکتا ہو نورا کا جسم پوری طرح نشو و نما کا حامل بنتے بنتے کہیں اٹک گیا اس کا راستہ دوسرا ہے وہاں محبت لبتی ہے جیسے ہرے رنگ کا ڈرنک کسک دیتا ہے۔"

"جنگ ختم ہوئی تو نورا انسٹی ٹیوٹ سے استعفیٰ دے کر چلی گئی میں سوچتا ہوں اسے ضرور کوئی سہارا مل گیا ہوگا اپنی ہی گرمی سے گرین ڈرنک کسک مارتا ہے اور اپنی ہی نرمی سے ہرے رنگ کی گڑیا گھائل ہو جاتی ہے نورا کی یاد میرے لئے آنچ بھلے ہی نہ ہو روشنی ضرور ہے وہ جہاں بھی رہے خوش رہے۔"

"ہرے رنگ کا کیا کوچ اور کیا مقام، ہرا رنگ کہیں بھی چلا جائے ہرا رنگ تو ہرا ہی رہے گا۔" اگنی متر نے مسکرا کر کہا۔

ریستوران میں کسی کسی میز پر مزاحیہ فقرے چست کئے جا رہے تھے رد یم نے بڑی گرم جوشی سے کہا" جب وہ ہونٹوں پر زبان پھیرتی تو معلوم ہوتا لفظ معنی ڈھونڈ رہے ہیں وہ ایک دن بولی کہنے کو یہ گرم ملک ہے لیکن یہاں کی ہر چیز ٹھنڈی ہے یہاں ہر رات کی ہتھیلی چاند سورج سے خالی ہے کسی کسی رات کی ہتھیلی پر شکر کا ستارہ بھی ہے تو پچکا پچکا۔ اس طرح وہ ہرے رنگ کی گڑیا نہ جانے کیا کیا بول جاتی تھی۔

"او ہرے رنگ کی گڑیا منہ سے بول۔"

رد یم نے دیکھا کہ سامنے بیٹھی کسی کی ہرے رنگ کی گڑیا اسے ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی ہے وہ اپنے ماضی کے ہرے رنگوں میں کھو گیا اس کہانی کے ہرے رنگوں میں کھو گیا جو نورا اس کے اور اپنے بارے میں لکھنا چاہتی تھی جیسے" وہ خود بہت دنوں سے لکھ رہا تھا وہ بولا میرے سونے کی گڑیا کو پتہ چل جائے کہ میں اس ہرے رنگ کی گڑیا کا قصہ لکھ رہا ہوں تو میرے کاغذات اٹھا کر چولھے میں جھونک دے میری سونے کی گڑیا میری ہمسفر ہے لیکن سپنے کی پگڈنڈی پر تو میں تن تنہا چلتا ہوں جہاں تیز تیز ڈگ بھرتا میں جو نولولو پہنچتا ہوں اور نورا میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہتی ہے۔

"تم آ گئے؟" وہ بتاتی ہے کہ اب وہ چیخ مار کر بے ہوش نہیں ہوتی وہ گرین ڈرنک اب بھی

کسک مارتا ہے اور اسے اٹھا کر کہیں سے کہیں لے جاتا ہے اور یہ کہتے کہتے وہ اپنا بازو میری کمر کے گرد حمائل کر دیتی ہے؟

وہ دیر تک اپنے خیالوں میں کھویا بیٹھا رہا جیسے اب ایک لفظ بھی کہنے کو نہ رہ گیا ہو۔ اگنی متر نے اسے جھنجوڑا۔ "دیکھو ادھر"

بائیں کونے میں ایک ادھیڑ عمر کی عورت اکیلی بیٹھی تھی۔ وہ عورت اشتیاق بھری نظروں سے سارے ماحول کا جائزہ لے رہی تھی جب چائے آئی تو عورت نے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے کر رویم کی طرف دیکھا اور پھر پینے لگی۔

وہ سچ مچ بیاہی اٹھ کر اپنے شوہر کے ساتھ زینے کی طرف بڑھی رہی ہرے لباس میں ہرے رنگ کی گڑیا وہی۔ وہی بالکل رویم نے جلدی جلدی اپنی کتابیں سمیٹیں اور وہ بولا "ٹھیک ہے اگنی متر ہر عورت نورا نہیں ہو سکتی لیکن کوئی خیال تو نورا ہو سکتا ہے۔" اگنی متر عینک اتار کر پھر ادھیڑ عمر عورت کو دیکھنے لگا۔

" واقعی یہ عورت تمہاری نورا کی طرف ٹھنڈی چائے کا دھواں ہی معلوم ہوتی ہے کیوں رویم؟ تمہارا خیال کیا ہے؟" لیکن رویم تو جا چکا تھا۔

رام لال

پھر نہیں

ہم زندگی میں اچانک بہت کچھ کھو بیٹھتے ہیں اور افسردہ ہو جاتے ہیں۔ جیسے جانتے ہوں جو کھو چکے ہیں اسے پھر کبھی حاصل نہیں کر پائیں گے اگرچہ زندگی ایک تسلسل کا نام ہے۔ ہمیشہ آگے بڑھتی رہتی ہے۔ جتنا کچھ پیچھے چھوٹ جاتا ہے اس کی یاد ہمارے پاس زادِ راہ کے طور پر ہی رہ جاتی ہے۔ اسی کو ایک تجربہ بھی کہہ سکتے ہیں لیکن ——————

امیرا گورے اور میں نے ایک خاصی طویل مدت تک خط و کتابت کرتے رہنے کے بعد (جو رومانی کم اور حقیقت پسندانہ زیادہ تھی) اچانک یہ فیصلہ کر لیا، اب ہمیں ایک دوسرے سے کسی بھی شہر میں مل لینا چاہیے۔ وہ ناگپور میں رہتی تھی اور میں دہلی میں۔ آخر لکھنؤ میں ہی ملنا طے ہو گیا اور یہ بھی فیصلہ کر لیا گیا کہ جب ملیں گے تو نہ میں اس کے ہسبنڈ کے بارے میں مزید کچھ پوچھوں گا نہ ہی وہ میرے ساتھ میری بیوی کے متعلق کوئی بات کرے گی۔ اس کا بھی ایک کارن تھا۔ ہم خطوں میں ہی ایک دوسرے کو اپنے اپنے پارٹنرز کے بارے میں خاصی تفصیل سے سب کچھ بتا چکے تھے۔ مثلاً یہ کہ ——— امیرا کا پتی جارج گورے بہت زیادہ خود پسند واقع ہوا ہے اور وہ امیرا کی نسبت اپنی ماں کو زیادہ چاہتا ہے۔ جارج اس کی کلب لائف سے بھی مطمئن نہیں ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے امیرا اس کے حلقۂ احباب میں پہنچ کر ایسے لوگوں کو فوراً اپنے قریب کر لیتی ہے جنہیں ذاتی طور پر وہ پسند نہیں کرتا۔ وہ اگرچہ اس کے دوستوں کے بھجوائے ہوئے خطوط کو کبھی کھول کر نہیں پڑھتا بلکہ انہیں اپنی ڈاک سے الگ چھانٹ کر بڑی حفاظت سے اس کے کمرے میں رکھ آتا ہے لیکن ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ وہ شکی مزور ہے۔ اس کی بیوی یعنی امیرا غیر مردوں کے ساتھ خط و کتابت ہی کیوں کیا کرتی ہے! ——— اور اب تو ان کے درمیان بچوں کی تعلیم، ان کے سبجیکٹس اور تعلیمی انسٹی ٹیوشنوں تک کے انتخاب پر اختلاف پیدا ہو جاتا ہے اور آپس کی شکر

رنجیوں کی نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ کسی روز اچانک وہ ایک دوسرے سے طلاق لے لیں گے۔

جہاں تک میری بیوی کا تعلق تھا میں بھی تمہیں بتا چکا تھا کہ ہمارے درمیان بھی ایک مدت سے جذباتی گرمی سرد پڑ چکی ہے جس کا بنیادی کارن ہم دونوں کی ڈھلتی ہوئی عمر ہرگز نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ روزمرہ کے کئی پہلوؤں پر ہمارے رویّوں میں خاصا تضاد پیدا ہو چکا ہے۔ مثلاً میں انٹلکچوئل قسم کے دوستوں میں ہی ہر وقت گھرا رہنے کا عادی ہوں جبکہ وہ انتہائی کم ظرف قسم کے رشتے داروں کو ہی اہمیت دینے کی قائل ہے۔ کیونکہ انہی کی وجہ سے اُسے ایک سماجی تحفظ کا احساس مل سکتا ہے لیکن میں موجودہ زمانے میں سوشل سیکورٹی کو بالکل آؤٹ آف ڈیٹ سمجھتا ہوں۔ کیونکہ یہ ہماری آزادی کو مجروح اور محدود کر دیتی ہے ــــــــ اور چونکہ اپنے بزنس کی وجہ سے میں اکثر اپنے گھر سے دور ہی رہتا ہوں۔ میری بیوی دانستہ طور پر میرے بچوں کی ذہنی تربیت اس انداز سے کرتی رہی ہے کہ اب وہ میرے نظریات کا کھلم کھلا مذاق اُڑاتے ہیں۔

خیر۔ تو جیسے طے ہوا تھا، ہم ایک دوسرے سے کسی شہر میں ملیں گے تو اپنے اپنے گھریلو مسائل کا ذکر ایک دوسرے کے سامنے نہیں کریں گے اور ہم واقعی اس عہد پر کاربند ہی نظر آئے کیونکہ ہم دونوں کے اعصاب پر ایک دوسرے سے پہلی مرتبہ ملنے کی اس قدر خوشی طاری تھی کہ ہم اپنے اپنے تکلیف دہ ماضی کو بھول ہی گئے۔ ہمارے اپنے اپنے شہر اور بچے اور لائف پارٹنرز اور کئی دوسرے لوگ جن سے ہم اچانک دور چلے آئے تھے، ہمارے لیے ایک ماضی ہی تو بن چکے تھے۔ اور اب ہمیں ایسا لگ رہا تھا ہماری عمروں کے بیس بیس یا پچیس پچیس سال اچانک کم ہو گئے ہیں اور ہم نوعمر جذباتی عاشقوں کی طرح ایک دوسرے سے بار بار لپٹ سکتے ہیں اور ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے پکڑے اس قیام گاہ کی جانب فوراً روانہ ہو سکتے ہیں جسے نے ایک دوسرے کی رضامندی سے بہت پہلے ریزرو کرا لی تھی جسے ہماری ادھیڑ عمر کے دو لوگ کسی خاص وجہ سے ابھی تک نہیں منا سکے ہوں! لیکن ہمارے دل و دماغ پر ایک اور مسرت بھی چھائی ہوئی تھی۔ ہم نے ایک دوسرے کو پہلی بار دیکھا تھا۔ پتہ نہیں وہ مجھے اپنی نظروں سے ٹٹول کر کیا محسوس کر رہی تھی! میں اپنے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کا قد و قامت خاصا دلکش تھا اگرچہ اس کی کمر سے چھلکتا ہوا گوشت میری بیوی کے ہی جسم جیسا تھا۔

ساڑھی بلاؤز میں سے لٹکتا ہوا عورتوں کا ماس مجھے کبھی اچھا نہیں لگا، لیکن امیرا کا جسم چونکہ ایک

نئی قسم کی خوشبو دے رہا تھا! میں نے اپنے اندر ایک مدت سے پلتی ہوئی اس خواہش کو دبا لیا کہ کبھی کسی نوخیز لڑکی کی پتلی اور چکنی سفید کمر کو چھو کر دیکھوں گا۔ ہم مرد لنگ بوڑھے ہو کر بھی اس قسم کی خواہش سے نہیں بچ سکتے۔ میں نے ناکام خواہشوں اور نئی امیدوں کے درمیان پنڈولم کی طرح جھولتے ہوئے ایرا جارج کی طرف پھر دیکھا۔ یہ جائزہ لینے کے لیے کہ اس کے بھرے بھرے متناسب اعضا اس کی شخصیت کو زیادہ سے زیادہ کس حد تک چارمنگ بنا سکتے ہیں! میری آنکھوں میں اپنے لیے وہ ایک مسرت بھری حیرت اور بے خوفی اور تعریف کی سی کیفیت پاکر وہ بے حد خوش تو دکھائی دی لیکن اس نے میرے ہاتھ کو دبا کر یہ بھی کہہ دیا۔

"میری جان اس طرح مت دیکھیے جناب! مجھے جارج یاد آنے لگے گا۔ وہ بھی بالکل آپ کی طرح آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کا عادی ہے!"

پہلے تو میں نے ہنس کر اس کی بات ٹالنے کی کوشش کی پھر کہنے کو یہ الفاظ سوجھ ہی گئے "کوئی بھی عاشق کسی حسینہ کی طرف اس طرح دیکھنے سے کیسے باز آ سکتا ہے!"

لیکن مجھے اپنے ہی الفاظ نہایت احمقانہ بھی لگے اور میں ایک بار پھر ہنس دیا۔ یہ اعتراف کر کے۔

"مجھے یقین ہے میں آپ کے سامنے بالکل اُلو قسم کے عاشقوں جیسی باتیں کر رہا ہوں۔"

وہ شاید میری اندرونی گھبراہٹ کو سمجھ کر ہی بولی ——— "پر مجھے یہ سب اچھا لگ رہا ہے بہت ہی اچھا! میں آپ کو یقین دلا سکتی ہوں۔"

قیام گاہ پر پہنچتے ہی اس نے فوراً میرے اور اپنے سامان کو کھلوا کر اِدھر اُدھر قرینے سے رکھوا دیا ساتھ ساتھ میری ہر چیز، کپڑے، چادریں، تولیے، کتابیں، سوپ کیس وغیرہ کا جائزہ بھی لیتی گئی اور پھر بیرے سے چائے لے آنے کے لیے بھی کہہ دیا۔ بیرے کے جاتے ہی وہ مجھ سے معذرت بھری ہنسی کے ساتھ بولی "آئی ایم سوری۔ آپ سے یہ بھی نہیں پوچھا میں نے کہ آپ چائے پینا پسند کریں گے یا کوفی! خیر ہٹائیے اب تو! اس وقت میری خاطر چائے ہی پی لیجیے۔"

میں نے ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا "کچھ باتیں شاید سب ہی گھریلو عورتوں میں کامن ہوتی ہیں۔ جو کچھ وہ خود کھاتی یا پیتی ہیں اسی کے لیے وہ اپنے آدمی کو بھی مجبور کیا کرتی ہیں!"

"لیکن آپ میرے آدمی ہرگز نہیں ہیں۔" یہ کہہ کر وہ زور سے ہنس بھی پڑی۔ "وہ تو صرف جارج ہی ہو سکتا ہے۔ سمجھے! آپ تو بس ایک فرینڈ ہی ہیں میرے۔"

"اپنے آدمی اور دوست میں بہت زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی تو خیالات کے اعتبار سے عورت اپنے دوست کے ہی زیادہ قریب ہوجاتی ہے، مگر جسمانی طور پر وہ اپنے آدمی کی ہی رہتی ہے! اس وقت اگر میں کچھ اور پینا چاہتا ہوں تو! آپ دیکھ رہی ہیں نا، میں کتنا تھکا ہوا ہوں!"

"تو پیجیے نا، جو کچھ بھی آپ پینا چاہیں۔ میں منع تھوڑے ہی کرتی ہوں۔ بس آپ جب تک اپنا شغل فرماتے رہیں گے، میں بالکنی میں جاکر سڑک کی بھیڑ دیکھتی رہوں گی۔"

"سڑک کی بھیڑ کیوں؟ آپ کے لیے میں خود اسی جگہ اپنے خیالات کی بھیڑ لگا سکتا ہوں۔"

"اوہ، ہاؤ لولی یو آر! میں سچ مچ آپ کی باتیں پوری دلچسپی سے سنوں گی۔ اسی لیے تو آپ سے ملنے کے لیے آئی ہوں یہاں تک لیکن کیا کروں، شراب کی بو مجھ سے ذرا بھی برداشت نہیں ہو پاتی یہی ایک کمزوری ہے میرے اندر اور اس بات کو جارج بھی جانتا ہے۔ وہ تو کبھی کبھی جھلا کر مجھے 'یو۔ اولڈ بیچ' تک کہہ ڈالتا ہے! اور میں بھی اسے گندہ سؤر کہہ کر فوراً بدلہ لے لیتی ہوں، لیکن میں شراب کے معاملے میں دقیانوسی ہرگز نہیں ہوں۔ آئی سویر! دراصل میری ناک میں ہی کوئی خرابی ہوگی کہ اس کی بو پاتے ہی مجھے متلی سی ہونے لگتی ہے۔ سچ!"

وہ عجیب بھولے پن سے پھر ہنسنے لگی اور میں خوش ہوکر بولا۔ "ایک سچ بات میں بھی کہہ دوں! میرا ارادہ شراب پینے کا ہرگز نہیں تھا۔ میں تو اسے چھوتا تک نہیں۔ آپ کو بس چھیڑ رہا تھا! لیکن اس معاملے میں میری وائف بھی بے حد فنی ہے۔ بالکل آپ کی طرح وہ بھی قے کرتے جیسا منہ بنا لیتی ہے۔ جب بھی میرا کوئی دوست پی کر میرے یہاں چلا آتا ہے۔ اس وقت وہ چاہتی ہے۔ وہ ہمارے یہاں سے فوراً چلا جائے۔ لیکن یہ بھی کس قدر بھدا لگتا ہے کسی کے ساتھ ایسا سلوک کرنا۔ اس وقت میں بھی آپ کے جارج کی طرح آگ بگولا ہو اٹھتا ہوں!"

ایرا بولی — "لیکن آپ کی بیوی کو اگر واقعی قے نہیں آتی ہے تو اسے خواہ مخواہ کا جھگڑا نہیں کرنا چاہیے آپ سے۔"

میں نے اچانک اسے ہنستے ہوئے ٹوک دیا — "پلیز اسٹاپ اِٹ ایرا۔ جی! یاد ہے ہم نے

کیا طے کیا تھا یہاں آنے سے پہلے! ایک دوسرے کے یا اپنے اپنے گھر کے بارے میں کوئی بات نہیں کریں گے۔ لگتا ہے ہم اپنا اگریمینٹ بھول گئے؟!"

وہ بھی اپنی غلطی کا احساس کر کے ہنس پڑی اور میں نے دیکھا وہ ہنستی ہے یا بولتی ہے تو اس کے دانت بالکل نظر نہیں آتے۔ شاید اس کے دانت بہت چھوٹے چھوٹے ہیں! اس کے چہرے پر اس کے بھرے بھرے ہونٹ ہی زیادہ نمایاں ہیں جن پر بے شمار ننھی عمودی لکیریں ہیں۔ ایسی لکیریں ہر عورت کے ہونٹوں پر نہیں ہوتیں۔ کسی کسی عورت کے ہونٹ تو بالکل سپاٹ ہی ہوتے ہیں اور بے حد چکنے بھی۔ مجھے خاموش پا کر وہ بولی۔ "اچھا بابا، اب ہم گھر کی کوئی بات نہیں کریں گے۔ ایک دوسرے کے بارے میں ہی کریں گے۔ ٹھیک!"

اسی وقت بیرا چائے لے آیا اور رکھ کر چلا گیا تو امیرا میرے پاس آ بیٹھی اور سر جھکا کر چائے بنانے لگی۔ میں اس کے ترشے ہوئے خوبصورت بالوں کی طرف دیکھتا رہا جو اس کے چہرے کے ارد گرد جھول رہے تھے۔ اس نے میرے ہاتھ میں چائے کا پیالہ دے کر میری طرف قدرے حیرت سے دیکھا۔ یہ وہی حیرت تھی جس میں دبی دبی مسرت بھی شامل تھی اور جس میں میں بھی مبتلا تھا اور آئندہ لمحوں میں اور زیادہ مسرور ہو جانے کی توقع کر رہا تھا۔ شاید وہ بھی اسی قسم کا تصور کر رہی تھی۔ میں نے الفاظ ٹٹولتے ہوئے کہا۔ "کسی دوسری عورت سے یعنی ——— دوسرے آدمی کی عورت سے ملنے کا یہ میرا پہلا اتفاق ہے۔"

"اچھا!" وہ شرارت بھری نظروں سے میری طرف دیکھتی ہوئی مسکرا دی۔ "اور کیسا لگ رہا ہے آپ کو؟"

"میرے دل میں کسی قسم کے خوف کا احساس تو ہرگز نہیں ہے کیونکہ ہم اپنے اپنے گھر سے بہت دور ہیں۔ اس وقت پھر بھی ایسا لگ رہا ہے میں کسی دوسرے آدمی کی بیش بہا دولت اڑا لایا ہوں!"

"یہ احساس اڈونچر کا ہے یا کسی اور چیز کا؟" وہ چائے کے گھونٹ نگلتے نگلتے میری طرف ٹٹولتی ہوئی نظروں سے بھی دیکھتی رہی۔

میں نے جواب دیا۔ "پتہ نہیں کیا ہے یہ! لیکن سو فی صدی اڈونچر بھی نہیں ہے۔"

"میرا خیال ہے یہ ڈر ہی ہے جو دراصل تمہیں مجھ سے لگ رہا ہے۔"

پھر وہ معذرت بھری ہنسی کے ساتھ بولی۔ "معاف کیجیے میں کچھ زیادہ بے تکلف ہو گئی!"
"بے تکلف تو ہمیں ملتے ہی ہو جانا چاہیے تھا۔ شاید اسی وجہ سے میں تمہیں ابھی تک دوسرے آدمی کی عورت سمجھ رہا ہوں! جبکہ جانتا ہوں تم اتنی دور سے صرف مجھ ہی سے ملنے کے لیے آئی ہو۔"
"تم بھی تو!"
"ہاں، میں بھی!"
"تو یہی ایڈونچر ہوا نا اور ہمارا ایڈونچر تو اسی وقت سے شروع ہو گیا تھا جب ہم ایک دوسرے کو لمبے لمبے خط لکھنے لگے تھے۔ ان خطوں میں ہم اظہار عشق بھلے ہی نہیں کرتے تھے لیکن اپنے اپنے گھر کی ساری باتیں ضرور لکھ دیتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی بات تک۔ اسی طرح ایک دوسرے کے مسائل جاننے کی کوشش کرتے تھے شاید! کتنا دلچسپ معلوم ہوتا ہے جب دو اجنبی مسائل کی راہ سے دلوں کی گہرائیوں میں اترنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ ہمارے درمیان سیاسی مسائل پر تبصرے بھی اسی نیت سے ہوا کرتے تھے۔" وہ بے اختیار ہنستی ہی چلی گئی۔
"ہاں، جبکہ اچھی طرح جانتے تھے ہمیں نہ مسز گاندھی سے کچھ لینا ہے نہ جمی کارٹر یا بھٹو سے۔ یہ سب سیاست کے کتنے دریا، پہاڑ اور سمندر پار کر کے ایک دوسری حقیقت تک پہنچنے کا ذریعہ بن گیا!"
"اسی لیے میں خوش ہوں کہ ناکامی کا منہ نہیں دیکھنا پڑا ہمیں۔"
"تم بہت ذہین عورت ہو۔" میں نے خالی پیالہ میز پر رکھا اور اسے بتایا۔ "اور خوش تو میں بھی بہت ہوں کہ تم نے اتنی جلدی مجھے ایک بہت بڑی کش مکش میں سے نکال لیا۔ کسی بھی دوسری عورت کی طرف قدم بڑھانا مرد کے لیے بہت مشکل کام ہوتا ہے۔ اب تو میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ میں تم سے ملنے سے پہلے کسی غیبی طاقت کے اشارے پر ہی تم سے محبت کر رہا تھا۔"
وہ اپنا پیالہ ادھورا چھوڑ کر میرے پاس آ بیٹھی۔ میرے دونوں کندھوں پر اپنے ہاتھ رکھ کر بولی۔
"نہیں یہ تم نہیں تھے۔ میں تھی، میں جو تم سے محبت کر رہی تھی! تم نے تو یہ بات کہنے کی جرأت تک مجھ سے حاصل کی ہے۔ یعنی میں ہی اس معاملے میں تمہاری سب سے بڑی طاقت بن گئی!"
"لیکن اتنی بڑی طاقت حاصل کر لینے کے باوجود میں تمہارے جارج کو نہیں بھول پا رہا ہوں جسے میں نے ابھی تک دیکھا ہی نہیں۔ ایسا لگتا ہے وہ مجھ سے زیادہ لمبا چوڑا اور مضبوط شخص ہو گا!"

"وہ کچھ بھی ہے لیکن تمہارے مقابلے میں بہت کم تر ہے اور جب کبھی تمہاری اس سے ملاقات ہو جائے تو تم گھبراست جانا۔ اس کی طرف سیدھے دیکھنا۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تاکہ اسے یہ احساس ہو سکے کہ جو کچھ تم نے مجھے اتنے کم عرصے میں دے دیا ہے وہ خود اتنی لمبی ازدواجی زندگی میں بھی مجھے کبھی نہیں دے پایا۔ تم دیکھنا وہ تمہاری ہی آنکھوں میں اپنی ناکامی کی جھلک پا کر اپنی آنکھیں فوراً جھکا لے گا۔"

وہ کچھ لمحوں تک میری طرف مسکراتی ہوئی دیکھتی رہی۔ پھر میرے چہرے کو چھو کر بولی — "میں تم سے ملنے سے پہلے ہی سمجھ گئی تھی کہ تمہارے گالوں کی یہ ہڈیاں بہت چوڑی اور مضبوط ہوں گی اور تمہاری یہ ٹھوڑی بھی اتنی ہی سخت ہو گی! مجھے یہ چہرہ پسند ہے۔ میرے باپ کا بھی قریب قریب ایسا ہی مضبوط چہرہ تھا۔ مجھے کچھ کچھ یاد آتا ہے۔ جب بہت چھوٹی تھی تو ان کی گود میں بیٹھ کر ان کی طرف بڑی حیرت سے دیکھا کرتی تھی اور میں اپنے اندر ہمیشہ یہی خواہش محسوس کرتی رہی کہ مجھے انہی کی شکل و صورت والا ہی کوئی مرد نصیب ہو سکے! کیا اپنی اس کامیابی میں میں بھی کسی غیبی ہاتھ کا کرشمہ سمجھوں!"

میں جذباتی ہو کر کئی لمحوں تک خاموش ہی بیٹھا رہا تو وہ بولی — "یہ واقعی ایک کرشمہ ہے کہ میں نے تمہیں دریافت کر لیا ہے!"

وہ میرے ساتھ بے اختیار لپٹ سی گئی۔ میرے گالوں کے ساتھ اپنے گال رگڑتی رہی اور اکھڑی اکھڑی سانسوں کے درمیان کہتی رہی — "یہ میں ہوں۔ میں! جو تم سے محبت کر رہی ہوں۔ تم ایسا نہیں بھی کر سکو گے تو میرے لیے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں تب بھی تمہیں اسی شدت سے چاہتی رہوں گی۔ کیوں کہ میں نے بالآخر تمہیں ڈھونڈ ہی لیا ہے۔ اب تمہیں مجھ سے کوئی نہیں چھین سکے گا!"

میں نے بڑی مضبوطی سے اس کے منہ پر اپنا منہ رکھ دیا تو وہ بولی — "چھی! تمہیں تو پیار کرنا بھی نہیں آتا۔ یہ کام بھی میں ہی کروں گی۔ لو دیکھو! کسی عورت کو پیار اس طرح کیا جاتا ہے!"

اس نے میرے ہونٹوں کو بہت دھیرے دھیرے چوسنا شروع کیا اور آنکھیں بند کر لیں اور مجھے اپنے بازوؤں میں پوری طرح سے کس لیا۔ مرد کے لیے یہ بات بہت بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ کوئی عورت اسے اس قدر والہانہ طور پر چاہے: مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ہم اپنے پیچھے کچھ بھی نہیں چھوڑ آئے ہیں۔ جو کچھ ہو، وقت سامنے ہے وہیں سے سب کچھ پہلی بار شروع ہو رہا ہے؛ اگرچہ یہ سب دراصل ایک

روزانہ اخبار کے خطوط والے کالم سے ہی شروع ہو گیا تھا۔ جس میں ایڈیٹر کے نام قارئین خطوط لکھ لکھ کر اپنے خیالات کا اظہار کیا کرتے ہیں۔ کبھی کسی ایڈیٹوریل کی حمایت میں کبھی اس کی مخالفت میں۔ کبھی کبھی اخبار پڑھنے والے بھی ایک دوسرے کے خطوط کے بارے میں لمبی لمبی بحثیں چھیڑ دیتے ہیں۔ ایرا، جارج اور میری دوستی کی بنیاد وہی خطوط بن گئے تھے۔

ہم نے شروع شروع میں کسی نہ کسی سیاسی یا سماجی مسئلے پر ایک دوسرے کی حمایت میں کئی کئی خطوط اس اخبار کے کالموں میں چھپوائے تھے۔ پھر اچانک ایک دوسرے کو براہِ راست بھی لکھنے لگے تھے اور پھر باقی سارے موضوعات کو نظر انداز کر کے صرف ایک دوسرے سے ملنے کی خواہش کا بار بار اظہار کرنے لگے تھے۔ ہماری یہ ملاقات اسی مشترکہ خواہش کی ایک تکمیل تھی۔

رات بہت ٹھنڈی اور خوشگوار تھی۔ ہم ہوٹل کے وسیع لان میں کافی دیر گئے تک ٹہلتے رہے۔ شاید وہ تھک گئی تھی لیکن اس نے رکنے کا نام ایک بار بھی نہیں لیا۔ جب تک میں چلتا رہا وہ چلتی رہی۔ ہم چلتے چلتے باتیں بھی کرتے جا رہے تھے۔ باتوں میں ہم دونوں کی دلچسپی اس لیے بڑھتی جا رہی تھی کہ وہ ہمیں ایک دوسرے کو سمجھنے میں خاصی مدد دے رہی تھیں۔ ایرا کا کہنا تھا "جدید ہندوستانی سوسائٹی میں بھی عورت پر کافی پابندیاں ہیں۔ اس وقت مردوں نے اسے جتنی ڈھیل دے رکھی ہے اس کے پیچھے خود ان کی اپنی لذت کوشی کی تمنائیں بھی کام کر رہی ہیں۔"

میں نے اسے سمجھانا چاہا ــــ "یہ تھوڑی سی آزادی بھی دراصل اکنومک آرڈر سے جڑی ہوئی ہے۔ آدمی کی قوتِ خرید بڑھ جائے گی تو وہ عورت کو پھر گھر کے اندر قید کر دے گا۔"

ایرا نے کہا ــــ "کسی حد تک میں تمہارے اس نقطۂ نظر کے ساتھ اتفاق کر سکتی ہوں، لیکن یہ بھی کہوں گی کہ سوسائٹی جب ایک مرتبہ ٹوٹنے لگتی ہے، تو پھر اس پر جلدی قابو پا لینا آسان نہیں ہوتا۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ سناؤں ــــــ جارج ایک بار ایک گرل فرینڈ کو گھر میں لے آیا۔ میرے ساتھ اسے بڑے اخلاق سے ملایا۔ میں نے بھی اخلاق کے ہی ناطے سے اس کی خاطر تواضع کرنے میں سی بھی کنجوسی سے کام نہ لیا اور یہ بات میں جانتی تھی کہ وہ اس لڑکی سے پہلے بھی گھر سے باہر ضرور مل چکا ہوگا۔ کبھی نہ کبھی! اور آج وہ لڑکی ہمارے گھر میں ہمارے ماحول کو اسٹڈی کرنے کے لیے ہی آئی ہے۔ میرا اور جارج کا آپسی برتاؤ بھی دیکھنے کے لیے اور یہ اندازہ کرنے کے لیے بھی کہ وہ مجھے جارج سے الگ

کر کے اس گھر میں رہ سکے گی یا نہیں! لیکن شاید اسے بڑی مایوسی ہوئی ہوگی یہ دیکھ کر کہ میں بہت زیادہ محبت کرنے والی عورت ہوں اور رُومانی بھی واقع ہوئی ہوں اور میری یہی دو خامیتیں جارج کو مکمل طور پر مجھ سے الگ نہیں ہونے دیں گی۔ اب دیکھو نا میں اور جارج ایک مدت سے ایک دوسرے کے ساتھ سوئے تک نہیں، لیکن پھر بھی وہ میری بہت عزت کرتا ہے "

میں نے پوچھا ۔" تم شاید یہ بھی کہنا چاہتی تھیں جارج ابھی تک اس لڑکی سے ملتا رہتا ہوگا، لیکن تم سے مستقل طور پر الگ ہونے کے بارے میں کبھی نہیں سوچتا!

ہاں، میں نے خود اس سے ایک دن کہہ بھی دیا تھا ۔" وہ لڑکی اگر تمہاری داشتہ بن کر کہیں اور رہ سکتی ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا، لیکن شاید وہ خود کو اس کا خرچ برداشت کرنے کے قابل نہیں پاتا ہے اسی لیے بہت کم اس سے یا دوسری لڑکیوں سے مل سکتا ہے "

لان سے واپس آتے ہوئے میں نے بھی اسے ایک واقعہ بتا دینے میں کوئی قباحت نہ سمجھی۔

" میں نے جب شادی کی تو مجھے معلوم تھا میری بیوی پہلے بھی کسی سے جذباتی طور پر وابستہ تھی، لیکن حالات کچھ ایسے بن گئے کہ شادی اسے میرے ہی ساتھ کرنی پڑ گئی۔ میں بھی اسے بہت چاہتا تھا۔ اس نے مجھے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ میں پوری کوشش کروں گی اسے بھول جانے کی لیکن اس کے لیے تم مجھے کبھی طعنہ وغیرہ مت دینا۔!"

" پھر؟" ایرا نے ہمارے کرائے کے کمرے کے سامنے پڑی ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھتے ہوئے کہا ۔" وہ اس آدمی کو واقعی بھول گئی پھر!"

میں نہیں کہہ سکتا، لیکن شاید ان معنوں میں وہ اسے واقعی نظر انداز کر چکی ہے جس مطلب سے تم پوچھ رہی ہو، لیکن وہ اسی آدمی کی کتنے برسوں سے پاس بھی تو ہے! پہلے بھی وہ اسی دفتر میں ساتھ کام کرتے تھے اور میں تو اس آدمی کی بھی بڑی قدر کرتا ہوں "

" کیونکہ وہ تمہاری بیوی کو کبھی چاہتا تھا!"

" شاید یہی وجہ ہو شاید وہ اب بھی اسے چاہتا ہو! پھر بھی ہمیں انسانی جذبوں کی پاکیزگی کا احترام تو کرنا ہی چاہیے "

لیکن شاید تمہارے دل میں احترام اپنی بیوی کے لیے بہت زیادہ ہے۔ اس آدمی کی نسبت۔

(باقی صفحہ ۲۴۹ پر)

جوگندر پال

بھاؤں، بھوں

احمد نے تانگے والے سے کہا کہ اب بائیں طرف اس کچی گلی میں مڑ جاؤ۔

تانگے والا مڑنے لگا لیکن اسی اثناء میں گلی سے بطخوں کا غول کا غول ٹائیں ٹائیں کرتے ہوئے برآمد ہوا اور تانگے والے نے سرعت سے لگام کھینچ لی اور بڑی بے تابی سے بطخوں کے گزرنے کا انتظار کرنے لگا

— ارے بھئی، تیز تیز چلو اور راستہ خالی کرو۔"

ٹائیں ٹائیں!

ایک بطخ احمد کی طرف دیکھ کر رک گئی — ٹائیں! — دوسریوں نے بھی رک کر اس کی طرف گردنیں اٹھالیں — ٹائیں — ٹائیں — ٹا — !

احمد طربناک سی پریشانی سے تانگے والے کی طرف دیکھنے لگا۔

ٹائیں ٹائیں — ٹا! —

شاید وہ ایک دوسرے کو بتا رہی تھیں — ہاں یہی ہے وہ! — ٹائیں!

اری کچھ مجھے بھی بتاؤ، کون ہے؟

وہی، اور کون؟ ہمارے محلے میں رہنے آیا ہے۔

اچھا! — ایک طرف ہٹو، میں بھی دیکھ لوں — ٹائیں! — کیا گبرو جوان ہے! — ٹائیں

ٹا — ٹائیں! —

اچھا، مرتی ہو تو مرو! — تانگے والے نے گھوڑے کو حرکت میں لانے کے لئے کھینچی ہوئی لگام کو ڈھیلا چھوڑ دیا — چلو بیٹے!

ٹائیں — ٹا! —

اچانک ایک کتا کہیں سے وارد ہو کر تانگے کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔

"اچھا تو آپ ہیں؟

ہوں تو یہی ہی یار ــــ احمد کو لگا کہ اس نے واقعی کتے سے جواباً کہا ہے اور وہ مسکرانے لگا۔

آپ نے مجھ سے کہا؟ ــــ تانگے والے نے مڑ کر احمد سے پوچھا۔

بھوں ــــ بھاؤں ــــ بھاؤں! ــــ کتا بھونک بھونک کر تانگے والے کو مخاطب کرنے لگا

ــــ آگے دیکھو ــــ آگے! ــــ

واقعی تانگے والا آگے دیکھنے سے ذرا چوک جاتا تو اس کا تانگہ ایک بڑھیا کو روند کر آگے جا چکا ہوتا۔

کیسے لوگ ہیں صاحب؟ بیچوں بیچ آ جا رہے ہیں۔

بھوں ــــ بھاؤں! ــــ وہ بے چاری تو بوڑھیا ہے۔ تم ہی ایک طرف ہو کے کیوں نہیں چلاتے؟

بھوں ــــ بھاؤں ــــ بھاؤں! ــــ

گنگارام! ــــ ارے او گنگارام! ــــ ایکا ایکی ایک جوان لڑکی بھاگتی ہوئی اپنے کھلے دروازے پر آ کھڑی ہوئی ــــ گنگا ــــ!

احمد تعجب سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا کہ وہ کسے بلا رہی ہے۔

تمہاری روٹیاں پڑی پڑی سوکھ رہی ہیں گنگارام۔

ارے! تو یہی ہے گنگارام!

کتے نے ذرا سا رک کر لڑکی کی طرف سر اٹھا لیا ــــ بھاؤں!

نہیں، میں تمہاری نوکر نہیں، جو تمہاری راہ تکتی رہوں۔

بھاؤں ــــ بھوں! ــــ ابھی آتا ہوں! ــــ وہ پھر تانگے کے پیچھے دوڑنے لگا۔

ارے بھئی، جاؤ، روٹیاں کھاؤ ــــ احمد نے گویا مسکرا مسکرا کر اسے مشورہ دیا ــــ کیوں بھوکے پیٹ دوڑ دوڑ کر جان ہلکان کر رہے ہو؟

بھاؤں! ــــ آپ ہمارے ساتھ رہنے آئے ہیں تو کم سے کم آپ کو گھر تک تو چھوڑ آؤں ــــ شوق سے بھرا بھرا گنگارام تانگے کے آگے ہو لینے کے لئے پہلو کے راستے کی طرف اچھلا تو احمد لپک کر پیچھے

سمٹ گیا ـــ ہٹ! ـــ چل ہٹ! ـــ

قدم سیٹ کے اوپر کر لیجئے صاحب ـــ کوچوان نے احمد کو متنبہ کیا ـــ آوارہ کتوں کا کیا بھروسہ؟

بھوں ـ بھو ـ بھاؤں! ـــ گنگارام فرطِ شوق سے بھونکتے ہوئے گھوڑے کے آگے آگے دوڑنے لگا ـ بھوں! ـــ میرے پیچھے پیچھے آتے جاؤ گھوڑے ـــ آؤ مجھے معلوم ہے انہیں کہاں جانا ہے ـــ آؤ اب اِدھر دائیں طرف مڑ جاؤ ـــ وہ ـــ وہ آخری گھر ہے ـــ بھاؤں! ـــ ہٹو موسی! ـــ وہ گلی کے عین درمیان بیٹھی ہوئی ایک بھوری بلّی سے مخاطب ہوا ـــ دیکھتیں نہیں، تانگہ آرہا ہے ـــ میاؤں! ـــ بھوکی ہو تو مجھے کھاؤ گی کیا؟ جاؤ شیخو گوالے کی کچھلی کھڑکی کا پٹ ٹوٹا ہوا ہے! ـــ آتے جاؤ گھوڑے! ـــ وہ گھر ہے ـــ یہ ـــ لو آ گیا ـ بھوں ـ بھاؤں! ـ ٹھہرو بھئی، یہی ہے۔ آگے کہاں جا رہے ہو؟ ـــ بھاؤں! ـــ

بس، یہیں! ـــ احمد نے کوچوان سے کہہ کر تانگہ رکوا لیا۔

مکان ابھی نیا ہی بنا تھا لیکن باہر کا پلاسٹر نہ ہونے کے باعث میلا کچیلا سا معلوم ہو رہا تھا۔ ارد گرد انیٹوں کی چار دیواری کی بجائے لوہے کا نوکیلا تار بندھا ہوا تھا۔ پہلو میں چند سو مربع گز کا ایک پلاٹ تھا اور اُس کے آگے ایک پرانا کھلا قبرستان، جہاں اِدھر اُدھر چند ٹوٹی پھوٹی پکی قبریں تھیں، لبی لبی قبریں! ـــ وہ بکری اُس قبر کے سوراخ میں منہ ڈالے پوچھ رہی تھی، کیوں دادا، خیریت سے ہو؟ اندر دم گھٹ رہا ہے تو باہر آ جاؤ! ـــ قبرستان میں جہاں جہاں زمین ہموار ہو چکی تھی وہاں وہاں قبروں کے باسیوں نے قبروں سے باہر نکل کر جھونپڑے بنا لئے تھے، شادیاں کر کے ڈھیروں بچوں کے باپ بن گئے تھے ـــ اُن کے بچے کھیلنا چھوڑ کر دوڑ کے تانگے کے آس پاس جمع ہونے لگے ـــ او بچّو ـــ ایک نیم برہنہ گندی عورت اپنے آپ کو ڈھانپنے کی کوشش میں اور برہنہ کرتی ہوئی چلائی ـــ گھتّے کو بھی ساتھ لے جاؤ، رو رہا ہے ـــ سامنے کے گھر کے دروازے پر ٹاٹ لٹک رہا تھا اور ٹاٹ کے آگے گھر والے ایک دوسرے سے جُڑ کر اپنے پیروں پر جھولتے ہوئے کسی پھٹے پرانے پردے کی تصویر پیش کر رہے تھے جس پر جا بجا پیوند لگے ہوتے ہوں۔ ایک پیوند پردے سے اُدھڑ کر احمد کے پاس چلا آیا۔ اُس کے بوڑھے چہرے پر ان گنت جُھریاں تھیں، گویا باسی آٹے پر چیونٹیاں ہی چیونٹیاں۔

تمہارا ہی نام لطیف احمد ہے نا ؟

جی ہاں ۔

کمیٹی کے دفتر میں کام کرتے ہو نا ؟

جی ہاں ۔۔۔

کیا کام کرتے ہو ؟

جی ہاں ! ۔۔۔ احمد بوکھلا گیا ۔

وہ بوڑھا ہنسنے لگا اور چیونٹیاں سراسیم ہو کر ایک دوسرے پر چڑھ دوڑیں ۔

میرا نام امجد علی ہے ۔ سید امجد علی ۔۔۔ اور یہ میرا جدی مکان ہے ۔ احمد کی سمجھ میں نہ آیا کہ اسے کیا جواب دے ۔

بڑے پیارے بچے ہو ۔ تمہارے مالک مکان شبیر صاحب اپنے سبھی گھر والوں کے ساتھ آج اپنی بہن کے یہاں گئے ہوئے ہیں ، شام کو لوٹ آئیں گے ۔۔۔ انہوں نے ہمیں تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے ۔ اب جھٹ سے شادی کر کے اسی محلے میں بس جاؤ ۔۔۔ سید امجد علی منہ پھیر کر ٹاٹ کے آگے آگے چلتے ہوئے پردے کے ایک رنگدار پیوند کی طرف دیکھنے لگا جس کے کمزور ٹانکے اس کی بے صبر مسرت آگیں متلاطم حرکت سے ٹوٹتے جا رہے تھے ۔

کھڑے کھڑے اس طرح جھولنے سے گر جاتے ہیں شنّو ۔۔۔ امجد علی نے اس طرف دیکھ کر کہا ۔۔۔ یہ میری بیٹی شنّو ہے ۔

ہی ہی ۔۔۔ ہی ۔۔۔ ہی ! ۔۔۔ شنّو کے منہ سے پچکاری سی چھوٹ گئی اور کئی ریشمی ہنسی اچھل کر ان کے قدموں میں آگری ۔

بھوں ۔۔۔ بھاؤں ! ۔۔۔ جاؤ شنّو ، اندر جاؤ ۔۔۔ بھاؤں ! ۔۔۔ کنواری لڑکیاں گلی میں اس طرح کھلے منہ کھلے سر نہیں ہنستیں ۔۔۔ بھاؤں !

احمد نے تانگے کے اگلے حصے میں اپنا فولڈنگ بیڈ اور بستر رکھا ہوا تھا جنہیں محلے کے بچے اس سے پوچھے بغیر تانگے سے اتار رہے تھے ۔ بقیہ سامان وہ دو روز پہلے ہی جما گیا تھا ۔

احمد سے پیسے وصول کر کے کوچوان تانگے کو موڑنے لگا ۔

بھاؤں! ــــ گنگا رام شنو کو بدستور گھر کے اندر جانے کو کہہ رہا تھا۔

جاؤ، نہیں جاتی!

بھاؤں! ــــ!

یہ ہمارا گنگا رام ہے، ہمارے سارے محلّے کا چودھری! ــــ کیوں گنگا رام، احمد میاں سے مل لیئے؟

بھاؤں! ــــ ہاں، مل لیا ہوں ــــ بھاؤں! ــــ گنگا رام کی نظر اچانک پنڈت رام رکھا پر پڑ گئی جو بدن پر دھوتی لپیٹتے، لاٹھی سنبھالتے اِدھر ہی آ رہا تھا ــــ بھاؤں! ــــ اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو پنڈت؟ ــــ بھوں ــــ بھو! ــــ بیٹوں کی تلاش میں نکلے ہو تو وہ دونوں مکئی کے دانے کے پاس سر جوڑ کر مزے سے گھاس چر رہے ہیں۔

حرام خور آخر بیل کی اولاد ہیں۔ مجھ بڈھے کو اکیلا چھوڑ جاتے ہیں اور گھنٹوں نہیں لوٹتے ــــ میں بھی کسی دن چھوڑ کر کہیں نکل جاؤں گا۔

بھاؤں! ــــ کیا ہوا پنڈت؟ تمہارے چرنے کے دن تو بیت گئے ــــ بھوں! ــــ اُن کے دن تو اب کہیں آئے ہیں!

احمد کی نظر قبرستان میں بھٹکنے لگی تھی کہ اچانک کسی نادیدہ وجود سے ٹکرا گئی۔

کون؟

اُس نے دیکھا کہ جیسے وہ دیکھ رہا ہے وہ کچھ نہ کچھ تو ضرور ہے پر اُس کی کوئی شکل ہی نہیں ــــ وہ کچھ دیکھنے کی بجائے اندھوں کے مانند آنکھیں کھولے گھور گھور کر سوچ رہا ہے۔

اے بھائی، گھبرا کیوں گئے ہو؟ نئے آئے ہو اِس لئے تمہیں معلوم نہیں ــــ پورے پونے چار سال سے یہیں رہ رہا ہوں ــــ وہ ــــ وہ بنگلہ دیکھ رہے ہو ــــ کرنل کا بنگلہ ــــ بس اُسی کے بائیں پچھواڑے میری آرام گاہ ہے۔ کبھی فرصت ہو تو حضر دینا نا۔

احمد کی آنکھیں اُس بنگلے کی طرف مڑ گئیں۔

وہ بنگلہ کرنل جے رام کا ہے جی ــــ پنڈت رام رکھا اُسے بتا رہا تھا ــــ اتنے بڑے بنگلے میں بیچارہ اکیلا رہتا ہے۔ بڑا اچھا آدمی ہے لیکن نشے میں ہو تو ہم اُسے دیکھتے ہی دروازے بند کر لیتے ہیں۔

ہاں بھائی، ملٹری کا آدمی ہے ــــ سیّد امجد علی کہنے لگا ــــ کون جانے جھٹ سے بپھرا ہوا ایسے

نکال کر دو چار گولیاں تڑا تڑ چھوڑ دے۔

نشے میں اُسے ذرا بھی ہوش نہیں رہتا۔ ہم سب کو گالیاں بکتے ہوئے اپنے پڑوس میں سیاں بابا کی قبر کے باہر جا بیٹھتا ہے اور پھر دونوں میں گھنٹوں نا معلوم کیا کیا باتیں چلتی رہتی ہیں۔

اے پنڈت، احمد میاں کو وہ قصّہ بھی سناؤ نا، جب کرنل نے ایک بار نشے میں سیاں بابا مرحوم پر گولی چلا دی تھی ——— بابا مرحوم کو کیا گزند پہنچتی، اُس نے مسکرا کر کرنل کو بتایا، جو بندہ والا ایک بار آپ ہی مر جاتا ہے، اُسے تمہاری ساری فوج بھی نہیں مار سکتی۔ جاؤ ٹھنڈے پانی سے نہا کر ہوش میں آجاؤ تو میرے پاس لوٹ آنا ———

بھوں — بھاؤں! — میں روٹیاں کھا کے ابھی آتا ہوں۔ بھاؤں! — ورنہ کاسہ باقی مل گی — گنگارام دُم ہلاتے ہوئے پلٹ گیا۔

احمد نے کتے سے آنکھیں موڑیں تو بچے اُس کا سامان اُٹھا کر مکان کے احاطے میں داخل ہو رہے تھے۔

اے بھئی، تم سب کیوں ——— وہ بھی اُن کے پیچھے ہو لیا۔ اُس کے کمرے کا دروازہ مکان کے پہلو میں خالی میدان کی طرف کھلتا تھا ——— وہ سوچ رہا تھا میں نے یہاں اس باہری کمرے کو اس لئے ترجیح دی تھی کہ مالک مکان سے الگ تھلگ آزادانہ رہنے کو ملے گا مگر یہاں تو سارا جہاں میری بود و باش میں شریک ہو گا ——— ار۔ر۔ر! بستر گرا دیا۔ دیکھو کھل گیا ہے ——— بچے بستر کو لپیٹنے لگے ——— نہیں، میں آپ ہی باندھ لیتا چلا کروں گا۔ اندر جا کے خواہ مخواہ ہر شے کو چھیڑیں گے ——— نہیں، میں آپ ہی اُٹھا کر لے جاؤں گا ——— اب تم جاؤ!

کمرے کا تالا کھولتے ہوئے احمد نے دیکھا کہ مکان کے پیچھے نشیب پر کئی جھونپڑے بنے ہوئے ہیں اور جھونپڑوں کے نیچے گندا نالا بہہ رہا ہے جو کئی دھاروں میں بٹ بٹ کر بار بار یکجا ہو جاتا ہے اور یکجا ہو جاتا ہے تو اُس کی کثافتیں فراواں ہو ہو کے اپنے آپ بے وزن ہو جاتی ہیں اور اُس کے وجود سے شاداں پرندے اُڑنے لگتے ہیں ——— لطیف احمد کو دفعتاً احساس ہوا کہ وہ دراصل شنّو کے بارے میں سوچ رہا ہے ——— ہی ہی ——— ہی ——— ! ——— وہ ہنسی کی پچکاری سے بچنے کے لئے ذرا سا اچھلا۔

"تالا نہیں کھل رہا بابو؟ ——— ایک لڑکا مکان کے باہری دروازے کی طرف جاتے ہوئے لوٹ آیا ——— لاؤ میں کھول دوں۔

نہیں، جاؤ تم ——— اپنا ہی گھر ہے تو کھل جائے گا۔

تالا تو کھل گیا لیکن اندر قدم دھر کر احمد کو اندر آجانے کا احساس نہ ہوا، گھر تو وہاں ہوتا ہے جہاں پہنچنے والے کا انتظار ہو رہا ہو؟ جہاں کہیں دو دن یا دو سال کا ٹھکانا مل گیا وہیں ذرا دم لینے کو رُک گئے ـــــ اُسے محسوس ہونے لگا کہ اُس کا بدن تھکن سے ٹوٹ رہا ہے ـــــ سو جاؤں! ـــــ اُس نے جلدی جلدی فولڈنگ بیڈ کو بچھایا اور اُس پر بستر لگا کر ویسے ہی جوتوں سمیت لیٹ گیا ـــــ او ــ و! دروازہ کھلا رہ گیا ہے! ـــــ لیکن اُٹھنے کی بجائے پہلو بدل کر اُس نے آنکھیں موند لیں اور اندھیرے اور اُجالے کی صفیں سرعت سے ایک دوسرے میں دھنس کر بکھر گئیں اور ـــــ اور ـــــ ٹھک ـــــ ٹھا ـــــ ٹھک ـــــ ٹھا ریل گاڑی چلنے لگی ـــــ ٹھک ـــــ ٹھا! ـــــ وہ ریل گاڑی کے اندر ہے یا باہر؟ ـــــ نہیں، وہ تو یہاں لیٹا ہوا ہے ـــــ ٹھک ـــــ ٹھا ـــــ اُس نے آنکھیں کھول کر دیکھنا چاہا لیکن یوں ہی آنکھیں بند کئے پڑا رہا ـــــ ہاں، وہ ریل گاڑی میں ہی بیٹھا ہوا ہے ـــــ نہیں، لیٹا ہوا ہے ـــــ ٹھک ـــــ ٹھا ـــــ گھر جا رہا ہے ـــــ اور ـــــ اور اپنی گلی میں آ پہنچا ہے ـــــ ہی ہی ـــــ ہی ـــــ ہی! ـــــ اتنی دیر سے کیوں آئے؟ ـــــ وہ گھبرا گیا ہے ـــــ بولو اتنی دیر سے کیوں لوٹے؟ ـــــ اُس کی باچھیں کھل گئی ہیں ـــــ ہی ہی ـــــ ہی ہی ہی ـــــ ہی! ـــــ ار ـــــ ر! پرے ہٹو شنّو، بھیگ جاؤں گا! ـــــ یہ بات ہے؟ ـــــ تو لو ـــــ ہی ہی ہی! ـــــ ار ـــــ ر! ـــــ ہی ہی! ـــــ ہی ہی ـــــ دیکھو ذرا نہلاتے ہو تو کتنے پاک نکل آئے ہو! ـــــ نہیں، جمعہ کے جمعہ نہیں، ہر روز نہایا کرو ـــــ ہر روز! ـــــ گندے نالے کے اوپر نشیب پر اُن کا ـــــ اُس کا اور شنّو کا کچا سا گھر ہے ـــــ نہیں، میرا ہاتھ تھام کر اسی طرح چُپ چاپ پڑے رہو ورنہ لڑھک کر گندے نالے میں جا گرو گے ـــــ نہیں ـــــ نہ! شرم کرو، وہ دیکھو سیاں بابا کا بھوت اِدھر ہی آ رہا ہے۔ دیکھ لے گا تو کیا کہے گا ـــــ السلام علیکم، بابا! کدھر سے آ رہے ہو؟ ـــــ وعلیکم السلام بچو! کرنل کے لئے یہ بوتل اُٹھا لایا ہوں۔ شراب پی پی کر معدے کے درد کے مارے لفٹ رائٹ، لفٹ رائٹ کر رہا ہے ـــــ لاؤ بابا، تمہارا ہاتھ پکڑ کر اوپر لے جاؤں ـــــ نہیں بیٹے، دم نکل چکا ہے تو کیا، اب اپنے آپ اوپر بھی نہ جا سکوں گا؟ ـــــ ہی ہی ہی! ـــــ ٹھہرو شنّو! ـــــ نہیں، آتے جاؤ ـــــ ہی ہی ـــــ وہ شنّو کے پیچھے بھاگتے ہوئے یہاں گندے نالے کے کنارے ترکاری سے لدے ہوئے سرسبز کھیت میں نکل آیا ہے ـــــ ہائے، کتنے بڑے بڑے گوبھی کے پھول ہیں، لاؤ چُنّی کے دونوں طرف ایک ایک باندھ لوں ـــــ مجھے بہت اچھا ـــــ بہت ہی اچھا لگ رہا ہے احمد ـــــ جی چاہتا ہے اِس کھیت میں سما جاؤں احمد، اور اِن سارے گول گول پھولوں کو اپنی گود میں چین سے پڑے ہوئے محسوس کروں! ـــــ شنّو!

ہ — کہاں غائب ہو گئے ہو شنتو؟ — شں — اشی — ی! — چُپ! دیکھتے نہیں میرے بچوں کی آنکھ لگ گئی ہے؟ — ا — کہاں ہو شنتو؟ — کھیت چپکے سے نالے کے بے چین گندے پانی کو چوس رہا ہے اور کوکھی کے پھول خواب ہی خواب میں پرورش پا رہے ہیں اور دھرتی کو پہلو بدلنے کی شدید خواہش ہو رہی ہے مگر وہ جوں کی توں سانس روکے پڑی ہے کہ اُس کے نونہال ہڑبڑا نہ جائیں — شنتو! — شی — ی! — چُپ! — ٹھک — ٹھا — ٹھک — ٹھا — ریل گاڑی پھر نمودار ہوئی ہے اور اِس قدر تیز رفتاری سے حرکت میں ہونے کے باوجود اُسی ایک مقام پر کھڑی ہے جہاں وہ سویا ہوا ہے — ٹھک — ٹھا — بھوں — بھاؤں — شنتو! — کہاں ہو شنتو؟ — شی — ی! — چُپ! بھوں — بھاؤں — بھاؤں! — احمد کے ٹخنے پر کٹکٹ ناسا ہوا اور وہ سوتے سوتے ایک دم ہڑبڑاتے ہوئے ٹانگیں کھینچ کر بیٹھ گیا۔

بھاؤں — بھاؤں — بھوں! — گنگارام اُس کے بستر پر بیٹھا تھا — بھاؤں! —

احمد نے بدحواسی میں کھڑے ہو کر پاس ہی کونے میں رکھی ہوئی مچھردانی کی لوہے کی سلاخ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لی اور اسے زور سے گنگارام پر دے مارا۔

ک — ٹک! — گنگارام کی ٹانگ کی ہڈی نے کھال کے اندر ٹوٹ کر فریاد کی اور گنگارام نے چیختے ہوئے اپنے آپ کو بیڈ سے گرایا اور بے اختیار آہ و بکا کرتے ہوئے گھسٹ گھسٹ کر دروازے سے باہر نکل گیا۔

احمد نے ہانپتے ہوئے دروازے کی چٹخنی اندر سے چڑھالی اور پلٹ کر اپنے بستر پر آ بیٹھا اور اپنے آپ کو سمجھانے لگا کہ جو بھی ہے، آخر کتا ہے — وہ تو خیر ہوئی کہ میری آنکھ کھل گئی ورنہ کیا پتہ کیا سوچ کر اپنے دانت میرے وجود میں گاڑ دیتا — ہمارا چپڑاسی پیٹ میں یہ بڑی بڑی چودہ سوئیاں کھبوا کر بھی چلتا بنا تھا — ساڑھے تین — ابھی تھوڑا اور سو لیا جائے — اور وہ پہلے کے مانند ویسے ہی جوتوں سمیت پھر لیٹ گیا اور لیٹے لیٹے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور ایک لمبا راحت آگیں کش لیتے ہوئے اُس کی آنکھیں مندنے لگیں — اور پونے دو گھنٹے کے بعد وہ جاگا تو اُس کی پھٹی پھٹی آنکھوں نے دیکھا کہ سگریٹ سے بستر کی اوپری چادر اُس کے پہلو میں جل جل کر اُس کے جسم کے قریب آ کے بجھ گئی ہے اور چادر کے نیچے میٹرس پر بھی سیاہی سی آ گئی ہے اور بجھا ہوا سگریٹ اپنے دفاع میں اُس سے مخاطب ہے کہ اِس میں میرا کیا قصور؟ تم نے آپ ہی تو مجھے جلا کر اپنی آنکھیں موند لیں شکر کرو تم خود بھسم ہونے سے بچ گئے ہو — احمد کی سمجھ میں

کچھ بھی نہیں آرہا تھا سو اُس نے عادتاً خدا کا شکر ادا کیا کہ بچاؤ ہو گیا ـــــ میرا بھی جل جل کر بھسم ہونا ہو جاتا تو کتنی اذیت ناک موت ہوتی ـــــ اُسے ہندوؤں کی لاش کو جلانا بڑا عجیب لگتا تھا کہ مرحوم کا جو کچھ بھی رہ جاتا ہو گا اُس کا جلنا محسوس کر کر کے اپنی تمام تر نیکیوں کے باوجود سیدھے پہلے اُسے جہنم ہی کا سامنا ہوتا ہو گا۔

احمد نے سوچا کہ تھوڑی دیر کھلی ہوا میں گھوم آؤں، تو طبیعت سنبھل جائے گی۔

باہر آ کر اپنے سامنے قبرستان کی طرف نگاہ دوڑا کر اُسے نا معلوم کیونکر محسوس ہوا کہ قبروں میں ایک بھی مُردہ زندہ نہیں۔ اُسے حیرت سی ہوئی اور اُس نے جی ہی جی میں اُن کے حق میں دعائیہ کلمہ پڑھا اور تیز تیز چل کے مکان کے احاطے سے نکل آیا۔ گلی میں وارد ہو کر وہ کچھ متعجب ہو کے ذرا سا ٹھہر گیا کہ وہ سوّرنی اتنی دُور سے اُسے دیکھتے ہی اپنے بچوں کو ہانکتی ہوئی اور پرے کیوں بھاگ گئی ہے۔ اُس کی آنکھیں بہت دُور تک اُن کا تعاقب کرتی رہیں۔ سوّرنی کا بھدا پن اُسے بھلا لگ رہا تھا ـــــ اُس کے خرگوش جیسے ننھے منّے کومل بچے اُن خاردار جھاڑیوں میں پھنس پھنس کر بھاگتے ہوئے لہولہان ہو رہے ہوں گے ـــــ یہ کیوں مجھ سے خوفزدہ ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے ہیں ـــــ اپنے کندھوں کو اچک کر دو قدم چل کر وہ امجد علی کے مکان کے سامنے مسکراتے ہوئے رک گیا اور گدگداتی سی خواہش سے مغلوب ہو کر لٹکتے ہوئے ٹاٹ کے پردے کے پیچھے ہاتھ ڈال کر دروازہ کھٹکنے لگا۔

کون؟

(وہی!ـــــ جاؤ، نہیں جاتی!) مَیں ہوں لطیف احمد۔

ابّا گھر میں نہیں۔

کب آئیں گے؟ ـــــ اُس نے سوچا، شنّو نے شاید اُسے پہچانا نہ ہو ـــــ مَیں لطیف احمد ہوں، آپ کے سامنے کے مکان کا نیا کرایہ دار۔

بول دیا نا، گھر میں نہیں۔

ٹاٹ کے پیچھے دروازہ ـــــ ٹاک سے بند کر دیا گیا۔

امجد علی کے مکان کی باؤنڈری سے باہر نکل کر وہ شرم اور خفگی سے گلی میں تیز تیز چل رہا تھا کہ ایک مرغی اُس کے پیروں سے چھپاک سے اُڑی اور اوجھل ہو گئی۔

بڑے جری ہو بابو ـــــ سامنے سے پنڈت رام رکھا اپنے دونوں بیٹوں کے آگے آگے آرہا تھا۔ ذرا ہوشیاری سے کام لے کے روند دیتے نا! بے چاری کو بچنے کا موقع کیوں دیا؟

میں حیرت سے اُس کی طرف تکنے لگا ___ نہیں، اُس کے ڈیلوں کی طرف، جو اس کی زہر بھری نظروں سے آگے نکل کر مجھ پر اُچھل پڑنا چاہ رہے تھے۔

نہیں، بیٹو، سرکار نے تمہیں پھانسی کا حکم دے دیا تو میں کیا کروں گا ہے ___ آؤ بابو سے کرنل سنبھل لے گا۔

ٹھہریے پنڈت جی، آخر میں نے کیا کیا ہے؟

پوچھتے ہو، کیا کیا ہے؟ ___ وہ بےچارہ محلّے بھر میں دہائی دے رہا ہے کہ میں سنتو کی بات چھیڑنے کے لئے بابو کے پاس گیا مگر بابو نے میری ٹانگ توڑ کے رکھ دی!

بھاؤں ___ بھاؤں ___ بھوں!

(بقیہ پھر نہیں صد ۲۳۹ سے)

تمہاری باتوں سے یہی لگتا ہے:" اس نے کرسی کی پشت پر اپنا سر ڈال کر کہا۔

میں نے کوٹ کے اندر سے پائپ نکال کر اس کے اندر جما ہوا کاربن کھرچتے ہوئے جواب دیا۔

اور تمہاری باتوں سے بھی یہی احساس ہوتا ہے کہ تم جارج کو نظر انداز نہیں کر سکتیں!

"شاید ہم پھر اپنے ایگریمنٹ کو توڑ رہے ہیں۔"

"لیکن اپنے اپنے پارٹنر کے بارے میں اس طرح سوچنا اچھا کیوں لگ رہا ہے؟"

"اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو یہی کیا جائے اِس وقت!"

پھر ہم کافی دیر تک اپنے اپنے گھر کے بارے میں باتیں کرتے رہ گئے۔ پہلے جو جان سے شروع ہوتا ہوا محسوس ہوا تھا اس سے پہلے بھی وہاں ایک سلسلہ موجود تھا۔ اس سلسلے کو توڑ دینا یا بھول جانا اتنا آسان نہیں لگا جیسا ہم سمجھتے تھے۔

اگلے روز صبح ہم نے اپنے اپنے گھر کو واپس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ فیصلہ اس قدر اچانک اور قطعی تھا کہ ہم دونوں میں کوئی بھی اس پر نظرِ ثانی کرنے کے لیے تیار نظر نہیں آیا۔ جب میں اسے گاڑی میں بٹھا چکا جو میری گاڑی سے بہت پہلے چھوٹتی تھی تو اس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔" میں تمہیں کبھی بھول نہیں سکوں گی لیکن پھر ملنے کا وعدہ نہیں کر سکتی۔"

میں بھی اس کی طرف ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے کئی لمحوں تک دیکھتا رہا۔ پھر جب گاڑی حرکت میں آگئی، تو میں جلدی سے یہ کہہ کر اپنے سامان کے پاس جا بیٹھا۔" اچھا خدا حافظ!"

اختر جمال

سمجھوتہ ایکسپریس

جب کبھی الکشن کی بات ہوتی ہے تو میری نظروں کے سامنے بی آپا کا چہرہ آجاتا ہے۔ کندن سا دمکتا ہوا رنگ۔ بڑی بڑی کالی آنکھیں، بکھرے بکھرے بال اور سبز لباس۔ دور سے مسلم لیگ کا جھنڈا معلوم ہوتی تھیں انتخابی مہم کے دوران وہ اور ان کی تحریک پر دوسری لڑکیاں بھی سبز پوش بنی رہیں۔ وہ کہا کرتی تھیں "ہم سب کو دور سے مسلم لیگ کا جھنڈا ہی نظر آنا چاہئے۔ اس سے زیادہ اچھی بات کیا ہے کہ ہمارا وجود اپنی جماعت کی علامت بن جائے"

وہ بڑے بڑے پوسٹر آج بھی میری نظروں کے سامنے آجاتے ہیں۔ جو بی آپا ہم سب کو بٹھا کر لکھواتی تھیں اور مضمون بتایا کرتی تھیں۔

"مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ"

"پاکستان کے لئے ووٹ اسلام کے لئے ہے"

"اتحاد، تنظیم۔ یقین محکم"

"ہم قائداعظم کے ساتھ ہیں۔ لے کے رہیں گے پاکستان"

"خیبر سے راس کماری تک مسلمان ایک قوم ہیں"

مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت مسلم لیگ ہی آپ کے ووٹ کی حقدار ہے۔" وغیرہ وغیرہ۔

بی آپا خاندان بھر کی لڑکیوں میں سب سے بڑی تھیں اور ہم سب کی لیڈر تھیں۔ طلباء اور خواتین کے جلسے

وہ تقریریں کرتی تھیں۔ اور وہ بہت اچھی مقررہ تھیں۔ انہوں نے بہادر یار جنگ کی تقریروں سے متأثر ہو کر ان کا سا اسلوب اپنانے کی کوشش کی تھی۔ کلام اقبال کی حافظ تھیں۔ بڑی خوبصورتی اور عمدگی سے تقریر کے درمیان اقبال کے اشعار پڑھتی تھیں اور نثر میں شعر کے نگینے اتنی خوبصورتی سے جڑتیں کہ دل سے واہ کے بجائے آہ نکلتی تھی!

"میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو" ہم پاکستان کی صورت میں عالم اسلام ہی نہیں ساری انسانیت کے لئے ایک مٹی کا حرم بنانا چاہتے ہیں۔ ایک ایسی خود مختار آزاد اسلامی ریاست جہاں ہم اسلام کی اعلیٰ خود مختاری، انصاف اور مساوات کا عملی نمونہ دنیا کے سامنے رکھ سکیں۔ اور وہ مثالی معاشرہ ہی مرد مومن اور شاہین پیدا کر سکتا ہے"

اس دور کی ہر لڑکی نے اپنا آئیڈیل وہ "مرد مومن" ——— اور "شاہین" بنا رکھا تھا جس کا درجہ انہوں نے علامہ اقبال کی شاعری میں دیکھا تھا۔ زمین پر چلنے پھرنے والے مرد حقیر پودے معلوم ہوتے تھے اور خیالوں کے وہ شاہین تصوراتی پاکستان میں بس رہے تھے۔ جن کا نقشہ علامہ نے یوں کھینچا ہے۔

اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب اس کی نگہ دلنواز
نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

اور ——— عقل کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ
حلقۂ آفاق میں گرمیٔ محفل ہے وہ

ہر لڑکی کو شاہین کا پرستار دیکھ کر ہر نوجوان خود کو شاہین بن کر دکھانے کا آرزومند تھا۔

جب ناگپور میں مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا سالانہ جلسہ ہوا تو بی آپا ناگپور گئیں اور جب وہاں سے واپس آئیں تو قائد اعظم اور بہادر یار جنگ کی تقاریر انہیں تقریباً زبانی یاد تھیں۔ بی آپا نے دو آتشہ کو سہ آتشہ بنا کر دلوں میں ایک ایسی آگ بھڑکائی کہ سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے بس سب کے ہونٹوں پر ایک ہی لفظ تھا "پاکستان"!

ان دنوں بھوپال میں کوئی کالج نہ تھا اس لئے سب لڑکے لڑکیاں علی گڑھ پڑھنے جایا کرتے تھے۔

بی آپا خاندان کی واحد لڑکی تھیں اور بھوپال کی پہلی لڑکی جو پڑھنے کے لئے علی گڑھ گئیں۔ ان کے بعد چند لڑکیاں اور بھی جانے لگی تھیں، علی گڑھ کالج میں پڑھنے والے طلبا ایک ہی دن ایک ہی گاڑی سے روانہ ہوتے تھے اور اسٹیشن پر کالے برقعے اور کالی شروانیاں دور سے نظر آیا کرتی تھیں۔ طالب علم ساتھ جانے والی شہر کی لڑکیوں کے محافظ دستہ کی حیثیت سے سفر کرتے تھے۔ عزیز رشتہ داروں میں جو جان پہچان کے لڑکے ہوتے تھے ان کو بزرگ خاص طور پر خیال رکھنے کی تاکید کرتے تھے۔ اور یہ محافظ قلی تک کے فرائض خوشی خوشی انجام دیا کرتے تھے ہر اسٹیشن پر پانی کے لئے پوچھتے دوڑ دوڑ کر صراحیاں بھر بھر کر لاتے۔ اور علی گڑھ کالج کے دروازے تک چھوڑ کر رخصت ہوتے۔

جب بی آپا علی گڑھ سے آتیں تو اس قدر دلچسپ باتیں سناتیں کہ خاندان بھر کی لڑکیوں کا تانتا لگ جاتا۔ ہر کمسن لڑکی کا جی چاہتا کہ جلدی سے بڑی ہو۔ میٹرک پاس کرے اور علی گڑھ کی راہ لے!

سلطانیہ ہوسٹل۔ علی گڑھ کالج۔ گرلز کالج کے وسیع برآمدے اور ہوسٹل کے باغات۔ عظمت چغتائی کی کہانیاں اور مجاز کے رسیلے شعر۔ جاں نثار اختر کی نظم "کالج کی لاری ہے" کتنا رومانس تھا علی گڑھ میں، اور بابا جی —— شیخ عبداللہ جو لاٹھی لیکر پورے کالج کا راونڈ لیا کرتے تھے شاید بی آپا کے زمانے میں وہ لاٹھی نہ لیتے ہوں۔ میں نے انھیں بہت زمانے بعد دیکھا تھا۔ بی آپا کے دور میں علی گڑھ سبز تھا اور میں جب وہاں گئی تو علی گڑھ "سرخ" تھا۔

قیام پاکستان کے لئے استصواب رائے ہونا تھا اور اس مقصد کے لئے انتخابات شروع ہونے والے تھے۔ علی گڑھ کالج کئی ماہ بند رہا۔ لڑکے لڑکیاں سب الکشن کا کام کر رہے تھے۔ ان دنوں بی آپا الکشن کے کام کے سلسلہ میں ناگپور آگئیں۔

ہمارا گھر گویا بند ریاستی مسلم لیگ کا صدر دفتر تھا۔ اور شہر میں ناگپور سٹی مسلم لیگ کا دفتر تھا۔ موہن پورے میں مسلمانوں کے بڑے بڑے جلسے ہوتے تھے، جن میں لیگی رہنما اور طالب علم لیڈر تقریریں کیا کرتے تھے، ہم سب کو الکشن کا بے چینی سے انتظار تھا۔ ایک دن میں نے کہا "وہ دن جلد آئے کہ ہم سب ووٹ ڈالیں۔"

بی آپا نے چونک کر کہا: "تم —— ! تم تو ووٹ نہیں دے سکتیں۔"

"واہ جی —— یہ کس طرح ہو سکتا ہے —— آخر میں کیوں ووٹ نہیں دے سکتی —— مجھے

شدید صدمہ ہوا۔ اس وقت تک مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ ووٹ کے لئے عمر کی قید ہے۔ میں بہت چیخی چلائی — وہ پندرہ سولہ برس کی عمر میں لڑکیاں بالغ اور باشعور ہوتی ہیں پھر یہ زیادتی کیوں ———!"

بی آپا نے کہا تم ناحق بحث کر رہی ہو ——— بھئی قانون نہیں بدلا جا سکتا۔" ووٹ کا مسئلہ صرف میرا ہی نہیں بلکہ میری عمر کی تمام لڑکیوں کا مسئلہ تھا۔ اس لئے میں نے قائد اعظم کو خط لکھا کہ عمر کے قانون میں تبدیلی کی جائے ——— جب میرے شور مچانے کا کوئی نتیجہ نہ نکلا تو میں نے کہا: "کوئی بات نہیں، میں اپنے ایک ووٹ کی جگہ پورے سو ووٹ ڈلواؤں گی۔"

بی آپا نے کہا: "خدا کرے کہ تم پاکستان جا کر ووٹ دو ———!"

الکشن کے دن ہر جگہ سبز پوش لڑکیوں کا پولنگ بوتھ پر جمگھٹا تھا۔ صبح سویرے سے لاریوں اور ٹرکوں میں بھر بھر کے محلوں سے عورتوں کو لے جایا جا رہا تھا۔ لڑکیاں اپنے لباس کی طرف اشارہ کر کے بتاتیں "ایسے رنگ کے ڈبہ میں ڈالنا۔" اور سبز رنگ کا ڈبہ مسلم لیگ کا تھا۔

جب الیکشن کا نتیجہ نکلا تو مسلم لیگ کے امیدوار کو سو فیصد ووٹ ملے، خوشی کے مارے ہم سب کے قدم زمین پر نہ ٹکتے تھے۔ سارے ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا اور مطالبہ پاکستان ایک ٹھوس حقیقت بن کر سامنے آگیا تھا ——— ! بی آپا الیکشن کے بعد خوش خوش بھوپال واپس چلی گئیں۔

اسی زمانے میں ان کی شادی ہو گئی۔ دولہا بھائی پرانے علیگ اور تحریک پاکستان کے سرگرم رکن تھے۔ بی آپا کی شادی ذہنی اور نظریاتی ہم آہنگی کا نتیجہ تھی، دولہا بھائی اپنے جوش و خروش اور ان تھک جد و جہد کی وجہ سے انہیں "شاہین" سے ملتے جلتے دکھائی دیتے اس زمانے میں یہ معلوم ہوتا تھا کہ اسلامی ہیرو قاسم، طارق وغیرہ میں سے کسی کی روح ان کے جسم میں بیقرار ہے اور وہ خدا جانے مستقبل میں عشق کے کتنے بڑے بڑے امتحان دیں گے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ پاکستان تو پہلی سیڑھی ہے۔ سفر کا نقطۂ آغاز ——— ! جمال الدین افغانی، شاہ ولی اللہ ——— اور علامہ اقبال کے فلسفہ کو نچوڑ کر وہ پان اسلامزم کا نقشہ سمجھاتے۔

ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست !

لیکن جب بی آپا سے شادی کے بعد انہوں نے بالکل عام لوگوں کی طرح ملازمت کر لی اور گھر کے دائرے میں محدود ہو گئے تو بی آپا کو سخت ناامیدی ہوئی۔ پہاڑوں کی چٹانوں میں بسیرا کرنے والا "شاہین" اور مرد "مومن" جس کے جہان کی انہیں کوئی حد ہی نظر نہ آتی تھی وہ تو کولہو کا بیل ثابت ہوا۔ اور وہ تصور پاش

باقی ہوا جو انہوں نے بڑی محنت سے بنایا تھا۔

مجھے چودہ اگست ۱۹۴۷ء کی رات ہمیشہ یاد رہے گی۔ بی آپا شادی کے بعد دولہا بھائی کو لیکر پہلی بار بھوپال سے ہمارے ہاں آئی ہوئی تھیں۔ ہم سب بہت خوش تھے۔ ڈرائنگ روم میں سارا گھر جمع تھا۔ ریڈیو بج رہا تھا۔ اور گرم گرم چائے کا دور چل رہا تھا۔ دولہا بھائی اور ابا ریڈیو کے پاس بیٹھے تھے باقی سب لڑکے لڑکیاں قالین پر تکیے اور گدے رکھ کر رت جگا منانے کی تیاری کر رہے تھے۔ اب رت جگا شادی بیاہ میں بھی نہ ہوتا ہوگا ——! سب کے دل خوشی سے دھڑک رہے تھے۔! غلامی کی لمبی رات ختم ہونے والی ہے۔ اب اجالا ہمارا مقدر ہوگا! قائداعظم تقریر کریں گے۔ پنڈت نہرو بولیں گے۔

رات کے بارہ بجے اعلانِ آزادی ہوا۔ شیجیتا کرپلانی کی آواز میں اقبال کا ترانہ گونج رہا تھا۔

"سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا"

دنیا کے نقشے پر ایک نیا ملک پاکستان بن گیا! سب نے نماز شکرانہ پڑھی۔ میں نے کہا، میں آج آسمان کو رنگ بدلتے دیکھوں گی —— اس لئے کہ آج کا سورج آزادی کا سورج ہوگا ——"

بی آپا نے کہا" بی بی آدھی رات کو سورج کہاں —— سحر کا انتظار کرو"

میں نے باہر نکلتے ہوئے کہا" میں یہ دیکھنا چاہتی کہ آسمان کی کالی چادر کیسے رنگ بدلتی ہے —— سحر کیسے ہوگی!"

گھر کے سب لڑکے محلے کے دوسرے لڑکوں کو لیکر سڑک پر نکل گئے، اور آدھی رات کے سناٹے میں پاکستان کے جھنڈے لہراتے ہوئے "پاکستان زندہ باد" کے نعرے لگانے لگے۔ سنسان رات کی تاریکی میں در و دیوار بول اٹھے۔

ہم سب کے تعجب کی حد نہ رہی جب دولہا بھائی جو مسلم نیشنل گارڈ کے سپہ سالار تھے باہر نکل کر لڑکوں سے بولے" ارے میاں —— تم لوگ ہندوستان میں ہو۔ ہندوستان زندہ باد کا نعرہ لگاؤ ——؟ سب نے آنکھیں پھاڑ کر دولہا بھائی کو دیکھا۔ یہ —— یہ آپ کہہ رہے ہیں" مگر پھر جب قائداعظم نے یہ کہا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو آج سے ہندوستان کا وفادار شہری ثابت ہونا ہے تو پھر سب کے سر جھک گئے۔ "قائداعظم کا بھی اب حکم یہی ہے"؟ بھائی صاحب سب کو سمجھا رہے تھے۔

سب کی آنکھوں میں پاکستان بننے کی خوشی میں موتی ہی موتی چمکتے نظر آرہے تھے۔! اور بی آپا دفور جذ

سے دور رہی تھیں۔

"واہ! ہم تو پاکستانی ہیں۔ ہم ہندوستانی نہیں بن سکتے۔ ہم پاکستان جائیں گے۔"

ابا نے ان کے سر پر ہاتھ رکھا: "بیٹی ہم مشکل پسند لوگ ہیں۔ ہم مسلمان ہیں۔ ہمیں اب ہندوستانی بن کر بھی دکھانا ہے۔"

بی آپا نے چاروں طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں بے بسی تھی ——— جیسے اب یہ حکم ماننے کی ان میں طاقت نہ ہو۔ وہ بغاوت پر تُل گئی تھیں: "واہ کل تک تو برصغیر کے مسلمان ایک قوم تھے۔ اور آج ایک دم وہ ——— وہ دو قومیں ہیں۔ ایک ہندوستانی۔ ایک پاکستانی ——— یہ کیسے ہو سکتا ہے؟!"

قائداعظم کی تقریر تو تم نے سنی ہے ——— ! پاکستان میں بسنے والے ہندو مسلم، سکھ، عیسائی، پاکستانی ہیں اور ہندوستان میں بسنے والے ہندو مسلم ہندوستانی ہیں"۔ بھائی صاحب باہر کھڑے ہوئے لڑکوں کو سمجھا رہے تھے۔ اور اندر بی آپا، اس فیصلہ پر بری طرح سسک رہی تھیں ——— "نہیں ——— نہیں ——— ہم پاکستانی ہیں ——— ہم نے آنکھ کھول کر پاکستان کا شعور اور اسلام کی محبت کو ایک سمجھا تھا، اب اتنی جلدی ——— !"

ہاں بیٹی! ——— اس کام میں وقت لگے گا، پھر ابا نے سب مسلم لیگی رضا کاروں کو سمجھانے کی کوشش کی: "ہم نے اسلام کی سربلندی کے لئے پاکستان بنایا ہے، اپنے لئے نہیں! قلعہ بنانے والے اپنے رہنے کو قلعہ نہیں بناتے۔ وہ اپنی فوجوں کے لئے مورچہ بنا کر ہٹ جاتے ہیں۔ ہمارا کام ختم ہو گیا۔ ہماری محنت اللہ کے لئے ہے۔ اب جو اس کا حکم ہو گا، ہم اس کی رضا پر چلیں گے ——— !"

دُولہا بھائی نے بلند آواز سے کہا: "چچا میاں، انشاء اللہ ہم اس امتحان میں پورے اتریں گے!"

بی آپا نے دلی ریڈیو اسٹیشن کی سوئی لاہور پر گھمائی اور جب ریڈیو نے یہ کہا: "یہ ریڈیو پاکستان لاہور ہے"۔ تو بی آپا نے ریڈیو کو اپنے سینے سے لگا لیا، اور پھر رونا شروع کر دیا۔ بی آپا، اور ہم سب لوگ اسی لمحہ اڑ کر پاکستان جانا چاہتے تھے ——— !

پڑوس کے گھروں سے مرہٹے، پارسی، عیسائی، ہندو سب قوموں کے نوجوان نظر آ رہے تھے ——— اور ہندوستان زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔ دُولہا بھائی نے "پاکستان زندہ باد" کے نعرے لگانے والوں کو واپس بلا لیا۔ اس لئے کہ ہندو مسلم فساد کا اندیشہ تھا اور ایک دم اتنی جلدی دوسرا نعرہ لگانا آسان نہ تھا، ابا نے سچ کہا کہ اس کام میں وقت لگے گا۔

چند روز بعد دولہا بھائی اور بی آپا بھوپال چلے گئے۔ اور پھر کچھ عرصہ بعد ہم سب بھی بھوپال چلے گئے۔ ان دنوں سب کو پاکستان جانے کا جنون سوار تھا اس سلسلہ میں اکثر رنا رلانا ہوتا تھا۔ بی آپا اور دولہا بھائی کے درمیان اکثر لڑائی جھگڑا بھی ہوتا تھا۔ بی آپا کے والد کا جب انتقال ہوا تو وہ بہت چھوٹی تھیں۔ وہ ابا کو ہی اپنے والد کی جگہ سمجھتی تھیں اور ہر بات میں ان سے مشورہ لیا کرتی تھیں۔ ان کی تعلیم اور سیاسی تربیت میں بھی ابا کا ہاتھ تھا، ابا ان کو خاندان بھر کی لڑکیوں کے لئے ایک مثال بنانا چاہتے تھے۔ اور وہی انہیں علی گڑھ کالج میں داخل کرا کے آئے تھے، بی آپا کی والدہ خاموش، اللہ والی خاتون تھیں اور دنیاوی کاموں میں وہ ہر قدم ابا کی مرضی سے اٹھاتی تھیں۔ بی آپا کے بڑے بھائی ریاست بھاولپور میں ملازم تھے۔ بی آپا کی شادی کا فرض ادا کر کے ان کی والدہ بیٹے کے پاس جا چکی تھیں۔ بی آپا اکثر غصہ میں کہتیں اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ آپ پاکستان نہیں جائیں گے تو میں آپ سے شادی نہیں کرتی۔"

دولہا بھائی کا سارا کنبہ بھوپال میں تھا وہ نہ خود جانا چاہتے تھے اور نہ دوسروں کے جانے کے حق میں تھے، ان کا کہنا تھا کہ "اگر سب چلے جائیں گے تب بھی میں یہاں رہوں گا۔"

اِدھر پاکستان کے فراق میں بی آپا نے کھانا پینا چھوڑ رکھا تھا۔

بھائی صاحب ابا جان کے ساتھ "مجلس اتحاد و ترقی" سے وابستہ ہو کر ہندو مسلم اتحاد کے لئے کام کر رہے تھے، گوالیار، کپورتھلہ اور دوسری ریاستوں میں فسادات کی آگ بھڑک رہی تھی۔ مسلمانوں کے قافلے ہجرت کر کے بھوپال آ رہے تھے۔ دوسری جانب سندھ اور پنجاب کے شرنارتھی آ رہے تھے۔ ان حالات میں امن و امان قائم رکھنا اور فسادات نہ ہونے دینا وقت کا سب سے بڑا تقاضہ تھا ابا کا خیال تھا کہ مسلمان آنے والے شرنارتھیوں کو ہندوؤں سے پہلے آگے بڑھ کر گلے لگائیں تو فساد نہیں ہو سکتا۔ وہ دن رات شرنارتھیوں کی آبادکاری کے کام میں حکومت کا ہاتھ بٹانے میں مصروف تھے، اور پاکستان سے بے گھر ہو کر آنے والے انہیں اپنی ذمہ داری معلوم ہو رہے تھے۔ اس لئے کہ اسلامی عدل و انصاف کے جو بڑے بڑے دعوے یہ لوگ غیر مسلموں کے سامنے کیا کرتے تھے۔ ان قافلوں کی ہجرت سے وہ سب غلط ثابت ہوتے تھے، وہ اپنی صفائی پیش کرنے کو کہتے:

قائد اعظم پاکستان میں ہندوؤں اور سکھوں کو خوشحال اور امن سے بستا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں مگر یہ فسادات انگریزوں کی "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی کا نتیجہ ہیں،

سب طرح کی صفائیاں پیش کرنے کے باوجود مسلم لیگی مجرم سے بن گئے تھے اور ہر طرف سے یہ طعنے سن رہے تھے کہ "اب پاکستان گیا پھر مسلمان ناپاک جگہ کیوں بیٹھے ہیں؟"

دہلی میں فسادات کی وجہ سے مسلمانوں کے محلے کے محلے خالی کرا کے انہیں کیمپوں میں پہنچا دیا تھا۔ جہاں سے گاڑیوں میں بھر بھر کر انہیں پاکستان بھیجا جا رہا تھا، ان کے خالی گھروں میں شرنارتھیوں کو آباد کیا جا رہا تھا۔

"بھوپال میں یہ صورت حال نہیں ہونا چاہئے۔ آپا سب کو سمجھاتے۔ اگر ہم سب گئے تو بہت سے لوگوں کے قدم اکھڑ جائیں گے۔" رفتہ رفتہ سب نے پاکستان جانے کا نام لینا چھوڑ دیا۔ مگر بی آپا اپنی ضد پر اڑی رہیں۔

ایک دن بی آپا نے مجھ سے کہا کہ "میں اگر تمہارے بھائی سے بات کرتی ہوں تو بہت زیادہ بدمزگی پیدا ہو جاتی ہے اور چچا میاں میرا دل رکھنے کو کہہ دیتے ہیں کہ تم لوگ پاکستان چلے جاؤ۔ مگر شاید دل سے وہ یہ نہیں چاہتے تم کسی دن اپنے بھائی سے اچھی طرح بات کرو ——— تم مباحثوں میں حصہ لیتی ہو۔ اپنے بھائی کو قائل کر دو تو میں تمہیں مان لوں۔ اور تمہارے بھائی اپنی سب بہنوں میں تمہیں پسند کرتے ہیں، تمہاری بات سنیں گے۔"

میں تمام ہتھیاروں سے لیس ہو کر دولہا بھائی کے پاس پہنچی، بالکل جیسے کسی ڈبیٹ کی تیاری کی جاتی ہے۔ اگر انہوں نے یہ کہا تو میں یہ کہوں گی اور اگر انہوں نے وہ کہا تو میں یہ کہوں گی۔

دولہا بھائی آرام کرسی پر آدھے لیٹے آدھے بیٹھے کتاب پڑھ رہے تھے۔ بی آپا گھر میں خفا خفا سی پھر رہی تھیں مجھے کمرے میں جانے کو کہہ کر وہ باورچی خانے میں چلی گئیں۔

میں نے گھما پھرا کر پاکستان کا موضوع چھیڑا۔ اور گھنٹہ بھر بی آپا کی وکالت کرتی رہی۔ بھائی صاحب، ہاں ——— ہوں کئے بغیر چپ چاپ سنتے رہے۔ مسکرا کر بولے۔ "تقریر تو بڑی محنت سے تیار کی ہے۔ انعام ملنا چاہئے۔" پھر میرے سر پر ہلکی سی چپت جما کر بولے۔ "گڑیا ——— میں تجھ سے پورے بیس برس بڑا ہوں۔ تو مجھے قائل کرنا چاہتی ہے۔"

پھر کہا "اب آرام سے بیٹھو اور میری بات بھی سنو۔"

انہوں نے میرے سامنے ایک نئے انداز سے حالات کا تجزیہ کیا۔ بی آپا جتنی جذباتی تھیں وہ اتنے ہی حقیقت پسند بھی تھے۔ میں نے اقرار تو نہیں کیا مگر ان کی باتوں کی میں خود قائل ہو گئی۔ "گاندھی جی رام راج کی مثال دینے کے لئے آج بھوپال کا نام لے رہے ہیں۔ سب ہندو مسلمان یہ طے کر چکے ہیں کہ ہم ایک بھی ناخوشگوار واقعہ یہاں نہ ہونے دیں گے۔ ہمیں یہاں بدلتے ہوئے حالات میں اہم کردار ادا کرنا ہے۔ میں مسلم نیشنل گارڈز کا

سالار تھا۔ کانگریسی مسلمان بھاگ سکتے ہیں۔ مگر میں نہیں بھاگ سکتا!" وہی ابا والی منطق!

بہرحال یہ سب ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں، میں بی آپا کے پاس باورچی خانے میں جاکر بیٹھ گئی۔

کیا بولے تمہارے بھائی!

میں نے کہا۔" بی آپا میں نے تو انہیں اتنا بڑا طعنہ تک دیدیا کہ ایک وہ مجنوں تھا کہ جس نے دشت دشت کی سیاحی کی، ایک آپ ہیں کہ بی آپا کی خاطر پاکستان تک نہیں جا سکتے! اور اس بات پر انہوں نے میرے سر پر چپت رسید کی ہے۔"

بی آپا آنسو پونچھ کر ہنسنے لگیں۔

دولہا بھائی کی بیٹھک میں قائداعظم کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ انہوں نے اسے اتار کر مولانا ابوالکلام آزاد کی تصویر لگالی۔ بی آپا نے غصہ سے کہا۔" یہ تصویر نہیں اُتر سکتی۔"

بھائی صاحب بڑی نرمی سے بولے۔" جان اسے لیجاکر تم اپنے کمرے میں بڑے شوق سے لگالو۔ لیکن باہر کے کمرے میں اسے دیکھ کر لوگ ہمیں پاکستانی ایجنٹ سمجھتے ہیں۔ ہم لوگ پانچواں کالم کہلاتے ہیں۔ کل جن سنگھ کے جلسہ میں لالہ جی کہہ رہے تھے کہ مسلمانوں کے گھروں میں جاکر دیکھو تو آج بھی مسٹر جناح کی تصویر ٹنگ رہی ہے۔ جب تک پانچویں کالم کو صاف نہیں کیا جائے گا ہماری آزادی خطرے میں ہے۔"

بی آپا نے تصویر اپنے کمرے میں لگالی...... اور جل بھن کر بولیں" موقعہ پرست!"

رفتہ رفتہ بی آپا نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا۔ لڑکے لڑکیاں ٹولیاں بنا کر مہاجرین کی آبادکاری کے سلسلہ میں کام کر رہے تھے۔ بی آپا بھی عملی کاموں میں مصروف ہوگئیں،

انہیں دنوں بھائی صاحب حیدرآباد گئے اور مخدوم محی الدین سے جاکر ملے۔ وہ تلنگانہ تحریک سے اتنے متأثر ہوئے کہ جب واپس آئے تو ان کے ساتھ بکس بھر کر تلنگانہ تحریک سے متعلق لٹریچر اور سوشلزم سے متعلق کتابیں تھیں۔ دولہا بھائی نے جب اپنے خیالات کا پرچار کیا تو نوجوانوں کی ایک بڑی ٹولی ان کے ساتھ ہوگئی۔ ہندو مسلم ایک آواز ہو کر محنت کش طبقے کی سیاست میں حصہ لیں۔ یہی سب مسائل کا حل تھا۔ تنگ دلی اور فرقہ پرستی کو ختم کرنے کے لئے وہی سیاست سامنے آسکتی ہے جو خود تنگ دلی اور فرقہ پرستی سے پاک ہو، مخدوم کی قیادت میں ہندو مسلم، کسان اور مزدور اس طرح ایک تھے جیسے ایک رسی میں بٹے ہوئے ریشے۔ نئی زندگی ———— نئے تقاضے ———— نوجوانوں کو سیاست نے اس طرح جذب کر لیا کہ

یہ لگتا تھا کہ ایک ٹھکانے سے بہت سے ٹھکانے جنم لیں گے۔

چند سال بعد جب میں پاکستان آنے لگی تو بی آپا نے مجھے گلے لگا کر کہا "تم خوش قسمت ہو، پاکستان میں سانس لو گی، خدا کی قسم ساری عمر کے بدلے مجھے وہاں کی ایک سانس مل جائے تو میں وہ سجدۂ شکر میں گزار دوں"

"بی آپا آپ کے بغیر جانا مجھے ذرا بھی اچھا نہیں لگ رہا ہے"

"خدا کا یہی حکم ہے کہ میں یہاں رہوں۔ اب میں تمہارے پاس آیا کروں گی۔ اماں کے پاس بہاولپور رہ جاؤں گی ——— قائد اعظم اور علامہ اقبال کے مزاروں پر بھی جاؤں گی"

"بی آپا! آپ ضرور آئیے گا ——— پکا وعدہ کیجئے ———"

"ہاں پکا وعدہ ہے ——— پھر چلتے چلتے ان کی آواز آئی "ہم سب کی دعاؤں کی چھاؤں ہمیشہ تمہارے سر پر رہے گی"

جب میں نے پاکستان آکر چاند تارے والا پرچم دیکھا تو میرے کانوں میں برسوں پہلے سنا ہوا بی کا جملہ گونجنے لگا "کسی دن یہ سبز ہلالی پرچم پاکستان کا قومی جھنڈا بنے گا" میں نے جھک کر مٹی اٹھا اور اسے اپنے ہونٹوں سے لگایا اور میرے بہت سے آنسو مٹی میں گر کر جذب ہو گئے۔

پھر سالہا سال گزر گئے۔ میری وہ بہت پیاری بہن جو میری دوست اور رہبر تھیں میرے ان کے درمیان صرف ایک رشتہ رہ گیا۔ خط ———!

جب ان کے خط آتے تو مجھے ایسا لگتا کہ سب فاصلے طے کر کے وہ لفظوں کی وساطت سے میرے پاس آگئی ہیں۔ ان کی شخصیت کی خوشبو مجھے اپنے ارد گرد محسوس ہوتی۔ پھر رفتہ رفتہ دونوں ملکوں میں تعلقات کی کشیدگی ہمارے رشتوں کے درمیان حائل ہو گئی اور خط و کتابت بھی بند ہو گئی۔

دونوں ملکوں اور ان سے وابستہ تلخ یادوں نے دو پڑوسی ملکوں کے درمیان جو فاصلہ پیدا کر دیا وہ مریخ کے فاصلے سے زیادہ تھا اور ہماری دوستی، محبت اور خون کے سب رشتے دھنکی ہوئی روئی کی طرح خلا میں بکھر گئے۔ قیدیوں کو تو پچیس لفظ لکھنے کی اجازت تھی مگر ہندوستانی عزیزوں کو پچیس لفظ بھی لکھے جا سکتے تھے۔ انہی حالات میں بی آپا کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ ماں بیٹی کو ان تیئس برسوں میں ایک دوسرے کی صورت دیکھنا نصیب نہ ہوا تھا، بڑی مشکل سے لندن سے ایک صاحب کی معرفت بی آپا کو تعزیتی خط بھیجا۔ بہت عرصے کے بعد بی آپا کا کویت کے کسی صاحب کی معرفت جواب آیا ——— "بی بی ——— مسلسل جدائی اور دو

دل کی آنکھ کھول دیتی ہے۔ میں اماں کو دیکھ لیتی تھی اور دعا کرتی تھی کہ خدا انہیں جلد اپنے پاس بُلا لے، جہاں سچی راحت اور محبت ہے۔ تمہارے لئے دعا کرتی ہوں کہ تم اپنی ماں سے مل سکو، ماں باپ کی خدمت ہم دونوں کی قسمت میں نہ تھی۔"

شملہ معاہدے کے بعد ہندوستان جانا ہوا تو بی آپا سے بیس برس کے بعد ملاقات ہوئی — دہلی کے ریلوے اسٹیشن پر بی آپا — بھائی صاحب، ان کے بیٹے بیٹیاں سب جمع تھے۔ میرا خیال تھا کہ بیس برس میں ہم سب میں اتنی تبدیلی آگئی ہوگی کہ ایک دوسرے کو پہچاننے اور ڈھونڈنے میں شاید دقّت پیش آئے گی لیکن ایک دوسرے پر نظر پڑتے ہی ہم دوڑ کر لپٹ گئے، ذرا دیر تک آنسوؤں نے ہمیں بات نہ کرنے دی۔ تصویر میں جو صورتیں یاد تھیں، وہ بالکل بدل چکی تھیں، مجھے وہاں کھڑے کھڑے ایک جگ کے گذرنے کا احساس ہوا میں نے سوچا ہم سب بوڑھے ہوگئے ہیں، بی آپا کی سفید لٹیں، دوہرا جسم — اور عینک۔

انہوں نے ہنس کر کہا "تم تو مجھ سے دس برس چھوٹی ہو مگر تمہارے بال بھی سفید ہونا شروع ہوگئے"

"ہم نے کچھ ضرورت سے زیادہ ہی زمانے کا گرم و سرد چکھا ہے۔ مگر مجھے تو بڑھاپا بہت پسند ہے"

"واہ — کیوں" انہوں نے تعجب سے دیکھا۔

"اس لئے کہ خدا کے فضل سے بڑھاپے میں جوان بچوں کی رفاقت نصیب ہوتی ہے" بی آپا نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولیں "یہ تو سچ ہے"

رات کو جب ہم سب اکٹھے ہو کر بیٹھے تو بی آپا بولیں "صبح سے مجھے یہ حسرت ہو رہی ہے کہ کاش ہم ایک دوسرے کو بدلتے، بچوں کو پروان چڑھتے، زندگی کی خوشیوں اور غموں کو بانٹتے ہوئے بیس سال گذارے ہوتے"

"اتنی تڑپ آخر ہماری نسل کے مقدر میں کیوں لکھی تھی ——— !" میں بھی شاید صبح سے بی آپا ہی کے دل کی بات سوچ رہی تھی۔ بی آپا نے کہا "اگر قائداعظم زندہ ہوتے تو وہ مسائل کو حل کر لیتے ہمارے درمیان پھر شاید دشمنی کے بجائے دوستی کا رشتہ ہوتا۔ میرا دل کہتا ہے کہ قائداعظم ہندوستان کے مسلمانوں کو بالکل نہ بھول جاتے!"

"نہیں بی بی ——— سچی بات بہت کڑوی ہوتی ہے۔ مگر اب اس عمر میں ہمیں کم از کم ایک دوسرے سے تو بالکل سچ بولنا چاہئے ——— اور تم سے گلہ میں یہ سوچ کر کیا ہی ہوں کہ تمہارے پاس [illegible] ہو —؟

"کیا بگڑ ـــــ کیا بگڑ ـــــ؟"

"بگڑ یہ کہ کشمیر کے چند لاکھ مسلمانوں کا تم لوگوں کو کچھ نہ کچھ درد رہا۔ دریاؤں اور دفاعی اہمیت کے تقاضے بھی ساتھ تھے۔ لیکن ہندوستان کے دہ کروڑ مسلمان جو تحریک پاکستان کا ایک حصہ تھے انہیں پاکستان والے بھول گئے، دودھ کی مکھی کی طرح الگ کیا ـــــ! حالانکہ ہم دو ملکوں میں رہ کر بھی ایک دوسرے کی طاقت بن سکتے تھے!"

"دراصل ہمارے یہاں آمریت کی لمبی رات رہی۔ ہمیں تو اپنے آپ پر بھی اختیار نہ تھا۔ پھر بیگم کیا کرتے؟"

"انہوں نے آہستہ سے کہا: "خدا کا شکر ہے ہمارے یہاں جمہوریت رہی، ہم لڑتے جھگڑتے، کٹتے مرتے اور شور مچاتے رہے۔ لیکن ہم نے بھی اپنے آپ کو جاننے میں بہت وقت لیا ـــــ ہم ایک عرصہ تک یہ محسوس کرتے رہے کہ ہمارے جسم یہاں اور روحیں پاکستان میں ہیں۔ تمہاری کرکٹ اور ہاکی کی ٹیمیں جیت جاتیں تو ہم خوش ہو ہو کر مٹھائی بانٹتے، اپنی شکست اور تمہاری جیت کی خوشی مناتے۔ جب یہاں فرقہ وارانہ فساد ہوتے تو ہم پاکستان کی طرف دیکھتے ـــــ صدر ایوب کو صلاح الدین ایوبی کا جانشین سمجھتے تھے ـــــ مگر اب سب خوش فہمیاں ختم ہو گئی ہیں۔"

کیا مطلب ـــــ؟"

اب ہم کسی طرف نہیں دیکھتے۔ اب ہم نے اپنے آپ کو پہچان لیا ہے۔ ہمیں اب اپنی ذات میں اعتماد حاصل ہوا ہے۔ جب مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کی جنگ ہوئی تو ہم نے اپنا چہرہ دیکھ لیا۔ ہم نے زمین کے رشتہ کو جانا اور اب ہم ہندوستانی ہیں! بی آپا نے بڑے اعتماد سے کہا۔ پھر بولیں:۔

"اچھا بھئی یہ سیاست چھوڑیں، اپنی باتیں کریں ـــــ!"

"مجھے اپنے متعلق بتائیے ـــــ آپ کیا کیا کرتی ہیں؟"

"میں تعلیم بالغاں کے ایک مرکز میں کام کر رہی ہوں۔ وہاں اردو اور ہندی دونوں پڑھائی جاتی ہیں"

"بڑھے طوطوں کو پڑھانا بہت مشکل ہوگا"

"ہاں مشکل بھی اور بہت دلچسپ بھی۔ ڈھیروں لطیفے جمع ہیں۔"

"مسلمان تعلیم میں ہندوؤں سے پیچھے ہیں یا برابر ہیں؟"

"بہت پیچھے ہیں ـــــ مسلمان نئے تقاضوں سے بڑی دیر میں سمجھوتہ کرتے ہیں، لکیر کے فقیر

تے ہیں۔ سرسید جیسے بجٹ کے لوگ اگر کچھ اور پیدا ہوجاتے جو سیاست سے قطع نظر تعلیم، تہذیب اور اقتصادی پہلوؤں پر توجہ دیتے تو شاید ہم ایک تہذیبی انقلاب لا سکتے۔ اب فیملی پلاننگ کا کام ہوا۔ مسلمانوں نے یہ سمجھا کہ فیملی پلاننگ کے بہانے ان کی نسل کشی کا سامان ہو رہا ہے۔"

"یہ مسلمانوں کے لئے سیاسی مسئلہ بھی تو ہے ——— ! اقلیت کی ذہنیت اور نفسیات اکثر یت سے ہمیشہ جدا ہوتی ہیں۔ اپنے مٹ جانے کا خطرہ ہی وہ چیلنج ہوتا ہے جس کی وجہ سے اپنی بقا کے لئے کوشاں رہتی ہے۔ اور اگر اکثریت کا طرز عمل کسی خطرے کا احساس نہ دلائے تو پھر شاید کوئی کشمکش شدید طور پر پیدا ہو۔"

"ہاں لیکن ہم چھوٹی اقلیت نہیں۔ سب سے بڑی اقلیت ہیں۔ آٹھ کروڑ آخر جب پاکستان بنایا اس وقت تو سات کروڑ تھے۔"

"بی آپا ان گنت لوگوں کی قربانیاں۔ درد و غم یہ سب چیزیں ضائع نہیں جا سکتیں۔ ایک نہ ایک دن حالات بہتر ہوں گے۔"

بی آپا نے کہا ——— "ہندوستان اور پاکستان بڑے اور چھوٹے بھائی کی طرح بھی رہ سکتے تھے۔"

"بی آپا یہ تو اسی وقت ہو سکتا تھا جب بڑے بھائی کے دل میں وسعت ہوتی۔ ہندوستان کی تنگ دلی و تنگ نظری اور جارحیت کا خطرہ نہ ہوتا تو ہماری سیاست، معیشت سب چیزیں بہت آگے ہوتیں، ہم ترقی یافتہ ہوتے۔"

"بی آپا نے کہا ——— تم ساری ذمہ داری ہندوستان پر ہی نہیں ڈال سکتیں۔"

اس لمحہ مجھے یہ محسوس ہوا کہ ہم دو بہنیں نہیں دو ملک بول رہے ہیں۔ میں نے کہا۔ "بی آپا ایک کنجوس اور بد مزاج آدمی، اپنے کنبے کی محبت حاصل نہیں کر سکتا، وہ قینچی سے سارے رشتے خود ہی کاٹتا ہے۔ یہی حال بنیا سیاست کا ہے۔ بنیا سیاست نے ہمارے درمیان جنگیں کرا دیں، دونوں طرف کی اقتصادی حالت تباہ ہوئی اور بڑے ملکوں پر انحصار بڑھا۔"

بی آپا نے کہا ——— ہندوستان کنجوس بنیا نہیں ہے ——— ہمارے یہاں مختلف مذاہب تہذیبیں پھل پھول رہی ہیں۔ یہ تو ایک ایسا گلشن ہے جس میں ہر رنگ کے پھول ہیں۔"

"گاندھی جی ایک زبان اور دو رسم الخط کی باتیں کرتے تھے تو اب دوسرا رسم الخط بھی جرم ہو گیا ہے۔ اگر ان برسوں میں دونوں رسم الخط پھلتے پھولتے مسلمانوں کو نوکریوں میں تعداد کی مناسبت سے تناسب ہوتا

فوج میں ان کا حصہ ہوتا۔ تو یہ ثابت ہو تاکہ دو قومی نظریہ غلط تھا۔ ہندوستان نے تو ان تیس برسوں میں اپنے طرز عمل سے یہ ثابت کیا ہے کہ دو قومی نظریہ صحیح تھا۔

"بی آپا نے کہا" اب اکثریت یہ سمجھ گئی ہے کہ اقلیت کو قومی زندگی سے الگ تھلگ کر کے ان کا اپنا قد چھوٹا ہو جاتا ہے۔ اب انہوں نے میر، غالب اور اقبال کو اس طرح اپنایا ہے کہ دیوناگری رسم الخط میں سب موجود ہیں"

"سوال یہ ہے کہ اردو زبان بحیثیت ایک زبان اور رسم الخط سے یہاں زندہ رہے گی"

"ہاں ضرورت اس لئے کہ ہندوؤں میں بھی ایک طبقہ اردو کی بقا کے لئے جد و جہد میں ہمارے ساتھ ہے۔ اگر پاکستان سے اچھے تعلقات قائم ہوں۔ رسائل اور کتابیں بڑے پیمانے پر تبادلہ ہوں تو اردو کی مقبولیت میں اضافہ ہوگا"

"ہاں اب انشاء اللہ دونوں ممالک کے درمیان اچھے تعلقات قائم ہو سکیں گے"

بی آپا نے کہا۔ ان سب باتوں کے باوجود اردو بڑی سخت جان ہے۔ رسم الخط تو بدل گیا لیکن ہندی پر چھا گئی ہے۔ تم ہندی ادب پڑھو، سادہ، شگفتہ نظم و نثر کا ایک نیا اسلوب پیدا ہوا ہے جسے گنگا جمنی اسلوب کہنا چاہئے"

یہاں نے ہندی ادب کو اگر اردو رسم الخط میں شائع کیا جائے تو پاکستان کے لوگ بھی پڑھ سکیں گے"

"بی آپا نے کہا، اردو کتابوں کی اچھی کتابیں نہ صرف دیوناگری رسم الخط میں چھپ رہی ہیں بلکہ علاقائی زبانوں میں بھی ترجمہ ہو رہا ہے۔ اور ان باتوں کی وجہ سے ہندو مسلم دشمنی اب ختم ہو رہی ہے۔ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے مسائل کو سمجھ رہے ہیں اور قریب آ رہے ہیں۔

"یہ تو اچھی بات ہے"

"ابھی فیملی پلاننگ کے مسئلہ پر حکومت نے جو غلط رویہ اختیار کیا ہے اس کے خلاف ہندو اور مسلمانوں نے مل جل کر تحریک چلائی ہے۔ اور اب وہ یہ جان گئے ہیں کہ سیاست میں اگر وہ ایک دوسرے کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر نہ چلے تو دونوں کا استحصال ہوگا"

میں نے کہا۔ ریل کے سفر کے دوران یہ محسوس ہوا کہ پرانا چھوت چھات کا طریقہ بھی ختم ہو چکا ہے"

ہاں اب چھوت کا رواج بالکل نہیں رہا۔ اور اب ہندو بھی عرب، ایران اور دوسرے ممالک میں ملازمت کے لئے جاتے ہیں۔ فارسی، عربی اور دوسری زبانیں شوق سے سیکھ رہے ہیں اور تہذیبی طور پر مسلمانوں کے

زیادہ قریب آرہے ہیں۔"

"یہ تو ایک اچھی صورت حال ہے۔ سائنس تو فاصلے کم کر رہی ہے۔ سیاست نے ہی فاصلے بڑھائے ہیں۔"

بی آپا نے کہا: "آؤ دونوں ملکوں کی خوشحالی، ترقی، آزادی اور اچھے تعلقات کی دعا کریں۔" بی آپا نے اپنے ہاتھ اٹھائے، اسی لمحہ جامع مسجد سے اذان کی آواز آئی۔!

مجھے محسوس ہوا کہ جیسے یہ قبولیت کی گھڑی تھی۔

بی آپا کے گھر سے جامع مسجد کا نظارہ بالکل صاف دکھائی دیتا تھا۔ طویل و عریض سیڑھیوں پر نمازی بچے بڑے جوان اور بوڑھے بڑی تیزی کے ساتھ چڑھ رہے تھے اور دوسری جانب لال قلعے کی فصیلیں نظر آرہی تھیں۔ مجھے لگ رہا تھا کہ یہ زبان، رسم الخط، تہذیب اور یہ شاندار مسجد اور لال قلعے کی فصیلیں سب ایک رشتہ جوڑے کھڑی ہیں۔

ایک دن ہندی اردو مسئلہ پر بات کرتے ہوئے بی آپا نے کہا۔ تمہارے ہاں بھی تو اردو صرف دلیلے کی زبان ہے۔ سرکاری زبان نہیں ہے، اس لئے تمہیں بڑھ بڑھ کر باتیں کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ کم از کم آزادی کے بعد ہندی اپنے گھر کی مالکہ تو بنی۔ اردو تو آج تک وہاں اپنا جائز مقام حاصل نہ کر سکی۔"

میں نے کہا۔ بی آپا عوامی تحریکیں آگے بڑھتی ہیں تو عوام اپنی زبان کو بھی گدی پر بٹھاتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی اردو ایک نہ دن سرکاری زبان بنے گی۔ اردو اور علاقائی زبانوں کا مستقبل وہاں روشن ہے۔"

بھائی صاحب نے کہا: "تم دونوں کی باتیں تو ایک دن میں ختم نہ ہوں گی۔ کیا ہم سب کو سارے دن بھوکا ہی رہنا ہوگا——؟"

اور ہم دونوں یہ سوچ رہے تھے کہ شاید اب تک ہم نے تو باتیں ہی نہیں کیں ہیں۔ لڑکے لڑکیوں کو دیکھ کر یہ لگتا تھا، کہ یہ لوگ پہلی بار نہیں ملے ہیں۔ اب میں خوب دوستی ہوگئی تھی۔ مگر وہ سب بھی اپنی اپنی بحثوں میں الجھے ہوئے تھے —— اور ایک دوسرے کو زیادہ اچھی طرح جاننے اور سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"اچھا تو کل کا کیا پروگرام ہے——؟ بھائی صاحب نے پوچھا۔

میں تو سب سے پہلے 'نظام الدین اولیاء' جاؤں گی، اور اس کے بعد پھر کہیں اور——"

"پھر تم صبح سویرے اپنے بھائی صاحب کو ساتھ لیکر چلی جانا۔"

"آپ بھی چلئے نا۔"

"نہیں بھئی! میرا بھانجا اور بھانجی پہلی بار میرے گھر پر آئے ہیں۔ تم مجھے اپنے ہاتھ سے ان کے لئے پکانے دو، تم دوپہر تک آجانا۔"

"اچھا جیسے آپ کی خوشی۔"

بھائی صاحب راستہ میں دہلی کی ادبی اور تہذیبی زندگی کے متعلق بتلاتے رہے اور صبح سے دوپہر تک ہم لوگ نظام الدین اولیا، ہمایوں کا مقبرہ، غالب کا مزار اور غالب اکیڈمی، راج گھاٹ، نہرو گھاٹ، سرمد شہید اور ابوالکلام آزاد کے مزار سب جگہ دیکھ آئے۔

گھر آکر بھائی صاحب نے بی آپا سے کہا:

دہلی کی سب قابل ذکر اور مرحوم شخصیتوں سے تو یہ مل آئیں۔"

بی آپا نے کہا تمہارے بھائی صاحب مزاروں پر نہیں جاتے۔ اچھا ہوا تمہارے ساتھ ان کی بھی حاضری ہوگئی۔

"ہاں بھئی! ہمیں مُردوں سے زیادہ زندوں سے دلچسپی ہے۔"

میں نے کہا: "نظام الدین اولیا، اور شاہی مسجد وغیرہ دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ ان جگہوں کی دیکھ بھال زیادہ اچھی طرح نہیں کی جاتی ہے۔ مرمت پر کوئی توجہ نہیں ہے۔ خصوصاً مسجد میں اداسی اور ویرانی کا احساس ہوتا ہے ———!

زندہ مسجدیں تو در و دیوار بولتے معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں وہ زندگی نہیں جو لاہور کی بادشاہی مسجد میں محسوس ہوتی ہے۔"

"دیکھ بھال تو کی جاتی ہے۔ مگر تمہارے ہاں یہ سب کام اوقاف والوں کو کرنا چاہئے۔" بی آپا نے کہا۔

بھائی صاحب بولے:" تم نے نئے اور پرانے اور پھر صدیوں پرانے مقبرے ایک ساتھ دیکھے ہیں، اس لئے شائد یہ احساس ہوا۔"

"ہو سکتا ہے یہ وجہ ہو۔ یہ صحیح ہے کہ راج گھاٹ اور نہرو گھاٹ، کی ہریالی، تازگی اور حسن مسحور کرنے والا ہے۔"

"امّی! میرا تاج محل دیکھنے کو بہت جی چاہتا ہے۔" میری بیٹی کو تاج محل دیکھنے کی شدید آرزو تھی۔ بی آپا نے کہا: تمہاری اماں دو دن کے لئے دہلی آئی ہیں اور ہوا کے گھوڑے پر سوار ہیں، ورنہ ہم آگرے کا ویزا لے لیتے اور تمہیں "تاج محل" ضرور دکھاتے۔"

کوئی شخص انگلینڈ یا امریکہ جاتا ہے تو وہ جس شہر میں جانا چاہے، جا سکتا ہے، مگر ہندوستان اور پاکستان کے درمیان اتنی پابندیاں ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی خاص شہر کا ویزا رکھتا ہو تو وہ اس علاقے کے گاؤں میں نہیں جا سکتا۔ حالانکہ آگرہ اتنا قریب ہے۔ لیکن تاج محل دیکھنے کے لئے ویزا ضروری ہے۔

بھائی صاحب نے کہا "اب کے جب آؤگی تو ہم تمہیں تاج محل ضرور دکھائیں گے اب دونوں ممالک کے درمیان بہت جلد ریل چلنے والی ہے۔ اور اس ریل کا نام سمجھوتہ ایکسپریس رکھنے کی تجویز ہے"

بی آپا نے کہا "سمجھوتہ ایکسپریس کے بجائے دوستی ایکسپریس زیادہ اچھا رہے گا۔"

میں نے کہا "اب آپ لوگ آئیے اب آسانیاں بھی ہو جائیں گی"

بی آپا نے کہا، میرا بہت جی چاہتا ہے کہ ایک بار پاکستان آ کر ان کے مزار پر فاتحہ پڑھوں، قائد اعظم اور علامہ اقبال کے مقبروں پر جاؤں اور داتا صاحب کے مزار پر حاضری دوں۔ لیکن دیکھو کبھی یہ خواب حقیقت بنتا بھی ہے یا نہیں۔ سنا ہے قائد اعظم کا مقبرہ بہت خوبصورت ہے،

"ہاں بہت خوبصورت ہے، آپ آئیے آپ کو سب جگہیں دکھائیں گے"

بھائی صاحب بولے "تمہاری آپا ابھی تک اندر سے مسلم لیگی ہیں "پانچواں کالم"—ان کے پاس آج تک قائد اعظم کی تصویر موجود ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ اب وہ دیوار سے الماری میں محفوظ ہو گئی ہے"

"واہ! میں پانچواں کالم نہیں ہوں، ہندوستان کے لوگ اگر اسٹالن، ماؤزے تنگ اور... سے محبت کر سکتے ہیں تو قائد اعظم سے کیوں محبت نہیں کر سکتے!

بھائی صاحب خاموش ہو گئے، بی آپا نے کہا "وہ تصویر میرے ذہنی سفر کی ایک منزل ہے۔ محبت کرنے والے پشیمان نہیں ہوتے! مسلمانوں کی اسلام سے محبت کا نام پاکستان تھا اور ہم اپنی محبت پر پشیمان نہیں ہیں!"

ان کی آنکھوں میں ایک نسل کی جد و جہد، محنت اور ایثار کا غرور تھا—پھر انہوں نے مجھ سے کہا "لیکن مجھے تم لوگوں سے شکایت ہے —تم نے وہ پاکستان نہیں بنایا جو قائد اعظم اور علامہ اقبال بنانا چاہتے تھے"

"خالہ—! ہم وہ پاکستان بنائیں گے!" میری بیٹی کی آواز میں یقین اور عزم تھا۔ بی آپا نے اسے گلے لگا لیا، پیار کیا اور کہا "اب وہ تصویر تمہاری ہے"

آمنہ ابوالحسن

لحاف

کام کرتے کرتے مہر کی نگاہ اچانک دھوپ میں پھیلے ہوئے لحاف پر پڑی تو اُسے بڑی شرمندگی سی محسوس ہوئی۔ لحاف بہت میلا ہو چکا تھا اور جہاں جہاں سے ادھڑ گیا تھا سیا ہوا تھا جب یہ لحاف نیا تھا تو اس کا کلر کامبنیشن اور ڈیزائن دیکھ دیکھ کر مہر بہت خوش ہوا کرتی تھی۔ کیسے روشن روشن رنگ اور کتنے نازک بیل بوٹے! ہر صبح جب وہ بستر صاف کیا کرتی تو بہت ہلکے ہاتھوں سے لحاف کو جھٹکتی۔ اُس کی شکنیں نکالتی تب ایسی احتیاط اور سلیقے سے اُس کی تہہ لگاتی جیسے اُس کے ہاتھوں میں لحاف نہیں کوئی زندہ چیز ہو۔

مہینوں وہ اسی نازک ذہنی سے اس کی حفاظت کرتی رہی مگر شکیل لحاف کو کوئی جاندار چیز نہیں سمجھتا تھا بلکہ صرف استعمال کی ایک چیز۔ جب تک لحاف بہت نیا تھا وہ بھی ذرا محتاط رہا مگر پھر جیسے جیسے دن گزرنے لگے اس کی احتیاط ختم ہوتی گئی۔ اُس کی ابتدا کی عادت تھی کہ لحاف کو اپنے اطراف غلاف کیطرح لپیٹ کر سویا کرتا اور اتنا کس لیتا کہ لحاف خود اس کی جان کا ایک حصہ بن جاتا۔

کچھ عرصے تک لحاف نے شکیل کا کساؤ بڑے استقلال سے برداشت کیا مگر پھر احتجاج کے طور پر اس کے ٹانکے جگہ جگہ سے ٹوٹنے لگے اور روئی کی جمی ہوئی پرتیں اکھڑ اکھڑ کر چھوٹی چھوٹی گیندوں کی شکل اختیار کرنے لگیں۔ جب مہر شکیل کو ایسی بداحتیاطی کے لئے ٹوکتی تو وہ ہنس کر کہتا۔

" ارے لحاف ہی تو ہے جان۔ کتنا بھی نیا ہو کبھی نہ کبھی تو پرانا ہو ہی جائے گا اور پھر استعمال کی چیز کو نمائشی طور پر برتنا مناسب بھی تو نہیں۔ مجھے تو بس ایک ہی چیز کی حفاظت اچھی لگتی ہے وہ صرف تم ہو۔ بقیہ سب تو ....

وہ اپنی بات یہیں ختم کر کے جب مہر کو اپنی مضبوط باہنوں میں کس لیتا تو مہر لحاف سے بے دردی کا ماتم بھول کر محبت بھرے لمس کے بے پناہ اور خوابناک جزیرے میں اتر جاتی اور پھر اس جزیرے کے حوالے

کچھ اور یاد نہ رہ جاتا۔

دو جاڑے اسی لحاف میں شکیل اور مہر نے بخیر و خوبی گزار دیئے مگر تیسرے جاڑے میں چونکہ افشاں بھی ان کی زندگی میں شامل ہوگئی لہٰذا مہر نے شکیل کیلئے نیا لحاف خرید لیا اور پرانے لحاف کے ٹوٹے ہوئے ٹانکے ٹھیک کرکے اُسے اپنے اور افشاں کے استعمال میں لے لیا۔ افشاں کافی صحت مند تھی۔ اُسکی سبھی عادتیں صحیح تھیں مگر ایک کمزوری یہ تھی کہ رات میں کئی بار بستر گیلا کر دیتی۔ اگرچہ مہر نے لحاف کو گیلا ہونے سے بچانے کی خاطر ایک ہلکی سی دلائی بھی لحاف کے اندر استعمال کرنا شروع کر دی مگر اس احتیاط کے باوجود سوتے میں کروٹیں بدلنے سے ہلکی دلائی اِدھر اُدھر سرک سرک جاتی اور لحاف گیلا ہوئے بغیر نہ رہتا۔

شروع شروع میں مہر کو بہت جھلاہٹ اور کوفت ہوئی مگر پھر افشاں کی محبت کے آگے اُسے اِس بات کی زیادہ پرواہ نہ رہی۔ پھر تو یہ معمول ہو گیا کہ ہر صبح مہر اس لحاف کو دھوپ میں پھیلا دیتی کہ ہر روز اس کا دُھلنا ممکن نہ تھا۔ دن بھر کی دھوپ کھا کر ایک تو لحاف سوکھ جاتا دوسرے پیشاب کی بدبو مر جاتی یا کم از کم مہر کو محسوس نہ ہوتی مگر جب شکیل افشاں کے قریب لیٹتا تو ناک سکوڑ کے لحاف کو پرے سرکا دیتا اور مہر سے کہتا۔

" اُفوہ! اتنا بدبودار لحاف کس طرح اوڑھ لیتی ہو اور غضب کہ افشاں کو بھی اڑھاتی ہو۔ اس سے صحت پر بُرا اثر پڑ سکتا ہے بھئی۔ کیوں نہیں ایک نیا لحاف خرید لیتیں۔ ؟"

مہر مسکرائی۔

" نیا لحاف۔ ! خیال تو اچھا ہے مگر افشاں فوراً ہی اُس کا بھی یہی حال کر دے گی جب تک وہ بڑی نہیں ہو جاتی یا بستر گیلا کرنا چھوڑ نہیں دیتی نیا لحاف خریدنا بیکار ہے۔"

شکیل ہونٹ سکوڑ کے رہ جاتا۔ "تم جانو۔" اور پیشاب کی بدبو کو دبانے کے لئے ہر رات سونے سے پہلے مہر لحاف پر ہلکا ہلکا عطر مل دیتی مگر عطر کی خوشبو جلد ہی پیشاب کی بدبو سے مات کھا جاتی۔ کچھ عرصے کے بعد مہر نے عطر ملنا بھی چھوڑ دیا۔ وہ بدبو کی عادی ہو گئی اور افشاں کے ساتھ اسی لحاف میں مست نیند سونے لگی۔

ایک سردی اور گزر گئی۔ افشاں نے بستر گیلا کرنا بھی چھوڑ دیا پھر بھی لحاف کو دھوپ کھلانا مہر کی عادت بن گئی تھی حالانکہ اُس کے بیل بوٹے اور رنگ دھوپ کھا کھا کر مدھم ہو چکے تھے۔ گیلا پن

اور کثرتِ استعمال کی وجہ سے کناروں پر سے کہیں کہیں غائب بھی ہو چکے تھے پھر بھی مہر کی پسندیدگی اور وابستگی کی نظروں میں اب تک جوں کے توں محفوظ تھے۔

معروفیات کی زیادتی کی وجہ سے اُس نے مدّت سے نظر جما کر لحاف کو نہیں دیکھا تھا مگر جب انشاں اسکول جانے لگی تو اُسے اتنی فرصت مل گئی کہ درہم برہم چیزوں کا جائزہ لے کر انہیں حسبِ ضرورت سدھار لے ایسے میں اُس کی نگاہ دیر تک لحاف پر پڑی تو اسے کافی شرمندگی ہوئی۔ اُن کی معاشی حالت اب ایسی گئی گذری تو نہیں کہ اتنا ناصاف۔ میلا۔ پرانا لحاف ضرور ہی استعمال کیا جائے۔ یہ تو شکیل کے سماجی وقار کے منافی بات ہوئی چنانچہ وہ فوراً اُسی روز جا کر ایک نیا لحاف خرید لائی۔

شکیل نے جب نیا لحاف دیکھا تو خوش ہو کر بولا "ڈارلنگ۔ یہ ہوئی نا بات کچھ۔ چیزوں کے استعمال کی بھی ایک حد ہوا کرتی ہے جانِ من جس کے بعد انہیں خیر باد کہہ دینا ضروری ہو جاتا ہے۔ دیر سے سہی مگر تم نے اسے رخصت تو کیا۔ شکریہ!"

اس رات شکیل بھی اپنا لحاف چھوڑ کر نئے لحاف میں مہر اور انشاں کے ساتھ خوب مزے سے سویا۔ لیکن اگلی رات مہر کو بالکل نیند نہیں آئی۔ رات بھر وہ بے چینی سے کروٹیں بدلتی رہی اور بار بار اُس ڈھیر کو دیکھتی رہی جہاں فاضل غیر ضروری بستروں کے ساتھ پرانا لحاف بھی پڑا ہوا تھا۔ اُسے عجیب بے قراری سی محسوس ہوئی۔ اُس نے بہت کوشش کی کہ نئے لحاف کی ملائم روئی جمی ہوئی دبیز پرتوں کی خوشگواری کو قبول کرے۔ اس کے دل آویز رنگ روپ اور نئے پن کی دمک سے لطف اندوز ہو مگر خوبصورت یادوں کی مسرت اور گزراں زندگی کے لطیف ترین لمحات کی جو نہایت پرانے لحاف سے وابستہ تھی وہ ہزار چاہنے پر بھی نئے لحاف کی راحت نہ بن سکی۔ وہ اُس کے بیاہ کا لحاف تھا جس میں اس کی سہاگ رات محفوظ تھی شکیل کی جیتی جاگتی مردانہ خوشبو اب بھی کہیں نہ کہیں دبی سانسیں لے رہی تھی۔ خود اس کی اپنی بھرپور نسائیت کا افتخار شکیل سے انشاں کا حاصل کرنا اور انشاں کے بچپن کی معصوم بھینی مہک اور میٹھا آلا بڑے غرور سے مسکرا کر یکا یک وہ اٹھی۔ نیا لحاف اُس نے انشاں کو اڑھایا اور خود کو پرانے لحاف سے ڈھک لیا۔ روٹھی ہوئی نیند ایک دم اُس کی آنکھوں میں آ گئی۔

صبح شکیل نے جاگ کر دیکھا تو بُرا سا منہ بنا کر بولا۔

"یہ کیا۔ پھر یہ میلا لحاف۔؟ اسے پھنکوا کیوں نہیں دیتیں اب۔؟"

(باقی صفحہ ۲۹۱ پر)

نکہت حسن

واں کے نکالے ہوئے

(۱)

چھت پر سے ربیع الاوّل کا چاند دیکھ کر مشرف حسین کی بیوی عالیہ بیگم کمرے میں آئیں۔ انھوں نے کارنس پر رکھا ہوا "میلاد اکبر" اتارا، طاق میں رکھتے ہوئے اگردان کی گرد صاف کر کے اس میں اگربتیاں لگائیں، دیوار پر لگے ہوئے مکّے، مدینے والے فریم کو ڈوپٹے کے کونے سے صاف کیا۔ خس کے عطر کی شیشی، گلاب پاش اٹھا کر تخت پر رکھا۔ ہاتھ سے تخت پوش کی سلوٹیں برابر کیں اور پھر اس پر جھالر والے غلاف کا تکیہ رکھنے کے بعد کمر بند کی گرہ میں سے سوا روپیہ کھول کر لڑکے کو دیا کہ نکّڑ کی دکان سے تبرّک لے آئے اور پھر لڑکیوں کو آواز دی۔

"بارہ وفات کا چاند ہوگیا۔ آؤ لونڈیوں مولود شریف پڑھ لو۔ اور ہاں زبیدہ چچی کو بھی خبر کرتی آنا"

انھوں نے اپنا سر عقیدت سے ڈھانپا اور خود دالان میں بچھے ہوئے تخت پر آ کر بیٹھ گئیں۔

درود تاج، پیدائش کا بیان اور 'زمین بولی فلک بولا' والی نعت تو وہ اکیلی پڑھتی تھیں۔ روایت اور "آمنہ کا لال" کی نظمیں زبیدہ خاتون پڑھتی تھیں۔ سلام پڑھتے وقت لڑکیاں ساتھ لگ جاتی تھیں۔ لڑکیوں کی آوازیں ہی کہاں تھیں اور پھر ان فلمی گانوں نے اور بھی ریڑھ مار رکھی تھی۔ کیا حمد کیا نعت، اور کیا مناجات، سب کی تان 'نگری میری کب تک یوں ہی برباد رہے گی' پر جا کر ٹوٹتی تھی۔ عالیہ بیگم کو میلاد پڑھتے ہوئے ایک مدت ہوگئی تھی، اس عمر میں بھی ان کی آواز بڑی کراری اور پاٹ دار تھی۔ 'آسمان زمین والی نعت تو وہ پوری ڈھب کر پڑھتی تھیں۔ پڑھتے ہوئے ہُو ہُو جنگ کا سماں باندھ دیتی تھیں۔

'فلک بولا گھٹا اٹھ کر مری بجلی کو گھٹا دے گی۔

'زمیں بولی کہ مجھ کو عاجزی تجھ سے بڑھا دے گی۔
'فلک بولا ستاروں کا مری منزل میں لشکر ہے۔'
زمیں بولی کہ مسجد میں مری اللہ اکبر ہے!'

آسمان کی بات، آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر بڑے دبنگ لہجے میں کہتی تھیں اور زمین کی بات گردن جھکا کر اور آنکھوں کو بند کر کے عاجزی سے بیان کرتی تھیں۔ ان کی آواز میں سوز بھی تھا اور جذبے کی کیفیت بھی۔ یہی وجہ تھی کہ ان کو لڑکیوں کی رواں رواں کرتی ہوئی آوازیں پسند نہیں آتی تھیں۔ سلام کے لئے مجبوری تھی۔ وہ سلام ہی کیا جس کی گونج گلیوں اور محلّوں میں نہ سنائی دے۔ "مدینہ نہ دیکھا تو کچھ بھی نہ دیکھا!"

انہوں نے گہرا سانس لیا اور پھر لڑکیوں کو پکارا۔
سُن نہیں رہی ہو۔ میں کیا کہہ رہی ہوں ! چاند ہو گیا۔"
نجمہ نے نزہت کو اور نزہت نے صغریٰ کو دیکھا۔
"چلو نا" نجمہ منمنائی۔
"تم لوگ جاؤ" نزہت نے پلنگ پر اوندھے پڑے پڑے کہا۔
"تم بھی چلو۔ نانی اماں سب کو بلا رہی ہیں" نجمہ بولی۔

"مجھے کب مولود پڑھنا ہے!" نزہت نے نانا کا عذر پیش کیا اور کتاب پڑھنے لگی وہ "شوکت آرا" کے آخری حصّے پر تھی۔ ربیع الاوّل کا چاند نکل ہی آیا تھا تو جانے یہ اماں بی کو فوراً محفلِ میلاد کی منعقد کرنے کی کیا ضرورت تھی!" نزہت نے جھنجھلا کر سوچا۔ نزہت کو اپنے گھر کے طور ہی سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ ہر وقت کسی نہ کسی نذر و نیاز، فاتحہ درود، سوز خوانی، حمد اور نعت کا سلسلہ لگا رہتا تھا! انسان کا کبھی نہ کبھی یہ بھی تو دل چاہتا ہے کہ وہ بس آرام سے لیٹا ہوا "شوکت آرا" پڑھتا رہے۔

ناول پڑھنے کا چسکا نزہت کو نیا نیا پڑا تھا۔ یہ چسکا دادا اکرام الٰہی کے کتب خانے سے پڑا تھا۔ اکرام الٰہی جو محلّے میں ڈپٹی صاحب کے نام سے جانے جاتے تھے اور جو اس وقت قینچی کی سگریٹ پیتے تھے اور ہارڈی پڑھتے تھے۔ اپنے گھر کے جس حصّے میں وہ رہتے تھے وہ دوسرے حصّوں سے بالکل الگ تھلگ۔ کمرے میں خس کی ٹٹّی لگی ہوئی تھی اور چھت کے ساتھ کپڑے کا جھالر والا پنکھا تھا جو کبھی ہاتھ سے اور کبھی پیر میں ڈوری ڈال کر کھینچا جاتا تھا۔ اکرام الٰہی کے خادمِ خاص کا نام عظیم اللہ تھا مگر سب اس کو "اجی ملّا" کہہ کر پکارتے تھے۔ یہ دو روپے ماہانہ اور روٹی کپڑے پر پنکھا

کھینچنے کا فرض ایک مدت سے انجام دے رہا تھا۔ اکرام الہٰی کے کمرے کے سرخ پتھروں والے چکنے فرش پر اوندھا پڑا ہوا وہ مستقل پنکھے کی ڈوریاں کھینچتا رہتا تھا۔

کمرے میں چاروں طرف لکڑی کے تختے جڑے تھے۔ یہ تمام تختے کتابوں سے بھرے ہوئے تھے۔ سب سے اوپر والے تختوں پر کلام پاک کے نادر اور قیمتی نسخے۔ تفسیرات۔ سیرۃ النبی کی جلدیں، اولیاء اللہ اور صوفیائے کرام کے حالات۔ بہشتی زیور۔ بائیبل کے قدیم اور جدید نسخے، بھگوت گیتا، رامائن اور اسی قسم کی اور کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ کمرے کے داہنے ہاتھ پر لمبے والے تختے اردو اور فارسی کی کتابوں کے لئے مخصوص تھے۔ رباعیات خیام، مثنوی مولانا روم، حافظ اور رومی، گلستان اور بوستان سعدی، فسانۂ عجائب، طلسم ہوشربا، الف لیلیٰ، میرامن کی چہار درویش، طوطا کہانی، شوکت آرا، شہیدی بیگم، صبح زندگی، شام غم، مثنوی زہر عشق، قسم کی سینکڑوں کتابیں جن کے کناروں پر سنہرا پانی پھرا ہوا تھا درمیانی تختوں پر ترتیب سے رکھی تھیں، دنیائے ادب، فلسفے اور شاعری کے نادر نسخے۔ ہومر، گوئٹے، فلابیئر، دانتے، ڈکنز، ہارڈی، چیخوف، اسکاٹ اور ٹالسٹائی۔ شیکسپیئر بائرن، کانٹ، ہیگل اور نٹشے وغیرہ سب کتب خانے کے تختوں پر صف باندھے کھڑے تھے۔ نچلے حصے پر اردو اور انگریزی رسالوں کے ڈھیر اور زمین پر روزناموں کے پلندے رکھے ہوئے تھے۔ کونے والی میز پر روز کا اخبار پڑا رہتا تھا۔ کمرہ ہر وقت خس کی خوشبو اور ہلکے ہلکے خواب آور اندھیرے سے بھرا رہتا۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر پڑے ہوئے رنگین جالی کے پردے مستقل ہلتے رہتے تھے۔ اس کمرے اور ان کتابوں کو قریب سے جا کر دیکھنے کی خواہش ہر وقت نزہت کے سینے میں مچلتی رہتی تھی۔ اکرام الہٰی کی بیٹی روشن آرا سے اس کی اچھی خاصی دوستی تھی۔ اس نے جب بھی روشن سے اکرام الہٰی کے کمرے میں جانے کو کہا وہ "نا بابا" کہہ کر کانوں کو ہاتھ لگاتی تھی، وہ دن بھر سلیقے سے ڈوپٹہ اوڑھے انگلی کے پورے پر گزروں ڈی۔ ایم۔ سی۔ کا دھاگا لپیٹے اپنی شادی کے تکیہ غلافوں کے لئے کروشیا کی بیلیں بنتی رہتی تھی۔ یا پھر لٹھے کے ٹکڑوں میں فریم لگا کر "میٹھے خواب" اور "اچھی راتوں" والے غلاف کاڑھا کرتی۔ اس کا ارادہ شاید شادی کے فوراً بعد اپنے میاں کو بے حد چین کی نیند سلانے کا تھا۔

اکرام الہٰی میں بظاہر تو ایسی بات نہیں تھی کہ لوگ ان سے خوف کھائیں۔ نزہت کے لئے تو وہ ہمیشہ سے ہی انگریز گوروں کی طرح پرکشش رہے تھے۔ سب سے الگ تھلگ، سفید بھق، قینچی کا سگریٹ اور تھامس ہارڈی! اس نے کئی دفعہ عظیم کی بھی خوشامد کی تھی۔

"اجی ملاّ" بھائی لاؤ میں پنکھا کھینچ دوں تھک گئے ہوگے۔" پر عظیم اللہ ایک ڈرپوک چوہا۔ اکرام الٰہی کی ہیبت سے اس کا دم نکلتا تھا۔ اکرام الٰہی کا کمرہ خواب کی طرح نزہت کے ذہن پر چھایا رہتا۔ اونچی چھت والا کمرہ۔ دیواروں میں جڑے ہوئے تختے، جھالر والا پنکھا، سگریٹ کے خالی اور بھرے ہوئے ڈبّے، نقشین پایوں والا نواڑی پلنگ، جالی کے پردے، سمور کے کشن، دیواروں پر منہ کھولے ہوئے بارہ سنگھوں کے سر، خس کی خوشبو، طلسم ہوش ربا اور عرب کی راتیں!

"یا اللہ! اگر یہ ہماری ہی دنیا ہے تو اتنی دُور کیوں ہے؟" بچپن سے خوابوں کے جزیرے میں بسنے والی نزہت اب جوانیوں کی حدود میں قدم رکھنے کے بعد کچھ زیادہ ہی اوٹ پٹانگ سوچنے لگی تھی۔

ڈپٹی صاحب کے گھر سے جب وہ اپنے گھر واپس آتی تو اس کو سخت گھٹن کا احساس ہوتا۔ اوپر سے گھر والوں کی لتاڑ پڑتی وہ الگ۔

"یہ تم ڈپٹی صاحب کے گھر کیوں دوڑ دوڑ کر جاتی ہو؟ اب ایسی ننھی بھی نہیں رہی ہو کہ کھلے سڑکوں پر کدکڑے لگاتی پھرو۔"

وہ کونسی سڑک پار کر کے جاتی تھی۔ بس یوں ہی منڈیروں منڈیروں چلتی ہوئی وہ بے خیالی میں اچانک اکرام الٰہی کے گھر کی سیڑھیاں اتر کر ان کے کمرے کے سامنے جا کر کھڑی ہو جاتی۔ ننگے پیر، دھوپ کی تپش سے اس کے تلوے جلنے لگتے۔ کھڑے کھڑے ٹانگوں میں چیونٹیاں سی رینگتیں لیکن وہ یوں ہی کھڑی حسرت سے کبھی عظیم اللہ کو، کبھی پنکھے کو اور کبھی کتابوں کو تکا کرتی۔

وہ گرمیوں کے سخت اور جھلسا دینے والے دن تھے۔ صبح سویرے ٹھٹھا۔ دھوپ نکل آتی اور گرم ہوائیں چلنے لگتیں۔ آم کے پیڑوں پر ابھی بور ہی آیا تھا کہ گھروں گھروں ہنڈولے پڑ گئے اور کڑھائیاں چڑھ گئیں۔ دھانی اور سرخ دوپٹے رنگے جانے لگے۔ اور منہارن بی سرخ اور ہری بانکیں لے کر گھروں گھروں گھومنے لگیں۔ کنواری اور نوبیاہتا کلائیوں میں چوڑیاں چڑھاتے ہوئے وہ خود ہی گنگناتی رہتی تھیں۔ تب عظیم اللہ کو اپنے گونے کا خیال آیا جس کو وہ پچھلے کئی ساونوں سے ٹال رہا تھا۔ اکرام الٰہی اس کی چھٹی کی درخواست کبھی منظور نہ کرتے اگر بروقت نزہت اپنی خدمات پیش نہ کرتی۔

"دادا، میں پنکھا کھینچ دیا کروں گی۔ جانے دیں بچارے کو۔" وہ صحن میں کھڑے کھڑے منمنائی۔

"اری چڑیل تو!" اکرام الٰہی نے اس کے سر کے پیچھے کھڑی ہلتی چوٹی کو مروڑی دیتے ہوئے کہا۔

اس دن پہلی مرتبہ بی نزہت پنکھے کی ڈوری کھینچنے کے لئے اکرام الٰہی کے کمرے میں داخل ہوئیں جہاں انھوں نے ڈوری تو کم کھینچی البتہ دادا کے کمرے میں رکھی وہ کتابیں جو اُن کے اپنے گھر میں شجر ممنوعہ تھیں ایک ایک کرکے چاٹنی شروع کر دیں۔ کبھی تو وہ کتاب میں اس درجہ غرق ہو جاتی کہ ڈوری کھینچنا بھی بھول جاتی۔ اکرام الٰہی کتاب یا اخبار سے نظر ہٹا کر گردن جھکا کر نیچے دیکھتے تو نزہت کو کتاب میں غرق پاتے۔ وہ بغیر کچھ کہے ہوئے مسکراتے ہوئے واپس لیٹ جاتے اور برابر کی میز پر رکھا ہوا ہاتھ کا پنکھا اٹھا کر جھلنا شروع کر دیتے۔ ایسے میں نزہت کو ایک دم احساس ہوتا اور وہ ہڑبڑا کر تیز تیز پیر چلانے لگتی۔

"اچھا تو بی نزہت لگا چکیں کل کے لئے پان، !" اکرام الٰہی دل ہی دل میں مسکراتے۔

مولوی مشرف حسین کی بیٹی نزہت اور اکرام الٰہی کے تعلقات کی بنیاد میں اردو کی چیلے چیلے مضمون والی کتابوں کا بڑا دخل تھا۔ جواب اکثر نزہت اپنے گھر والوں کی نظروں سے بچا کر چھپے چوری اکرام الٰہی سے مانگ کر لانے لگی تھی۔ وہ ان کتابوں کو صندوقوں کی کوٹھری میں بیٹھ کر یا میلے کپڑوں کی ڈولی کی آڑ لے کر پڑھتی تھی ——۔ "شوکت آرا بیگم" کی یہ آخری جلد تھی جس کو آج ہی ختم کرنا تھا۔ کیونکہ اکرام الٰہی علی الصبح ایک ہفتے کے لئے شکار پر جانا تھا اور ان کے جانے سے پہلے اس کو دوسری کتاب لانی تھی۔ ادھر بارہ وفات کا چاند نکل آیا اور گھر کے در و دیوار "تیری شان جلّ جلالہ" کی آوازوں سے گونجنے لگے۔ گھر کے اندر ہر قسم کی غیر شرعی باتوں پر سختی سے پابندی کے احکامات جاری ہو گئے۔ کمروں کے فرش دھوئے جانے لگے۔ جگہ جگہ مٹی کی سکوریوں میں اگر دان لوبان سلگا دیا گیا۔ مشرف حسین نے سیرۃ النبی کی جلدوں میں کاغذ کی نشانیاں لگا لگا کر بارہ روز کا پروگرام مرتب کیا۔ انھوں نے تمام کتابیں زبیدہ خاتون کو دینے کے بعد ایک ایک نکتہ اچھی طرح سمجھایا۔ زبیدہ خاتون مشرف حسین کے چھوٹے بھائی سرفراز حسین کی بیوی تھیں۔ سرفراز حسین کے انتقال کے بعد وہ مستقل طور سے مشرف حسین کے ہی پاس رہنے لگی تھیں۔ بچوں کی تعلیم و تربیت گھر کی دیکھ دیکھ اور اندر باہر کے سب کاموں میں ان کے رائے مشورہ کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ ان کے باپ جو انگریزی حکومت کے دورِ اقتدار میں ترقی کرتے کرتے ڈپٹی کلکٹری کے عہدے پر پہنچ گئے تھے خاندان کے پہلے گریجویٹ تھے۔ ان کی لیاقت اور ان کے عہدے سے سب رعب کھاتے تھے۔ انھوں نے انگریز گورنس رکھ کر زبیدہ خاتون کو تعلیم دلوائی تھی اُس وقت زبیدہ خاتون فل بوٹ پہنتی تھیں، بالوں کی دو چوٹیاں باندھتی تھیں اور رَوکنگ ریڈر پڑھتی تھیں۔ ان کو ساری ٹھنڈی یخ بستہ صبحوں اور شاموں اور جگ مگ جگ مگ کرتے ننھے ستاروں والی انگریزی کی نظمیں یاد تھیں۔

قسمت کی بات کہ وہ اتنی جلدی بیوہ ہوگئیں اور مشرف حسین کے گھر آ کر پڑ رہیں۔ ایک تو بیوگی کا غم چھوٹے چھوٹے بچوں کا ساتھ، قصبے کا تنگ اور گھٹا ہوا ماحول۔ اس قصبے اور اس ماحول سے تعلق پیدا کرنے میں انھیں شروع شروع میں بہت دشواری ہوتی۔

زبیدہ خاتون نے سیرت کا بیان پڑھتے پڑھتے لڑکیوں کو دیکھا اور بولیں:

"منہ بند کئے کیا بیٹھی ہو، درود شریف پڑھو۔" تینوں لڑکیاں ہل ہل کر درود شریف پڑھنے لگیں، نزہت اس وقت بھی بے کل سی بیٹھی ہوئی تھی۔ اور میلاد سننے سے زیادہ اس کے ختم ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کا دل دو مین کتاب میں اٹکا ہوا تھا۔ "سالوں کی جدائی کے بعد توشوکت آرا بیگم کے میاں واپس آ رہے تھے۔" نجمہ نے اس کی شکل دیکھی اور پھر گردن جھکالی۔ نجمہ زبیدہ خاتون کی بیٹی تھی۔ اس کی منگنی کوٹھ بوندی والے وکیل صاحب کے بیٹے سے ہوگئی تھی۔ جو ٹاٹا کمپنی میں کام کرتے تھے۔ وکیل صاحب کا گھرانہ بڑا روشن خیال گھرانہ تھا۔ ان کی بیوی بڑے خاندان سے تھیں اور بڑی ٹھسے والی بی بی تھیں۔ نجمہ سے منگنی کرنے کے بعد انھوں نے اونچ نیچ سمجھائی تھی اور ساتھ ساتھ اپنے لڑکے کی خواہش کا اظہار بھی کر دیا تھا۔

"اسد میاں انگریزی کمپنی میں ملازم ہیں، گوروں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ہے۔ دعوت، پارٹیوں اور کلب وغیرہ کا سلسلہ لگا رہتا ہے۔ نجمہ کو اگر تھوڑی بہت انگریزی زبان کی شدھ بدھ ہو جائے اچھا ہے۔ بھائی مشرف حسین سے اجازت لے کر اسکول میں داخلہ کرا دو۔ جب تک شادی ہوگی ابتدائی جماعتیں پڑھ لے گی۔"

مشرف حسین نے خط پڑھ کر ایک طرف ڈال دیا اور پھر ٹہل ٹہل کر بولنے لگے۔

"چلیے میں انگریزی اور لاٹ ملک پر چھاتے ہوئے نحوست کے بادل ان لڑکوں کو نظر نہیں آ رہے ہیں! کارتوسوں والی چربی آنکھوں پر چڑھ گئی۔ گوروں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ہے۔ واہ واہ، بہت فخر کی بات ہے! ارے میاں اپنے جامے میں رہو۔ اب شریف گھرانوں کی لڑکیاں کلب اور پارٹیوں میں جائیں گی۔"

مشرف حسین بولتے بولتے باہر نکل گئے ان کے جانے کے بعد زبیدہ خاتون نے پھر خط پڑھا۔ تب ان کو بھی یہ سب باتیں بڑی بے وزن سی لگیں۔

"منگنی توڑ دوں؟" انھوں نے خود سے پوچھا۔

"اکلوتا لڑکا اور وکیل صاحب کا گھرانا!"

نجمہ عمر کے پندرھویں سال میں تھی۔ زبیدہ خاتون جلد سے جلد اس فرض سے سبکدوش ہونا چاہتی تھیں

نزہت کو نجمہ کی منگنی بہت مہنگی پڑ رہی تھی۔ کیونکہ نجمہ کے ساتھ ساتھ اس کو بھی اس تربیتی کورس میں شامل ہونا پڑ رہا تھا جس کی خواہش کا اظہار بڑے دن کی چھٹیوں میں آکر اسد احمد نے کیا تھا۔

کوئٹہ بوندی والے وکیل صاحب کے بیٹے اسد احمد ——— جو ایک کمپنی میں کام کرتے تھے۔ پائپ پیتے تھے اور سنہری فریم والا چشمہ لگاتے تھے۔

وہ جب بڑے دن کی چھٹیوں میں آئے تو مشرف حسین کے گھرانے میں ہاتھوں ہاتھ لئے گئے۔ اوّل تو وکیل صاحب کے بیٹے، پھر گھر کے ہونے والے داماد! کہاں اٹھائیں، کہاں بٹھائیں۔ تھے بھی اتنے شاندار! لمبے چوڑے سنجیدہ۔ بڑی بڑی باتیں۔ بڑی رسانیت اور دھیمے دھیمے لہجے میں کرتے تھے۔

"عورت مرد گاڑی کے دو پہیئے، آزادیٔ نسواں، اینی بیسنٹ اور سروجنی نائیڈو۔ آنچل اور پرچم۔ آئین نو سے ڈرنا، تحریکیں اور تنازعے، صبح نو، جدید عورت اور ملک کے تقاضے اور نیا انسان"۔ ایسے ہی اور بہت سے من من بھر وزنی الفاظ پھوکے پھیکے لہجے میں بول کر جب وہ جانے لگے تو تھوڑی دیر کے لئے مشرف حسین بھی قائل ہو گئے۔

"زبیدہ بچیوں کے لئے کسی ماسٹر کا بندوبست کر ہی دینا چاہئے"۔

"ٹھیک ہے بھائی صاحب"۔ زبیدہ خاتون کے سینے سے ایک بھاری بوجھ اتر گیا۔ کہاں تو وہ اسد احمد کو دیکھ کر منگنی توڑنے کا فیصلہ کر چکی تھیں۔

"زمین آسمان کا فرق ہے!" انھوں نے دو چار دن ہی میں اسد احمد کی ذہنی بلندی کا اندازہ لگا لیا تھا۔

"خواہ مخواہ بعد میں فضیحتے ہوں۔ اس سے بہتر ہے معاملہ ابھی صاف کر لیا جائے"۔ وہ ویسے بھی زبردستی اور بے جوڑ شادی کی قائل نہیں تھیں۔

"ہائے اللہ نجمہ آپا!" صغریٰ نے دروازے کی جھری میں نظریں گاڑے گاڑے کہا۔

"مرمٹیں!" نزہت شرارت سے مسکرائی اور پھر کھڑی ہو کر مچان پر رکھی ہوئی کتابوں کو کھکھوڑنے لگی۔ کافی دیر تلاش کرنے کے بعد اس نے ایک بوسیدہ سی کتاب نجمہ کے آگے ڈالتے ہوئے کہا۔

"بس شروع ہو جاؤ۔ ونگا ڈسیو دی کنگ"۔ اور پھر خود جا کر مشین پر بیٹھ گئی جہاں کٹے ہوئے کمربندوں کا ڈھیر پڑا ہوا تھا۔ ان آڑی اڑی کٹی ہوئی گزوں لمبی دھجیوں کے سرے جوڑنے کے بعد ان کو دوہرا کر کے سینا تھا۔

"سلائی کی یہ ابتدائی مشقیں کس قدر بکواس ہیں" اس نے بے دلی سے مشین چلاتے ہوئے کہا۔ کوئی حد بھی ہوتی ہے! گز دو گز لمبی دھجیوں پر بیٹھے ہوئے سیدھی سیدھی بخیہ کرتے چلے جاؤ۔ زبیدہ چچی! خدا کی قسم یہ تو زندہ گڑھوں میں گڑنے سے زیادہ اذیت ناک ہے" وہ زور سے بولی اور پھر کہا۔

"میری حالت پر آنسو بہاؤ لوگو" وہ تیز تیز مشین چلا رہی تھی اور اس سے کہیں زیادہ تیز بول رہی تھی۔

"غضب کی روانی ہے" نجمہ نے آہستہ سے کہا اور اپنے کرتے میں تُرپائی کرنے لگی۔

برابر کے گھر سے گانے کی آواز آ رہی تھی۔

"زچہ میری چھپکلی سے ڈر گئی رے"

"یہ لیجئے، وہ اسد احمد ہی کیا کم تھے کہ شیخ بندو کے بیٹے کے ہاں فرزند ارجمند بھی تولد ہو گئے۔ کونسی ہی عورت کی خبر لگتے تھے صاحبزادے اسد احمد ——— ! عورت تو وہی کی وہی ہے۔ زچہ، بچہ اور چھپکلی۔!" اس نے مشین کے ہتھے کو روکتے ہوئے کہا اور پھر نجمہ سے بولی۔

"اے بی یہ تمہارے اسد احمد بیک دقت کتنی لڑکیوں سے شادی کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں ؟"

"کم از کم تم سے نہیں" نجمہ نے کہا۔

"شکریہ۔" اس نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے کہا اور پھر بولی۔

"بھئی میں تو اس تربیتی کورس سے عاجز آ چکی ہوں۔ شادی تو ہو رہی ہے تمہاری اور سلیقہ مندی کی مشقیں کروائی جا رہی ہیں مجھ بیچاری کو۔ بھلا کیوں ؟" نزہت نے پوچھا اور پھر بولی۔

مجھے تو ڈر ہے کہ وہ جو کڑوے چرائتے کی بوتل زبیدہ چچی نے تمہارا رنگ روغن نکھارنے کے لئے منگائی ہے وہ بھی مجھے ہی پینی پڑے گی" نزہت نے مسخرے پن سے کہا۔

ہم سب ایک ہی راہ کے مسافر ہیں ہماری راہیں جدا ہیں" صغرا جو بڑی دیر سے چپ بیٹھی تھی اس نے اسد احمد کے لہجے کی نقل اتارتے ہوئے کہا۔

"سپاٹ اور گھسی پٹی سڑک۔ اسد احمد کی ماڈرن عورت کا انجام ——— پچھواڑے کے گھر میں جھانکو۔ بیچارے بھگوتی پرشاد بھی کچھ نہیں کر سکتے۔!" نزہت نے مشین کو خالی خالی چلاتے ہوئے کہا۔

"لاؤ یہ کمربند مجھے دو میں سیدھے کر دوں" نجمہ بولی۔

"دادا کے شوق ہی ختم نہیں ہوتے۔ اس عمر میں بھی شیر افگن بننے کی تمنا لئے ہوئے جنگل کو نکل گئے۔

پورا ہفتہ بالکل سپاٹ گزر گیا۔ ان اوندھے سیدھے، اول جلول کاموں میں" نزہت نے سلے ہوئے کرہنڈوں کے ڈھیر کو نجمہ کی طرف اچھالا اور خود اٹھ کر صحن میں بنی ہوئی دیوار پر منہ ٹکا کر شیخ بندو کے گھر میں جھانکنے لگی۔

(۲)

شیخ بنیاد علی کے کچے گھر کے دالان میں دو مہینے پہلے پکی چھت والا کمرہ بنا تھا اس کمرے کو دیکھ کر نمبردار تصدق حسین نے کہا تھا۔

"قصبے میں پکی عمارتوں کی تعمیر۔ قرب قیامت!"

قصبے میں قیامت سر پر ہی کھڑی رہتی تھی۔ اور اب کچھ دنوں سے یہ قیامت گھروں کی چوکھٹوں پر آ کر بیٹھ گئی تھی۔ ذرا ذرا بات پر دین اور مذہب کو خطرہ لاحق ہو جاتا۔

نزہت نے گردن کو ذرا اور لمبا کر کے شیخ بندو کے گھر میں جھانکا۔ گھر کے کچے صحن میں کڑوے تیل کے چراغ روشن تھے۔ محلے کی عورتیں ڈھولک لئے بیٹھی تھیں۔ صحن میں بنے ہوئے چولھے میں اپلے سلگ رہے تھے اور کڑوے تیل کی جھل پوری فضا میں بکھری ہوئی تھی۔ شیخ بندو کی بیوی جو ایک دبلی پتلی قصباتی عورت تھیں مٹی کے بڑے سے کونڈے میں خمیری آٹے میں پکا ہوا گڑ ڈال کر پوڑوں کا قوام تیار کر رہی تھیں۔ ان کی بہو فہمیدہ جو صبح سویرے بیٹا پیدا کر کے نبٹی تھی نقشین پاؤں والے پلنگ پر آلتی پالتی مارے ہوئے بیٹھی تھی۔ پلنگ کے سرہانے لگے ہوئے شیشے میں نومولود بچے کا عکس مسکرا رہا تھا۔ بالکل ویسی ہی مسکراہٹ فہمیدہ کے چہرے پر بکھری ہوئی تھی۔ بچے کا باپ رشید حافظ جی کو بلانے گیا ہوا تھا۔ رشتے دار عورتیں بچے کے نام کے متعلق تبادلۂ خیال کر رہی تھیں۔

"اَئے بھابی جمعہ کے دن ہوا ہے سیدھا سیدھا جمّا رکھ دو۔"

چندا رکھو چندا، چاند رات کو بہو کو پیدائش کے درد لگے تھے۔" دوسری بولی۔

"جاؤ بھی، جمّا، چندا بھی کوئی نام ہووے ہیں۔ کوئی نئے فیشن کا نام رکھو" تیسری بولیں۔

"وہ کیسا رہے گا جناح صاب" ایک اور خاتون بولیں۔ جو سنہری کمانی کا چشمہ لگائے ہوتے تھیں، اور ابھی تھوڑی دیر پہلے موجودہ سیاسی بحران، گاندھی جی کی بکری اور برت پر بہت کچھ بول چکی تھیں۔ ان دنوں ہی دو چار نام جناح، لیاقت، جوہر، جواہر، گاندھی، پٹیل عوام کے ذہنوں پر چھائے ہوئے تھے۔ وہ تو شکر ہے

ان عورتوں کا ذہن گاندھی، کچلو کی طرف نہیں گیا ورنہ تو نام کا قصّہ ختم ہو جاتا۔

"ہٹو بی یہ بھی کوئی نام ہوا۔"

"لیاقت کیسا رہے گا؟" وہ ہی بی بی پھر بولیں جو خود کو مسلم سیاست کی مرد میدان سمجھے ہوئے تھیں۔

"بیبیوں میں تو ایک ہی بات کہوں ہوں۔ کوئی سا بھی نام رکھو بس شروع میں محمد ضرور لگا دینا نام میں بڑا اثر ہووے ہے۔" بنیاد علی کی بیوی نے عقیدت سے اپنی دونوں انگلیوں کو چوما اور پھر آنکھوں سے لگانے کے بعد کڑھائی میں پڑے ہوئے پوڑوں کو اُلٹ پلٹ کرنے لگیں۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ چھپّر کے نیچے بیٹھے ہوئے شیخ بنیاد علی دھاڑے

"بھاگوانو تم نام ہی طے نہیں کر چکیں۔ وہ حافظ جی بچّے کو شہد چٹانے اور کلام اللہ سنانے بھی آگئے۔

بس ہو گیا طے۔ محمد لیاقت علی۔!" وہ پلنگ سے اٹھے اور حافظ جی کو لینے دروازے پر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد عورتوں نے باری باری بچّے کی پیشانی چومی اور پھر تلوا دیکھنے کے بعد اٹھ آنے۔ روپیہ، سوا روپیہ اس کی بند مٹھیوں میں رکھنے کے بعد بچّے کو ماں کی گود میں ڈال دیا۔ اس دھینگا مشتی میں بچہ ہلکان ہو چکا تھا اور اب وہ اونچی آواز میں رو رہا تھا۔ بچّے کی ماں، فہمیدہ محنت کش طبقے سے تعلق رکھنے والی، کسے تنے جسم کی صحت مند عورت تھی۔ بیٹا پیدا کرنے کا ارمان شادی کی پہلی رات سے اس کے سینے میں کلکاریاں مار رہا تھا۔ یہ تو خدا کی دین اور قسمت کی بات کہ پے در پے سات بیٹیاں پیدا کرنے کے بعد اب کہیں جا کر یہ بھولے ناتھ تشریف لائے تھے۔ اس نے بچّے کا گلابی گال اپنے کالے کھردرے گال کے ساتھ لگایا اور بولی۔

"نا میرے چاندنا ———

کالے سمندروں پر کالے ہی پار جاتے۔

کالوں کی لاج رکھنا میرے کرشن کالے۔" وہ بچّے کو ہلا رہی تھی اور گا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر سکون خود اعتمادی اور غرور تھا۔ جیسے اب وہ پوری دنیا سے ٹکرّ لے سکتی ہے۔ ان گوروں کی کیا ہستی۔ وہ تو اس کوڑیالی نسل کے لئے چند سال کے اندر اندر پوری بٹالین تیار کرنے کا ارادہ لے کر شیخ بنیاد کے گھر آئی تھی۔

کالے اور طاقتور انسانوں کا ایک عظیم لشکر ——— !

اس نے صحن میں کھڑے ہوئے اپنے منحنی سے مرد کو دیکھا۔ سات بیٹیوں کا باپ۔ ذمّہ داریوں کے بوجھ سے اس کے کندھے وقت سے پہلے جھک گئے تھے۔

"تم اب کچھ فکر نہ کرو حاجرہ، فاخرہ، آمنہ، امینہ، بتول بی بی، منّی اور چنّی کے ابّا۔ لیاقت کے ہوتے اب ہمیں کا ہے کی فکر۔" اس نے بچّے کو اپنی بھری بھری چھاتیوں کے ساتھ بھینچ لیا۔

بچّے کی زبان پر شہد کی بوند ٹپکانے اور کان میں کلام اللہ سنانے کے بعد۔ حافظ جی منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے دروازے سے نکل گئے۔ لاٹھی کی ٹھک ٹھک کے ساتھ ان کی ٹوٹی پھوٹی آواز گلیوں میں بڑی دیر تک سنائی دیتی رہی تھی۔

"تم کس کس کی زبان پر شہد کی بوندیں ٹپکاؤ گے اندھے حافظ جی! ہمارے اپنے چاروں طرف اتنی ہزاروں، کروڑوں تلخ و ترش زبانیں لٹک رہی ہیں۔ گز گز لمبی لمبی کڑوی کسیلی زبانیں ملک کے گوشے گوشے میں ایک دوسرے کے خلاف زہر اگل رہی ہیں۔ تمہارا یہ شہد کا قطرہ اب کچھ کام نہیں آسکتا۔ زہر گھولو اور زہر پلاؤ۔ یہی جہانگیر کا انصاف ہے!" اصغر نے ہوا میں ہاتھوں کو گھماتے ہوئے مسخروں کے سے انداز میں کہا۔

"کامریڈ اصغر کی جے!"

مسجد کے چبوترے پر کھڑے ہوئے لڑکوں نے نعرہ لگایا۔

اصغر بڑی دیر سے اپنے ساتھیوں سمیت مسجد کے چبوترے پر کھڑا ہوا کسی قومی رہنما کے لہجے کی نقل اتار اتار کر تقریر کر رہا تھا۔ اس کا یہی شوق تھا اور یہی دلچسپیاں۔ ان دنوں نوجوان ذہنوں میں یہی سودا سمایا ہوا تھا۔ ہر بات کی نفی کرنا وقت کا سب سے بڑا تقاضا تھا۔ اصغر کو تو یہ جوش اور جذبہ ورثے میں ملا تھا۔

"اس بھنبھناہٹ سے کام نہیں چلے گا ملّا جی! خدا کا نام لینے کے بجائے بچّے کے کان میں چپکے سے کانی باتی گزر را کر دیا ہوتا۔ پھر دیکھتے اس منتر کا تماشہ!" وہ چبوترے سے چھلانگ لگا کر حافظ جی کے سامنے آکر کھڑا ہوا۔

"استغفر اللہ! استغفر اللہ! تو مشرف حسین کا بھتیجا اصغر ہے نا!" حافظ جی نے ہاتھ سے اس کے کندھے کو ٹٹولا اور پھر بولے۔

"تیرا تایا تو غیروں کی تربیت کرتا پھرے ہے۔ تجھے کیوں پُن کر کے چھوڑ دیا ہے!"

"دلیوں کے گھر شیطان قرب قیامت!"

نمبردار تصدق حسین جو قریب کھڑے ہوئے تھے بڑبڑاتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

مشرف حسین نے واقعی اصغر کو پُن کر کے چھوڑ دیا تھا۔ وہ اصغر کے باپ سرفراز حسین کا زمانہ دیکھے ہوئے

تھے۔ اگر کوئی ہٹ دھرمی اور کٹ حجتی کو ہی زندگی کی اقدار اور اصول بنالے تو پھر آگے کیا گنجائش رہ جاتی ہے۔ ہر بات کی نہیں کرنا سرفراز حسین کی عادت تھی۔ وہ کانگریس کے سرگرم رکن تھے۔ اچھی خاصی سرکاری نوکری کو لات مار کر ملک میں ہونے والے سیاسی دنگل میں کود پڑے۔ جب تک زندہ رہے چکّی کی مشقت کے ساتھ مشقِ سخن بھی جاری رہی۔ تقریریں کرنے، جلوسے کروانے، جلسے جلانے اور جلسے جوینٹ کروانے کے لئے شہروں شہروں بلوائے جاتے تھے۔ کبھی الہ آباد ہیں تو کبھی امرتسر۔ آج دہلی ہیں تو کل لکھنؤ۔ کبھی پنجاب پہنچے ہوتے ہیں تو کبھی بنگال کے بٹوارے پر دوندنگ رہے ہیں۔ ابھی 'رولٹ ایکٹ' پاس بھی نہیں ہوا کہ یہ تیار ہیں کالی جھنڈیاں لے کر۔ رام نومی کا جلوس نکل رہا ہے تو سب سے آگے آگے، شری رام چندر جی کی جے، اور گاندھی جی کی جے کے نعرے لگا رہے ہیں۔ اپنے گھر سے حلوہ اور پوریاں پکوا کر لئے جا رہے ہیں، اور ہندو مسلمانوں کو جمع کر کے ایک ہی برتن سے پوریاں اور مٹھائیاں کھا کھا کر اور ایک ہی برتن میں پانی پی پی کر ہندو مسلم ایک ہیں کے مظاہرے کر دار ہے ہیں۔ کوئی بھی کانفرنس ہو یا اس کے خلاف۔ کوئی بھی مشن آئے ان کا بس ایک ہی نعرہ تھا۔ 'واپس جاؤ، واپس جاؤ'۔ گھر کو اچھا خاصا آشرم بنا دیا۔ بیوی کو حکم دیا۔

"چرخا کاتو اور کھدر پہنو اور خبردار جو بدیسی مال استعمال کیا۔" بچّے کے دانتوں میں دبا ہوا ہنٹلے پامر کا بسکٹ نوچ کر باہر گلی میں کتّے کے آگے ڈال دیا۔ جب تک زندہ رہے بچاری زبیدہ خاتون کو خون کے آنسو رلوایا۔ وہ غریب 'کنگ ریڈرز' پڑھ کر اور 'گوڈ سیو دی کنگ' کہہ کہہ کر حکومتِ وقت کی وفاداریوں کے زیرِ اثر پلی بڑھی تھیں۔ یہاں دنیا ہی بدلی ہوئی تھی —— ——

—— سوت کی ہنڈیاں، چرخا، کھادی، ستیہ گرہ، برت، مرن برت، شدّھی، سول نافرمانی، سودیشی اور بدیسی کے چکّروں میں ایسی الجھیں کہ چند سال میں ہی ساری مغربی تہذیب کی روشنیاں گل ہو گئیں۔ اب تو چاروں طرف کڑوے تیل اور بنولے کے چراغ تھے۔ سوت کی ہنڈیاں تھیں اور چرخے اور تکلے۔

اصغر کی پیدائش ان ہی حالات اور ماحول میں ہوئی تھی۔ بڑا ہوا تو اس نے گھر کے اندر اور گھر کے باہر بساطیں ہی اجڑتی ہوئی دیکھیں۔ باپ جلسے جلوسوں کی شیدائی کانگریس کے سرگرم رکن۔ جے ہند اور گاندھی جی کی جے کے نعرے لگانے والے۔ بیوی ٹھنڈی یخ بستہ صبحوں اور جگ مگ جگ مگ کرتے ننھے ستاروں اور فل بوٹ پہننے والی روشن خیال خاتون۔ ادھر انہوں نے بچّے کو جوتے موزے پہنا کر اور گلے میں چھوٹی سی ٹائی باندھ کر اسکول بھیجا ادھر باپ نے ٹائی والی نوچ نوچ کندھے پر بٹھایا اور لے گئے کسی جلسے میں۔ بیٹے کی کمر تھپتھپا

رہے ہیں اور لگوا رہے ہیں بدیسی سامراج کے خلاف نعرے۔ کچّا ذہن اور کم عمری، اصغر کو باہر کی دھنگتی دھاڑتی زندگی کا ایسا چسکا پڑا کہ اس کو اسکول سے ہی نفرت ہو گئی۔ جہاں لمبا چغہ پہنے ہوتے فادر تھے اور مس کرسٹینا اور پیانو کی مدھم آواز میں روں روں کرتا ہوا صدیوں پرانا گھسا پٹا تریکل بستہ نغمہ ــــــ

زبیدہ خاتون سمجھا بجھا کر اس کو اسکول کے لئے تیار کرتیں۔ وہ اسکول جانے کے بجائے محلّے کے لڑکوں کو جمع کر کے جلوس نکالنے لگتا۔ ساری چکنے چکنے صفحوں والی کتابوں کی جھنڈیاں بنا ڈالیں۔ انگریزی کی ابتدائی نظموں کے بجائے "جن گن من اور بنے بنیادن سیتا رام، جیسے نغمے فرفر سناتا۔ باپ دیکھتے تو نہال نہال ہو جاتے " اللہ رسول کے نام سے بیزار اور مسلمانوں کو قبروں کا مجاور کہنے والے سرفراز حسین کا بیٹا اصغر وقت کے تقاضا دں کو پورا کرنے کی دھن میں سرفراز حسین سے بھی دو ہاتھ آگے ہے"۔ زبیدہ خاتون دہل کر سوچتیں ــــ ــــ

ہر قسم کے نرم و نازک جذبوں سے عاری اس بچّے کی تربیت میں کس کا قصور تھا اس کا جواب انھے حافظ جی کو کون دیتا ــــــ؟

ــــــ مشرف حسین، زبیدہ خاتون یا سرفراز حسین ــــ جنھوں نے اپنا دین، اپنا ایمان، اپنی اقدار، اپنا عہدہ و مرتبہ، اپنی عزّت اور بالآخر اپنی جان تک ملکی وفاداریوں کو نبھانے میں صرف کر دی۔ اور ایک دن الہ آباد جیل میں آٹھ ماہ کی قید بامشقت کاٹتے ہوئے خاموشی سے چل بسے۔ ان کی میّت جب گھر میں آئی تو مشرف حسین ایک طرف کھڑے ہوئے سوچ رہے تھے۔

" مسلمانوں کے قبرستان میں دفن ہوگا، یا اس کی ارتھی اٹھے گی؟ ــــ مرا ہو گا کوئی ادھارمی سیدھی وصیّت کر کے"

محلّے کے لوگ کندھا دینے کو تیار نہیں تھے۔ مولوی صاحب نے نماز جنازہ پڑھانے سے انکار کر دیا اور تو اور گورکن ان کی قبر کھودتے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگا رہا تھا۔ اس دن جو مشرف حسین کی پورے قصبے میں تھڑی تھڑی ہوئی تھی اس کا خیال کر کے آج بھی وہ کانپ جاتے تھے۔ کس مشکل سے انہوں نے خدا رسول کا واسطہ دے دلا کر، حدیث اور نبیوں اور پیغمبروں کے حوالے سنا کر محلّے والوں کو راضی کیا تھا۔

سرفراز حسین جیسے بھی تھے، تھے تو مشرف حسین کے بھائی اور اب تو مر گئے تھے۔ مُردے کا ذکر ہمیشہ اچھے الفاظ میں کرتے ہیں۔

وہ میت کے سرہانے گم سم کھڑے تھے۔ سرفراز حسین کی زندگی کے کتاب کے سارے ورق ان کے سامنے بکھرے ہوئے تھے۔ ان کے پیلے پیلے کھردرے صفحوں پر سیاہی تھپی ہوئی تھی اور حاشیوں پر کپڑے کے وہ پھونسڑے چپکے ہوئے تھے جو سیاہی میں چمک پیدا کرنے کے لئے ڈالا جاتا ہے۔ انھوں نے خاموش رہنے میں ہی عافیت سمجھی اور میت کو کندھا دیتے ہوئے قبرستان کی طرف چل دیئے۔ اس وقت ان کے کندھے سے کندھا لگائے اصغر بھی چل رہا تھا۔ اونچے قد اور دبلے پتلے جسم کا لڑکا محرومی کا بوجھ اٹھائے مشرف حسین کے ساتھ قدم سے قدم ملانے میں ہانپا جا رہا تھا۔

مولوی صاحب سے منھ زوری کوئی ایک بات تھی۔ اصغر تو پورے قصبے کے لئے مصیبت بنا ہوا تھا۔ بات بے بات لڑنے مرنے کو تیار۔ چلتی ہواؤں سے الجھتا۔ وہ نہ ہندو کا حامی تھا اور نہ مسلمان کا طرفدار، اور نہ ہی حکومتِ وقت کا وفادار۔ وہ کسی بھی قسم کی وفاداریوں کو نبھانے کا سرے سے قائل ہی نہیں تھا وفاداریاں کیا ہوتی ہیں اور کیسے نبھائی جاتی ہیں اسے یہ معلوم ہی کب تھا۔ اس کا ذہن بچپن سے ایک گورکھ دھندا تھا۔ مکڑی کے جالوں کا ایک بڑا سا الجھاؤ ——

پورے ملک میں ایک ملا جلا شور تھا۔ گھر کے باہر گانے باجے کے ہنگامے تھے اور گھر کے اندر قربِ قیامت کی پیشین گوئیاں۔ تعلیمی اداروں میں مغربی زبان اپنا اثر دکھا رہی تھی۔ مسجد سے ابھی تک مؤذن لوگوں کو سلامتی کی طرف بلا رہے تھے اور مندروں اور پاٹھ شالوں میں گھمسان کا یدھ چھڑا ہوا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کون سا راستہ اختیار کرے۔ اس پر سرفراز حسین کی بے وقت موت نے اس کو بالکل ہی بیچ منجدھار میں لا کھڑا کیا۔ اس کے ذہن کے پتواروں کو کوئی راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

مشرف حسین سخت مذہبی اصولوں کے پابند تھے ان کا ایک ہی کہنا تھا۔

"جو خدا اور رسول کا نہیں وہ کس کا ہوگا!" انھوں نے اصغر کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ جب تک باپ کی موت کا اثر رہا اس کا دف مارا رہا۔ زبیدہ خاتون نے اطمینان کا سانس لیا۔

چلو سرفراز حسین نے مر کر بیٹے کو جینے کا ڈھنگ تو سکھلا دیا!" انھوں نے اتنے بڑے خسارے کو مستقبل کے منافع کی آس میں خاموشی سے قبول کر لیا۔

مگر اصغر ایک چکنا گھڑا۔ ماں کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو ابھی پوری طرح خشک بھی نہیں ہونے پائے تھے کہ وہ پورے جہان کے خلاف خم ٹھونک کر کھڑا ہو گیا۔

(۳)

مشرف حسین کے گھر میں پھر مکھیاں سی بھنبھنانے لگیں۔ نزہت اور صغریٰ کے کان بالشت بالشت بھر لمبے ہو گئے ــــــــ خرگوش کے کان۔ کوئنہ بوندی والے وکیل صاحب کی بیوی کا پھر خط آیا تھا۔ اسد احمد مشرف حسین کے گھر سے بڑے دل برداشتہ ہو کر گئے تھے۔ نجمہ کے متعلق۔ تو انہیں معلوم تھا کہ وہ شکل و صورت کے لحاظ سے 'ابلا پری' ہے۔ مگر انہیں تو آج کی عورت چاہئے تھی۔ موم کی مریم نہیں۔ وہ کسی اور ہی خیال سے اُدھر گئے تھے۔ ملاقاتیں، تبادلہ خیال، پسند ناپسند، مستقبل کے منصوبے یعنی ان کی زبان میں کورٹ شپ والا معاملہ ہی چوپٹ تھا۔ لڑکیوں کو مروڑ تروڑ کر سات تالوں میں بند کر رکھا تھا۔ لڑکی نہ ہوئی لال جن کی جان ہو گئی۔ کھولتے چلے جائیے۔

"ڈبیا کے اندر ڈبیا، ڈبیا کے اندر ڈبیا، ڈبیا میں موتی، موتی میں دانہ، دانے میں بھنگا، بھنگے میں ــــ لاحول ولا قوۃ"

انھوں نے کوئٹہ بوندی پہنچتے ہی اپنی ماں کو صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔

"ہمارے اور ان کے ماحول میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ذہنی ہم آہنگی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ آج کل مردوں کی ترقیوں میں عورت کی دلکشن خیالی کو بہت دخل ہے۔ جس نے صاحب بہادر کے سامنے انگریزی کے دو چار لفظ بول دیئے بس اندازہ لگا لیجئے شوہر کے مقدر کے ستارے کا۔ نجمہ تو غالباً انگریزی زبان کے حروف سے بھی ناواقف ہے!"

تمہاری اس لن ترانی کا مقصد کیا ہے آخر!" زمانی بیگم نے سب کچھ سمجھتے ہوئے انجان بن کر پوچھا۔

"اب اس سے زیادہ آسان الفاظ تو میرے پاس ہیں نہیں۔ آپ سمجھنے کی کوشش کیجئے امی۔"

"منگنی توڑ دوں؟" انھوں نے چشمے کے اندر سے اسد احمد کو گھورا اور پھر بولیں۔

"ابھی تو وہ غریب میاں کو رو کر بیٹھی ہے کہ میں ایک پہاڑ اور اس کے اوپر توڑ دوں ـــ میاں خلوص و محبت بھی کوئی چیز ہوتی ہے! تمہاری انگریزی کی لغت میں یہ الفاظ ہیں کہ نہیں؟ بس جو منہ میں آیا بولتے چلے جاتے ہو۔ آج کل کے نوجوان کو کیا چاہئے اور کیا نہیں چاہئے اس کا تھوڑا بہت اندازہ مجھے بھی ہے۔ اپنے باپا کو اور مجھے جانتے ہو؟ آسمان زمین کے سرے کہاں مل رہے ہیں؟"

"ارے امّی آپ کیسی باتیں کرتی ہیں۔ آپ کا اور بابا کا کیا مقابلہ! آپ کی زندگی تو مثالی زندگی ہے۔ نمونہ!"

"تم میں بھی اگر صلاحیتیں ہیں تو کیوں پولا ہے ہو میاں! انجمہ کچّی لکڑی ہے۔"

"اور ہنہہ! یہ آپ کی خوش فہمی ہے۔ آپ ذرا جا کر وہاں کے حالات دیکھئے ہر فرد اپنی اپنی جگہ چٹان کی طرح جما ہوا!" انھوں نے دونوں ہاتھوں سے کنپٹیوں کو دباتے ہوئے کہا۔

"یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ اصولوں، اقرار اور وضعداری کی بات۔"

کیسے اصول اور کیسی وضعداری! یہ سب لبیرے اپنے چاروں طرف لٹکانے کی ضرورت کیا ہے آخر! آج کا انسان قرون اولیٰ کے انسان کا سوانگ بھر کر نہیں جی سکتا۔ پردے کے پیچھے بیٹھ کر 'سرتاج من سلامت' کہنے کے دن گئے۔"

"اور کیا، گلیوں گلیوں ہڑ دنگا مچا رہی کر ڈکرانے دن ہیں۔" زمانی بیگم نے غصّہ سے کہا۔

"بہر حال، آپ خط تو لکھ کر دیکھئے پھر۔"

"ہاں ہاں، لکھوں گی کیوں نہیں۔ مگر ایسے نہیں جیسے تم کہہ رہی ہو۔" زمانی بیگم نے مدبّرانہ انداز میں کہا۔ آنکھوں پر سے چشمہ اتار کر اس کو ڈوپٹہ کے کونے سے صاف کیا۔ اور پھر پیڈ اور قلم اٹھا کر لکھنے لگیں۔

"میں نے برخورداری نجمہ کے داخلے کے متعلق تمہیں پہلے بھی لکھا تھا۔ علم حاصل کرنے کے لئے تو خدا اور رسول نے بھی کہا ہے۔ قصبے میں جو کائستوں کا اسکول ہے لڑکیوں والا، وہی جہاں بھائی قربان علی کے گھرانے کی بچیاں پڑھتی تھیں وہاں کے متعلق مجھے علم ہے کہ وہ انگریزی زبان کی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم بھی دیتے ہیں۔ اسلامیات کی استانی مولانا عبدالغفار دیوبند والے کی سالی ہیں۔ وہ ہمارے عزیزوں میں سے ہیں۔ وہ مسلمان لڑکیوں پر خاص نظر رکھتی ہیں۔ نجمہ کو اسکول میں داخلہ دلوانے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ اچھا ہے شادی کے وقت تک دو چار جماعتیں پڑھ لے گی۔ ذرا گھر سے باہر نکلے گی۔ اپنی ہم عمر لڑکیوں سے ملنے جلنے سے بہت فرق پڑتا ہے۔ تم مشرف بھائی سے صلاح و مشورہ کر کے اب یہ قدم اٹھا ہی لو۔

بھائی مشرف اور بھابی عالیہ سے میرا سلام کہنا۔ بچوں کو دعائیں۔

دعاگو تمہاری بہن۔
زمانی بیگم"

یہی وہ بھن بھن تھی جس کا شور پچھلے کئی ہفتوں سے مشرف حسین کے گھر میں پھیلا ہوا تھا اور نزہت اور صغریٰ کے کان بالشت بالشت بھر کے ہو گئے تھے۔ گھر کے کھلے دالان میں مشرف حسین، زبیدہ خاتون اور عالیہ بیگم کی موجودگی میں رات دن بولتے رہتے تھے۔

" بے جوڑ شادیوں کا انجام، اپنی تہذیب اور روایات سے انحراف، انگریزی تہذیب کا زہر، اندھی تقلید دین اور مذہب سے بیزاری، اخلاقی قدروں کا نقصان، سائنس کی تباہیاں، جدید تقاضے، حالات حاضرہ اور بیچارا مردِ مومن "۔

" یا اللہ یہ ہمارے گھر ایکا ایکی ایسے افلاطونی مسائل کیسے پیدا ہو گئے! بیچاری امی اور زبیدہ چچی! ان کا تو ابھی لڑکیوں کے زندہ گاڑے جانے پر کڑھنا ہی ختم نہیں ہوا تھا یہ اسرا احمد کی عورت آنچل کے پھریرے لہراتی ہوئی بیچ میں کہاں سے آ دھمکی!" نزہت جو دروازے سے کان لگائے کھڑی تھی اس نے سوچا۔

" بھگوتی پرشاد سے میں نے بات کی ہے۔ اب دیکھو دو ایک دن میں جواب دیں گے۔ اسکول کے داخلے کے تو میں خلاف ہوں"۔ مشرف حسین نے زبیدہ خاتون کی طرف دیکھا جن کی آنکھوں کے گرد پھیلے ہوئے حلقے ان دنوں کچھ زیادہ ہی گہرے ہو گئے تھے۔

دراصل امتحان کا زمانہ ہے۔ الہ آباد بورڈ کے فیصلے آئے دن بدلتے رہتے ہیں۔ بھگوتی پرشاد امتحانی پرچوں کے سلسلے میں وہاں گئے ہوئے ہیں"۔

کوئی مہاراج سروپ بھی تو ہیں۔ سنا ہے بڑے سنیاسی سے بزرگ ہیں۔ ڈپٹی صاحب کا لڑکا اطہر بتا رہا تھا کہ کیرتن اور بھجن کے ساتھ ساتھ قرآنی آیتوں کے بھی بڑے اچھے حافظ ہیں"۔

"وہ بھروپیا! نہیں جی۔ دو تین دن کی بات ہے۔ جہاں اتنے دن صبر کیا کچھ دن اور سہی۔ ہاں تم بیٹھک میں پردے کا انتظام کروا دینا تینوں لڑکیاں پردے کے پیچھے بیٹھ کر پڑھیں گی"۔

نزہت نے اپنی ہنسی روکتے روکتے زور سے اپنا پیٹ دبایا اور پھر پلنگ پر جا کر دھم سے گر پڑی۔

"وہ مارا!" یہ کہہ کر وہ پھر اٹھی۔ نجمہ تخت پر بیٹھی ہوئی اپنے کرتے کے گریبان میں ٹوئی لگا رہی تھی اس نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا اور بولی۔

" کیا ہوا؟"

" آپ کو خود معلوم ہو جائے گا صاحب زادی انجمن آرا۔ کنیز کیا عرض کر سکتی ہے۔ گستاخی معاف۔ آپ کی

اعلیٰ تعلیم کا بٹ وابستہ ہو رہا ہے۔ اٹھئے، موی بنڈے پر شاہ ۃ العنبر لگا کر شانوں پر معطر زلفیں بکھیر کر، ڈوپٹے کا زرتار آنچل سنبھالتی ہوئی ہاتھ میں مور کا پر اور بلّور کا قلمدان پکڑ کر تیار ہو جائیے۔ پردے کے پیچھے استادِ محترم تشریف لایا ہی چاہتے ہیں" نزہت نے کورنش بجاتے ہوئے کہا۔

"بکواس مت کر" نجمہ نے اپنی آنکھوں میں ڈھیروں حیرانیاں بھر کر نزہت کو دیکھا۔

گھبرانے کی ضرورت نہیں نجمہ بیگم۔ یہ وقت ہم سب پر آتا ہے آخر ہمیں اپنے بھسڈی پن کی کچھ نہ کچھ تو سزا بھگتنی ہی ہوگی"

"تمہارا دماغ تو دادا کی لائبریری نے خراب کر دیا ہے۔ پڑھتی ہو نا دہ الابلا، طلسم ہوشربا اور زہر تریاق"

"چپ چپ!" نزہت نے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے کہا اور پھر بولی۔

"دیواروں کے کان! اتنی معمولی سی بات تو تمہیں یاد ہی رکھنی چاہئے نجمہ بیگم اور پھر ابھی ہم اتنے بھی روشن خیال نہیں ہوئے ہیں۔ کاش اسد احمد جلدی جلدی چکر لگائیں! خداوند ان کی نوکری ادھر ہی لگ جائے!" نزہت نے مکاری سے آنکھیں بند کرتے ہوئے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔

"بی بی تمہیں بھونرے میں رکھ کر پالا گیا ہے۔ تم سیّد گھرانے کی بیٹی ہو اور طور ہیں تمہارے ہنڑوالی کے سے" صغریٰ جو بڑی دیر سے خاموش بیٹھی ہوئی نزہت کی حرکات و سکنات کو غور سے دیکھ رہی تھی بزرگانہ انداز میں بولی۔

"بے جا باؤ کا اثر" نزہت نے لاپروائی سے کہا۔

"بس اب تم بولو گی اپنے من پسند الفاظ۔ مواد بھرا پھوڑا، ناسور اور ٹیسیں۔ میں تو بھیّا جا رہی ہوں۔ تمہارے پاس بیٹھ کر تو اچھا بھلا انسان پاگل ہو جاتا ہے" صغریٰ نے کھڑے ہو کر پلنگ کے نیچے سے اپنے چپل نکالے اور پھر سر کو ڈوپٹے کے پلّو سے ڈھانپتی ہوئی کمرے سے نکل کر کھلے صحن میں آگئی۔ جہاں دھوپ ڈھل کر منڈیروں اور چھجوں پر ٹکی ہوئی تھی۔ گھر کی چھت پر ایک چیل بہت دیر سے گردن ڈالے بیٹھی تھی۔

"کم بخت منحوس" صغریٰ نے زمین سے کنکر اٹھائے اور اس چیل کو اڑانے کے لئے اچھل اچھل کر نشانے لگانے لگی۔

گھر پر چھائی ہوئی نحوست کو ختم کرنے کی ایک معصوم کوشش ـــــ

"تم سے ٹک کر نہیں بیٹھا جاتا؟" اصغر جو صحن میں کھڑا ہوا اس کو چھلتے ہوئے دیکھ رہا تھا دھاڑا۔ وہ ابھی ابھی گھر میں آیا تھا۔ گھر میں پکنے والی کھچڑی کی خوشبو اس کی ناک میں بھی پہنچ چکی تھی اس کے مزاج کی تلخی ان دنوں کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی۔

" یہ صاحب زادے اسد احمد ہیں کیا ۔ چلے ہیں لارڈ میکالے کی اولاد۔ قدم تو رکھ کر دیکھیں اس گھر میں بھگوتی پرشاد۔ خون کی ندیاں بہہ جائیں گی۔"

گھر میں اپنی اہمیت جتانے کا ایک یہی طریقہ تو اسے آتا تھا۔ نون خاں، طرّم خاں۔ ورنہ اسے ایسی کونسی ماں کی پریشانی یا بہن کی تعلیم و تربیت کی پرواہ تھی۔ اس کی بَلا سے راج رجیں یا گھاس کھودتی پھریں۔

"تم کون کہ میاں خواہ مخواہ؟" زبیدہ خاتون نے اس کو جھڑکا۔

" ابھی تک کو تمہیں کسی سے کچھ واسطہ نہیں تھا۔ آج تم بہن کے ایسے سگے ہوگئے۔ ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈالو کبھی بھیڑے سے بھی ٹکر ماری ہے۔ لونڈیا اگر دو حرف انگریزی کے پڑھ لے گی تو ایسی کونسی قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ تم کب سے مذہب کے ٹھیکیدار بن گئے۔ یہ کہو کہ خون کی سفیدی اپنا اثر دکھا رہی ہے۔ وہی باوا والی کٹ حجتی، اپنا اثر دکھائے اور پھر دکھائے۔" زبیدہ خاتون اصغر کو ڈانٹ رہی تھیں۔ کہیں مشرف حسین کے کان میں بھنک نہ پڑ جائے۔ انھوں نے اس خیال سے دروازے کی کنڈی چڑھا لی تھی۔

" اس کا کیا ہے یہ تو دو دنک دھاڑ کر چپ ہو جاتے گا۔ مشرف بھائی نے اگر کہیں سن لیا تو بنی بنائی بات بگڑ جائے گی۔" انھوں نے کھڑکی میں سے باہر بیٹھک میں جھانکا۔ جہاں پرستلی بانڈھنے کے بعد وہ ابھی پردہ تان کر اطمینان سے آکر بیٹھی تھیں۔ نجمہ کو انگریزی زبان کی تعلیم دلوانے کا دیرینہ خواب کس قدر سسک سسک کر پورا ہو رہا تھا۔ انھوں نے دو باری میں ہلتے ہوئے پردے کو بیچارگی سے دیکھا۔ اور پھر الماری کھول کر انگریزی زبان کی وہ ابتدائی کتابیں نکالنے لگیں جو بہت زمانہ گذرا مسوری کی ٹھنڈی یخ بستہ ہواؤں میں، اونٹ کی کمروالی سڑک پر، کھپریل پڑے ہوئے گھر کے کمرے میں جلتے ہوئے آتش دان کے قریب بیٹھ کر انھوں نے انگریز گورنس مارگریٹ تھامسن سے پڑھی تھیں ـــــ

سالوں پرانی گرد و غبار سے اٹی ہوئی بوسیدہ صفحوں والی کتابیں ـــــ

انھوں نے آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کا بڑا سا گھونٹ بھرا اور گردن موڑ

دیکھا۔ اصغر کمرے کی کنڈی کھول کر جا چکا تھا اس کی سخت کمزوری اور ہر قسم کے جذبات سے خالی پھٹے بانس سے ملتی جلتی آواز کمرے کے سناٹے میں ابھی تک گونج رہی تھی ۔

(۴)

مشرف حسین کے گھر کی سیڑھیوں پر بھاری قدموں کے ساتھ ساتھ بھگوتی پرشاد کی آواز سنائی دی۔ اور گھر کے اندر ایک کھلبلی مچ گئی۔ زبیدہ خاتون نے لڑکیوں کو آواز دی "نجمہ، صغریٰ، نزہت ــ لڑکیوں چلو ماسٹر صاحب آ گئے۔" گھر کے ملازم نے صحن میں پڑی ہوئی کپڑے والی آرام کرسی اٹھا کر دالان میں رکھی۔ لڑکیاں اپنی بغل میں کتابیں اور سروں پر دوپٹوں کے پلو سنبھالتی ہوئی کمرے سے نکلیں اور جا کر پردے کے پیچھے بیٹھ گئیں ــ اس وقت تک بھگوتی پرشاد دالان میں آ کر کرسی پر بیٹھ چکے تھے ــ انگریزی زبان کی قواعد کی پہلی کتاب ان کے سامنے کھلی ہوئی تھی۔

بھگوتی پرشاد قصبے کے اسکول میں ریاضی اور انگریزی زبان کے ماہر استاد مانے جاتے تھے۔ عمر رسیدہ، تجربہ کار اور انتہائی سخت مزاج۔ زبان سکھانے کے معاملے میں وہ کسی رو رعایت کے قائل نہیں تھے۔ اسکول کے لڑکے ان کا نام سنتے ہی کانوں کو ہاتھ لگاتے تھے۔ ان کی سزائیں بڑی عجیب و غریب تھیں۔ لکھائی اگر خراب ہوتی تو وہ دو ہولڈروں کے درمیان لڑکوں کی انگلیاں رکھ کر اس قدر سختی سے دباتے کہ اچھے سے اچھا طاقت ور لڑکا چیں بول جاتا۔ کوئی تلفظ اگر غلط ادا کرتا تو تھوڑی کے نیچے اپنی بھاری بھرکم مٹھی سے اتنی زور کا ٹھونگا مارتے کہ پوری بتیسی ہل جاتی۔ سبق پڑھتے پڑھتے اگر انگلی اِدھر اُدھر ہل جاتی تو ہولڈر کی نب چبھو چبھو کر انگلیاں لہولہان کر دیتے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ پڑھانے میں بھی ایسے ماہر کہ سال دو سال کے اندر اندر زبان کی ساری باریکیاں، موٹائیاں اور شعلہ بیانیاں ازبر ہو جاتی تھیں۔ ان کے پڑھائے ہوئے لڑکے بقول ان کے گوروں سے دو بدو گفتگو کر سکتے تھے اور انگریز کو بے بھاؤ کی سنا سکتے تھے۔

"پتا چلے گا۔ سب میم صاحب بننے کے خواب دھرے رہ جائیں گے۔ جن ہیں پورے کے پورے!" اصغر لڑکیوں کو کئی دن پہلے سے خوف زدہ کر رہا تھا۔

"ضرورت کیا پڑ گئی اس غلامی کے ٹھپّے کی؟" وہ پھر بولا۔

"مجھے خود اس ڈرامے کی تک سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔" نزہت نے اصغر کی ہاں میں ہاں ملائی۔

وہ پردے کے پیچھے بیٹھ کر پڑھنے کے سخت خلاف تھی۔ اسکول میں داخلے کی تو بات ہی اور ہوتی!

"زبردستی تھوڑی ہے۔ مت پڑھو" نجمہ نے کہا۔

"پر جو نہیں جڑے گا پھر" اس نے شرارت سے آنکھ ماری۔

"اس کی ذمہ داری میں لیتا ہوں" اصغر بولا۔

"جانیے بھی اصغر بھائی، آپ کسی کرم کے ہوتے تو پھر رونا ہی کیا تھا۔ دیکھا تھا اسد احمد ترقی پسند کو س قدر زبردست تھے ——!" نزہت نے ہنستے ہوئے کہا۔

"نام نہ لو اس چیر تنائی کا میرے سامنے" اصغر بولا۔

"ارے اپنے بھی کچھ تو ان کی ہونے والی کا خیال کیجیے" نزہت بولی۔

"یہ کب سے سننے لگی!" اصغر نے دور بیٹھی ہوئی نجمہ کو دیکھا۔

نجمہ نے اپنی آنکھیں اوپر اٹھائیں اور اصغر کو گھورا۔ جیسے کہہ رہی ہو۔

میں سنوں یا نہ سنوں کیا فرق پڑتا ہے۔ تم تو بہر حال، بولو گے ہی۔ اس لئے کہ تم اس گونجتی گرجتی صدی کی پیداوار، جہاں اگر زبان پر تالے ڈال بھی دیئے جائیں تو زنجیروں کے حلقے بول اٹھتے ہیں۔ کال کوٹھریاں بولتی ہیں ریشمی بولتے ہیں، دھواں، چارسے کے ڈھیر، دیواروں پر تھپے ہوئے اپلے، کچے آنگنوں میں پڑا ہوا مویشیوں کا گوبر اور دودھ کی دھار، ہر چیز بولتی ہے۔ بولنے میں کونسی ایسی بڑی لاگت لگتی ہے۔ سب ایک ہی انداز میں ایک ہی بات تو کہہ رہے ہیں کہ یہ سب کچھ جو کچھ بھی ہے سب غلط ہے۔ اللہ اللہ خیر صلا"

نجمہ جب سوچنے پر آتی تو خاموشی سے ڈھیروں سوچتی چلی جاتی تھی۔ اپنی پندرہ سولہ سالہ زندگی میں سوچنے کے علاوہ اس نے اور کیا بھی کیا تھا۔ وہ دراصل اتنی ناسمجھ نہیں تھی جتنی شکل سے نظر آتی تھی۔ ناسمجھ ہو بھی کیسے سکتی تھی جبکہ آنکھ کھولتے ہی اس نے گھر کے اندر تو تو، میں میں، ہوتی ہوئی دیکھی۔ ماں باپ کے نظریاتی اختلافات، چکی کے وہ دو پاٹ تھے جن کے درمیان پس کر وہ علیحدہ ضرور ہو گئی تھی مگر ابھی ختم نہیں ہوئی تھی ——

اس کے تمام جذبے اور شوق ایک انجانے خوف تلے دب سے گئے تھے۔ بس ایک احساس باقی تھا — خوف کا احساس — دھڑکوں اور خدشوں کا احساس۔ وہ اپنے گھر میں چلتی تھی تو سہمے سہمے قدموں کے ساتھ۔ بولتی تو رک رک کر، کھاتی تو ڈر ڈر کر۔ وہ تو سانس بھی سہج سہج لیتی تھی۔ جو جس نے کہا خاموشی سے مان لیا۔ جیسا پہنایا پہن لیا

جیسا کھلایا کھالیا ــــ اختلافات کا ہتوڑا اس کے ذہن کی سب سے اوپری سطح پر بیٹھا ہوا ہر لمحے دانت نکوسے مرذنگ بجاتا رہتا تھا۔ اچھی خاصی لڑکی مٹی کا تھوا بن کر رہ گئی تھی۔ مستقبل قریب یا بعید میں اس کا ارادہ ایک بار بھی 'نہیں' نہیں کہنے کا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ خاموشی سے بھگوتی پرشاد سے انگریزی زبان کا درس لینے کے لئے تیار ہوگئی ورنہ دل تو اس کا بھی یہی چاہ رہا تھا کہ سارے ان انتظامات کی ایسی تیسی کرکے رکھدے اور بالکل اصغر کی طرح اسد احمد کو چیخ چیخ کر کہہ کر ان کتابوں کو آگ لگا دے۔

"جاگنے سے فائدہ!" اس نے سوچا "سوتے رہو کہ نیند انسان کی تازہ ترین دریافت ہے"

اس کو ہر قسم کی بیداریوں کا انجام بخوبی معلوم تھا۔ کہ آنکھوں میں ترمرے آجاتے ہیں، موتیا بند اتر آتا ہے۔ کالے پانی کا عارضہ لاحق ہوجاتا ہے اور پھر انسان اندھیرے میں ناک ٹوئیے مارتے مارتے ہلکان ہوجاتا ہے۔ اپنی ماں کا انجام وہ دیکھ رہی تھی۔ ہر قسم کے رتجگوں کا انجام ــــ کھلی آنکھیں لئے وہ کہاں کہاں نہیں بھٹکیں اور بالآخر اپنے ذہن کے روشن اندھیاروں میں بھٹک بھٹکا کر اپنے آپ میں ہی گم ہوگئیں ــــ

اس نے نظریں اٹھا کر صحن میں بیٹھی ہوئی زبیدہ خاتون کو دیکھا جن کے چہرے پر مدت بعد سکون کی ہلکی ہلکی چھایا تھی ــــ

نجمہ کو ہفتہ کے اندر اندر انگریزی زبان کے حروف کی پہچان ہوچکی تھی ــــ

(چوتھی قسط)

(بقیہ لحاف ص۲۶۹ سے)

مگر بغیر کچھ کہے نہایت خاموشی اور سکون سے اٹھ کر مہرنے اسے ہمیشہ کی طرح دھوپ میں پھیلا دیا۔ سے بالکل ہی بے نیاز کہ آنے جانے والے یا پاس پڑوسی اس لحاف کو دیکھ کر اُن کے متعلق کیا رائے قائم کریں گے.........

مسعود اشعر

سَفرنامہ

صرف ہوا کے قدموں کی چاپ ہے جو پیڑوں سے دُور کہیں چل رہی ہے — کسی پیڑ کا ایک پتا بھی ہلتا نظر نہیں آتا. مگر چاپ ہے — دھیرے دھیرے، ہولے ہولے پاؤں بڑھانے کا احساس. قدم قدم، پاؤں پاؤں۔

پیڑوں کی پھنگیوں پر نظریں جمائے جمائے آنکھوں میں سیلاب آجاتا ہے، آنکھیں پلک جھپکنا بھول گئی ہیں۔

تاریک راستہ، مسجد، قبرستان، ٹوٹی پھوٹی قبریں، قبرستان کی پختہ دیوار، صدیوں پرانا بڑ کا پیڑ اور اس کی گزوں چوڑی جڑ جس کے غار جیسے کھکھ سے سیال خوف جھینگروں کی آواز میں بہہ رہا ہے — اور عشاء کی نماز کا وقت ہے۔

تو کیا میں سو رہا تھا؟ سو نہیں رہا تھا تو آنکھ کیسے کھلی؟ وہ سب کہتے ہیں کہ تم بڑے لوگوں کی بیماری میں مبتلا ہو۔ میری آنکھیں دن رات کھلی رہتی ہیں. میں کھلی آنکھوں سے سب کچھ دیکھتا ہوں مگر وہ سب کچھ کیا ہے — اُس گھڑی میں نے سچ مچ کچھ دیکھا تھا — یا کچھ بھی نہیں دیکھا تھا؟ — میرے اوپر انکشاف ہو گیا اُس حقیقت کا جس کا مجھے علم نہیں ہونا چاہیئے تھا — میرے اُوپر وہ راز منکشف ہو گیا جسے میں عمر بھر جاننا نہیں چاہتا تھا — اور اب —!

میں صدیوں پرانے پیڑ کے گزوں چوڑے بھائیں بھائیں کرتے کھکھ میں کھڑا ہوں. صرف ہوا ہے جو کھو کھلے سوراخوں میں راستہ بناتے ہوئے چیختی ہے، شور مچاتی ہے۔

ہماری مسجد کے ساتھ قبرستان تھا. سڑک کے ساتھ ساتھ دُور تک قبرستان چلتا، پھر مسجد آتی. یا — نمازوں کے لئے آتے جاتے اس قبرستان سے گزرنا پڑتا. عشاء کی نماز کے بعد یہ راستہ بہت طویل اور —

کٹھن ہو جاتا کہ پیچھے مڑ کر دیکھنے کی خواہش اور گردن ٹیڑھی ہو جانے کا خوف گھر تک پیچھا کرتے اور گھر کا دروازہ بند ہو جانے تک مڑ کر دیکھ لینے کا خطرہ کندھوں پر سوار رہتا۔

مسجد سے نکلتے ہی کوئی انجانی چاپ تعاقب شروع کر دیتی اور ہر چار قدم کے بعد پیچھے مڑ کر دیکھنے کی خواہش اس زور سے ہلّہ بولتی کہ گردن خود بخود اکڑ جاتی اور قدم تیز ہو جاتے۔

"جنت کیسی ہو گی؟" وہ آنکھوں میں مستقبل کے اندھیرے کاٹنے والی چمک لئے مجھ سے سوال کرتے۔ میں پورے سکون اور اعتماد کے ساتھ جنت کے بارے میں انہیں بتاتا۔ جنت کی ایک ایک چیز کا ذکر کرتا۔ اُن نعمتوں کی تفصیل بیان کرتا جو اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو جنت میں عطا کرے گا۔ وہ سب حیرت سے منہ کھولے میری باتیں سنتے۔ اُن پر یقین کرتے مجھے مزید حوصلہ دیتے کہ میں جنت کے ایک ایک طبقے اور ایک ایک گوشے کے احوال اس طرح بیان کروں جیسے وہ سب میرے آنکھوں دیکھے ہوں۔ ان کا اعتماد مجھے اپنے اوپر اعتماد کرنے کی ہمت بخشتا اور میں اُن سب نعمتوں کو سچ مچ اپنی آنکھوں سے دیکھتا کہ ساری رات میری آنکھیں کھلی رہتیں۔

تو کیا کوئی انجانی چاپ ان سب کا تعاقب بھی کرتی ہے؟ اگر کوئی چاپ ان کا پیچھا نہیں کرتی تو پھر وہ ایسے سوالات کیوں کرتے ہیں ——!!

جی چاہتا میں بھی اُن سے سوال کروں۔ اُن سے ان کی خواہش، ان کے خوف معلوم کروں۔ لیکن ڈر لگتا کہ اگر ان میں سے کسی ایک نے بھی "نہیں" کہہ دیا تو میں کیا کروں گا۔

اور پھر اُس وقت تک سوال کرنے والے تو وہ تھے، میں تو جواب دینے والا تھا۔ یقین، ایمان اور اعتماد کے ساتھ۔

تراویح کی بیس رکعتیں، اور تین رکوع لقمے کے بغیر سنا تا ہیں اور لقمہ بھی حافظ جی کا جن کی آنکھوں کی بینائی بھی ان کے تیز و تند حافظے میں محفوظ ہو گئی ہے۔ حافظ جی سامع بنے پیچھے کھڑے ہیں، بالکل میرے پیچھے۔ بیس کی بیس رکعتوں میں ان کی سانس اجنبی خوف کی طرح میری گردن پر سرسراتی رہتی ہے۔ میری آنکھیں سجدہ گاہ پر ہیں، ذہن قرآنی آیات پر اور کان حافظ جی کے لقمے پر ——اور میرے پیچھے دُور تک صف در صف کوئی کھڑا ہے۔

میں وضو کرتا ہوں، ٹوپی سیدھی کرتا ہوں اور حافظ جمال میاں کے مزار میں داخل ہو جاتا

ہوں۔ عصر اور مغرب کا درمیانی وقت ہے۔ مزاروں پر حاضری کے لئے بہتر وقت بھی ہوتا ہے۔ اندھیرا بھی نہیں ہوتا کہ کسی چاپ کا خوف رہے، اور اتنا اُجالا بھی نہیں کہ ساری آہٹیں روشنی میں تحلیل ہو جائیں۔

اگر بتیوں اور لوبان کے دھوئیں میں لپٹے اور تازہ اور باسی پھولوں کی خوشبو میں بسے مزار کے اندر داخل ہوتے ہی سر بھاری ہو جاتا ہے اور آنکھیں بند ہونے لگتی ہیں۔ کاندھوں، گردن اور پیٹھ پر انجانی آہٹ کا گرم گرم بوجھ پھر پگھلنا شروع ہو جاتا ہے اور میں جلدی سے فاتحہ ختم کر کے الٹا باہر نکلتا ہوں۔

تاریک راستہ، مسجد، قبرستان، ٹوٹی پھوٹی قبریں، قبرستان کی پختہ دیوار، صدیوں پرانا برگد کا پیڑ اور اس کی گرد جوڑی جڑ جس کے غار جیسے کھوکھ سے سیال خوف جھینگروں کی آواز میں بہہ رہا ہے ... ـــ اور عشاء کی نماز کا وقت ہے۔

" انقلاب کے زمانے میں انقلابیوں نے ان سب کی گردنیں اتار دی تھیں۔"

میں نے گھبرا کر گائیڈ کی طرف دیکھا۔ وہ نوٹرے ڈیم کیتھڈرل کے بلند و بالا دروازے کے سامنے کھڑی، بہت اوپر گنبد کے قریب ایک قطار میں کھڑے بہت سے مجسموں کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔

"کس کی گردنیں اُتار دی تھیں؟" میں بلندی پر پہنچنے کے بعد کیتھڈرل کے بجائے پیرس شہر کی عمارتیں اور دُور بہتے سین کو دیکھنے میں معروف ہو گیا تھا۔

" SAINTS کی۔" اُس نے غصے سے میری طرف دیکھا۔ " انقلابیوں نے تمام SAINTS کی گردنیں اُتار دی تھیں۔"

ٹورسٹ بس بے شمار سڑکوں اور گلیوں کے چکر لگاتی جب نوٹرے ڈیم پہنچی تھی تو مجھے یقین تھا کہ کیتھڈرل کی دلکشی اور خوبصورتی میرے اوپر ہیبت طاری نہیں کرے گی۔ میں جانی اور انجانی تمام آہٹ ... [illegible] ... ں آیا ہوں۔ کوئی چاپ اس مقدس خاموشی کو پارہ پارہ نہیں کرے گی۔ میری گردن میرے ہی اختیار میں رہے گی۔

رات میں نے لیڈو میں گزاری تھی، اور وہ دوپہر کا وقت تھا۔ پھر بس کی گائیڈ نے بھی میرے

منہ کا مزا خراب کر دیا تھا۔

اس کے بال سرخ اور بلاؤز سلیولیس تھا۔ وہ ڈرائیور کے ساتھ دائیں جانب ایک چھوٹی سی سیٹ پر ہماری طرف رخ کئے بیٹھی تھی۔ ہماری نہیں، صرف میری جانب۔ اس کے سامنے صرف میں بیٹھا تھا۔ اس کے کہنی سے بازو بغلوں تک ننگے تھے۔ دونوں ہاتھ مائکروفون کے ساتھ اوپر اٹھے تھے اور سرخ بالوں کے گچھے میرے حلق میں گھسے جا رہے تھے۔

"پھر ــــ؟" میں نے بے چینی سے سوال کیا کیونکہ وہاں SAINTS کے سر تو اپنی جگہ موجود تھے۔

" انقلاب ناکام ہوا تو وہ گردنیں دوبارہ لگا دی گئیں ــــ" اب اس نے میری طرف بالکل نہیں دیکھا۔ باقی لوگوں سے کہا جیسے وہ سوال بھی ان لوگوں نے ہی کیا ہو۔ وہ سب ہنس دیئے۔

"اچھا! ــــ دوبارہ گردنیں لگا دی گئیں!" ــــ مجھے ہنسی نہیں آئی۔

"ہاں نئے سر بنا کر لگا دیئے گئے۔"

وہ کیتھڈرل کے اندر داخل ہو گئی تھی۔ میں اس کے پیچھے تھا اور وہ میرے پیچھے ــــ!

وہ چابی بھرے کھلونے کی طرح انگریزی اور فرانسیسی میں کچھ کہہ رہی تھی اور اس کے ساتھ کھڑے لوگ اوپر ان مخروطی دریچوں کو حیرت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے جن سے ہری، لال، پیلی اور نیلی روشنیاں چھن چھن کر اندر آ رہی تھیں۔ میں نے اپنی گردن کا بوجھ ایک بہت بھاری ستون پر ڈالا اور پورے جسم کا زور لگا کر پلکیں کھول دیں۔

تمام دریچوں میں SAINTS کھڑے تھے جو باہر سے آنے والی روشنیوں میں مختلف رنگوں سے نہ جانے کون سی کہانیاں سنا رہے تھے۔

میری پیٹھ میں پگھلتی برف کی ٹھنڈی لکیر سی بنتی چلی گئی اور ایک جھرجھری کے ساتھ سارا جسم اس زور سے لرزا کہ ساتھ کھڑی ننھی سی بچی کے ہاتھ سے ریسیور گر گیا۔ اس نے غصے سے میری طرف دیکھا اور میں اس باریک آواز کو سننے کی کوشش کرنے لگا جو ستون کے ساتھ لٹکتے ریسیور سے آ رہی تھی ــــ ریکارڈڈ آواز کیتھڈرل کی تاریخ بیان کر رہی تھی۔

میں نے بچی کے سر پر ہاتھ پھیرا اور آگے بڑھ کر قربان گاہ کے قریب ایک موم بتی اور روشن

کر دی۔

فرض کر لو کہ وہ خواب تھا اور خواب بھی ایسا جو میں نے نہیں کسی اور نے دیکھا۔ میرے خواب ہمیشہ دوسرے لوگ ہی دیکھتے آئے ہیں۔ میں تو ان خوابوں کی تعبیروں کا خمیازہ بھگتنے والوں میں سے ہوں۔

میں بلغراد کے "انقلاب اکتوبر چوک" پہ کھڑا ہوں۔ میرے دونوں طرف دور تک سرسبز اور گھنے درختوں کی قطاریں ہیں اور میرے ساتھ اُجلی شکل والی وہ خاتون جس کے بالوں میں چمکتی چاندنی نے بھی اس کی خوبصورتی کو ماند نہیں کیا۔ میں بس سے اترتے ہی اس کے ساتھ ہو لیا ہوں۔

"اتنے بہت سے درختوں میں اندھیرا بالکل نہیں ہے۔"

"کیا کہا تم نے؟" اُس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

"اتنے بہت سے درختوں میں تو اندھیرا ہونا چاہیئے۔ سائے بھی تو اندھیرا کرتے ہیں نا۔"

وہ کچھ نہیں بولی، جلدی جلدی میرے ساتھ چلتی رہی۔

"ذرا آہستہ چلو، مجھے جلدی چلنے کی عادت نہیں ہے۔"

وہ ہنسی۔ اس نے اپنا بھاری تھیلا دائیں کاندھے سے اتار کر بائیں کاندھے پر لٹکا لیا۔

"بہت پرانی بات کر رہے ہو۔"

"جی۔؟!"

"اندھیرے اور سائے والی بات۔"

میری آنکھیں چھوٹی ہو گئیں اور ماتھے پر بے شمار اُلٹے سیدھے راستے اُبھر آئے۔

"ہم نے بالکل نیا بیوگراڈ آباد کیا ہے۔"

"بیوگراڈ؟ ——"

"وہی تمہارا بلغراد"

"اچھا میرا بلغراد اور تمہارا بیوگراڈ۔" میری سمجھ میں اس کی بات نہیں آ رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میں اپنے سائے سے باتیں کر رہا ہوں۔ وہ سایہ جو مجھے خوف زدہ بھی کرتا ہے اور میرا سہارا بھی بنتا ہے۔

"سایہ بھی تو ہمارے وجود کا ہی حصّہ ہے۔"

وہ چلتے چلتے ٹھہر گئی۔ سامنے رکتی بس کو دیکھا اور مجھے گھسیٹتی اس میں سوار ہو گئی۔

"ہم ہوٹل سلادیہ جا رہے ہیں۔"

پھر ہم گمرٹی اینٹوں کی بہت چوڑی سڑک پر بہت بڑے چوک کے قریب اتر گئے۔ وہ ہوٹل کے اندر نہیں گئی۔ میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی اس بلندی کی طرف لے گئی جہاں پھول بیچنے والیوں کی دکانیں تھیں۔

کسی انجانی شے کا خوف دراصل اس کی چاہت ہوتی ہے۔ اس انہونی شے کو جیتا جاگتا وجود عطا کرنے کی خواہش ——— اس نے کارنیشن کا ایک گچھا خرید کر میرے آگے کر دیا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ بکتی ہے سالی۔ بہت خوبصورت سمجھتی ہے اپنے آپ کو ———"

میں تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا پارلیمنٹ کی قدیم عمارت کی طرف چلا گیا ——— اب اس کے بالوں میں چمکتے چاندی کے تار میرے پاؤں کی زنجیر نہیں تھے۔

وہ کیا کہہ رہی تھی؟ میرے لئے تو کوئی چیز بھی انہونی نہیں ہے۔

میں قاہرہ سے آنے والی سڑک پر کھڑا اسنگلاخ محرابوں اور پتھریلے راستوں میں گھرے ابوالہول کو دیکھ رہا ہوں۔ بڑا اہرام پیچھے رہ گیا ہے اور نیچے چھوٹے موٹے اہراموں اور مقبروں کے سامنے ایک بہت وسیع اسٹیج سا بنا ہے جہاں دور دراز سے آنے والے سیاحوں کو بٹھا کر روشنیوں اور آوازوں کے ذریعے ہزاروں سال پرانی کہانیاں سنائی جاتی ہیں۔ میری توجہ کا مرکز حسب معمول ابوالہول کی ٹوٹی ناک ہے۔

وہ آہٹ، وہ چاپ انجانی تو نہیں ہے۔ وہ تو اتنی ہی حقیقی ہے جتنا میرا اپنا وجود۔ وہ میرے وجود کا حصہ ہے۔ میرے بدن کا رواں رواں اس کی گواہی دیتا ہے، اس کے ہونے کا اقرار کرتا ہے۔ میں اسے پہچانتا ہوں۔ اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ بچپن سے میرے ساتھ ہے۔ میں اسے جانتا ہوں۔ اس لئے وہ ہے۔ میری پہچان ہی اس کا وجود ہے۔

ایسی تیسی اس کی۔ مجھے چھیلنا چاہتی ہے، مجھے کھرچنا چاہتی ہے، ننگا کرنا چاہتی ہے میرے وجود کو۔

میں نے شارع جیزہ سے ٹیکسی پکڑی اور سیدھا جامع محمد علی پہنچا۔ جمعہ کا دن تھا مگر دوپہر کے ابھی بارہ بجے تھے۔ جمعہ کی نماز میں بہت وقت تھا اور زوال کے وقت نفل بھی نہیں پڑھے

جا سکتے۔

کسی بھی مسجد میں داخل ہونے کے بعد دو نفل پڑھنا سنت ہے۔

زوال کا وقت گزارنے کے لئے پہلے جوتے اٹھانے والے کے پاس بیٹھا رہا، پھر صحن کے بیچوں بیچ کھڑے سایہ کے گرم پانی سے وضو کیا۔ ہاتھ پاؤں سے وہ تمام گرد اتاری جو بلغراد، بڈاپسٹ اور بخارسٹ سے چڑھی چلی آ رہی تھی۔ پھر بے شمار گنبدوں سے مزین وسیع و عریض ہال میں دو نفل کی نیت باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

سلام پھیرا تو کندھوں اور پیٹھ پر جانی پہچانی آہٹ کا بوجھ موجود تھا ایک سکون کے ساتھ سامنے دیکھا۔ ایک جاپانی سیاح کیمرہ ہاتھ میں لئے مجھے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ اوپر ان گنت فانوس تھے اور نیچے لاتعداد کیمرے۔ نیم تاریک ہال میں چاروں طرف فلش گن کی روشنیاں چمک رہی تھیں۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا، سارا ہال سیاحوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے جلدی سے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے۔

"یہاں دو منبر کیوں ہیں؟"

میرے پیچھے کھڑے کسی سیاح نے شاید گائیڈ سے پوچھا۔

"ایک خطیب کے لئے، دوسرا شاہ وقت کے لئے۔"

"اچھا!" یکلخت میری گردن خود بخود پیچھے مڑ گئی۔ مجھے نہیں معلوم کس نے سوال کیا اور کس نے جواب دیا مگر میں گردن گھما کر ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

تاریک راستہ، مسجد، قبرستان، ٹوٹی پھوٹی قبریں، قبرستان کی پختہ دیوار، صدیوں پرانا بڑ کا پیڑ اور اس کی گزدوں چوڑی جڑوں کے کھکھ سے سیال خون جھینگروں کی آواز میں بہہ رہا ہے۔

موسم سرد ہے۔ اس موسم میں رات جلدی آجاتی ہے اور اندھیرا بھی زیادہ گہرا ہوتا ہے۔ دن رات آندھی چلتی ہے اور بڑے بڑے تنومند درختوں کی شاخیں اور پتے زہرناک ہوا کے جھکڑوں میں سڑکوں پر لڑھکتے پھر رہے ہیں۔

عشاء کی نماز کا وقت ہے۔

عشاء کی نماز ہو چکی ہے اور شبینہ شروع ہونے والا ہے۔ اب بھی امام نہیں ہوں۔ سارا

قرآن ایک رات میں ختم کرنا ہے، اس لئے امام بھی کئی ہیں۔

امام بہت سے ہیں، شبینہ جاری ہے، سارا قرآن ایک رات میں ختم کرنا ہے۔

میں صدیوں پرانے برگد کی گزوں چوڑی جڑ کے تاریک کھکھ کی طرف بیٹھ کئے قبرستان کی پختہ دیوار کے ساتھ کھڑا ہوں۔ آگے چلنے کی کوشش اس لئے نہیں کرتا کہ وہ جانی پہچانی چاپ بھی میرے ساتھ ہو جائے گی پیچھے مڑ کر دیکھنے کی ہمت اس لئے نہیں ہوتی کہ اندھیرے کھکھ سے نکلنے والی جھینگروں کی آوازیں اور بھی تیز ہو گئی ہیں۔

"کیا میرا ماضی بھی میرا نہیں ہے کہ میں اسے مڑ کر دیکھ سکوں؟"

اب میرے اندر کا خوف مجھے طاقت بخشتا ہے اور میرے پاؤں خود بخود اٹھنے لگتے ہیں اپنے گھر کی طرف آنکھیں آگے کی جانب دیکھ رہی ہیں اور کان اس چاپ کے قدم گن رہے ہیں جو رفتہ رفتہ نزدیک آتی جا رہی ہے۔ جوں جوں گھر قریب آ رہا ہے، وہ چاپ بھی قریب آتی جا رہی ہے۔

گھر قریب آ گیا ہے اور گرم گرم سانسیں میری گردن پر دھواں چھوڑ رہی ہیں۔

گھر نزدیک آ گیا ہے اور میرے کاندھے بوجھ سے جھکے جا رہے ہیں۔

گھر سامنے آ گیا ہے اور میری آنکھوں کی طاقت بھی میرے کانوں نے حاصل کر لی ہے۔

گھر دو قدم رہ گیا ہے اور ــــــ

اب میں برداشت نہیں کر سکتا ــــــ

میں بجلی کی تیزی سے ایڑیوں پر گھوم کر اپنا سارا جسم صدیوں پرانے اندھیرے کھکھ کے سامنے لا کھڑا کرتا ہوں۔

اب میں چاروں طرف دیکھ رہا ہوں۔

راستہ، مسجد، قبرستان، ٹوٹی پھوٹی قبریں، قبرستان کی پختہ دیوار، صدیوں پرانا برگد کا پیڑ اور اس کی گزوں چوڑی جڑ جس کے بھائیں بھائیں کرتے کھکھ کے اندر

میں کھڑا ہوں۔

صرف ہوا ہے جو کھو کھلے سوراخوں میں راستہ بناتے ہوئے چیختی ہے، شور مچاتی ہے اور سیال خوف بن کر سڑکوں پر بکھرے پتوں میں مل جاتی ہے۔

انور عنایت اللہ

پچھلے پہر

کہنے کو چار سال کی مدت بہت طویل نہیں ہوتی لیکن میں نے یہ جلا وطنی بڑی مشکل سے گذاری۔ میں نے اپنی بیوی کو مہینہ بھر پہلے کراچی بھیج دیا تھا کیونکہ اسے اپنی بھتیجی کی شادی میں شرکت کرنی تھی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے ہسپتال کے بڑے ڈاکٹر کو تفصیلی خط لکھا تاخیر کی وجہ بتائی اور اپنے آنے کی اطلاع دی۔

ایک مہینے کے بعد جب میرا جہاز لندن سے اُڑا تو بے اختیار رشید مجھے شدت سے یاد آیا۔ جی چاہا کہ یہ ہوسکتا کہ ہوائی اڈہ پر میری بیوی کے ساتھ وہ بھی میرے استقبال کے لئے موجود ہوتا۔ ڈاکٹر کا آخری خط دو مہینے پہلے مجھے ملا تھا اور اس نے یہ خوشخبری سنائی تھی کہ اب وہ مکمل طور پر صحتیاب ہوگیا تھا اور یہ کہ اب میں اسے دیکھوں تو مشکل ہی سے پہچان سکوں گا کیونکہ وہ اس لاغر بچے سے بہت مختلف تھا جسے میں نے عیدگاہ کے باہر فٹ پاتھ پر بھیک مانگتے دیکھا تھا۔

اُس عید کو جوں ہی میں عیدگاہ سے باہر نکلا حسب معمول لنگڑے، لولے، اندھے، بچے، جوان اور بوڑھے فقیروں نے مجھے گھیر لیا۔ ان کی فریاد اور دعاؤں سے فضا گونج رہی تھی۔ ان سے بچتا بچاتا میں اپنی کار کی طرف بڑھا تو میری نظر اُس بچے پر پڑی وہ دوسرے فقیروں کے ساتھ مل کر نمازیوں کی جان عذاب میں کرنے کے بجائے ایک طرف فٹ پاتھ پر ہاتھ پھیلائے بیٹھا تھا۔ وہ بھی یقیناً ہمارے بال بچوں کا صدقہ مانگ رہا ہوگا لیکن آس پاس کے شور و غل میں اس کی آواز صاف نہیں سنائی دے رہی تھی۔ میں نے رحم کھا کر جیب سے ایک روپیہ کا نوٹ نکالا اور آگے بڑھا جھک کر اسے دینے لگا تو میں نے فوراً اسے پہچان لیا۔ وہ رشید تھا وہ بے حد دُبلا ہوگیا تھا۔ سردی کے باوجود جسم پر سوتی قمیص تھی جس پر جا بجا پیوند لگے ہوئے تھے۔ خاکی نکر بھی پڑی تھی شاید وہ بیمار بھی تھا کیونکہ اس کا چہرہ زرد تھا اور آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے تھے۔ اس کا ... گود میں تھا اور بایاں ہاتھ پھیلا کر وہ بھیک مانگ رہا تھا۔

اسے اس حال میں دیکھ کر میں تڑپ اٹھا اور بے اختیار مجھے مقدر یاد آگیا، ہمارا اکلوتا بیٹا جو سال بھر پہلے صرف چھ سال کی عمر میں ہم سے ہمیشہ کے لئے روٹھ گیا تھا۔ رشید اس کا ہم عمر ہی تو تھا۔ آج اس سے آنکھ ملانے کی ہمت نہیں ہوئی اور میں نے جلدی سے اپنا نوٹ اس کی کھلی ہوئی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ اس نے میری طرف دیکھے بغیر بالکل میکانکی انداز میں مجھے سلام کیا ـــــ اپنے بائیں ہاتھ ہی سے۔ چونکہ اس کا دایاں ہاتھ اب تک گود میں پڑا تھا اس لئے میں نے قدرے حیرت سے دیکھا تو میں کانپ گیا ـــــ خدا کی پناہ ـــــ اس پر جذام کے آثار صاف نظر آرہے تھے!

وہ عید میرے لئے قیامت بن کر آئی۔ ابھی ہم نے مقدر کی اچانک موت کو پوری طرح بھلایا بھی نہ تھا کہ اچانک میری رشید سے ملاقات ہو گئی۔ اس کا ذکر میں نے جان بوجھ کر اپنی بیوی سے نہیں کیا کیونکہ رشید کی ماں نے جس طرح اس سے بدتمیزی کی تھی اس کے لئے اس نے اس عورت کو کبھی معاف نہیں کیا تھا۔ کاش اس نے میری بیوی کی بے عزتی نہ کی ہوتی، کاش اس معصوم کی ماں اتنی بُری نہ ہوتی تو آج رشید ہمارے ہی گھر میں ہوتا اور شاید اس موذی مرض سے محفوظ۔

اُس رات کو میں بالکل سو نہ سکا۔ آنکھیں بند کرتا تو رہ رہ کر اُس معصوم کا زرد چہرہ آنکھوں کے سامنے آجاتا۔ جب خاصی رات گزر گئی تو میں نے بےچینی سے سگریٹ سلگایا۔ ماچس کی تیلی جلانے سے پہلے میں نے اُس کا رُخ اپنی بیوی کی طرف کیا تو دیکھا وہ میرے اضطراب سے بے خبر سو رہی تھی۔ ایسی ہی دھیمی سی روشنی میں میں نے پہلی بار اسے دیکھا تھا۔ اس رات کو تیز بارش ہو رہی تھی۔ ہم ایک دعوت سے تقریباً آدھی رات کو لوٹے تو کار کی روشنی میں ہم نے دیکھا کہ ہماری کوٹھی کے باہر ایک درخت کے نیچے کوئی سکڑا بیٹھا تھا۔ بارش اتنی تیز تھی کہ پناہ لینے کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا تھا۔ اسے اس حال میں دیکھ کر میری بیوی نے ازراہ ہمدردی ملازم کو یہ کہہ کر بھیجا تھا کہ اسے سائبان کے نیچے پناہ لینے کی اجازت دے دے۔ تھوڑی دیر کے بعد ملازم نے آکر ہمیں بتایا تھا کہ درخت کے نیچے ایک غریب عورت بیٹھی تھی۔ اس کی گود میں ایک چار پانچ سالہ بچہ بھی تھا جسے تیز بخار تھا۔ وہ انہیں لے آیا تھا۔

وہ رات اُن لوگوں نے ہمارے یہاں گزاری۔ صبح کو میری بیوی اس سے ملی تو اس کی بپتا سے متاثر ہو کر خصوصاً بچہ پر رحم کھا کر یہ فیصلہ کیا کہ انہیں ہمارے ہی یہاں پناہ دی جائے۔ عورت گھر کا کام کاج کر سکتی ہے رہنے کے لئے مالی کا کوارٹر چھ مہینے سے خالی پڑا تھا۔ چنانچہ اس طرح ماں بیٹے ہمارے یہاں رہنے لگے۔ رشید،

صفدر کا ہم عمر تھا جس کی وجہ سے ہمارا بچہ بے خوش تھا کہ اسے کھیل کے لئے ایک ساتھی مل گیا۔ بہت جلد وہ بچہ ہم لوگوں میں گھل مل گیا۔

طبیعتاً وہ سنجیدہ تھا۔ صفدر کی طرح نہ شریر اور نہ ضدی۔ وہ ہر وقت صفدر کے ساتھ رہتا۔ جب اس کے ماسٹر صاحب آتے تو قریب بیٹھ کر غور سے اُن کی باتیں سُنتا جیسے سبق یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس طرح سال بھر گذر گیا اور اِس دَوران میں رشید ہمارے گھر کا ایک فرد بن گیا۔ ہم اس کا اسی طرح خیال رکھنے لگے جیسے وہ بھی ہمارا ہی بچہ ہو۔ پھر یکایک، ایک تکلیف دہ واقعہ ہوا۔ ایک دن باورچی نے شکایت کی کہ یہ عورت ٹھیک نہیں ہے۔ اکثر راتوں کو اُس کے پاس آوارہ قسم کے لوگ آتے ہیں۔ میں نے اس کی یہ شکایت نظر انداز کر دی لیکن ایک رات کو ہم ایئرپورٹ سے واپس لوٹے تو ہم نے ایک اجنبی کو اس کے کوارٹر میں جاتے دیکھا۔ یہ دیکھ کر ہم دونوں کو بہت غصہ آیا لیکن ہم نے صبح تک انتظار کرنا بہتر سمجھا۔ صبح کو میری بیوی نے اسے بُلا کر اُس اجنبی کے بارے میں پوچھا تو اس نے بڑی ڈھٹائی سے جواب دیا۔

"یہ میرا ذاتی معاملہ ہے بیگم صاحب۔ آپ نے مجھے نوکری دی ہے۔ قید نہیں کیا ہے"۔

اس نے آج تک اتنی بدتمیزی سے گفتگو نہیں کی تھی۔ مجھے غصہ تو بہت آیا لیکن میں نے اس کے بچے کی خاطر ضبط سے کام لیا۔ لیکن میری بیوی نے اسے ڈانٹا تو اس نے پھٹ سے جواب دیا۔

"بیگم صاحب آپ تو ایسے ڈانٹ رہی ہیں جیسے میں آپ کی زرخرید لونڈی ہوں۔ جتنی تنخواہ آپ مجھے دیتی ہیں اتنی کی نوکری تو میں جہاں چاہوں کر لوں"۔

یہ سننا تھا کہ میری بیوی آگ بگولا ہو گئی۔ اس نے اسی وقت اس کی پورے مہینے کی تنخواہ اس کے منہ پر دے ماری اور اسے گھر سے نکال دیا۔

اس کے جانے کے بعد ہفتوں ہمیں ایک عجیب خلا کا سا احساس رہا۔ ہم نے کبھی اس کا ذکر نہیں کیا لیکن دونوں کے رویّہ سے واضح تھا کہ ہمیں رشید کی فکر ستا رہی ہے۔ جب صفدر پڑھنے بیٹھتا یا تنہا تتلیاں پکڑنے کی کوشش کرتا، مجھے رشید شدّت سے یاد آتا۔ دن گزرتے گئے اور پھر رمضان آیا اور بھی گذر گیا۔ ہمارے یہاں آنے کے بعد اُس نے بھی صفدر کے ساتھ پہلا روزہ رکھا تھا۔ عید کی نماز پڑھنے بھی وہ میرے اور صفدر ہی کے ساتھ گیا تھا۔ عید کے بعد جس دن صفدر صرف چند دنوں کے تیز بخار سے ہم سے ہمیشہ کے لئے روٹھ گیا، اُس دن تو رشید ہمیں اتنی شدّت سے یاد آیا کہ لگا جیسے ہم نے ایک نہیں —

و معصوم بیٹوں کو ہزاروں من مٹی کے نیچے دفن کیا ہے۔ کچھ ایسی ہی تکلیف مجھے آج فٹ پاتھ پر اسے کس مپرسی کی حالت میں دیکھ کر ہو رہی تھی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کی کس طرح مدد کروں۔ اسے مرض بھی معمولی نہیں تھا۔۔۔ بلکہ نہایت خطرناک۔

صبح ہوتے ہوتے میں نے فیصلہ کیا کہ اس کے بارے میں اپنے ڈاکٹر سے مشورہ کروں گا۔ چنانچہ اسی دن میں اس کے پاس گیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اب یہ مرض لا علاج نہیں ہے، خصوصاً ابتدائی مرحلوں میں اور بچوں کو ہو تو۔ اب وہ زمانہ گزر گیا جب جذامیوں کو آبادی سے دور غاروں میں تڑپ تڑپ کر مرجانے کے لئے چھوڑ دیا جاتا تھا۔ اس کے علاج کے لئے خود ہمارے شہر میں ایک بہت اچھا ہسپتال تھا۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ وقت ضائع کئے بغیر فوراً اس بچے کو وہاں پہنچا دیا جائے۔ پھر اس نے ہسپتال کے بڑے ڈاکٹر کے نام اپنا سفارشی خط لکھ کر مجھے دیا۔

اتفاق سے دوسرے دن اتوار کی چھٹی تھی۔ اپنی بیوی کو کچھ بتائے بغیر میں نے اس مخصوص ہسپتال کا رُخ کیا جو شہر کے ایک سرے پر آبادی سے ذرا ہٹ کر تھا۔ اس میں داخل ہوتے ہوئے مجھے ڈر تو بہت لگا لیکن میں نے رشید کی خاطر یہ خطرہ بھی مول لیا اور سیدھا بڑے ڈاکٹر کے کمرے میں پہنچا۔ ڈاکٹر خندہ پیشانی سے ملا اور اس نے مجھے بیٹھنے کے لئے کہا تو میں نے کھڑے رہنا بہتر سمجھا کیونکہ اس عجیب سے ماحول میں مجھے وحشت ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر کو مجھ جیسے لوگوں سے یقیناً واسطہ پڑتا رہتا تھا، اس لئے اس نے مجھے بیٹھنے کے لئے اصرار نہیں کیا۔ سفارشی خط لے کر پڑھا اور پھر مسکرا کر کہا "میں آپ کے جذبے کی قدر کرتا ہوں حیدر صاحب۔ آپ مجھے وہ پتہ بتائیں جہاں آپ نے اسے آخری بار دیکھا تھا۔ میں ایمبولنس میں اسے یہاں لے آؤں گا۔ اتفاق سے آج ہی ایک نوجوان مکمل طور پر صحت یاب ہو کر یہاں سے گیا ہے۔ اس کی جگہ خالی ہے، میں داخل کر لوں گا"

میں نے خوش ہو کر عیدگاہ سے قریب اس فٹ پاتھ کا پتہ بتایا، ساتھ ہی اس کا حلیہ بھی۔

"وہ وہاں نہ بھی ملے تو ہم اسے ڈھونڈ نکالیں گے حیدر صاحب۔ ایسے مریض عموماً کسی نہ کسی فٹ پاتھ پر یا سڑک پر ضرور نظر آتے ہیں۔" ڈاکٹر نے مجھے تسلی دی۔ اس پر میں نے پوچھا۔

"کیا یہ مرض واقعی قابل علاج ہے ڈاکٹر صاحب؟"

"ہاں ہاں۔ — اگر ابتدائی مرحلوں میں مناسب علاج ہو تو۔۔۔۔۔۔ دراصل اس مرض کے بارے اتنی غلط فہمیاں ہیں کہ اس کا نام سن کر لوگ مریض سے دور بھاگتے ہیں۔ اگر احتیاط سے کام لیا جائے تو اِن کے

قریب رہتے ہوئے بھی انسان اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکتا ہے۔ اب آپ ہمارے ہسپتال کو دیکھئے۔ یہاں چھ ڈاکٹر اور پندرہ نرسیں کام کرتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے ایسے ہیں جو برسہابرس سے جذام کے مریضوں کا علاج کر رہے ہیں۔ مجھے اس خدمت میں چالیس سال ہوگئے۔ میرا یقین کیجئے۔ ہم سب خدا کے فضل سے اب تک محفوظ ہیں۔ آپ ہسپتال کا ریکارڈ دیکھیں تو آپ کو پتہ چلے گا کہ کتنے مریض ہر سال پورے طور پر صحتیاب ہو کر یہاں سے جاتے ہیں، ان کی آبادی کے لئے ہم انہیں چھوٹے موٹے ہنر بھی سکھاتے ہیں تاکہ وہ یہاں سے جا کے بعد معاشرہ میں مفید شہری بن سکیں۔" ڈاکٹر نے روانی سے مجھے سمجھایا۔

"لیکن ڈاکٹر صاحب!" میں نے فوراً پوچھا "کیا معاشرہ ایسے لوگوں کو آسانی سے قبول کرتا ہے؟"

"یہ مشکل تو ہے حیدر صاحب —— لیکن آج اتنی نہیں جتنی کہ آج سے تیس چالیس سال پہلے تھی —— معاشرہ کا کیا ایک زمانے میں لوگ برص سے بھی اتنا ہی خائف تھے جتنا کہ جذام سے حالانکہ برص نہ چھوت چھات کا مرض ہے اور نہ خطرناک —— بہرحال ہم اپنے طور پر پوری کوشش کرتے ہیں کہ ان بیچاروں کو سسک سسک کر بے بسی کی موت سے بچا لیا جائے اور انہیں سماج پر بوجھ بننے نہ دیا جائے۔ اکثر ہمیں آپ جیسے نیک اور خدا پرست انسانوں کا تعاون ملتا رہتا ہے۔ ان ہی کے سہارے یہ ہسپتال چل رہا ہے۔"

اس ڈاکٹر سے اس سے زیادہ گفتگو نہ ہوسکی۔ دوسرے دن دفتر میں مجھے فون آیا کہ رشید کو دورے آتے تھے۔ اس کا تفصیلی معائنہ بھی ہوگیا تھا۔ اور امید بندھتی تھی کہ دو چار سال میں یہ انشاءاللہ پورے طور پر صحتیاب ہوجائے گا کیونکہ ابھی مرض کی ابتدا تھی۔ اس کی باتوں سے مجھے خاصی تسلی ہوگئی۔

اگلے ہی اتوار کو میں نے اپنے کسی دوست کے یہاں جانے کا بہانہ کیا اور سیدھا ہسپتال پہنچا۔ ڈاکٹر مجھے ایک بڑے ہال میں لے گیا جہاں بہت سارے مریض بیٹھے تھے۔ ایک طرف وہ بھی بیٹھا خلا میں خدا جانے کیا تلاش کر رہا تھا۔ ہم قریب پہنچے تو بھی اس نے نہیں دیکھا اور نہ کچھ کہا۔ اس پر ڈاکٹر نے کہا۔

"رشید دیکھو —— تم سے ملنے کوئی آیا ہے" اس پر وہ آہستہ سے مڑا اور مجھ پر اچٹتی سی نظر ڈالی۔ لیکن وہ خاموش ہی رہا —— اس کی آنکھوں میں ایسی کوئی چمک پیدا نہیں ہوئی جس سے پتہ چلتا کہ اس نے مجھے پہچان لیا ہو۔ اس کے اس رویئے سے مجھے حیرت ہوئی کیونکہ اپنے قیام کے زمانے میں وہ مجھ سے بہت قریب آگیا تھا۔ شاید اس نے وہ منحوس دن بھلایا نہیں تھا جب میری بیوی نے غصہ میں اس کی ماں کو برا بھلا کہہ کر گھر سے نکال دیا تھا۔ لیکن اس میں میرا کیا قصور تھا؟ میں نے تو کوشش کی تھی کہ کم از کم یہ بچہ

ہمارے یہاں رہ جاتے۔ اس معصوم کا بھلا اس آوارہ عورت کے ساتھ کیسے گزارہ ہو سکتا ہے! اگر اُسے اپنے بچے کی فکر ہوتی تو وہ یوں آوارہ نہ ہوتی۔ خدا جانے اب وہ کہاں تھی اور اس نے اپنے بچے کو کس کے سہارے چھوڑ دیا تھا۔

وہ اب بھی یوں ہی کھویا کھویا سا خاموش بیٹھا تھا جیسے اسے کسی سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ "تم نے مجھے پہچانا نہیں؟" میں نے آہستہ سے پوچھا۔ اس پر اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں مقدر کا ابو ہوں رشید۔ ہم نے تمہیں کبھی نہیں بھلایا۔ تمہاری امّی بھی تمہیں اکثر یاد کرتی رہتی ہیں۔" وہ میری بیوی کو صفدر کی طرح امّی پکارا کرتا تھا۔ اس پر بھی اس نے نفی میں سر ہلایا اور آہستہ سے جواب دیا "نہیں ــــ امّی نہیں!"

"وہ واقعی تمہیں اکثر یاد کرتی رہتی ہیں رشید۔ اُس دن تمہاری ماں نے امّی سے بیہودہ بات کی تھی کہ انہیں غصہ آگیا تھا ــــ تمہاری ماں کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔ "ماں؟ ــــ چلی گئی" اس نے جواب دیا۔

"چلی گئی؟ ــــ کہاں؟" ــــ میں نے دوبارہ پوچھا۔

"نہیں معلوم" اس کے ساتھ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور میں ایک بار پھر تڑپ اٹھا۔ خدا جانے کیوں یکایک مجھے مقدر یاد آگیا۔ اگر وہ زندہ ہوتا اور وہ اس موذی مرض کا شکار ہو جاتا اور اسی طرح اس کی آنکھوں میں بھی آنسو آجاتے تو کیا میں یوں ہی سہما کھڑا اُسے دکھ میں صرف دیکھ ہی سکتا، آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگا کر کیا میں اُسے دلاسہ نہ دیتا؟ ــــ یہ کیسا ڈر تھا جو میری محبت اور تڑپ اور دل میں شدّت کے درد پر حاوی ہو گیا تھا؟ خدا جانے میری روح کی تڑپ اور میرے چہرے کے کرب کا ڈاکٹر کو کس طرح احساس ہو گیا، اس نے ہمدردی سے میرے بازو پر ہاتھ رکھا اور آہستہ سے کہا۔

"اب آپ چلئے۔ مریض کے لئے کسی قسم کا بھی جذباتی دھچکا مناسب نہیں ہوتا۔"

میں نے یہ سُن کر ٹھنڈی سانس لی اور رشید سے کہا۔

"اب چلتا ہوں رشید۔ لیکن اگلے اتوار کو پھر آؤں گا ــــ تمہارے لئے گیند، پھل اور ٹافیاں لے کر ــــ خدا حافظ۔"

مجھے معلوم تھا اسے یہ چیزیں بہت پسند تھیں۔

اس دن میں بوجھل قدموں سے لوٹ آیا۔ اس کے بعد میرا معمول ہو گیا کہ میں ہر اتوار کو بلا ناغہ اس کے پاس جاتا اور اپنے ساتھ اس کی پسند کی چیزیں ضرور لے جاتا۔ شروع شروع میں تو یوں لگتا جیسے اسے نہ مجھ سے کسی قسم کی دلچسپی ہو اور نہ میری لائی ہوئی چیزوں سے۔ لیکن آہستہ آہستہ خفگی اور بیگانگی کی وہ دیوار جو ہمارے

ری تھی گر گئی۔ اب وہ نہ صرف مجھے دیکھ کر مسکرانے لگا بلکہ مجھ سے مختصر سی باتیں بھی کرنے لگا۔ کسی اتوار کو اپنی کسی سروفیت کی وجہ سے میں اس کے پاس نہ جاتا تو اگلے ہفتے ڈاکٹر یا جرمن میڈن مجھے بتاتی کہ اس نے بڑی شدت سے انتظار کیا تھا۔ اسی طرح ایک سال گذر گیا۔ ایک اتوار کو ڈاکٹر نے مجھے یہ خوشخبری سنائی کہ رشید اب تیزی سے تیاب ہو رہا تھا۔ اس کا مرض تو کئی مہینے پہلے ہی قابو میں آگیا تھا۔ اب اُمید بندھ گئی تھی کہ اگر اس کی صحتیابی کی فتار یہی رہی تو انشاء اللہ ایک آدھ سال میں وہ یہاں سے مکمل طور پر ٹھیک ہو کر میرے ساتھ جاسکے گا!

اُس دن میں خوشی سے پاگل ہو گیا۔ جی چاہا ساری دنیا کو یہ حسین راز بتا دوں۔ لیکن میں کس سے کہتا، آج ب میں نے اپنی بیوی تک کو یہ نہیں بتایا تھا کہ میں ہر اتوار کو رشید سے ملنے ہسپتال جایا کرتا ہوں۔ وہ بھلا کیسے .داشت کر سکتی کہ ایک آوارہ عورت کے بچّے سے، جو جذام جیسے خطرناک مرض میں مبتلا تھا، اس سے ملنے میں ہسپتال ایا کرتا تھا۔

میری یہ خوشی زیادہ دیرپا ثابت نہیں ہوئی کیونکہ دوسرے ہی دن دفتر میں مجھے اطلاع ملی کہ ایک ہفتہ کے ذر مجھے سمندر پار جانا تھا ——— کم از کم تین سال کے لئے۔

جانے سے پیشتر میں ایک بار پھر اس سے ملنے ہسپتال گیا۔ بڑے ڈاکٹر کے علاوہ رشید کو بھی مجھے دیکھ کر حیرت ہوئی کیونکہ خلاف توقع میں اتوار کے بجائے جمعرات ہی کو وہاں گیا تھا ——— میں نے تنہائی میں ڈاکٹر کو اپنے عارضی تبادلے کی اطلاع دی، ساتھ ہی ایک ہزار کا چیک بھی دیا اور وعدہ کیا کہ آئندہ وقتاً فوقتاً مزید پیسے بھیجتا رہوں گا تاکہ رشید کی تمام ضروریات پوری ہو سکیں۔ اس کے بعد میں رشید کے پاس گیا اور بہت سے تحفے دیئے اور جب کراچی سے باہر جانے کی اطلاع دی تو وہ خاموشی سے سنتا رہا، پھر اُس نے آہستہ سے کہا۔

"آپ آئیں گے نا؟"

خدا جانے اِن چند لفظوں میں کیسا دُکھ تھا کہ میں تڑپ گیا۔

"ضرور آؤں گا بیٹا ——— تمہیں برابر خط بھی لکھتا رہوں گا ہر ہفتے میری طرف سے تمہیں برابر تحفے ملتے رہیں گے۔ جیسے ہی میرا کام ختم ہو جائے گا لوٹ آؤں گا، ڈاکٹر صاحب کو یقین ہے اُس وقت تک تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔ پھر ایک دن اچانک آکر میں تمہیں اپنے گھر لے جاؤں گا ——— بیٹا تمہیں ہمیشہ کے لئے یہاں کیسے چھوڑ سکتا ہوں؟

جذبات کی شدت میں خدا جانے میں نے اور کیا باتیں کیں اور اس نے ان کا کیا جواب دیا۔ مجھے تو صرف یہ یاد ہے کہ ڈاکٹر میرا بازو تھام کر مجھے اپنے ساتھ لے گیا اور ایک بار پھر تسلی دی کہ یہاں ہر طرح سے رشید کا خیال رکھا جائے گا۔

لندن میں میرا قیام کچھ طویل ہوگیا۔ اب چار سال کے طویل بن باس کے بعد آدھی رات کو میں کراچی پہنچنے ہی والا تھا۔ رات بے حد تاریک تھی اور جہاز کے اندر خاصی خنکی ہوگئی تھی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے مجھ سے بہت نیچے نیلی نیلی سدا سنیوں کا ایک طویل اور عریض حسین جال بچھ گیا اور ایئر ہوسٹس نے اعلان کیا کہ ہمارا جہاز کراچی کے بین الاقوامی ہوائی اڈے پر اترنے ہی والا تھا۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ کھڑکی سے منہ لگائے آسمان اور زمین کے درمیان کے فاصلہ کو تیزی سے گھٹتا دیکھنے لگا۔ پھر یہ فاصلہ بالکل ختم ہوگیا اور جہاز رن وے پر دوڑنے لگا۔ اس کی رفتار آہستہ آہستہ کم ہوگئی اور پھر وہ ہوائی اڈہ کی عمارت کے عین سامنے اس سے خاصے دور رک گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جہاز کا دروازہ کھلا تو سیڑھیوں تک سب سے پہلے میں ہی پہنچا۔ اندھیرے کی وجہ سے نظر نہیں آرہا تھا کہ میرے استقبال کے لئے میری بیوی کے ساتھ کون آیا ہے۔ لیکن جب میں کسٹم کے احاطے میں پہنچا تو میری بیوی نظر آئی۔ وہ تنہا کھڑی اچک اچک کر ہاتھ ہلا رہی تھی تاکہ میں آسانی سے اسے دیکھ لوں۔ میں نے بھی ہاتھ ہلا کر جواب دیا۔

خدا خدا کر کے ہوائی اڈہ کے تمام مرحلے پورے ہوتے اور میں کاندھے پر سفری بیگ لٹکائے ہاتھ میں بریف کیس لئے، دوسرے ہاتھ سے سامان کی ٹرالی ڈھکیلتا ہوا لاؤنج میں آگیا۔ ہمارے ڈرائیور نے آگے بڑھ کر ٹرالی سنبھالی اور ہم اپنی کار کی طرف چلے۔ میری بیوی نے بتایا وہ قریب ہی ایک درخت کے نیچے کھڑی تھی جس کے دائیں طرف بجلی کا ایک بے حد روشن کھمبا تھا جس کی ہلکی آسمانی روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ میں جونہی قریب پہنچا میرے قدم خود بخود رک گئے۔ کار کا دروازہ کھولے ایک خوش شکل نوعمر نوجوان کھڑا تھا جس نے عمدہ بش شرٹ اور پتلون پہن رکھی تھی۔

"ارے رک کیوں گئے! ــــ پہچانا نہیں! ــــ یہ رشید ہے بھئی" میری بیوی نے کہا۔

"رشید؟" میرے منہ سے آہستہ سے نکلا۔

"ویلکم ٹو پاکستان ڈیڈ" اس نے آگے بڑھتے ہوئے مصافحہ کے لئے اپنا دایاں ہاتھ بڑھایا۔ اس کی انگلیاں ٹیڑھی میڑھی ضرور تھیں لیکن صحیح اور سالم تھیں۔ ہاتھ پر کسی قسم کا کوئی داغ نہیں تھا۔ مجھے نہ

نذر الحسن صدیقی

فاصلے

(۱)

دن ڈھلنے لگا، پیلی پیلی دھوپ چھت کی منڈیروں پر اتر آئی اور ڈوبتے سورج کی کرنیں حویلیوں کے کنگوروں پر مچل رہی ہیں، کھیت کھلیانوں سے آنے والی آوازیں مدھم ہوگئیں اور دن بھر میرے ساتھ چلتے ہوئے وقت کے قدم بھی بوجھل سے پڑنے لگے،.... میں نڈھال وقت کی مانند تھکاماندہ ساغر تال کے کنارے کھڑا ہوں .... لہروں کے تھپیڑے شام کے سناٹے کا جز بن چکے اور تال کے دونوں پاٹ خاموش فضا میں گم ہیں" اچھوا" " اچھوا" کی مترنم لہراتی گاتی آوازیں اور اس پر پیہم کپڑے پٹخنے کی تال بھی دن بھر کی تھکن کے بعد سکوت کا روپ دھار چکی اور اب خاموشی ہی خاموشی ہے، ایک آدھ کہار گھینٹی پر بیٹھا ابھی تک سنگھاڑے توڑنے میں مصروف ہے تلوار کی دھار کی طرح تیز چلتی ہوئی سیت بھی بوجھل سی سبک گام چل رہی ہے جس سے تال کے ٹھہرے ہوئے پانی میں ہلکا ارتعاش پیدا ہو رہا ہے اور سبک رو ہلوریں لیتا خنک پانی میرے پاؤں تلے پڑے اس پتھر سے ٹکرا رہا ہے جس پر وقت کی تیز دھار نے دراڑیں اور رخنے ڈال دیئے ہیں اور جس کے شفاف اجلے چہرہ پر صدیوں پرانی کائی جمی ہوئی ہے، مگر سامنے کی اجلی اجلی نور میں دھلی عمارت، مذہبی اور تاریخی روایات کی امیں بلند وبالا ایستادہ ہے...... خواجہ نظام المشائخ حضرت نظام الدین اولیا کے والد بزرگوار حضرت سید احمد صاحب کی زیارت جس کے صحن میں کھڑا ہو گھنتی کا کہن سالہ درخت اپنی بوڑھی آنکھوں سے زمانہ کے انقلابات نشیب و فراز اور عروج و زوال کے کتنے دور دیکھ چکا.... اور میرے داہنے ہاتھ پر وہ دو قبریں ہیں جن کا تعویذ باڑھ پر چڑھے ہوئے تال کے دو ہاتھی ڈباؤ پانی میں بھی کبھی نہیں ڈوبتا..... یہ قبریں کس کی ہیں؟ خدا جانے.... گمنام صرف سینہ بہ سینہ پہنچی ہوئی قصہ کہانیوں والی نوعیت کی نیم تاریخی روایات میں زندہ..... بستی والے ان قبروں کو "ٹلیا" کے نام سے پکارتے ہیں۔ یہاں یہ کائی جا در تلے اس دخنوں والا پتھر وقت کی تیز دھار بہاؤ، کھنی کا کہن سالہ

درخت، دو گمنام قبریں، زمانہ کے انقلابات عروج و زوال اور نشیب و فراز کی ان گنت کہانیاں، میرے مسلسل چلتے ہوئے وجود میں پیہم سفر کر رہے ہیں۔ جیسے زمانہ کی گردشیں میرے قدموں سے لپٹی ہوئی میرے ساتھ ساتھ متحرک ہیں۔

اور میں چلتے چلتے ہری ہری دوب کے لق و دق قطعہ میں پہنچ گیا ہوں، تا حدِ نگاہ کنجن ہری لہلہاتی ہوئی گھاس مخملیں سبزہ کا فرش قدموں تلے بچھا ہوا..... میرے سامنے چند گھسیارے بڑی تیزی سے کھرپی چلا رہے ہیں، اور ابھی ابھی ان میں سے ایک نے گھاس کا گٹھا اپنے سر پر جمے ہوئے "مونڈھے" پر رکھا ہے اور اب وہ اپنی دن بھر کی محنت و مشقت کا بوجھ اپنے ہی وجود پر لادے چل پڑا ہے اور میرے پاؤں بھی جیسے اس کی نحیف و نزار پتلی پتلی مگر پھر بھی بڑی مضبوط ٹانگوں میں جڑ کر اس کے ساتھ ہی قدمے چل پڑے ہیں..... میرا وجود اور ذہن دو حصوں میں بٹ چکا ہے..... ایک حصہ ساغر تال کے کنارے کھڑا ہے، صدیوں پرانے پتھر کے رخنوں اور دراڑوں میں پھنسا ہوا جیسے میرے اپنے جسم کی حنوط شدہ لاش..... مگر دماغ اور ذہن دونوں پوری طرح زندہ اور اچھی طرح بیدار، جس کو ماضی کا کھردرا اور مضبوط پنجہ کرید کرید اور کھرچ کھرچ کر بلا کا ذکی الحس بنائے ہوئے ہے اور دوسرا وجود گھاس کے طویل و عریض قطعہ میں ہے، حرکت سے معذور جیسے گھاس آکاش بیل بن کر میری پیہم حرکت کرتی ہوئی ٹانگوں سے لپٹ گئی ہے..... مگر میری جامد و ساکت ٹانگوں سے میرے پاؤں الگ ہو کر گھسیارے کی تیزی سے حرکت کرتی ہوئی ٹانگوں سے جا ملے ہیں اور ان بھاگتی ہوئی وقت کے ساتھ کنوتیاں ملاتے ٹانگوں کو میں خوب پہچانتا ہوں، اس کے پورے وجود اور جسم و جاں سے اچھی طرح آشنا!..... للو کا جسم، تیزی سے بھاگتا اپنی مشقت کا بوجھ اپنے سر پر دونوں ہاتھوں سے مضبوطی کے ساتھ تھامے،..... میری قدموں کی گرد اور دھول میں اٹی آنکھیں اپنے اوپر چڑھی ٹانگوں کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی ہیں، پیلی پیلی زرد زرد مٹیالی پنڈلیوں پر نسوں کی گانٹھیں جگہ جگہ ابھری ہوئی اور مچھلیاں تنی ہوئی جن کی ہر شریان میں محنت اور مشقت کی تیز آنچ پر گرم ہوتا لہو تیزی سے گردش کر رہا ہے، اور گھٹنوں سے تھوڑا اوپر ذرا بھدی میلی سی غرقی بمشکل للو کی گھٹنوں تک کی شرعی ستر پوشی کا بھرم رکھے ہوئے اور میرا گھاس کا قطعہ میں کھڑا ہوا ساکت وجود لمحہ بھر کے لئے مسجد کے صحن میں جا کھڑا ہوا جہاں حافظ جی اپنی کرارک دار گونجیلی آواز میں للو کو غرقی باندھ کر نماز پڑھنے آنے پر ڈانٹ رہے ہیں کیونکہ تہبند نما غرقی للو کی گھٹنوں سے نیچے تک کی اچھی طرح ستر پوشی کرنے کے لئے کافی نہیں اور للو بیچارے سر جھکائے جگہ جگہ سے پیوند لگی غرقی کو بڑی حسرت سے دیکھ رہے ہیں، اور پھر للو کی نظر اوپر اٹھی اور نگاہ جیسے مسجد کے میناروں کے سہارے اوپر چڑھتی چلی گئی، بلند اور بلند آسمانوں

کے پردے چاک کرتی ہوئی...... اور پھر جیسے ساتویں آسمان سے بھی پرے عالمِ لاہوت سے ایک نداۓ الٰہی کی بازگشت مسجد کی محرابوں، دروں اور دالانوں میں گونجنے لگی...... اور اس کی تفسیر شاہ کے گلے کی جنت للّو کی پیشانی پر ثبت نظر آئی، روشن ستارے سے بھی زیادہ تابندہ اور چمکتے ہوئے سچّے موتی سے بھی زیادہ آبدار......

میرا جامد و ساکت وجود پھر گھاس کے قلوہ میں پہنچ گیا، مگر قدم بدستور للّو کی ٹانگوں کے ساتھ حرکت میں ہیں اور اب میری قدموں کی آنکھیں للّو کے بیٹھے سے لگے پیٹ پر جمی ہوئی ہیں جیسے پتھرائی ہوئی آنکھیں پیہم فاقوں کے مارے ہوئے پیٹ پر مرکوز، جس میں بھوک کی آگ کا لوکا ایک وقت بھی روکھی سوکھی میسّر نہ آنے کے سبب لمحہ بھر کے لئے سرد نہیں ہوتا مگر للّو اپنے اندر دہکتے اور بھڑ بھڑاتے آتش فشاں کو صبر و رضا کے وزنی پتھر تلے دباتے رہتے ہیں یہاں تک کہ معدہ اور آنتوں کی وہ حرکت جس کو بھوک کہتے ہیں معدوم ہو جاتی ہے اور آنتوں کی فریاد کرتی قراقر بھی کمزور اور نحیف ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو جاتی ہے اور آج بھی للّو کے پیٹ کے بند کنوئیں سے میں نے کان لگائے ہیں مگر وہاں تو مکمل سناٹا ہے، کسی خفیف سی حرکت کی ہلکی سرسراہٹ بھی نہیں......

اور للّو نے گھاس کے گٹھے کا بوجھ اپنے سر سے اتار پھینکا، اور ایک چمکتی ہوئی چوّنی ان کی ہتھیلی پر نظر آئی اور میرے قدموں کی آنکھیں بے اختیار ان کے چہرے کی طرف اٹھ گئیں، دن بھر کی محنت اور مشقت کے ملے ہوئے چہرہ پر ہلکا اطمینان تھا اور بشرہ میں مستقل ٹھہراؤ۔ آنکھوں میں عجیب سی چمک جیسے چوّنی کی چاندی بھوک بن کر پتلیوں کو روشن کر رہی ہو اور نیچے پیٹ کے بند کنوئیں میں دن بھر چپ رہنے کے بعد بھوک کی آنتوں کی قراقراہٹ یک دم چیخ سی بن کر ابھری اور معاً میں نے للّو کو دیکھا مگر وہاں تو وہی اطمینان کروٹیں لے رہا تھا اور للّو کے پیٹ سے ستھرا ان کے بشرہ اور چہرہ پر شائبہ تک نہ تھا......

اور للّو جب اپنے گھر میں داخل ہوئے تو گھاس کے قلوہ میں کھڑا ہوا میرا جامد و ساکت وجود ایک بار پھر للّو کے ساتھ ساتھ تھا، اور جب وہ بہ مشکل دو گز لمبی انگنائی پار کر کے چھوٹے سے کچّے کوٹھے میں پہنچے جس کی چھت پر پھونس کا چھپّر تھا اور آدھی پٹی ہوئی چھت سے جگہ جگہ سے آسمان جھانک رہا تھا تو معاً ان کی نظر ... میں پڑی چکّی کے دو پاٹوں کی طرف اٹھ گئی، خاموش و بے حس حرکت چکی...... مگر پھر جیسے چکّی کے دو ... یکایک متحرک ہو گئے اور اس کی گڑگڑاہٹ چھوٹے سے گھر میں گونجنے لگی اور دو منڈل منڈل کلائیاں ... کے ہینڈے کو چلاتی ہوئی نظر آئیں۔ خاتون کے تیزی سے گردش کرتے ہوئے ہاتھ اور خاتون کا پیسا ... پیٹ چکّی کے پاٹوں کو چھو چھو جاتا اور وہ نڈھال للّو کی امانت کا بوجھ سنبھالنے کی کوشش کرتی ہوئی ...

ہانپ کر چکّی کے پاٹوں کو چلانے کی کوشش کر رہی تھی...... ایک خورد سال بچہ مٹی میں آمازمین پر کھیل رہا تھا، پھر کچھ سرگوشیاں سی کوٹھرے میں سُنائی دیں اور خاتون بہ مشکل تمام اُٹھ کھڑی۔ اس سے تو دو قدم چلنا بھی دو بھر تھا ایک تو اپنا بھوکا نڈھال وجود ہی نہ سنبھال سکتا، پھر للّو کی امانت کا بوجھ اس کے اندر پلتا بڑھتا وجود جو اس کا خون چاٹ چاٹ کر زندہ تھا۔ للّو نے ایک نظر اس کے سراپے پہ ڈالی، وہ پھل سے لدی شاخ کی طرح دوہری ہو ہو جاتی اور للّو کی نظریں گرتی پڑتی گھسٹ گھسٹ کر چلتی ہوئی خاتون کے ساتھ ساتھ چلتی رہیں، خاتون نے ٹھنڈے پڑے چولہے کو جنگل سے بِن کر لائی ہوئی سوکھی سوکھی پتلی پتلی لکڑیوں کے سہارے روشن کیا اور کھیتی میں ایک موٹی مستی کی روٹی سینک کر لائی اور پھر سِل بٹہ پر ذرا سی لال مرچ اور نمک پیس کر روٹی پر رکھا اور للّو کے سامنے رکھ دیا، للّو نے ایک نظر خاتون کو دیکھا اور پھر زبردستی اُس کو اپنے پاس ہاتھ پکڑ کر بٹھالیا، خاتون نے ایک بڑا ٹکڑا اندراسی چٹنی کے سہارے حلق سے اُتارا، پھر دو گھونٹ پانی پی کر اپنے گرتے ہوئے وجود سے زیادہ اُس کو سہارا دیا جو اس کی کوکھ میں رستخیز بپا کیے اس کے کلیجہ کو کھرچ کھرچ کر کھائے جا رہا تھا.... .

میرے گُم صُم وجود نے ایک نظر کوٹھرے پر ڈالی اور پھر للّو کو دیکھا جو خاموش گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھے تھے، چکّی خاموش تھی، للّو خاموش تھے، کوٹھرے کے در و دیوار چپ تھے، مگر یکایک جیسے بھونچال آگیا، للّو کے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں، اندھیارا چھا گیا جیسے ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے، پھر زور سے کوندا ہوا، چمکتا پھیلتا کوندا کوٹھرے میں در آیا، لمحہ بھر کے لئے اُجالا ہو گیا، پھر پروائی لہکی اور دھوں تال پانی پڑنے لگا.... بارش کا زور ٹوٹا مگر ہلکی پھوار پھر بھی پڑ رہی تھی اور پروائی بدستور لہک رہی تھی..... ایسے میں کوئی گھر میں داخل ہوا، خاتون جیسے تیسے اُٹھی..... "کھیورا ایک پیسہ کا"...... وہ دو قدم گھسٹتی ہوئی چلی ٹانگیں کپکپا رہی تھیں اور کلیجہ میں مسلسل وہی اذیت ناک کھرچن،.... "ایک پیسہ کا لکڑای کا کھیورا"... پھر وہی آواز، اور اب اس آواز نے جیسے اس کے کلیجہ کی کھرچن کو ختم کر دیا، اس کو اپنے نڈھال جسم میں عجیب سی توانائی محسوس ہوئی، وہ بڑی استقامت کے ساتھ قدم بڑھاتی ہوئی چھپر کی اولتی کی طرف گئی، گھٹا ٹوپ اندھیرا بدستور تھا اور بارش میں بھیگی بھیگی پروائی سائیں سائیں کر رہی تھی...... اس نے ٹٹول ٹٹول کر کھیورا توڑا اور پھر... للّو کے ذہن میں سانپ سے سرسرانے لگے، کالے کالے ناگ زہر میں بجھی پھنکاریں مارتے ہوئے، بس میں بسے دانت گاڑتے ہوئے، لہراتے بل کھاتے اژدر،.... اور میں نے دیکھا کہ للّو کی پتھرائی ہوئی آنکھیں خاتون کے نیلے جسم پر مرکوز ہیں، ناک اور مُنھ سے خون بہہ بہہ کر اس کے نیلگوں بدن پر جگہ جگہ جم گیا ہے،..... خاتون بے حس و حرکت تھی اور اس کے پیٹ

میں پلتی بڑھتی دوسری زندگی بے جان، جیسے سب کچھ مردہ...... گھر کے کچے در و دیوار، نیم کا درخت، مٹی کا ٹھنڈا بڑا چولھا، سب کچھ بے حس و حرکت ساکت و صامت! اور نیم فاقوں کے مارے للّو ہر چیز اور ہر احساس سے عاری صرف خاتون کے خیال اور تصویر میں گم...... اور میرا جامد و ساکت وجود للّو کو ماضی میں گم سُم چھوڑ کر پھر گھاس کے قطعہ میں پہنچ گیا اور للّو بھی جیسے ماضی اور گھر کے بھیانک سناٹے سے گھبرا کر مسجد کی جانب چل دیتے اور چھوٹے سے بچّہ کو دونوں ہاتھوں سے سر سے اونچا کر کے منڈیر کے پار پڑوس میں دیئے گئے جوان کا روز کا معمول تھا اور میرے قدم بدستور ماں کی ٹانگوں کے ساتھ جڑے اُن کے ساتھ ساتھ حرکت میں ہیں، اور دوسری صبح بھی جب للّو حسبِ معمول گھاس کے قطعہ میں پہنچے میرے قدم اُن کے ساتھ تھے......

دوسری صبح گھاس کے قطعہ میں میرا جامد و ساکت وجود دن بھر للّو کو دوسرے گھسیاروں کے ساتھ گھاس چھیلتے دیکھتا رہا۔ اُن کی تیزی سے حرکت کرتی ہوئی کُھرپی دوپہر کو تھوڑی دیر کے لئے ٹھہری، تمام گھسیارے گھاس کے قطعہ کے پار چلتے ہوئے رہٹ پر پہنچے اور للّو بھی اُن میں شامل تھے، اور میرے قدم للّو کے ساتھ ساتھ ایک گھسیارا کنوئیں کی من پر چڑھا اور ایک ڈول پانی کنوئیں میں سے اسارا، باری باری سب نے ہاتھ منھ دھویا، اور چھوٹی چھوٹی پوٹلیاں کھول کر چبینے کے بڑے بڑے پھنکے مار کر اوک سے پانی پیا، مگر للّو اب سب سے الگ ایک طرف گھاس پر کھڑے نمازِ ظہر ادا کر رہے تھے، اور نماز ادا کر کے انھوں نے ایک مُٹھی چنے مُنھ میں ڈالے پھر پانی پیا اور پھر دوبارہ کام میں آکر جُٹ گئے، اور شام تک دن بھر تیزی سے گھاس چھیلتے رہنے کے بعد جب للّو کو یہ اندازہ ہو گیا کہ گھاس کا خوب بڑا گٹھا تیار ہو گیا تو انہوں نے اپنے سر پر جمے مونڈھے پر اس کو رکھا اور ایک بار پھر بستی کی جانب پیدل چل پڑے، اپنی محنت اور مشقت کا بوجھ اُتارنے، ایک چودھری کے بھاڑ پر جو ان کی روزی کا واحد ذریعہ تھی۔

پسینہ میں نہائے دھڑ کے نیچے جڑی ہوئی للّو کی ٹانگیں بڑی تیزی سے چل رہی تھیں اور میرے اُن کا ساتھ دے رہے تھے، للّو کھیتوں کو پار کرتے، کھلیانوں سے گزرتے، لیکھوں اور مینڈھوں کو پھلانگتے ہوئے بستی کی حدود میں داخل ہوئے اور دو طرفہ پھیلے ہوئے کچے جھونپڑوں کے درمیان سے گزرتے وہ بڑی پکی سڑک کے کنارے پہنچ گئے، سڑک کے پار چودھری کی گڑھی تھی مضبوط اور بلند و بالا جس کی بنیادیں نہ معلوم کب سے زمین کی گہرائیوں میں بہت نیچے جیسے پاتال میں پیوست تھیں اور سڑک کے اس طرف ذرا نشیب میں سرس کا بوڑھا درخت تھا، جس کی جڑیں بھی نیچے بہت نیچے زمین میں پھیلی ہوئی تھیں جیسے ایک دوسرے کے

ہمراز اور آشنا صدیوں سے آمنے سامنے کھڑے سرگوشیوں میں باتیں سی کرتے ہوتے..... سرس کے نیچے ایک شکرم کھڑی تھی اور سرس کے موٹے تنے سے گھوڑا بندھا ہوا تھا اور سائیس گھوڑے پر پیار سے ہاتھ پھیر پھیر کر کھریرا رہا تھا، للّو کو گھاس لاتے آتے دیکھ کر سائیں نے دُور سے آواز دی، للّو کی ٹانگیں لمحہ بھر کے لئے ٹھٹکیں اور پھر وہ شکرم کے قریب آکر ٹھہر گئے، سائیس ذرا سا آگے بڑھ کر للّو کے پاس پہنچا اور گھاس کے گٹھے کے لئے بھاؤ تاؤ کرنے لگا اور بات دو تین آنے سے شروع ہو کر چار آنہ پر جا کر ٹھہر گئی..... شاید ایک چوّنی ہی ازل سے للّو کا مقدر تھی۔ پھر سائیس نے اپنا منھ للّو کے کان کے قریب لیجا کر کچھ کہا...... میرے قدموں کو محسوس ہوا کہ ان پر کھڑے ہوئے للّو کے جسم میں گردش کرتا ہوا خون لمحہ بھر کے لئے تھم گیا، مگر پھر لوہے خون کو جیسے کسی نے متھ دیا، بڑے زور سے سنسناہٹ ہوئی، چیونٹیوں کے دل کے دل اوپر سے نیچے کو چلے جن کی سنسناہٹ مجھے اپنے قدموں کے تلووں اور اُنگلیوں کی پوروں تک محسوس ہوئی، دفعتاً میرے قدموں کی آنکھوں نے للّو کے چہرہ کو دیکھا، للّو کا چہرہ تمتما رہا تھا..... سائیس نے للّو کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر دو چوّنیاں رکھ دیں، للّو نے ایک نظر اپنی ہتھیلی پر چمکتی ہوئی چوّنیوں کو دیکھا۔ للّو کی ہتھیلی کا مقدر آج عمر میں پہلی مرتبہ کھلا تھا اور شاید للّو کی آنکھوں کی تقدیر بھی زندگی میں پہلی دفعہ چمکی تھی، جنھوں نے دو چوّنیوں کو ایک ساتھ عمر میں پہلی دفعہ دیکھا تھا۔ سائیس نے للّو کو حیرت زدہ دیکھ کر کہا" دیکھ کیا رہے ہو..... تمہاری دو دن کی کمائی کے برابر ہے" اور للّو جیسے چونک سے پڑے، دو دن کی محنت..... لمحہ بھر کے لئے نادار گھسیارے نے نہ معلوم کیا سوچا، مگر دوسرے لمحے جیسے ان کی قلب کی گہرائیوں سے ایک آواز اُبھری" دو دن کی کمائی..... اونہہ...... اور اگر تو بھیک مانگے تو چار دن کی کمائی ایک دن میں بھیک کے پیسے پیسے دو دو پیسے سے اکٹھی کر سکتا ہے..... مگر بھیک تو حرام ہے اور یہ چوّنی بھی"..... اور للّو نے دل کو سمجھا لیا اور وہ مطمئن ہو گئے..... پھر سائیس نے اپنا ہاتھ للّو کے سامنے پھیلایا جیسے دست سوال دراز کیا، مگر للّو سائیس کی ہتھیلی کو دراز چھوڑ کے اپنی مٹھی کو سختی سے بھینچے۔ دونوں چوّنیوں کو دبائے آگے بڑھ گئے، بڑی سلامت روی کے ساتھ ایک ایک قدم نپا تلا اور بڑا جچا ہوا اُٹھاتے ہوئے..... گڑھی کے لق و دق چبوترے کے سامنے وہ ٹھہر گئے، سینہ ہمالائی چوٹیوں کی طرح اُبھرا اور پھیلا ہوا، گردن میں ترچھا ترچھا خم اور سر سے لے کر انگشت پا تک عجیب سی چمک جیسے صبح ازل کا نور روئیں روئیں کو دمکا رہا تھا جس کا انعکاس مجھے اپنے قدموں پر بھی محسوس ہوا،..... اور وہ تحصیلدار سے مخاطب ہوئے، مگر للّو کے حلق سے جو

آواز نکلی وہ ان کی خارجی ہئیت اور وجود سے ہم آہنگ نہ تھی، جیسے کوئی اور مخلوق آسمان کی بلندیوں سے زمین پر اُتر کر بول رہی ہو، میرے قدموں کے کانوں نے زمین میں دھمک اور فضا میں ارتعاش محسوس کیا، جیسے زلزلہ سے پہلے والی کیفیت ہر چہار طرف طاری ہو گئی، چبوترہ پر بیٹھا ہوا ہر فرد بیساختہ چونک پڑا اور سب کی نظریں للّو کی طرف اُٹھ گئیں اور للّو نے تھوڑا اور آگے بڑھ کر جیسے تحصیلدار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑے دم خم والے تیوروں سے کہا "صاحب...... آپ کا یہ سائیں نہایت ہی بددیانت اور بے ایمان آدمی ہے اور لہجہ کی تیزی اور آواز کا کاٹ لوگوں کے دلوں کو چیرتا چلا گیا تحصیلدار صاحب نے جزبز سا ہو کر کرسی پر ایک پہلو بدلا، مگر للّو نے بغیر کسی اور طرف دھیان دیئے انہیں تیوروں سے اپنی بات جاری رکھی" یہ مجھے بے ایمانی اور حرام کی کمائی کی ترغیب دیتا ہے، اس نے مجھے رشوت کی پیشکش کی اور کہا کہ آپ کو جا کر یہ بتاؤں کہ گھاس کا گٹھا میں نے آٹھ آنے میں بیچا ہے، تاکہ یہ چونّی میں اور وہ آدھی آدھی بانٹ لیں،...... مگر مجھے حرام کی کمائی کا دھیلا بھی حرام ہے، سور کے گوشت سے بھی زیادہ غلیظ اور ناپاک"...... اور یہ کہہ کر بڑی حقارت سے ایک چونّی تحصیلدار صاحب کی طرف اس انداز میں اُچھالی جیسے وہ ناپاکی، غلاظت اور نجاست کی پوٹ ہو، چونّی چھن سے تحصیلدار کے پیروں تلے جا کر گری...... میرے قدموں کی آنکھوں کو نشیب میں کھڑے للّو ایمان و نور کا مجسمہ بنے نظر آئے، صبر و رضا اور استغنا کی انتہائی بلندیوں پر، پھر وہ آہستہ آہستہ چل دیئے، ایک چونّی مٹھی میں دبائے مگر میرے گنہگار قدموں کو اُن کے ساتھ چلنے کا یارا نہ تھا، وہ اکیلے تن تنہا آگے بڑھ گئے شاید ازل سے چل کر ابد کی وسعتوں میں گُم ہونے کے لیے۔

اور للّو کی ٹانگوں سے بچھڑے ہوئے قدم میرے گھاس میں کھڑے ہوئے وجود سے دوبارہ جا ملے اور میں گھاس کے قطعہ میں سے گزرتا ہوا ساغر تال کے "ٹیلے" کے سامنے والے کنارے پر پہنچ گیا، کنارے سے لگے ترکاریوں کے کھیت ہیں جن کا سلسلہ تال کے دُوسرے پاٹ تک چلا گیا ہے، کھیت کی میکھوں سے ملی ملی ایک طویل و عریض گزرگاہ ہے، پکّی سڑک سے کافی نشیب میں روک نما کچا راستہ جس کی دوسری طرف امرود کی بگیا ہے، اور یہ لمبا چوڑا راستہ تیسرے پہر سے کھیل کے میدان کا سماں پیش کرتا ہے، بستی کے نوعمر لڑکوں کا جمگھٹا لگ جاتا ہے اور پھر مختلف ٹولیاں اور ٹکڑیاں اپنے اپنے پسند کے کھیل میں مشغول ہو جاتی ہیں، گلّی ڈنڈا کھیلنے والے اپنا دھرا الگ دبائے ہوتے ہیں، کوئی "دوڑ دھوپی" کھیل رہا ہے اور لمبے لمبے ٹیلے تک

شہپریں اور پیچھے بھاگ کر آنے والا تیز رفتاری کا مظاہرہ کر رہا ہے، کچھ "پیسا لیسی" کی بازی لگا کر گلی چھونے کی کوشش کر رہے ہیں، ایک طرف نگیا کے مینڈھے سے لگی لگی ذرا بھر بھری اور نرم مٹی میں "ڈڈوا" اور "بالا ہو رہا ہے" ایک پالی ہم جیتے، ہم شیر تم جیتے " " اچھا، چھو چھو آم چھو بادام چھو" کی آوازیں قدموں کی دھمک کے ساتھ گونج رہی ہیں نگیا کے دوسرے مینڈھے پر "سیلی گھوڑی" کھیلا جا رہا ہے، اور اس سے ذرا ہٹ کر لکڑیوں سے کھیلے جانے والے کھیل "گیڑی" کا پھر چا ہو رہا ہے۔ ...... میرے چلتے ہوئے قدم کچھ دیر کے لئے ٹھہر گئے، میں نے چند لمحہ اس تمام منظر کو دو بارہ دیکھا اور پھر یہ منظر اور آوازیں میرے شعور کے نہاں خانوں کو کریدنے لگیں اور اب میرا چلتا پھرتا وجود آہستہ آہستہ تال کے کنارے پتھروں اور رخنوں میں پھنسے ہوئے وجود کی جانب مراجعت کر رہا ہے، شاید اس کے حنوط شدہ لاش جیسے جسم میں زندگی کی حرارت اور کلبلاہٹ دوبارہ پیدا کرنے کے لئے، اس حنوط شدہ لاش کی کوکھ سے میرے دوسرے وجود نے جنم لیا ہے، بڑا ہی تیز زندگی سے بھرپور، شوخ و شریر نوعمر کھلنڈرا وجود اور میرا یہ وجود رجعت قہقہری کرتا نگیا کے کنارے روک نما راستہ پر پہنچ گیا ہے، میرے ساتھ میرے دوسرے ہم عمر ساتھی، شغنوا، جیارا، ستارا اور کلوا ہیں اور دن ڈھلے تک میں ان کے ساتھ مختلف کھیل کھیلتا رہا، اور پھر چراغوں جلے ہم لوگ ایک دوسرے سے جدا ہو کر اپنے اپنے گھروں کو ہو لئے، آج بلا کی سردی تھی اس لئے بستی میں سر شام سے ہی سناٹا ہو گیا تھا، ایسی راتوں کو عموماً بستی میں بڑی جلدی سوتا پڑ جاتا ہے، اندھیرا پھیلتے ہی لوگ گھروں اور چوپالوں میں سرک جاتے ہیں، اور پھر چوپالوں کے اندر حقوں کی گڑگڑاہٹ اور چلموں کے دھوئیں کے ساتھ ساتھ بات چلتی ہے الاؤ کی آگ رات گئے تک دہکتی ہے اور الاؤ کی آگ تاپ تاپ کر پالے کو دور کرنے اور جسموں کو گرم رکھنے کا عمل لوٹے جاڑے جاری رہتا ہے اور چونکہ الاؤ کے گرد سونے کا سوال نہیں ہوتا اس لئے سینہ بہ سینہ پہنچی ہوئی قصہ کہانیاں عموماً کسی سن رسیدہ داستان گو کے مخصوص انداز میں رات بھر ذہنوں کو جگائے رہتی ہے، اور آج ریشمی گدوں اور لحافوں کے درمیان لیٹا ہوا میرا نیند سے عاری وجود شغنوا کے آج شام کہے ہوئے ایک جملہ میں پھنسا ہوا ہے، مسلسل ایک جملہ کی تکرار میرے لحاف میں لپٹے کانوں میں گونج رہی ہے اور پھر کانوں کے پردوں سے گزرتی ذہن اور دماغ میں رستخیز بپا کئے ہوئے ہے اور اس جملہ کے معنی اور مفہوم کی تلاش میں میرا ذہن مسلسل سوچ میں گم ہے، ..... ایک پہر رات اور بیت گئی مگر شغنوا کے ہونٹوں سے نکلا ہوا جملہ سوالیہ نشان کی صورت میرے دماغ کے پردہ پر چمک رہا ہے اور

پھر یہ سوالیہ نشان میرے ذہن کے پردے سے نکل کر نیم روشن دالان میں چکر لگا رہا ہے اور ساتھ ہی اس لفظ کی تکرار جیسے پوری حویلی میں گونج رہی ہے اور میں ان آوازوں اور مسلسل گردش کرتے ہوئے سوالیہ نشان سے گھبرا کر نرم گرم اور گداز لحاف اور گدّوں کے درمیان سے نکل کھڑا ہوا۔ چند لمحہ دالان میں کھڑا سوچ میں گم رہا اور پھر چپکے سے باہری دالان میں چلا آیا اور پھر دالان سے ملحق صحنچی سے گزرتا لمبے لق و دق صحن میں آگیا، باہر جاڑے کی چاندنی پسارے ہوئی تھی، سائیں سائیں کرتی جسموں کو چیرتی تیر کی طرح چلتی سرد ہوا کی آواز کے سوا کوئی دوسری آواز نہیں سنائی پڑ رہی تھی اور یہ آواز بھی اسی سناٹے کا ایک جز معلوم ہو رہی تھی ہے' میرا وجود صحن سے گزر کر باہر چبوترے پر پہنچ گیا اور پھر چبوترے سے اتر کر سڑک پر' میں نے ایک نظر بستی پر پھیلے سرد اور ٹھٹھرے سناٹے کو دیکھا اور لمحہ بھر کے لئے مجھے اپنے وجود میں برف کی سلاخیں اترتی محسوس ہوئیں مگر میں پھر بھی چلتا رہا، سڑک سے ملحق گلی میں داخل ہوا اور گلی کو پار کر کے میں بستی کے اندر بیچوں بیچ لمبے چوڑے گلیارے میں پہنچ گیا......

طویل و عریض گلی جو بستی کے اندر حدِ فاصل کا کام کرتی ہے، گلیارے کے اس طرف اونچائی پر پکے مضبوط بنیادوں والے مکان ہیں، نہ معلوم کب سے بڑی آن بان اور شان کے ساتھ آسمان کی بلندیوں سے باتیں کرتے ہوئے اور دوسری جانب ذرا نشیب میں پہلے تو چند کچے مکان ہیں اور پھر اس کے بعد اور اس سے لگے ہوئے چھپروں اور کچے کوٹھوں پر مشتمل جھونپڑے تمام مکانوں کا طویل سلسلہ بستی کے دوسرے سرے تک چلا گیا ہے' بستی والے ان مکانوں کو "منڈھیا" کہتے ہیں اور ان منڈھیوں کے درمیان سے گزرتی ہوئی چھوٹی چھوٹی گلیاں بستی کے دوسرے کنارے تک پونڑی ہوتی ہیں' اور ان چھوٹی چھوٹی گلیوں سے گزرتے ہوئے مجھے بستی پر پھیلے مہیب اور پرہول سناٹے سے ایک گونا خوف کا احساس ہوا، ہوا کی سائیں سائیں، کُہر کی دبیز چادر، اُجاڑ ویران چاندنی، جیسے بھوت اور مسان، چاندنی میں حل ہو کر چکر لگاتے پھر رہے ہوں، سردی اور پالے سے ٹھٹھرے ہوئے کتے بھی گلیوں میں خاموش دبکے پڑے تھے، دور کہیں ایک آدھ الاؤ کی روشنی ابھی تک نظر آ رہی تھی....

میں ان کچے مکانوں جھونپڑوں اور منڈھیوں کے مکینوں سے خوب واقف ہوں، یہ جبارا کا گھر ہے یہ ستارا کا، یہ بادالله کا، یہ حمیدا کا، یہ کاشتکار ہیں' زمین کا سینہ چیر کر محنت اور مشقت سے اپنی روزی کمانے والے، تاروں کی چھاؤں میں ہل لے کر جانے اور شام کو جھٹپٹا ہونے پر ہل لوٹانے والے زمین کے مزاج اور موسم کی نبض کے آشنا اور شناسا، اور اب میں چلتے چلتے "شفوا" کی منڈھیا کے پاس پہنچ گیا ہوں' شفوا جس کا آج کا ایک جملہ بلکہ ایک لفظ میرے ذہن کے تاروں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر میرے پورے وجود کو جیسے

برقی شاک لگا رہا ہے ..... چھوٹی سی منڈھیا کی نیچی منڈیر پر اب چاندنی اتر آئی ہے، میں چند لمحہ باہر ٹھٹھک کر کھڑا رہا، پھر منڈھیا کے اندر پہنچ گیا، بمشکل ڈیڑھ دو گز لمبی اور اتنی ہی چوڑی انگنائی کے سامنے ایک کچا کوٹھرا تھا، جس کے دروازہ پر ارہر کی سوکھی لکڑیوں کا ٹٹر لگا ہوا تھا اور چھت پر چھدرے پھوس کا چھپر تھا، جگہ جگہ سے نکلا ہوا ارہر کی لکڑیوں کے ٹٹر کے سامنے بیری کا ایک درخت تھا، جس کی شاخوں اور پتوں سے چھن کر آنے والی کوڑیالی چاندنی چھوٹی سی منڈھیا میں پھیلی ہوئی تھی، ارہر کی لکڑیوں کے بنے ٹٹر کو پار کر کے میں جھونپڑے نما کوٹھرے میں داخل ہوا۔ ..... مجھے اپنے قدموں تلے کسی بڑی نرم نرم اور گداز سی چیز کا احساس ہوا اور اس سے پہلے کہ میں نیچے دیکھوں مجھے پیال کے تنکوں کا احساس ہو گیا، پیال کا نرم و گداز گرم گرم بستر، میں نے ایک نظر کوٹھرے پر ڈالی، باہر پھیلی ہوئی چاندنی کی روشنی کے سبب میں بخوبی دیکھ سکتا تھا، پیال پر کوٹھرے کے ایک طرف صفدرا اور اس کی بیوی دبکے سمٹے لیٹے نظر آئے، صفدرا کی بیوی اور شفوا کی ماں کی چھاتی سے شفوا کی خورد سال بہن چمٹی ہوئی تھی، صفدرا اور اس کی بیوی ایک ایک بوسیدہ اور جگہ جگہ سے پھٹی چادر میں سمٹے ٹھٹھرائے اور سکڑے پڑے تھے اور اس سے لگے لگے شفوا کے دو چھوٹے بھائی دوہرے کے ایک پرانے ٹکڑے میں لپٹے ہوئے تھے اور ذرا ہٹ کر شفوا ایک موٹے دوہرے کے نسبتاً ذرا بڑے ٹکڑے میں بے سدھ نیند میں غلطاں پڑا تھا۔ دوہرے کا ٹکڑا جس میں بیسیوں چھید تھے، بڑے سوراخوں کو جگہ جگہ پیوند لگا کر بند کیا گیا تھا، شفوا کو گھٹنوں سے تھوڑا نیچے تک ڈھانپے ہوا تھا، اس کی آدھی سے زیادہ ننگی پنڈلیاں اور پاؤں شاید سن ہو کر سردی کے احساس سے عاری ہو چکی تھیں، میں نے ایک نظر نیم برہنہ ٹانگوں اور پیروں پر ڈالی، کالی کالی مٹیالی سی پنڈلیاں، جن کی کھال سردی کی وجہ سے جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھی اور دھول میں اٹے پیروں کی انگلیوں اور انگوٹھوں کی بوائیاں پھٹ کر مستقل زخم کی صورت اختیار کر چکی تھیں، میں چند منٹ بے سدھ کھڑا ہوا اس منڈھیا کے مکینوں کو دیکھتا رہا، پتھرائی ہوئی آنکھوں سے..... مگر اب میرے ساغر تال کے کنارے پتھروں رخنوں میں پھنسے بے حس اور بینائی سے محروم وجود کی بصارت یکایک لوٹ آئی ہے۔ وہ بصارت جو صدیوں پیچھے تک دیکھ سکتی ہے اور اس وقت میری آنکھیں صفدرا کو دیکھ رہی ہیں، زمیندار کے لق و دق فارم پر کھیت مزدوری بیگار کرتے ہوئے، پو پھٹنے سے پہلے سے لے کر تقریباً دن مندنے تک کبھی ایک کھیت میں کبھی دوسرے میں، کبھی نرائی، گڑائی اور بوائی کرتا اور کبھی پٹیلا لگاتا، اور ایک لمحہ بیت گیا، بوئی ہوئی فصل کو پانی کی ضرورت ہے اور

صفدرا دوسرے کھیت مزدوروں کے ساتھ مل کر بنیٹری چلا رہا ہے، " ندے " میں سے پانی بنیٹری کے ذریعہ بڑی تیزی اور سرعت کے ساتھ کھیت میں ڈالا جا رہا ہے اور یہ سب کچھ جیسے مشینی انداز میں ہو رہا ہے، صفدرا اور دوسرے مزدور دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے کام میں جٹے ہوئے ہیں، ان کے بازو اور ہاتھ میکانکی انداز میں حرکت کر رہے ہیں، مسلسل اور پیہم حرکت کے ذریعہ بنیٹریوں سے پانی ندے کے تالاب سے کھیت میں پہنچ رہا ہے...... اور ایک پل اور بیتا، کھیتوں میں فصلیں کھڑی ہیں...... گندم کی بالیوں میں دودھ دہی اتر آیا ہے، چنے کے ہرے ہرے کھٹ مندرے ساگ کے پودوں میں چھوٹے چھوٹے دانوں والے ہولے لگ گئے ہیں، میں نے دیکھا صفدرا نے دو چار مٹھی ساگ سوت کر اپنے منھ میں بھر لیا ہے، شاید بھوکی آنتوں کی قرقراہٹ تھوڑی دیر کو روکنے کیلئے...... اور ایک لمحہ اور گذرا...... دودھ دہی بھری بالیاں سنہری پھنگیوں میں بدل گئیں، ہرے ہرے ہولے پیلے پڑ گئے، بڑے بڑے چنے کے دانوں سے بھرے ہوئے...... فصل پک کر تیار ہو گئی، دوسرے لمحہ فصل کی کٹائی ہو رہی تھی اور میں نے دیکھا صفدرا لاکھ کی بڑی بڑی پلیاں باندھ کر بیل گاڑیوں میں لاد رہا ہے اور ایک لمحہ اور گذر گیا، فصل کھیتوں سے کھلیانوں میں آرہی ہے، لاکھ کے پلیاں اور گٹھے کے ڈھیر لگ گئے، بڑی بڑی پہاڑ جیسے گری کے تودے کھڑے ہوئے ہیں، صفدرا کھلیانوں میں دائیں چلا رہا ہے، ایک رفتار چلتے ہوئے بیل اپنے کھروں اور سموں سے بھوسے اور دانوں کو الگ کر رہے ہیں، اور اب صفدرا بڑے بڑے پلڑوں میں بھوسا اور دانے ملا ہوا اناج بھرے ہوا کے رخ پر کھڑے ہو کر سیلائی کا کام کر رہا ہے، موتی جیسے دانے پلڑے سے نیچے گر رہے ہیں اور تیز ہوا بھوسے کو اڑا کر الگ کر رہی ہے اور شام کو اسی سیلائی کئے ہوئے اناج میں سے دو اونجلی بجڑی اس کی دن بھر کی محنت اور مشقت کا معاوضہ تھی، میری آنکھوں نے ایک ٹک صفدرا کے ہاتھوں میں بھری بجڑی کو دیکھا پھر مزدور کے پیٹ پر نگاہ گئی، اور میری صدیوں پیچھے تک دیکھنے والی نظریں صفدرا کی ہنڈیا میں کئی خالی پیٹوں کو دیکھ آئیں اور میں نے اندازہ کیا کہ یہ دو اونجلی بجڑی تو اس اناج سے بھی بہت کم ہے جو بیل " دائیں " چلاتے ہوئے کھا جاتے ہیں ان کا تو دن بھر منھ نہیں رکتا، اور زمیندار اور کاشتکار کے حکم پر بیلوں کا منھ کھلا رکھا جاتا ہے، تو بنڑا نہیں چڑھایا جاتا اس لئے گیہوں چنا یا جو بھی اناج ہو ان کے پیٹ میں دن بھر اترتا رہتا ہے...... اور یہ دو اونجلی بجڑی شاید صفدرا اور اس کے خاندان کی ایک وقت کی شکم پری کرنے کے لئے کافی نہیں...... اور ایک لمحہ اور بیتا کھلیانوں سے اناج اٹھ کر گھروں میں پہنچ گیا، گھر گھر چین کی بنسی بجنے لگی، کھٹیاں اور کھتیاں اناج سے بھر گئیں اور وہ توتے بھی جو مدتوں سے گیہوں کے آٹے کا مزہ بھولے ہوئے تھے ایک بار پھر زیادہ خورد...

گندم کے مزوں سے تھوڑے دنوں کے لئے آشنا ہو گئے ..... صفدرا کے گھر کی حالت بھی قدرے بہتر ہو گئی، دو وقت پیٹ بھر کر نہ سہی ایک وقت ادنی پونی روٹی گھر کے ہر فرد کے حصہ میں آ ہی جاتی ....

اور اب ایک لمحہ نہیں جیسے ایک رت بدلی، اندر مہاراج نے کالی کالی گھٹائیں اٹھائیں اور دھرتی کا سینہ جل تھل بھر گیا، میرے سامنے پھیلے ہوئے ساغر تال میں میلوں دور سے آ آ کر پانی مل گیا، تال کے پاٹ پھیلتے ہی چلے گئے اور پھر پانی کناروں اور پاٹوں کے مدد توڑتا اس سڑک سارا رستہ کو عبور کرتا جس پر شام کو لڑکے کھیلتے ہیں کچی سڑک کو کاٹتا دوسری جانب کھیتوں میں اتر گیا، مگر دوسری طرف سید احمد صاحب کی زیارت کی سیڑھیوں سے اوپر نہیں پہنچ پاتا اور اس طرف "ٹلیا" کی قبروں کے تعویذ پانی سے بدستور جھانک رہے ہیں، بارش کا تار لمحہ بھر کے لئے نہیں ٹوٹتا، پندرہ پندرہ دن کا جھڑ لگا ہوا ہے، کسان، کاشتکار، کھیت، مزدور سب کھیت کھلیانوں سے سمٹ کر چوپالوں میں آ گئے، دن بھر آلہا اودل گائی جاتی ہے، سنانے والا آلہا اودل کی منظوم کہانی مخصوص انداز اور لے میں گا گا کر سناتا ہے، اور بھری چوپال حقوں اور چلموں کے دور کے ساتھ بڑے انہماک و اشتیاق کے ساتھ آلہا اودل کی بہادری کے کارنامے سنتی ہے، جتنے دن بارش کا زور چلتا ہے اور جھڑ لگا رہتا ہے کھیتوں میں کام بند رہتا ہے، کھیت مزدوروں کو یہ دن بہت بھاری پڑتے ہیں، مزدوری کہیں لگتی نہیں، اور نہ معلوم سال میں ایسے کتنے دن آتے ہیں کہ دن دن بھر چولہا ٹھنڈا پڑا رہتا ہے، ..... اور ابھی ابھی میں نے صفدرا کو دیکھا وہ چوپال سے اٹھ کر ہلکی ہلکی پھوار میں بھیگتا ہوا بجائے گھر جانے کے جنگل کی طرف جا رہا ہے، دوسرے تمام لوگ چوپال سے اٹھ کر آلہا اودل کی محفل عارضی طور پر ختم کر کے روٹی کھانے گھروں کو چلے گئے مگر صفدرا نے بجائے گھر کے جنگل کی راہ لی ہے، ..... اور تھوڑی دیر بعد میری آنکھوں نے اس کو جنگلی جامن کے درخت پر چڑھتے دیکھا، وہ لنگور کی طرح جستیں لگاتا بڑی پھرتی سے اودی اودی جامنوں سے لدے پیڑ کی اوپری شاخوں تک پہنچ گیا اور پھر ایک ہاتھ سے موٹی شاخ کو پکڑے دوسرے ہاتھ سے جامن توڑ توڑ کر کھانے لگا، اور جب روٹی کی بجائے خالی پیٹ جامنوں سے بھر گیا تو وہ اور جامنیں انگوچھے میں باندھے پیڑ سے نیچے اتر آیا اور ابھی اور اپنے بال بچوں کی پیٹ کی دوزخ میں بھوک کی بھڑ بھڑاتی ہوئی آگ کو بارش میں بھیگی ٹھنڈی جامنوں سے سرد کرنے کے بعد وہ آلہا اودل کی جمی ہوئی محفل میں دوبارہ پہنچ گیا،

اور میرے ساغر تال کے کنارے پتھروں اور رخنوں میں پھنسے وجود کی نظریں بدلتی رتوں اور موسموں میں صفدرا کا تعاقب کرتے کرتے اب پلٹ کر واپس آ گئیں، ..... مگر میرا چھوٹا وجود بدستور شغوا کی منڈھیا

میں کھڑا ہے، سرد اور سُن جسم۔۔۔۔ مگر ذہن بالکل ذکی الحس اور پوری طرح بیدار، جس میں ششفوا کا آج شام کا کہا ہوا جملہ مسلسل ہلچل مچائے ہوئے ہے اور جس کے معنی اور مفہوم کی تلاش نیند سے محروم رکھے سنسان گلیوں کے چکر کھلاتی مجھے صفدر راک منڈھیا تک لے آئی، مگر میرے ذہن میں سوالوں کے سانپ ابھی تک سرسرا رہے ہیں۔۔۔۔۔۔ اسی عالم میں صبح کاذب کے آثار نمودار ہونے لگا۔۔۔۔۔ پوری رات اُچھلوں ڈولوں سویا، نیند کا غلبہ زیادہ ہوتا تو کبھی ایک جھپکی کے بعد ہی اور کبھی تھوڑی دیر کی غنودگی کے بعد آنکھ کھُل جاتی پھر جیسے کسی سوال کے جواب کی تلاش میں سوچ میں گم دماغ بوجھل ہو جاتا، بوجھل دماغ پر پھر نیند کا تسلط ہوتا مگر کچھ دیر بعد پھر آنکھ کھُل جاتی۔۔۔۔؛

اور صبح کاذب کے ڈانڈے صبح صادق سے جا ملے اور پھر تھوڑی ہی دیر میں پو پھٹی اور اُجالا پھیل گیا، ذہن پہ کل رات کے واقعات کا بڑا واضح اور روشن عکس ثبت تھا، اور اس عکس کے ساتھ ششفوا کے ناقابلِ فہم جملہ کی بازگشت بھی ذہن میں مسلسل گونج رہی تھی، تھوڑی دیر بعد پورے گھر میں چہل پہل شروع ہو گئی، مٹھا بلونے اور رئی چلانے کی مترنم مخصوص آواز جو روزانہ ہر صبح کا معمول ہے وقت مقررہ پر پھر جلترنگ سا زبجانے لگی، اور تھوڑی دیر بعد نینی (تازہ مکھن) کا چھوٹا سا ڈھیر لگ گیا، میرا چھوٹا سا وجود حسبِ معمول روٹی کی ڈلیا تک گیا اور ایک باسی روٹی نکال کر نینی کا ایک لوندا رکھ کر کھانے لگا، صبح کے ناشتہ کا آغاز میں ہمیشہ تازہ مکھن اور باسی روٹی سے کرتا۔ روٹی اور مکھن ابھی ختم نہیں کر پایا تھا کہ باورچی خانہ سے آتی ہوئی خوشبوئیں میری بھوک کو اور چمکانے لگیں، اور پھر نیم برشٹ انڈے، آملیٹ، پراٹھے روغنی ٹکیاں، گاجر کا حلوہ اُبلے انڈے، حریرے سے بھرے ہوتے بڑے بڑے کٹورے ناشتہ کے تمام لوازمات میز پر پہنچ گئے، میں ناشتہ کی میز پر پہنچا، اور مجھے محسوس ہوا جیسے میرے پورے وجود کو کوئی چیز بے چین کئے ہوئے ہے اور ناشتہ کی اشتہا انگیز خوشبوؤں نے بھوک کو خوب چمکا دیا تھا مگر کھانے سے پھر بھی ایک گریز والی کیفیت پیدا ہو گئی تھی، شاید یہ اس بے چینی کا ردّ عمل تھا جس میں رات بھر اور اس وقت تک مبتلا رہا تھا، اور کھانے کی چیزیں دیکھ سوال کا نیش کچھ اور زیادہ تیز ہو گیا تھا۔

اور اسی بے چینی کے عالم میں میرے وجود میں قیامت سی بپا کئے ہوئے سوال میری زبان تک آ گیا، اور میں نے اپنے والد سے سوال کیا۔

"ابا جان۔۔۔۔"

اور میں نے سوال کرنے کے لئے مناسب الفاظ کی تلاش میں ذرا توقف کیا۔ تو انھوں نے مجھ سے استفسار کیا......

"جی بیٹے کہئے ..... کیا بات ہے"......

"ابّا جان..... وہ اللہ..... آں..... وہ "فاقہ" کیا چیز ہوتی ہے"......

اور میں نے دیکھا کہ والد صاحب کے ہاتھ سے نوالہ چھوٹ کر پلیٹ میں گر گیا، اور چہرہ کا رنگ ایسا پیلا ہو گیا جیسے کسی نے زردی کھنڈ دی ہو، دسترخوان پر تمام لوگ بھی ایسے سُن تھے جیسے سانپ سونگھ گیا ہو، چلتے ہوئے ہاتھ اور منھ ایسے رکے تھے جیسے کوئی بُری خبر اچانک سُنی ہو، اور سب لوگ حیرت زدگی کے عالم میں مجھے گھور رہے تھے، اور چند منٹ تک موت کا سا سناٹا طاری رہا اور پھر اس سکوت کو والد صاحب کی آواز نے توڑا، وہ مجھ سے مخاطب ہوئے

"بیٹے...... آپ نے یہ لفظ کس سے سُنا..... کہاں سُنا..... ایں"......

اور میں چند ثانیہ لوگوں کو اس قدر خاموش اور حیرت زدہ دیکھ کر خود بھی گھبرا گیا، اور جب والد صاحب نے پھر اپنا سوال دُہرایا، تو میں نے بہت اٹک کر جواب دیا،

"ابّا جان..... وہ شفوا ہے نا..... جی..... اوں..... وہ صفدر کا بیٹا..... جب کل شام ہم کھیل رہے تھے..... تو وہ..... سب نے بتایا کہ آج دوپہر کیا کیا کھایا تھا..... تو جب شفوا کی باری آئی..... تو اس نے کہا..... آج فاقہ بھیا (ہوا)..... ابّا جان..... میں رات سے سوچ رہا ہوں، یہ فاقہ کیا چیز ہوتی ہے"......

مگر میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے ابّا جان سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ اور زیر لب آہستہ آہستہ خود کلامی کے انداز میں کچھ کہنے لگے، مگر میں نے ان کی زبان سے ادا کیا ہوا ایک ایک لفظ صاف اور واضح سُن لیا۔

"اس کا باپ صفدر..... جب میرے ساتھ کھیلتا تھا تو وہ بھی یہی کہا کرتا تھا".....مگر یہ میرے سوال کا جواب نہ تھا، مجھے میرے سوال کا تجسّس ابھی تک پریشان کر رہا تھا، میرے چھوٹے سے وجود کی بے چینی بڑھتی ہی چلی گئی، پھر میرے وجود کو یوں محسوس ہوا کہ جیسے تال کے کنارے صدیوں سے پتھروں اور رخنوں میں پھنسے میرے وجود کی کشش مجھے کھینچ رہی ہے،..... میں ناشتہ کی بھری پری میز چھوڑ کر جیسے ہوا کے دوش پر سوار تال کے کنارے چند لمحوں میں پہنچ گیا اور اپنے بے حس اور جامد ساکت وجود کی

کوکھ میں ضم ہو گیا.....

اور مجھے بے حس زندگی کی حرارت سے عاری وجود سے اپنے سوال کا جواب مل گیا، اس سوال کا جواب جو زندگی سے بھرپور شعور اور آگاہی کے مالک ذہن اور فہیم انسان مجھے نہ دے پائے اور مجھے میرے ہی وجود نے اس نقطہ اور اس چیز کے معنی اور مفہوم اچھی طرح سمجھا دیئے جو شفو اکو صفدر سے توریث میں پہنچی تھی اور نہ جانے کب سے ان ہی کی میراث چلی آرہی تھی...... میرا جامد و ساکت وجود صدیوں سے ساغر تال کے کنارے کھڑا ہے تیز دھوپ اور لو کے آتشیں تھپیڑوں میں سرخ اور سن کر دینے والے پالے اور جاڑے میں ساون بھادوں کی جھڑی لگی رہتا ہیں ساغر تال کا پانی نہ معلوم کتنی مرتبہ خشک ہوا، ندھوں کی تلی تک میں پانی کی بوند نہ رہی، دھوپ دتیز چمکتے سورج کی تمازت نے تال کے سوتے تک خشک کر ڈالے تال چیکا مٹی کا غار سا ہو کر رہ گیا مگر پھر تال کے دونوں پاٹ پانی سے لبالب بھرے اس کنارے سے اس کنارے تک لہروں کا جال پڑ گیا۔ ایک لامتناہی نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہمیشہ رواں دواں۔ ازل سے لے کر ابد تک بہنے والا تیز بہاؤ ... سید احمد صاحب کی اصلی اجلی نیز کی دھلی زیارت آج بھی بلند و بالا ایستادہ ہے۔ اور میرے داہنے ہاتھ پر ٹیلا پر دونوں قبروں کے تعویذ اٹھے ہوئے ہوئے تال کے دو ہاتھی ڈباؤ پانی میں آج بھی نہیں ڈوبتے اور میرے بائیں ہاتھ پر صدیوں سے بسی ہوئی بستی آج بھی ویسی ہی جمی ہے۔ گھر گھر آنگن آنگن گلی گلی زندگی نئے نئے روپ میں رواں دواں۔

میرے وجود کی آنکھوں نے دیکھا بستی کے کنارے وہی قلعہ نما عمارتیں ہیں جن کے کنگورے آسمانوں میں اٹھے ہوئے ہیں اور جن کی بنیادیں نیچے بہت نیچے پاتال میں پیوست ہیں سڑک کے پار سرس کا بوڑھا درخت آج بھی ہوا میں جلتی ہیں ان عمارتوں سے سرگوشیوں میں باتیں کرتا ہے، میری آنکھیں ان عمارتوں کے چکر لگاتی چھوٹی پتلی گلیوں کو پار کرتی عمارتوں کی پشت پر لمبے چوڑے گلیارے میں پہنچ گئیں، طویل و عریض گلی جو حد فاصل کا کام کرتی ہے اور اس گلی کے پار ویسے ہی چھوٹے چھوٹے سے مکان ہیں جن کو بستی والے آج بھی سے پکارتے ہیں اور ان کے مکیں، صفدرا، باد اللہ، حمیدا، شفوا تیسری چوتھی پیڑی میں، افراد میں لٹے پاؤں، سوکھی سوکھی زرد زرد مٹیالی پنڈلیوں میں جڑے مدقوق جسم اور پیٹھ سے چپکے پیٹ نظریں گھبرا کر پلٹ آئیں، اور ہری ہری دوب کے قطعہ کو پار کرتی جہاں پہلے بہت پہلے میرے قدموں نے لمبی ٹانگوں کا ساتھ دیا تھا، ساغر تال کے کنارے کھڑے میرے وجود سے پھر آملیں، میں نے محسوس کیا وقت کا پہیہ بدل ہو گیا ہے، کھیت کھلیانوں میں مشینیں دھڑ دھڑاتی ہیں آدمی اور مشین ایک دوسرے میں ضم ہو گئے ہیں، آدمی جیسے

حرکت کرتی مشین کا ایک پرزہ۔ میں ٹکٹکی باندھے ساغر تال کے بہتے ہوئے پانی کو دیکھتا رہا۔۔۔۔ اور جیسے ایک لمحہ اور بیتا مجھے اپنی سماعت اور بصارت پر یقین نہ آیا۔۔۔۔۔ شور و غوغا، آہ و بکا، نالہ و شیون۔۔۔۔۔ چیخیں ہی چیخیں، درندوں کے غول بستی کی جانب بڑھتے ہوئے، انسانی خون گھر گھر آنگن آنگن، گلی گلی، سڑک سڑک ساغر تال کے پانی سے بھی زیادہ ارزانی کے ساتھ بہتا ہوا۔۔۔ میری آنکھوں نے دیکھا کہ تال کا پانی اس پاٹ سے اس پاٹ تک اور ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک سرخ ہو گیا ہے اور میرے وجود کو یوں محسوس ہوا جیسے تال کا سرخ ہوتا پانی شاید اس بار سید احمد صاحبؒ کی زیارت کی سیڑھیوں سے اوپر پہنچ جائے گا۔ اور شاید ٹیلیا پیر کی ان دونوں قبروں کو بھی ہڑپ کر جائے گا جن کے تعویذ دو ہاتھی ڈباؤ پانی میں بھی کبھی نہیں ڈوبے۔ پھر میرے مشام کو فضا میں گھٹن اور تعفن کا احساس ہوا، گدھ چیلیں اور کوؤں کے غول، زمین پر اترتے ہوئے۔۔۔ جیسے ہر چہار طرف موت کی بو بسی ہوئی ہو۔۔۔ میں نے بستی کی طرف دیکھا، بستی پر موت کا مہیب اور پر ہول سناٹا طاری تھا، جیسے صدیوں سے جامد و ساکت وجود کے اندر کوئی چیز پھٹی، بڑی ہی تیز اور تند۔۔۔ پھر ویران جلتی تعفن شدہ بستی سے لٹے پٹے لوگوں کا ایک قافلہ برآمد ہوا، صفدرا، جبارا، ستارا، بادا اللہ اور نہ معلوم کس کس کی کون سی نسل نہ معلوم منزل اور جستجو کی تلاش میں، اور میرا پتھروں اور رخنوں میں پھنسا وجود صدیوں کی گرفت سے آزاد ہو کر ان پریشان حال لوگوں کے ساتھ ساتھ چل دیا، قافلہ آگے بڑھتا رہا۔۔۔۔ بستی کو پیچھے چھوڑے ساغر تال کو پیچھے چھوڑے اور اپنے اجداد کی قبروں پر زیارت پر پیچھے مڑ کر آخری نظر ڈالی اور پھر دور ہوتی زیارت دھندلا کر نظروں سے اوجھل ہو گئی اور پھر ایک منزل اور مارنے کے بعد سید احمد صاحبؒ کے صاحبزادہ حضرت نظام الدین اولیاؒ کی درگاہ کو ہم پیچھے چھوڑ چکے تھے اور پھر حضرت خواجہ معین الدین چشتی، حضرت صابر کلیر کی زیارت بھی دور بہت دور رہ گئیں اور تھوڑی دیر بعد میں نے نظر اٹھا کر دیکھا کہ میرا وجود حضرت داتا گنج بخش کی درگاہ کے سامنے ہے، اور میرے ساتھ چلتا ہوا پریشان حال لٹے پٹے لوگوں کا قافلہ اب تتر بتر ہو چکا ہے، کسی نے حضرت شہباز قلندرؒ کی طرف رخ کیا ہے، کسی نے بابا فرید گنج بخشؒ کی جانب اور بہت سوں نے داتا دربارؒ کی سرزمین ہی میں اپنا ڈیرا جما دیا ہے۔۔۔۔۔ میری نظریں میلوں کی مسافت طے کرنے والے قافلے کے ہر فرد کا تعاقب کرتی رہیں، بادا اللہ، صفدرا، حمیدا، جبارا، ستارا کی نسل نئی نئی بستیوں کی تلاش میں نئی زمین سے اپنا رشتہ جوڑنے۔۔۔۔۔ اور تعاقب کرتی ہوئی میری نگاہیں دو ٹانگوں پر مرکوز ہو گئیں۔۔۔ للو کی تیزی سے چلتی ہوئی ٹانگیں، وہی پتلی پتلی زرد رو مٹیالی پنڈلیاں جس میں نسوں کی گانٹھیں جگہ جگہ سے ابھری ہوئی تھیں اور اوپر جو نظر گئی تو للو کے قدرے

دھندلے دھندلے خد و خال سامنے آگئے جن کی انفرادیت نسل در نسل منتقل ہونے کے باعث اور شاید بدلتے وقت کے سایوں کے سبب پھیکی پڑتی جا رہی تھی۔ للو کا پوتا بھی اپنے خورد سال بیٹے کی انگلی تھامے قافلہ والوں کی طرح نئی منزل کی تلاش میں نکلا تھا، میں نے باپ کی انگلی تھامے ساتھ چلتے ہوئے بیٹے پر نظر ڈالی تو مجھے اسکے چہرے پر باپ دادا کے نقوش کا پرچھاوا محسوس ہوا صرف ہلکا سا پرتو جلد مٹ جانے والی پرچھائیں، وقت کا چلتا ہوا سایہ شاید پرپوتے تک پہنچتے پہنچتے کچھ زیادہ گہرا ہو گیا تھا اور میں بھی جیسے سایہ سا بن کر دونوں کے ساتھ چلتا رہا اور ایک بستی کے باہر دریا کے کنارے برگد کے بوڑھے تناور درخت کے نیچے بیٹھ گیا اور للو کا پوتا عنایت اور پرپوتا شرافت بستی میں داخل ہو گئے۔

جھٹپٹا ہو چکا تھا اور شام کا سرمئی ملگجا اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا، دریا کا پانی بڑی سلامت روی سے بہہ رہا تھا، میں گام میں برگد کے نیچے چبوترہ پر تھکا ماندہ نڈھال وقت کی مانند بیٹھا تھا میلوں کی مسافت اور صدیوں کا فاصلہ طے کرنے کے بعد گم صم جامد و ساکت، نہ معلوم کن سوچوں میں گم، بوڑھے برگد کی جٹائیں میرے شانوں کو چھو رہی تھیں اور میرے وجود کی متحرک نظریں بستی کے اندر پہنچ گئیں، چھوٹی چھوٹی تنگ تنگ ویسی ہی گلیاں، چند بڑی بڑی عمارتیں اور پھر جھونپڑوں کا سلسلہ، ساغر تال کے کنارے بسی ہوئی بستی سے مماثل مگر محل وقوع کے لحاظ سے مختلف اور آبادی اور رقبہ کے اعتبار سے چھوٹی گلیوں اور جھونپڑوں کے چکر لگاتی واپس پلٹ کر اپنے جامد و ساکت وجود سے دوبارہ آملیں! اس وجود سے جو بے جان اور جامد ہونے کے باوجود انمٹ یادوں کے نقوش اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے اور جس کے اتھاہ سینہ کے سمندر میں سلسلے کی داستانیں آسودہ ہیں......

برگد کے پیڑ کے نیچے پسرے میرے وجود نے وقت کی نبضوں کو ذرا ٹٹولا تو محسوس ہوا کہ تیزی سے بھاگتے ہوئے وقت کی رفتار اور تیز ہو گئی ہے، جیسے سال مہینوں میں اور مہینے دنوں میں اور دن اور لمحوں میں بدل گئے ہیں، اور ایک لمحہ بیتا ہے برگد کے پیڑ کے نیچے ایک بار پھر سوکھے سوکھے پتوں کا ڈھیر لگ گیا ہے صرف لنڈ منڈ شاخیں ہی شاخیں نظر آتی ہیں یا سوکھی سوکھی لمبی جٹائیں جھولتی ہیں مگر ایک بار پھر ننھی منی کونپلیں پھوٹیں۔ بوڑھا درخت پھر ہرا بھرا ہو گیا اور نہ معلوم ایسی کتنی بہاریں آئیں اور بیت گئیں، دریا نہ معلوم کتنی بار باڑھ پر آیا، کل کی سی بات معلوم ہوتی ہے عنایت اپنے بیٹے کے ساتھ ساتھ داخل ہوا تھا اور پھر میری نظریں روزانہ عنایت کا تعاقب کرنے لگیں

میں اور کبھی دو سے کر میں اور پھر میری نظروں نے گھسیارے کے پوتے کو بل کی مٹھیا پکڑے خود اپنے کھیت میں کونٹر بناتے دیکھا...... پھر میری نظروں نے دیکھا کہ عنایت ایک دن شرافت کی انگلی تھامے قصبے کے اسکول کی طرف گیا، اور آج میری بوڑھی نگاہیں نوجوان شرافت کے تعاقب میں دور بہت دور نکل گئی ہیں...... نوجوان شرافت جوانی کے نشہ میں ایڈ ایڈ کر چلتا اور جھوم جھوم کر قدم رکھتا ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات کی پوری پوری تشکیل اور باپ کے خوابوں کی صحیح معنوں میں تعبیر بننے کے لیے اسکول سے نکل کر کالج کی دنیا میں پہلا قدم رکھنے کے لیے......

اور دیہاتی ناپختہ کا ذہن کچھ دن تو کالج کی نئی اور انجانی فضا کو سمجھ ہی نہ سکا، مگر میری آنکھوں نے پہلے تو اسے نامانوس فضا سے جلد ہی مانوس ہوتے دیکھا اور اجنبیت کا احساس تو چند ہی دن میں مٹ گیا تھا، پھر وہ اس فضا سے ایسا گھل مل گیا، جیسے نہ معلوم کب سے اس ماحول سے آشنا ہے...... اور تھوڑے دن بعد ہی کالج کے تعلیمی ماحول نے اپنا رنگ جمانا شروع کر دیا، اس کے ذہن کے دریچے کھلنے لگے، اور مطالعہ اور اکتساب علم تو ذہن اور دماغ کی غذا ہے۔ کالج کی سال بھر کی زندگی نے شرافت کی ذہنی اور دماغی صلاحیتوں کو اجاگر کرنا شروع کر دیا، وہ بھاری بھاری موضوعات پر مباحثوں میں حصہ لیتا اور ایسے ایسے ورنی دلائل دیتا کہ سننے والوں کو اس کی فہم و فراست پر رشک آتا، ہمہ وقت اس کے ساتھ رہنے والی میری جہاندیدہ بوڑھی آنکھوں نے شرافت کی ایک ایک خوابیدہ صلاحیت کو بیدار ہوتے دیکھا، بھاری مطالعہ، قابل اساتذہ کی صحبت اور کالج کا ماحول اس پر جلا کا کام کر رہا، وہ اب بھولا بھالا دیہات کی خاموش فضا سے نکلا نوعمر لڑکا نہ تھا، بلکہ متانت اور سنجیدگی اس کی بات بات، حرکات سکنات اور چہرہ اور بشرہ سے ٹپکتی۔ اور پھر جدید علوم اور فکری نظریات نے اس کے اندر نمایاں تبدیلی پیدا کرنا شروع کر دی جس کی جھلکیاں پہلے پہل تو اس کی خارجی ہیئت میں ظاہر ہونا شروع ہوئیں گیروے رنگ کے کھدر کے کپڑے عموماً وہ کھدر کی قمیص شلوار میں نظر آتا جس پر کبھی کبھی کھدر ہی کی صدری یا بنڈی ہوتی اور میری آنکھوں نے دیکھا کہ رفتہ رفتہ یہ لباس اس کی شخصیت کا جزو سا بن گیا۔ پھر میرے شعور کی آنکھوں کو محسوس ہوا کہ وقت گزرنے کے ساتھ یہ خارجی تبدیلی اس کے باطن میں بھی گھر کرتی جا رہی ہے، اس کا رجحان و میلان اور فکر و خیالات انقلابی ہوتے چلے گئے جس کا اظہار وہ اپنے کردار گفتار اور روزمرہ کے عادات و اطوار میں عملی طور پر بھی کرتا اور جیسے جیسے دن گزرتے گئے یہ خیالات و نظریات اس کے دل و دماغ کی عمیق ترین گہرائیوں میں نفوذ کر گئے۔

پھر میرے شعور کی آنکھوں کو یہ بھی احساس ہوا کہ شرافت نے ان کو ایمان سے بھی زیادہ عزیز بنا کے صرف اپنے سینہ ہی سے نہیں لگا رکھا تھا بلکہ اس کی پوری زندگی اس سے عبارت

اور ترویج میں حتی الوسع اور حسبِ استطاعت مدد کرتا، ذہانت کے ساتھ ساتھ وہ نطق کی وہی صلاحیتوں سے بھی مالا مال تھا اور جب انقلابی خیالات کو اس کا نطق ملتا تو جیسے ریشم کی طرح نرم سرسراتے الفاظ اور زبان میں تلوار کی دھار والی تیزی اور کاٹ پیدا ہو جاتی، اور انہیں صلاحیتوں کی بناء پر جلد ہی مخصوص حلقوں میں اس کو لیڈر والی حیثیت حاصل ہو گئی ۔ ۔ ۔ ۔ مزدوروں کا حامی، کسانوں کا بہی خواہ، مجسم ایثار و قربانی، شرافت کا پتلا، قول و فعل کی مکمل ہم آہنگی کا چلتا پھرتا نمونہ، وضع قطع لباس، نشست و برخاست اس کی ہر ہر بات سے اس کے نظریاتی اور فکری خیالات کی ترجمانی ہوتی۔

اور برگد کے نیچے پسرے بیرے وجود سے میری آنکھیں جب ایک مدت تک بچھڑے رہنے کے بعد دوبارہ آملیں تو مانوس قدموں کی چاپ پر میرے وجود نے چونک کر دیکھا، بڑی سلامت روی سے چلتا، شرافت بستی کا فرزند فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنی زندگی کے ایک باب کی تکمیل کرنے کے بعد اور شاید دوسرے کی شروعات کرنے کے لئے، بڑی تندہی، جانفشانی اور سرگرمی کے ساتھ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور رات کی خاموش بیکراں تاریکی میں میری نظر بستی کے چکر لگاتی شرافت کے نیم پختے کوٹھرے کے سامنے پہنچ کر ٹھٹک گئیں، لالٹین کی زرد روشنی کوٹھرے کے باہر آرہی تھی اور کوٹھرے کے اندر شرافت استغراق کی حد تک پہنچے ہوئے انہماک کے ساتھ مطالعہ میں گم تھا ۔ ۔ ۔ ۔ کئی ماہ تک میرے وجود نے شرافت کو خواب و خور حرام کئے اسی عالم میں رہتے دیکھا اور چند ماہ بعد ایک بار وہ پھر بستی سے رخصت ہوا، اس دوران وہ پوری بستی کی آنکھوں کا تارا بنا رہا، ہر ایک کے دکھ درد کا ساتھی سب کا بہی خواہ، اور اپنے انقلابی خیالات کا بیج وہ کسانوں کے بنجر ذہنوں میں بو گیا، بعض باتیں تو ان کی سمجھ بوجھ سے بہت اونچی تھیں مگر موٹی موٹی باتیں تو سب ہی کچھ لیتے ہیں، اور اتنا تو ہر ایک کے ذہن میں راسخ ہو گیا کہ سونا اگلتی یہ زمین جس پر ان کے آباء و اجداد اور وہ صدیوں سے صرف ہل چلانے کا حق رکھتے ہیں، در اصل خود ان کی اپنی ملکیت ہے، اور شرافت کے جانے کے بعد لوگوں کے ذہنوں میں اس کی باتوں کی بازگشت گونجتی رہی اور ہمیشہ سے سلامت روی کے ساتھ بہنے والے خون میں پہلے تو سنسناہٹ ہوئی اور پھر ابال آنے لگے۔

اور گاؤں کے نیم پختے کوٹھرے سے نکل کر شرافت شہر کے ایک چھوٹے سے فلیٹ میں کرایہ پر آباد ہوا، میرے وجود کی آنکھوں نے چند دن بعد اس فلیٹ کا جائزہ لیا تو محسوس ہوا کہ اس کی کل اثاث چند جوڑے کھدر کے کپڑے اور کتابوں کے گٹھر ہیں، جو دفتر کے بعد رات گئے تک شرافت کی تنہائی کی واحد ساتھی ہوتے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

بھی سب سے الگ چمکتا ہوا نظر آتا نہ صرف اپنی ظاہری وضع قطع اور لباس کے اعتبار سے بلکہ اپنے حُسنِ اخلاق

اور کردار کے لحاظ سے بھی، وہ روزانہ صبح دفتر کرایہ کی سواری میں جاتا اور واپسی بھی اسی طرح ہوتی، اس کے ساتھی افسران لمبی لمبی کاروں میں آتے، حالانکہ وہ ان کے برابر کا عہدہ دار تھا اور اسی گھومنے والی اسپرنگ دار کرسی پر بیٹھتا جس پر براجمان ہو کر آدمی خود کو کوئی اور مخلوق سمجھنے لگتا ہے۔ بلکہ اس کو محکمہ ایسا ملا تھا کہ ملک کی بڑی بڑی مقتدر ہستیاں اور صاحب ثروت لوگ بقول شخصے اس کے سامنے ہاتھ باندھے دن رات کھڑے رہتے، اور اس کے ساتھی افسران کبھی کبھی از راہ مذاق یا شاید جذبۂ رشک سے مجبور ہو کر اس طرف اشارہ بھی کرتے اور نیا راستہ دکھانے کی کوشش کرتے مگر شرافت ان کی کسی بات پر کان ہی نہ دھرتا

ایک مدت تک میری آنکھیں شرافت کو اسی ہیج اور انداز میں کام کرتے دیکھتی رہیں، مگر ایک دن اچانک مجھے اس کی ظاہری ہیئت میں نمایاں تبدیلی کا احساس ہوا، وہ لباس جس کو میری آنکھیں زمانۂ طالب علمی سے لے کر آج تک شرافت کے جسم پر دیکھتی چلی آئی تھیں اور جو شاید اس کی شخصیت کا ایک جزو بن گیا تھا، آج نہ معلوم کتنے برسوں کے بعد اس کے جسم سے کچھ ڈ گیا تھا، کھدر کی قمیض شلوار اور بنڈی کی جگہ اعلیٰ درجہ کے نفیس سوٹ اور ٹائی نے لے لی تھی۔۔۔۔۔۔ میرے وجود کی آنکھوں نے دیکھا تھا کہ وہ کچھ دنوں سے کچھ کھویا کھویا سا رہتا، گم صم جیسے کسی سوچ میں گم، رات گئے تک بے چین کروٹیں بدلا کرتا، مطالعہ تک سے بیزار جس کے بغیر وہ کبھی سو بھی نہ سکتا۔۔۔۔۔

اور کچھ دن تک اسی حالت سے دوچار رہنے کے بعد شرافت میں مجھے ایک نمایاں تبدیلی کا احساس ہوا، وہ اب رات کو پچھلے پہر فلیٹ میں واپس آتا، اور میری وجود کی آنکھیں ٹکٹکی باندھے فلیٹ کے دروازے کو تکتے تکتے پتھرا جاتیں اور میز پر بے ترتیب پڑی ہوئی کتابیں اوندھے منھ پڑی رہتیں شرافت رات گئے واپس آتا اور بعض اوقات تو مع سوٹ بوٹ کے بستر پر بے سدھ ہو کر گر جاتا، اور دوسرے دن دن چڑھے تک سوتا رہتا اور پھر جلدی جلدی تیار ہو کر دفتر روانہ ہو جاتا، ایک عرصہ تک یہ ہی شرافت کا معمول بنا رہا، میری آنکھوں نے دیکھا کہ شہلا اس کے ساتھ ہمہ وقت رہتی، دفتری اوقات میں بھی وہ زیادہ تر وقت شرافت کے دفتر ہی میں گزارتی وہ خوبصورت تھی اور جوان، دراز قد، کھلتا ہوا گندمی رنگ اور ترشا ہوا پیکر پتلی کمر، بھرا ہوا سینہ، قدم ڈالتی تو مورنی کی طرح پھرکیاں سی لیتی، شوخ ایک خاص کیفیت والی آنکھیں، سحر انگیز اور شاید شرافت بھی انھیں آنکھوں کے سحر میں کھو گیا تھا۔

شرافت سے اس کا تعارف سیٹھ کرامت نے کرایا تھا، مجھے اچھی طرح یاد ہے جب وہ پہلی

مرتبہ دفتر میں آئی تو شرافت سے بات کرتے وقت اس کی بوٹی بوٹی تھرک رہی تھی، آنکھوں میں ایک خاص کیفیت تھی جیسے کہہ رہی ہو "میں بھی آپ کی ہو جانے والی ہوں"۔ اور پھر چند ملاقاتوں کے بعد ہی یہ انداز ہمہ تن سپردگی بن گیا۔ دن بھر کی ملاقاتیں جیسے سے ہیں۔ رہتی تو شام عموماً کسی کلب Beach یا ریستوران میں گذرتی اور جس شب کی شامیں کا سلسلہ رنگین اور معطر راتوں سے جا ملا اور اس رنگین سودے میں امپورٹ اور ایکسپورٹ اور نہ معلوم کس کس چیز کے پرمٹ بڑی فراخدلی سے شرافت کے با اختیار ہاتھوں سے نکل کر چپکے سے سیٹھ کرامت کے ہاتھوں میں یوں سرکتے رہے کہ ایک ہاتھ کی دوسرے کو خبر نہ ہوتی۔ ۔ ۔ اور کچھ دن بعد مجھے محسوس ہوا کہ اب تو راستہ کھل گیا اور پھر تو نہ جانیں کتنی "سنبلائیں" آئیں اور چلی گئیں، نہ جانے کتنے سیٹھ بامراد اور شادمان شرافت کے دفتر سے پلٹے، اور پھر کچھ دن اور بعد میرے وجود کی آنکھوں نے دیکھا کہ اس رنگین لین دین میں ایک اور سنہری زنجیر کا اضافہ ہو گیا، بڑی ہی روپہلی آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی، اور اس سنہرے اضافہ کے ساتھ ہی میں نے دیکھا کہ فلیٹ میں ایک دن تالا پڑ گیا اور شرافت ہمیشہ کے لئے وہاں سے رخصت ہو گیا۔

میرے وجود کی آنکھوں نے الوداعی نظر چھوٹے سے فلیٹ پر ڈالی، جہاں ایک طویل عرصہ میں نے شرافت کے ساتھ گزارا تھا، اور جس سے ایک گونا انسیت اور وابستگی کی بنا پر آج اس کو خیرباد کہتے ہوئے مجھے اپنے دل میں ایک ٹیس اور عجیب سی کسک محسوس ہو رہی تھی، نہ معلوم شرافت کے چلتے وقت کیا احساسات تھے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور فلیٹ سے رخصتی کے بعد میری آنکھیں ایک بار پھر شرافت کے ساتھ ساتھ تھیں۔

اور ایک لمحہ بیتا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میری آنکھوں نے شرافت کی لق ودق وسیع کوٹھی میں راتوں کو جاگتے دیکھا، میری بوڑھی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو ہو کر اونگھنے لگتیں، مگر رعنائیوں اور معطر فضا میں گم شرافت کے مہمانوں کی خمار آلودہ آنکھوں سے نیند اچٹ کر شاید رات کی سیاہیوں میں حل ہو گئی ہوتی، اور رات کی سیاہ پردہ پوشی بھی کبھی لقعہ نور بنی کوٹھی کی پردہ پوشی سے عاری اور عاجز سی نظر آتی۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ہال کمرہ میں رات دن کو بھی شراتی ہوتی اور گلرنگ لچکتی بانہیں مضبوط بھرے بھرے بازوؤں میں لوٹتی رہتیں اور حسین پیکر بدمست جسموں کے شکنجوں میں مچلتے رہتے اور تمام قیود کو توڑتے اور حدود دھیدتے وہ اس حالت میں پہنچ جاتے کہ میری آنکھوں کو دیکھنے کا یارا نہ رہتا، اور اگر ہال کے روشن اسکرین پر کبھی بھولی بھٹکی کوئی پھسلتی نگاہ پڑ جاتی تو عجیب سی کراہیت کا احساس ہوتا، جیسے ابکائی آ رہی

طاری ہو جاتی اور طبیعت چاہتی کہ میری بصارت واپس اپنے وجود سے جا ملے، مگر میری آنکھیں ابھی اس پر قادر نہ تھیں...... شاید برگد کے نیچے پسرے وجود کو کچھ اور منظور تھا......

اور شرافت کے دن اور رات اسی انداز میں گزرتے رہے...... اور ایک ایک لمحہ اور بیتا،..... اور میری آنکھوں نے شرافت میں اچانک ایک تبدیلی دیکھی، وہ کھویا کھویا سا رہتا، اور پھر یہ حالت اضطراب کی حدود کو چھوتی ہوئی شب بیداری میں تبدیل ہو گئی، جس کوٹھی میں رات کو تمام جہاں کی رعنائیاں اور رنگینیاں سمٹ آتی تھیں اس کے در و دیوار سے ویرانی ٹپکتی اور اداسی ڈیرا جمائے نظر آتی، وہ پہروں راتوں کو بے چین کروٹیں بدلا کرتا اور پھر ایک وقت وہ آیا کہ بے چینی اور اضطراب مستقل اور مبہم کرب بن گیا، وہ اس کرب سے گھبرا کر بوتل اور جام کا سہارا لیا کرتا، مگر آہستہ آہستہ وہ اس کا اتنا عادی ہو گیا کہ یہ زہر بھی اپنا اثر "کلیتاً" کھو بیٹھا تو اس نے "مجبوراً" "دوسرا سہارا" ڈھونڈا، مگر شروع شروع میں تو وہ عارضی طور پر گولیوں کا سہارا لے کر مستقل اور مبہم کرب سے چھٹکارا حاصل کر لیتا، مگر جیسے جیسے دن گزرتے گئے گولیوں کی مقدار میں تو اضافہ ہوتا گیا، مگر اثرات میں اسی سرعت کے ساتھ کمی،..... اور جب میری متجسس نظروں نے شرافت کی اس حالت کا سبب جاننے کے لئے ٹوہ لینا شروع کی تو مجھے بہت جلد محسوس ہو گیا کہ شرافت کی موجودہ حالت کی وجہ شہلا کی ہی ذات ہے...... وہ ہستی جو اس کی زندگی میں ایک شرارے کی مانند داخل ہوئی اب لو دے کر بھڑکتی اور بھڑ بھڑاتی آگ بن گئی تھی......

کچھ دن بعد میرے وجود کی آنکھوں نے دیکھا کہ شرافت نئے دفتر میں منتقل ہو گیا اور یہ تبدیلی اسکے لئے غیر متوقع بھی تھی اور مایوس کن بھی، وہ کسی پہلو سے بھی اس سے خوش ہونا تو درکنار مطمئن نظر نہ آتا، اس تبادلہ نے اس کے وسیع دائرہ کو بالکل ہی محدود کر دیا تھا، بقول شخصے وہ صرف دفتری بابو سا بن کر رہ گیا، صرف ٹیبل ورک تک محدود اور جب اختیارات مٹے تو دنیا ہی سمٹنے لگی اور اس سمٹتی تنگ ہوتی دنیا میں وہ محبوس سا ہو کر رہ گیا اور اس نے گھبرا کر شہلا کے دامن میں پناہ ڈھونڈنی چاہی...... اس دوران میری آنکھوں نے محسوس کیا تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ شہلا میں شرافت کی دلچسپی فزوں تر ہوتی گئی تھی، اس کے باوجود کہ وہ سیٹھ کرامت کی منکوحہ تھی، فریدہ، عالیہ، نشو، رباب نہ معلوم کتنی شرافت کی رنگین زندگی کی چند گھنٹوں یا دو چار راتوں کی ساتھی رہیں، سیٹھ عابد، سیٹھ کریم اور سیٹھ لطیف کو بھی یہ راستہ سیٹھ کرامت نے دکھایا تھا اور سیٹھ کرامت سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان بنے چشم پوشی والا انداز اختیار کئے ہوئے تھے وہ اس سودے

کا میزان لگاتے تو خود کو نفع ہی میں پاتے ان کی اپنی کان میں جو ہیرا تھا اس کو شرافت کی جوہر شناس نگاہیں کسی صورت چھوڑنے کو تیار نہ تھیں، شہلا کو اب بھی دیکھ کر اس پر وہ کیفیت طاری ہوتی جو کسی نوجوان عاشق پر عشق کے ابتدائی مراحل میں ہوتی ہے، شرافت کے لئے وہ ایسی شراب تھی جس کا سرور کبھی نہیں اترتا مگر سیٹھ کرامت نے شرافت کے تبادلے کے ساتھ ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ اب شرافت کے ساتھ سودے میں نفع کی بجائے گھاٹے کا خدشہ ہے، ان کے نزدیک شرافت ایسا گھوڑا تھا جس کو ریس کے میدان میں اتروانا ہی نہیں تھا اور ایسے گھوڑے پر داؤ نہیں لگا کرتا .... اور سیٹھ کرامت کی ایما پر شہلا نے ایک گونا بے اعتنائی اور بے رخی والا انداز اپنا یا تھا......!

مگر شرافت نے پھر بھی ہتھیار نہیں ڈالے تھے، شہلا اب بھی اکثر و بیشتر اس کے ساتھ نظر آتی.... شاید سیٹھ کرامت کی اجازت کے بغیر اور مرضی کے خلاف بھی...... نہ معلوم کیوں!..... کبھی کبھی تو رات کے پچھلے پہر وہ شرافت کی کوٹھی سے باہر آتی جیسے پچھلا بھولا ہوا کوئی سبق دہرانے کے بعد!...... اور میں نے محسوس کیا تھا کہ اب کچھ دن سے شہلا بھی متفکر سی نظر آتی، شرافت مسلسل اس کو سیٹھ کرامت کو چھوڑ دینے اور اپنے ساتھ نکاح ثانی پر مجبور کر رہا تھا مگر وہ شیشہ میں اترتی نظر نہیں آتی تھی، وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ سیٹھ کرامت تو سونے کی ایسی کان ہے جس کا سونا کبھی ختم نہ ہوگا اور شرافت وہ کیمیا گر تھا جس کا نسخہ اس سے چھین لیا گیا تھا، مگر اس کے باوجود وہ شرافت سے قطعی طور پر قطع تعلق بھی نہ کر پاتی ......

کلب، ریستوران اور پھر ساحل سمندر سے واپسی تک میری ہمیشہ ساتھ رہنے والی نگاہیں دونوں کے ساتھ ساتھ کوٹھی میں داخل ہوئیں اور پھر وہ دونوں بیڈ روم میں چلے گئے اور پھر بیڈ روم کا دروازہ بند ہو گیا بند کمرہ سے کچھ دیر تک باتوں کی آوازیں آتی رہیں اور جام کھنکتے رہے، پھر روشنی گل ہو گئی اور اس کی جگہ مدھم مدھم نیلی روشنی کمرہ میں پھیل کر فضا کو اور زیادہ رومان انگیز بنانے لگی، اندھیرے اجالے ہر جگہ یکساں دیکھنے والی میری نظروں نے دیکھا کہ کمرہ میں لگا ہوا اسکرین بھی روشن ہو گیا اور اسکے بعد مجھے دیکھنے کا یارا نہ رہا......

میری آنکھیں بند دروازہ کو ٹکٹکی باندھے رات بھر تکتی رہیں، بھیگی ہوئی رات بوجھل بوجھل نم نم سی بڑی آہستہ آہستہ خرامی کے ساتھ ڈھلتی رہی اور پھر ڈھلتی ہوئی رات نے صبح کاذب کے بازوؤں میں دم توڑ دیا اور صبح صادق نمودار ہوئی..... کفن کی طرح سفید..... میں نے گھبرا کر بند کمرہ کو دیکھا!...... کواڑ بدستور بند تھے، پھر دن کا اجالا پھیل گیا، میری نظریں بند دروازہ کے باہر منڈلاتی رہیں اور جب خوب دن چڑھ گیا

تو میری نگاہوں میں بے چینی عود کر آئی اور پھر وقت گزرنے کے ساتھ بے چینی اور اضطراب نے سیمابی کیفیت اختیار کرلی، اور پھر مضبوط بند کواڑوں کے بند توڑتی میری نظریں بند کمرہ میں داخل ہوگئیں۔۔

۔۔۔ شہلا اور شرافت' شرافت اور شہلا جیسے ایک دوسرے میں ضم بیڈ پہ بے سُدھ پڑے ہوئے، شاید ایک دوسرے کی برہنگی کی پردہ پوشی کرنے کی کوشش ناکام کرتے ہوئے' اور میری آنکھوں سے میری شرم نے بڑھ کر دونوں کو ڈھانپ دیا۔ ۔۔۔۔ مگر میری بوڑھی زمانہ شناس نگاہوں نے محسوس کیا کہ جیسے شرافت بالکل بے سُدھ ہو' ۔۔۔۔ اور ساتھ ہی مجھے اس کے جسم میں اکڑن کا احساس ہوا۔۔۔۔ میری نظریں گھبرا کر بیڈ سے اُتر آئیں' اور میں نے دیکھا کہ سائڈ اسٹول پہ دو خالی شیشیاں پڑی ہیں۔۔۔۔ اور فرش پر لاتعداد فوٹو بکھرے پڑے ہیں' ۔۔۔۔ شرافت اور شہلا کے مختلف انداز اور بہر بہر حالت اور کیفیت میں اور میری نظریں تصاویر سے گھبرا کر پلٹیں تو سامنے روشن اسکرین آ گیا۔ پر وجیکٹر ان تصویروں کو چلتی پھرتی شکل میں عملی طور پر پیش کر رہا تھا ایک خاموش کہانی' ۔۔۔۔ ایک ان کہا افسانہ جس کے کردار صرف شہلا اور شرافت تھے۔

اور اب میری نظروں سے کمرہ میں لمحہ بھر نہ ٹھہرا گیا، وہ کوٹھی سے باہر آ گئیں' لق و دق کوٹھی دن کے اجالے میں بھی ویران بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔۔۔۔۔ مجھے محسوس ہوا کہ رگ رگ کے نیچے پسرے میرے وجود کی کشش اب میری آنکھوں کو کھینچ رہی ہے' اور میری آنکھیں کشاں کشاں چل پڑیں، چلتے چلتے میری آنکھوں نے دیکھا کہ ایک بہت ہی طویل سیدھا راستہ ہے کہ جس کے دونوں طرف اِدھر اُدھر دو دیواریں کھنچی ہیں اور ان دیواروں میں جگہ جگہ کچھ دروازے کھُلے ہیں' لیکن ان پر پردے پڑے ہوئے ہیں' راستے کے سرے پر ایک آواز دینے والا آواز دے رہا' اور ایک اژدھام ہے' خلقت کا کہ جو اس راستے پر چلا جا رہا ہے' اور ایک ندا ہے کہ مُسلسل آ رہی ہے "چلے چلو، اِدھر اُدھر مڑو نہیں" اور میری آنکھوں نے اس انبوہ میں للّو کو دیکھا اور شفوا حمیدا کو بھی کہ وہ بھی اس راستے پر چل رہے تھے اور للّو تھے کہ چلتے چلتے ایک دروازہ کی طرف بڑھے اور پھر ندا آئی "پردہ نہ اٹھانا، پردہ اٹھاؤ گے تو اندر چلے جاؤ گے" اور مجھے محسوس ہوا کہ جیسے یہ آواز للّو کے قلب کی گہرائیوں سے اُبھری ہو اور پھر للّو اس ندا کو سُن کر سیدھے راستہ پر گامزن ہو گئے اور پھر چلتے چلتے میری نظروں سے دُور ہو گئے اور ایک لمحہ اور بیتا۔ چلتے ہوئے لوگوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ اور مجھے شرافت بھی نظر آیا کہ وہ بھی اس بھیڑ میں شامل تھا اور سیدھا راستہ پر چلے جا رہا تھا، مگر میری آنکھوں نے دیکھا کہ

اس نے ایک پردہ اُٹھایا: ...... اور مجھے وہی ندا سنائی دی ...... کہ جو للّو نے سنی تھی مگر شرافت کی سماعت شاید بہری ہوگئی تھی وہ دروازہ میں داخل ہوگیا"......

اور چند لمحوں بعد میری رنگین برگد کے نیچے پسرے میرے وجود سے جا ملیں اور اب میرا جامد و ساکت وجود سوچ میں گم ہے، مسلسل ایک ہی سوچ اور ایک ہی سوال ...... حرام کی ایک چونی!... فاقہ ......! اور حرام موت میں کتنا فاصلہ ہے؟......

(بقیہ پچھلے پہر صفحہ ۳۰۳ سے)

اپنی بینائی پر یقین آرہا تھا اور نہ قوت سماعت پر۔

تمھی سوچ کیا رہے ہو؟ وہ تمہیں خوش آمدید کہہ رہا ہے۔" یہ کہتے ہوئے میری بیوی آگے بڑھی اور اس نے بغیر ہچکچائے رشید کا دایاں ہاتھ تھام لیا اور اُسے لے کر میرے پاس آئی اور روہانسی آواز میں کہا۔

"تمہارا خیال تھا مجھے اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم؟ مجھے تو چند ہفتوں کے بعد ہی معلوم ہوگیا تھا کہ تم ہر اتوار کو بلاناغہ کہاں جایا کرتے ہو ــــ پھر میں ہر مہینہ کو اس کے پاس جانے لگی ــــ تم بیوقوفوں کی طرح وہاں کیوں کھڑے ہو حیدر ــــ کیا تمہیں خوشی نہیں کہ خدا نے ہم سے ایک بیٹا لے لیا تو دوسرا دے دیا؟"

یہ کہتے ہوئے اُس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے اور میں نے جذبات سے بے قابو ہوکر دونوں کو گلے لگالیا۔

قدسیہ انصاری

مگس رانی

مجھے چھوٹی بھابھی پر سب سے زیادہ رشک آتا، کیا شاندار زندگی تھی ان کی میکے میں پہلوٹھی کی اولاد تھیں، اس لیے ماں باپ کی لاڈلی رہیں. شادی کی تو اپنی پسند سے سسرال آکر میاں کی آنکھ کا تارہ رہیں. پھر دھڑا دھڑ آٹھ بچے ہو گئے اور ہر بچے کی پیدائش پر میاں یوں لوکھلائے پھرتے کہ لگتا جیسے پہلا بچہ ہے شروع دن سے ہی دوڑے دوڑے کبھی اس ڈاکٹر کے پاس جاتے کبھی بھابھی کو فلاں کلینک میں گلوکوز چڑھتی اور کبھی فلاں اسپتال میں آئرن کے انجکشن لگتے. بھابھی کے کمرے میں میز ہمہ وقت پھل پھلاری اور مختلف قسم کے ٹانک دواؤں سے سجی رہتی. بھابھی بھی خوب تھیں، اس زمانے میں شجر ممنوعہ کو چھوڑ کر صرف پھلوں یا گوشت سے پیٹ بھرتیں. پھر بھی چھوٹے بھائی کو یہی شکایت رہتی کہ نجمہ تو کچھ کھاتی ہی نہیں ہے. یہ تو ان کی زندگی میں عالم تھا، پھر جب مریں تو اس شان سے کہ لوگ ان کی شکایتیں بھول گئے اور ان پر اور ان کے بچوں پر ترس کھانے لگے. ہائے کیا دن تھے مرنے کے بعد بیچارے ننھے ننھے بچے یتیم ہو گئے. اب ان کو کون دیکھے گا.

مگر اب لوگوں کو کون سمجھائے کہ نجمہ بھابھی تو مگس رانی تھیں. صرف بچے پیدا کرنا ان کا کام تھا باقی کام یعنی بچوں کا گھر درست کرنا، ان کو نہلانا، دن بھر آنکھیں پھوڑ کر ان کے کپڑے سینا. ان کے لیے سوئٹر بننا، یہ سب کچھ وسیمہ کرتی تھی، سو وہ اب بھی کر رہی ہے.

چھوٹے بھائی کی زندگی میں نجمہ بھابھی ہوا کے جھونکے کی طرح آئیں. بارہ سال کے عرصہ میں آٹھ بچے بھی پیدا ہو گئے اور آخری بچے کی پیدائش میں وہ خود بھی اللہ کو پیاری ہو گئیں. ان کی موت کی خبر سن کر ایک دم سے میرے ذہن میں خیال آیا کہ موت نے ان کو چھٹی دے دی ورنہ وہ اور بھی بچے پیدا کیے جاتیں اور ساتھ ہی نگاہوں میں ان کا سراپا گھوم گیا. بھاری بھر کم جسم. گداز ہاتھ پیر اور آگے کو

بے طرح نکلا ہوا پیٹ، جس کی جسامت میں بچہ کی پیدائش سے پہلے صرف انیس بیس کا فرق ہوتا ہے
مجھے یقین ہے کہ جو گزی ساری میں ان کی کمر پر سامنے کی طرف صرف دو ایک ہی پلیٹیں پڑتی ہوں گیں۔

سنتے ہیں کہ عرصہ ہوا بھابھی چھوٹے بھائی کے پڑوس میں آ بسی تھیں اور اس عرصہ میں پتہ نہیں چھوٹے بھائی کو کیسے موقع ملا کہ بارہ عدد بہن بھائیوں کے ہوتے ہوئے بھی انہوں نے نجمہ بھابھی سے بڑے ہی دھانسو قسم کا عشق کیا۔ نجمہ بھابھی کے کمرے کی طرف کھلنے والی کھڑکی سے تانکا جھانکی ہونے لگی اور کاغذ کی گولیاں غسل خانے کے راستے کھڑکی سے جانے لگیں اور انہیں گولیوں میں عہد و پیمان ہونے لگے۔ پھر چھوٹے بھائی نے قسم کھائی کہ شادی کروں گا تو نجمہ سے ورنہ نہیں۔

سب حیران تھے کہ کہاں نجمہ بھابھی ٹھیٹھ گجرانوالہ کی رہنے والی اور کہاں چھوٹے بھائی یو پی کے مہذب شہر لکھنؤ کے باشندے۔ چکن کے سفید براق کرتے چنی ہوئی آستین تنگ مہری کے پاجامے گورے چٹے منہ میں پان کی دھڑی جمائے بہت آہستہ آہستہ رک رک کر بات کرتے اور نجمہ بھابھی خوب گھیر والی شلوار، ڈھیلی ڈھالی لمبی قمیص، بات کریں تو لگتا جیسے لڑ رہی ہوں۔ ان کی بات بھی پوری ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ آدھی اردو آدھی پنجابی۔ امی نے پوری کوشش کر کے ہر طرح سے سمجھایا، رشتے کے ایک ماموں نے اونچ نیچ بتلائی، مگر چھوٹے بھائی مکھڑا اپنے سر پر صافہ باندھ، نجمہ بھابھی کے گھر پہنچ گئے۔

یہ آج سے بیس سال پہلے کی بات ہے۔ اس وقت مہاجرین ریلے کی شکل میں آ رہے تھے۔ ان میں اور پنجابیوں میں کا بہت بڑا فرق تھا۔ اب تو نئی نسل کو فخر ہے کہ وہ صرف پاکستانی ہے۔ ان کی الگ کوئی کلچر نہیں کوئی تہذیب نہیں، مگر اس وقت تو مٹی مٹی کا فرق تھا۔ کوئی یو پی کا تھا، کوئی سی پی کا، کوئی مدراس، یا بمبئی والا۔ نجمہ بھابھی دلہن بن کر آئیں تو اس طرح کہ اپنی طرف کی ساری رسمیں چھوٹے بھائی کی بہنوں، بھاوجوں سے لڑ بھی ڈلوایا، امی نے ان کی طرف سے آیا ہوا گنگا جمنی اپنی ساس کا وہ چندن ہار جو انہوں نے چھوٹی بہو کے لیے رکھ چھوڑا تھا۔ وہ نجمہ کے گلے میں ڈالا۔ وہ ویسا ہی لاکر میں پڑا رہا۔

نجمہ بھابھی دولہن بن کر تو جیسے تھیں ٹھیک ہی تھیں۔ لیکن جیسے ان کی باتیں عضب ہو گیا۔ شادی کے کچھ دنوں کے بعد جب الٹی او رچکروں کا سلسلہ شروع

کے کان میں یہ بات ڈال دی گئی۔ امی بیچاری اس کی عادی نہیں تھیں ان کے بارہ بچے ہوئے مگر کبھی منہ سے بھاپ نہیں نکالی۔ ساس نندوں نے ان کے بدلے ہوئے انداز سے خود ہی سمجھ لیا مگر نجمہ بھابھی کو تو ہر وقت دوسری جان کی فکر رہتی تھی۔ کھانے میں مرغن غذائیں اس لیے کھاتی تھیں کہ ان کے جسم میں دوسری جان پرورش پا رہی تھی۔ ٹیکسی رکشہ میں اس لیے نہیں بیٹھتی تھیں کہ دوسری جان کی ذمہ داری ہے۔ کہیں دھکا یا چوٹ نہ لگ جائے۔ نندوں نے دوسری جان کا مذاق بنا لیا تھا۔ باورچی خانے میں یا جب کبھی نجمہ بھابھی ادھر اُدھر ہوتیں تو ایک دوسرے کو دوسری جان کہہ کر پکارتیں۔ نجمہ بھابھی جب بھی اس قسم کی بات کرتیں تو وہ لوگ ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھ کر مسکراتیں اور نجمہ بھابھی چھوٹے بھائی کی نظر بچا کر ایک دوسرے پر فقرے چست کیا کرتیں۔

نجمہ بھابھی کو یہ احساس شدت سے تھا کہ وہ اس خاندان میں نہیں کھپ رہی ہیں۔ لہذا انھوں نے دیورانیوں جیٹھانیوں اور بڑی نندوں کے دیکھا دیکھی شلوار چھوڑ کر ساری اٹھالی اور موقع بے موقع پہننے کے لیے ایک آدھ غرارہ بھی سلوا لیا۔ جو ان کے بھاری بھر کم جسم پر بہت ہی عجیب سا لگتا۔ ریڈیو پر پنجابی لوک گیت سن نندوں اور چھوٹے بھائی سے اس کا مطلب پوچھتیں اور پھر اس کا جواز یہ دیتیں کہ وہ ٹھیٹھ پنجابی نہیں سمجھ سکتی ہیں۔ کیونکہ وہ خود پنجاب سے زیادہ عرصہ باہر رہی ہیں۔ غرض کہ بیچاری نے ہر ممکن کوشش کر ڈالی، مگر وہ لوگ بھی بڑے ہی کڑے تھے۔ اپنے کلچر کا اس قدر مان تھا کہ مشکل سے کسی کو سیٹتے تھے پھر نجمہ بھابھی تو تھیں موٹی بھدی کرخت آواز اور دبنگ لہجے والی۔ اس پر سے طرہ یہ کہ لوگ آتے جاتے امی سے پوچھتے کہ آپ کی چھوٹی بہو غیر خاندان کی ہیں کیا۔ وہ آپ لوگوں سے بالکل الگ لگتی ہیں۔

قصہ دراصل یہ تھا کہ فرحت بھابھی اور طاہرہ بھابھی اس کی سگی بھانجیاں تھیں۔ شکل وصورت عادات و اطوار میں بہت کچھ اپنے سسرال والوں میں ملتی تھیں۔ بلکہ جب سب مل کر بیٹھتے تھے پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ کون نند ہے اور کون بھاوج اسی بات پر اکثر چھوٹے بھائی، بڑی بھابھی اور منجھلی بھابھی سے مذاق کرتے کہ آپ لوگ تو جب ہمارے بھائیوں کے ساتھ چلتی ہیں۔ تو لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں، آپ دونوں میاں بیوی کم اور بہن بھائیوں زیادہ معلوم ہوتی ہیں۔ چھوٹے بھائی کے مذاق کرنے کا انداز بھی خوب تھا۔ پاندان میں سے پان بناتے، بڑے اہتمام سے گلوری منہ میں کھلتے

پھر بھابھیوں سے چھیڑ خانی شروع کرتے۔ ہلکی مسکراہٹ اور دھیمے لہجے میں چھوٹے بھائی واقعی شہزادہ لگتے۔ اس کے برعکس نجمہ بھابھی بالکل بھکڑ تھیں۔ وہ تو ایسے کھلے کھلے مذاق کرتیں کہ سننے والا جھینپ جاتا اور پھر دھیرے سے ان کے پاس سے کھسک جاتا۔ اسی بات پر تو بھابھی سب سے زیادہ چڑھ جاتیں کہ یہ لوگ خود اسے گھلنا ملنا پسند نہیں کرتے ہیں، مگر ساتھ میں ان کو اس بات کا بھی اعتراف تھا کہ ان کی بیٹی سب پھوپھیوں اور دادی کی لاڈلی ہے۔ ویسے وہ ہے ہی بہت پیاری دبلی پتلی نازک سی بالکل امی کی دوسری شکل۔

دھیرے دھیرے چھوٹے بھائی اپنے گھر والوں سے دور اور سسرال والوں کے قریب ہوتے گئے۔ عنایت بھائی صاحب کے صرف دو ہی تو اولادیں تھیں۔ ایک نجمہ دوسری وسیمہ۔ وسیمہ کی عمر بڑھتی جا رہی تھی، مگر ابھی اس کی شادی کا کچھ ذکر نہیں تھا یا بقول نجمہ بھابھی کے سسرال والوں کے کوئی الو نہیں پھنستا تھا، مگر خود نجمہ بھابھی کی امی سب سے یہی کہتی تھیں کہ نجمہ کی صحت خراب ہے اوپر سے بچے ہوتے جا رہے ہیں وہ اکیلی سارے بچوں کو کیسے دیکھ سکتی ہے اب تو وسیمہ کی شادی اسی وقت ہو گی جب نجمہ کی بیٹی بڑی ہو کر چھوٹے بھائی بہنوں کو سنبھالنے کے قابل ہو جائے گی۔

مگر ابھی نجمہ بھابھی کی بیٹی کے بڑے ہونے میں کافی دن تھے اور نجمہ بھابھی بھی سال کے کچھ مہینوں کو چھوڑ کر باقی دن ایک کے بعد دوسرے بچے کی تیاری میں لگی رہتیں۔ وسیمہ ان کی دیکھ بھال کرتی، چھوٹوں کو دودھ بنا کر پلاتی، بڑوں کو بیٹھا کر قرآن پڑھاتی، ان کو اسکول چھوڑ کر آتی۔ ان کے کپڑے سیتی واقعی وسیمہ کی ہمت تھی مائیں تو ایک دو بچوں ہی میں مل جاتی ہیں مگر وسیمہ بیک وقت آٹھ بچوں کو سنبھال رہی تھی۔ ہر بچے کو رات کو سوتے وقت سلیپنگ سوٹ پہناتی، پھر صبح اٹھ کر ان کے دانتوں کو برش کر کے ان کے کپڑے بدل کر نک سک سے درست کرتی۔ ان کو ناشتہ کرا کر اسکول چھوڑ کر آتی اور باقی کو باورچی خانے میں اپنے سامنے پیڑھے پر بیٹھا کر پڑھاتی جاتی اور ناشتے کے لیے پراٹھا سینکتی جاتی۔ پھر اسی طرح گھر کا سارا کام نبٹاتی۔ چھوٹا سا دو کمرے کا گھر ہر وقت چندن بنا رہتا۔ اتنے بچوں کے ہوتے ہوئے بھی مجال ہے کہ گھر میں کوئی چیز ادھر سے ادھر پڑی مل جائے۔ یہاں تک کہ غسل خانے پیخانے میں بھی المونیم کے صاف ستھرے لوٹے مانجھ دھو کر رکھے ہوتے۔

جب میں چوتھی جماعت میں پڑھتی تھی۔ میری کلاس کی مس نے مجھے بتایا تھا، کہ شہد کی

مکھیوں یا چیونٹیوں میں صرف ایک ملکہ ہوتی ہے، جو صرف انڈے دیتی ہے۔ باقی دوسرے کام یعنی چھتے بنانا پھولوں سے رس جمع کرنا۔ اپنی ملکہ کی حفاظت کرنا، یہ کام سب دوسری مکھیاں کرتی ہیں۔ نجمہ بھابی کو جب بھی دیکھتی ہوں مجھے شہد کی مکھیوں کی وہ ملکہ یاد آجاتی ہے۔ بھولی بھالی نجمہ بھابی جن کو دیکھ کر بظاہر کوئی اندازہ نہیں ہوتا، جب وہ اسپتال جاتیں تو معلوم ہوتا کہ لڑکا یا لڑکی پیدا ہوئی ہے اس وقت چھوٹے بھائی فون سے سب کو نومولود کی اطلاع دیتے۔ ساس نندوں کے علاوہ اگر کوئی بھولے بھٹکے مبارک باد دینے پہنچ بھی جاتا تو یہ دیکھ کر اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتیں کہ خوبصورت رنگ برنگے کھلونے، فراک اور سوئٹر میں ملبوس بچہ نجمہ جابی کی پلنگ کی پائنتی پالنے میں پڑا سو رہا ہے۔ مجھے یاد نہیں کہ کبھی میں نے ان کے بچوں کو ایک دو سال کے پرانے کپڑے پہنے دیکھا ہو۔ ہر بچے کی آمد پر نئے سرے سے کپڑے سلتے، فراک سوئٹر بنتے جاتے۔ بقول نجمہ بھابی کے وسیمہ کپڑے سینے میں ماہر ہے بغیر کسی کے سکھائے دوکانوں سے ڈیزائن دیکھ کر اتار لیتی ہے۔

آنکھوں پر موٹے تال کا چشمہ لگائے، بالوں میں کہیں کہیں چاندی کے تار چمکتے ہوئے موٹے موٹے بھدے نقوش والی وسیمہ پر مجھے بہت ہی ترس آتا مگر وہ خود میں مگن اور مطمئن رہنے والی لڑکی تھی جیسے نہ ستائش کی پرواہ تھی اور نہ کسی قسم کا فرسٹریشن تھا، مگر جب نجمہ بھابی نے ہمیشہ کے لیے چھوٹے بھائی کا ساتھ چھوڑ دیا تو لوگوں کے کہنے سننے اور زور ڈالنے سے چھوٹے بھائی نے وسیمہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وسیمہ جب نجمہ بھابی کی جگہ آئی تو خیال تھا کہ بچوں سے وہ اکتا چکی ہے۔ امی بھی برابر یہی کہتی تھیں کہ اب خدا نہ کرے وسیمہ سے چھوٹے کی اولاد ہو۔ نجمہ کے بچے پل جائیں یہی بہت ہے۔ آنے جانے والے بھی اسی قسم کی بات کرتے کہ وسیمہ تو پہلے ہی ماں کی جگہ ہے، مگر جب خود اس کی اپنی اولاد ہو جائے گی تو پتہ نہیں کیسا سلوک کرے گی۔

خدا معلوم اندر کیا کھچڑی پکی اور کیا طے ہوا کہ چھوٹے بھائی شادی کے ایک ہفتہ بعد ہی مردانہ آپریشن کرا کر چلے آئے۔ وہی تو منحوس دن تھا، جب میں نجمہ بھابی کا پرسہ دینے گئی تھی۔ میں نجمہ بھابی کی میت میں نہیں گئی، مگر سنا ہے کہ اس دن سے زیادہ وسیمہ آج سنجیدہ تھی بات کرتے کرتے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے کیا کہوں۔ ایک بڑی بی نے آگے بڑھ کر وسیمہ کو لپٹا لیا اور بولی صبر کر بیٹی، صبر کوئی مرنے والے کے ساتھ مر نہیں جاتا ہے۔ اب تو تو ہی ان بچوں کی ماں ہے؛ وسیمہ نے آنسو پونچھ کر بڑے کرب سے ان کی طرف دیکھا اور گود میں پڑے ہوئے بچے کو سینے سے لگا لیا۔۔

مشرف احمد

خوشبو

شدید سرد رات میں وہ ایک درخت کے سائے تلے بیٹھا ہوا تھا، سامنے کی سڑک کے پار بستی کے پرانے مکینوں کے روشن مکانات تھے، موسم کی شدت رگوں میں خون منجمد کر رہی تھی، شاہراہوں پر چلتے ہوئے اس نے تیس برس گذار دیئے تھے۔

ایک نادیدہ قوت اس کے پاس کھڑی تھی۔ اس سرد رات میں جب کہ تمام انسان اپنے اپنے آرام گھروں میں تھے، کھلے آسمان تلے اس کا تنہا وجود دیکھنے والوں کے دلوں میں ہمدردی کی لہر ضرور پیدا کر دیتا۔ پر اس نادیدہ قوت کی ہمدردی جس نے انتہائی نامساعد حالات اور خون آشام لمحوں میں اس کی حفاظت کی تھی، اس کی ہمدردی تو اس کے لئے ناگزیر تھی۔

"تم اپنے گھر کیوں نہیں جاتے"؟ آسمانوں اور زمین کے پھیلاؤ سے یہ سوال اٹھنا شروع ہوا۔

اس نے دل گرفتہ لہجے میں کہنا شروع کیا، میرا کوئی گھر نہیں ہے، میں نے مختلف بستیوں میں اپنی عمر کا قابل ذکر حصہ گذارا ہے۔ ہر بار ایک بستی سے دوسری بستی میں، اپنی آنکھوں میں نئے خواب سجا کر آیا۔ مگر وہ کہتے ہیں یہاں تمھارے لئے کچھ نہیں ہے۔

"آخر کیوں"؟

مجھے نہیں معلوم۔ اس بستی میں آنے سے پہلے میں ایک اور بستی میں رہتا تھا۔ اور اس سے بھی پہلی بستی کی سکونت ترک کی۔ میری آنکھوں میں کچھ خواب تھے۔ ان خوابوں نے مجھے اتنا بے چین کیا کہ میں اپنا سب کچھ چھوڑ کر نئی بستی کی طرف چل دیا۔ میری طرح اور لوگ بھی نئی بستی کی طرف ہی جا رہے تھے۔ ان سب لوگوں کی آنکھوں میں میری ہی طرح کے خواب تھے۔ رنگ برنگے۔ جیسے قوس قزح جن کی دلکشی میں آدمی کھو جاتا ہے۔ یہ سب

خواب بہت سہانے اور خوبصورت تھے۔ جب ان خوابوں کو دیکھتے ہوئے ہماری آنکھیں نئی زمین نئی بستی کی طرف تھیں۔ تو یقیناً ہماری پہلی بستی کا چہرہ اتر گیا ہوگا۔ زمین روتی ہوگی مگر ہم نے زمین کا اترا ہوا چہرہ نہ دیکھا۔ اب میں جو بے سروسامان اور بے سہارا ہوں اور کسی زمین میں میرے پاؤں نہیں جمتے تو شاید یہ پہلی بستی کی بد دعا کا اثر ہے۔

اس بستی کے بعد میں نے نئی بستی کی مٹی سوندھی سوندھی خوشبو سے اپنے مشام جاں کو معطر کر لیا ہے، اور نئی بستی کی زمین میں اپنے پاؤں میں نے نہایت مضبوطی سے جمالئے تھے اور ایک طویل عرصہ تک میں اس خوش فہمی میں مبتلا رہا کہ میرے پاؤں بھی میری پسندیدہ نئی دھرتی کے پرانے باسیوں کی طرح زمین میں مضبوطی سے جمے ہوئے ہیں۔ اور میرے گرنے کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ لیکن تھوڑے عرصے بعد میں دیکھتا ہوں کہ اور سب لوگ کے پاؤں تو اسی طرح مضبوطی سے زمین میں جمے ہوتے ہیں۔ شاید نیچے دھرتی میں گذری ہوئی نسلوں نے ان کے پاؤں کو مضبوطی سے جما رکھا ہے۔ لیکن جس جگہ میں کھڑا ہوتا ہوں وہاں زمین شور زدہ ہو جاتی ہے۔ میرے پاؤں کو مٹی چھوڑنے لگتی ہے۔ اور میری گرفت دھرتی پر کمزور ہو جاتی ہے۔

اپنی پہلی بستی چھوڑنے کے بعد اب میں تیسری بستی میں آیا ہوں۔ دوسری بستی میں میرے ساتھ یہی کچھ بہت ہو چکا ہے۔

دوسری بستی کی سرگذشت بیان کرو۔ اس نادیدہ قوت نے جو اس کے حال سے واقف تھی اس کو بات کرنے کی قوت عطا کی۔

یہی کہ میں نے اپنے پاؤں کو دھرتی کے بجائے خلا میں محسوس کیا، میں لڑکھڑانے لگا۔ اور جب باوقار انداز میں کھڑے ہوئے لوگوں کے درمیان آدمی لڑکھڑانے لگے یا گر پڑے تو جلد از جلد اس مقام سے اس ہجوم کی نظروں سے پوشیدہ ہونا چاہتا ہے۔ میرے ساتھ بھی اور بہت سے دوسرے لوگوں کے ساتھ، جو مدتوں سے پہلے پہلی بستی سے آمادۂ سفر ہوئے تھے۔ یہی کچھ ہوا۔

وہ بستی جس کو میں چھوڑ کر آیا ہوں، اس بستی کا ایک حصہ تھی، جس میں میں اب رہتا ہوں۔ وہ خوشبوؤں اور خوابوں کی سرزمین تھی، لیکن یکایک وہاں تاریکی کا ایسا سیلاب آیا کہ لوگ اس میں ایک دوسرے کو نہ پہچان سکے، نئے رشتے کمزور ثابت ہوئے۔ میں نے اس زمین کی خوشبو کو اپنے بدن سے چمٹا لیا تھا۔ میں بھی اس بستی کے قدیم لوگوں کی طرح خود کو محسوس کرنے لگا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ان سب لوگوں کی طرح میرے پاؤں بھی زمین پر مضبوطی سے

چھے ہوئے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ وہ یہ بھی بھول گئے ہوں گے کہ میں کسی اور لبستی سے آیا تھا۔

مگر یکایک اس لبستی میں ایک وبا پھیل گئی۔ اس وبا کا نشانہ وہ لوگ تھے جو کسی اور لبستی سے آکر اس نئی لبستی میں آباد ہوئے تھے۔ سنئے باسی پرانے باسیوں کی زبان بولتے تھے۔ اور ان کو علیحدہ پہچاننا مشکل ہوگیا تھا۔ مگر تازہ وبا نے نئے باسیوں کے چہروں پر ایسے نشان لگا دیئے تھے کہ وہ علیحدہ پہچانے جاسکتے تھے۔ میں بھی اپنا چہرہ چھپانے میں ناکام رہا۔ یہ نشان مجھ سے وابستہ ہر چیز پر لگ گیا، میرے دفتر کی میز پہ میرے گھر کے دروازے پر، اسی طرح اور ہزاروں لوگوں کی پہچان یہ نشان بن گیا تھا۔

میں جب اپنی پہلی لبستی سے چلا تھا اور نئی لبستی میں داخل ہوا تھا۔ تو پاؤں جمانے کے لئے مجھے بڑی جدوجہد کرنا پڑی تھی۔ زندگی کا یہ نیا دور آزمائش، تکالیف اور دکھ کے لمحات سے عبارت تھا۔ آج بھی میرا ٹھکانا آسمان کے نیچے یہ زمین ہے۔ اور نئی لبستی کے ابتدائی دنوں میں بھی میں نے بے شمار راتیں آسمان پر چمکتے ہوئے تاروں کو دیکھتے ہوئے گذاری تھیں۔ میں فٹ پاتھوں اور جھگیوں میں رہا۔ رفتہ رفتہ میں نے اس نئی لبستی میں ایک گھر بنا لیا۔ اور اپنی زندگی کے ہر سانس کے ساتھ میں اس گھر کی خوبصورتی اور دیدہ زیبی میں اضافہ کرتا رہا۔ میرا یہ گھر اس نئی لبستی میں دھیرے دھیرے ابھرا تھا اور میں نے اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر اس مکان کی تعمیر کی تھی۔ مگر جب وہ وبا پھیلی تو اس نے لبستی کے پرانے باشندوں کے دلوں میں نفرت کے پودے کو تناور درخت بنا دیا۔ ان کا خیال تھا کہ اس نئی لبستی میں میرے ہاتھ الہ دین کا چراغ لگ گیا تھا۔ اور انہوں نے مجھے سب چیزوں سے محروم کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ لبستی کا کوئی بھی قدیم باشندہ میرے مکان میں رہنے اور دفتر میں میری کرسی پر بیٹھنے کا حقدار تھا۔

اس وبا میں جس میں تمام قدریں مرتی جا رہی تھیں۔ میں کوشش کے باوجود اپنے پاؤں زمین پر جمائے نہ رکھ سکا۔

پھر وہ میرا امتحان لینے بیٹھے۔ میرا خیال تھا کہ اس تمام عرصے میں نئی لبستی کی زمین کی خوشبو نے پرانی خوشبو کو ختم کر دیا ہوگا۔ میرے روئیں روئیں سے نئی زمین کی خوشبو آرہی تھی، مگر ان لوگوں کے نزدیک یہ خوشبو غیر معتبر ٹھہری۔

چنانچہ اس قیامت خیز طوفان نے مجھے اس لبستی سے باہر نکال دیا۔

اب میں دوسری لبستی میں چلا آیا۔

میری زندگی پر ایک سرد اور یخ لبستہ رات طاری ہے۔ سب لوگ یہاں اپنے اپنے قبیلوں کے ساتھ ہیں

ان کے بدنوں سے اس زمین کی خوشبو آتی ہے۔ وہ سب لوگ اپنے اپنے آرام دہ گھروں میں موسم کی شدت سے بے نیاز رہیں گے،

"تم بستی میں کس لئے آگئے ہو؟"

اس لئے کہ دونوں بستیوں کے در ہمیشہ کے لئے بند ہو چکے ہیں۔ میرے پاس میری پچھلی خوشبو باقی نہیں رہی۔ اسے عقائد کی تیز ہوا اڑا کر لے گئی ہے۔ مگر شاید خوشبو کبھی جدا نہیں ہوتی۔ ہاں کبھی کبھی ہم اپنے اپنے مفادات کی خاطر اسے غیر معتبر قرار دے سکتے ہیں۔ میں نے اپنی سب سے پہلی خوشبو کو شعوری طور پر خود سے جدا کیا تھا اور اب نئی خوشبو کی تلاش میں ہوں۔ میرا مطلب ہے خوشبو تو میرے پاس ہے اس بازار میں اس کو قیمتی جنس تسلیم کر لیا جائے۔

مگر اس یخ بستہ رات میں تو تم ٹھٹھر کر مر جاؤ گے، اسی نادیدہ قوت نے اس سے کہا،

" نہیں اگر لاکھوں برقی قمقموں سے روشن گھر میں بھی رہوں تو میرا ماضی کا المناک تجربہ مجھے اس روشنی سے پوری طرح آسودہ نہیں ہونے دے گا، میری اوّلین خواہش یہی ہے کہ میرے جسم سے اس نئی دھرتی کی خوشبو آنے لگے۔ اس کے بعد ہی اب میں کچھ سوچ سکتا ہوں۔

مگر اس انتظار میں تو کئی نسلوں کو اجنبیوں کی طرح اور بغیر خوشبو کے جینا پڑتا ہے۔ ہاں اگر یہ خوشبو قیمتاً ملے تو میں اس کی قیمت میں اپنا سب کچھ دینے کو تیار رہوں،

یہ خوشبو، سونے چاندی سے نہیں مل سکتی، تم اس بستی کے کسی بھی روشن گھر میں چلے جاؤ، وہ تمہیں قبول کر لیں گے، نادیدہ قوت نے اس کو مشورہ دیا۔ جاؤ جاؤ خوفزدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آدمی کی زندگی کا چراغ تیز و تند ہواؤں میں جلتا ہی رہتا ہے۔ تم بے دھڑک اس بستی کے کسی گھر میں چلے جاؤ۔

وہ جو ماضی کے تجربات سے خائف تھا۔۔۔ اس نادیدہ قوت کے اشارے پر اس سرد اور یخ بستہ رات میں بھیگی ہوئی سڑک پر چلتا ہوا۔ روشن مکانوں کی قطاروں کی طرف چلتا گیا۔ اس کے لئے پہلے ہی ایک دروازہ وا تھا۔

"آؤ دوست آؤ"

کیا میں دوستوں کے درمیان آپہنچا ہوں۔ بیپڑی جمے ہونٹوں سے آواز نکلی۔ جو ساری بستی میں اس کی آمد کی اطلاع بن گئی۔ اس کے سرد ہاتھ نے گرم ہاتھوں کی حدت محسوس کی۔

"میں تمہاری آنکھوں میں پنہاں سوال سے واقف ہوں۔ میں اس نادیدہ قوت کا ایک حصہ ہوں اور تم بھی ہم سب جن کے دلوں میں اس نے اپنی مہربانی سے محبتوں کے چراغ روشن کر رکھے ہیں۔ یہاں پانی تمہارے پاؤں کے نیچے نہیں پھیلے گا۔ اور یہاں کی زمین تمہیں شاید فکر زدہ اور اپنی گرفت چھوڑتی ہوئی محسوس ہو مگر حقیقت اس سے مختلف ہوگی۔"

روشن گھر کے مکین نے کہنا شروع کیا "میں اپنے اجداد کے خوف کو محسوس کر سکتا ہوں وہ بھی تمہاری طرح خوف اور اندیشوں سے دوچار ہوئے ہوں گے جب پہلے پہل آکر انہوں نے اس دھرتی پر پڑاؤ کیا ہوگا مگر شاید اس زمانے میں پرانے مکینوں کے پاس اصطلاحات کا وہ ذخیرہ نہ تھا کہ جن کو استعمال کر کے وہ میرے خاندان کے افراد کو تھکا سکتے۔ ہاں نئے پن کا ایک احساس اور ایک خوف ضرور شروع شروع میں انہیں رہا ہوگا جس خود اعتمادی کے ساتھ آج میں اس دھرتی پر چلتا ہوں۔ وہ میرے خاندان کے اس فرد کے حصے میں نہ آئی ہوگی جو سب سے پہلے اس جگہ رہنے آیا تھا۔"

"مگر تم اپنی خوشبو کا ذکر لے بیٹھے۔ مجھے پناہ دو۔ یہ سرد یخ بستہ رات مجھے مارے ڈال رہی ہے۔"

"تم زندہ رہو گے۔ ہاں تمہیں اس عمل سے گزرنا پڑے گا۔ اور شاید تمہارے بعد ایک آدھ نسل کو اور مگر چھوڑو ان باتوں کو۔ آؤ اس گھر کے کمروں کی خوشگوار حدت تمہاری منتظر ہے۔ میری آغوش تمہارے لئے وا ہے اور جو بھی تاریخ کے اس عمل سے اور انسانوں کی بے بسی اور بدنصیبیوں سے آگاہ ہوگا تمہیں اس کی آغوش اپنے لئے وا ہی ملے گی۔"

"تم نے طویل رات کا ایک لمبا حصہ بے آرامی، موسم کے شدائد اور دکھ میں گزار دیا ہے۔ اب صبح کی آمد سے پہلے کے یہ چند گھنٹے تمہارے لئے آرام بن کر آ رہے ہیں۔ روشنیوں سے گھرے ان نرم اور آرام دہ مکانوں میں تمہارے لئے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اس زمین پر زندگی بسر کرنے والی میری پچھلی نسلوں کی خوشبو اس مکان کو اپنی حفاظت میں لئے ہوئے ہیں۔ وہ دن دور نہیں ہے جب تمہارے بدن سے بھی اس زمین کی خوشبو آنے لگے گی۔ سپیدۂ سحر کے ظہور تک وہ مکان روشنیوں سے منور رہتے۔"

تقی حسین خسرو

پُل کے اُس پار

شروع ہی سے مجھے تاریخ سے دلچسپی رہی تھی۔ اور میں تاریخ بہت جی لگا کر پڑھتا تھا۔ دوسرے مضامین کے پریئڈز میں تو میں اپنی جماعت سے غیر حاضر رہ سکتا تھا۔ اور سچ پوچھئے تو رہتا تھا۔ کیونکہ مجھے اسپورٹس سے بھی تو دلچسپی تھی، اور جب میں کھیل کے میدان میں ہوتا تو پھر مجھے کچھ یاد تو نہ رہتا۔ میں کھیل میں اُسی طرح ڈوب جاتا جیسا آرٹسٹ یا فن کار، آرٹ یا فن کی تخلیق میں ڈوب جاتے ہیں، اور پھر انہیں اپنے گرد و پیش کی کوئی خبر نہیں رہتی۔ لیکن تاریخ کے مضمون میں میرے لئے کھیل سے زیادہ دلچسپی تھی۔ شاید اگلے زمانوں سے میرا کوئی تعلق تھا۔ شاید تاریخ کے پریئڈ میں اُس تعلق کی تجدید ہو جاتی تھی۔ اور میں بیچ میں حائل زمانوں کو عبور کر کے ایک بار پھر اپنے آپ کو پا لیتا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میں ٹائم ٹیبل میں تاریخ کے پیریڈ کے نیچے سُرخ روشنائی سے نشان لگا لیتا تھا۔ ہفتے میں تین دن تاریخ کا پیریڈ ہوتا تھا۔ اور وہ تینوں دن میری کاپی کی پُشت پر ٹائم ٹیبل کے خانوں میں بالکل اُسی طرح اُبھرے نظر آتے۔ جیسا انسانی تاریخ کے جنگل میں وہ دور جب انسان نے جنگل کو کاٹ کر آفتاب کی روشنی سے اور ماہتاب کی چاندنی سے آشنائی پیدا کی۔ تاریخ کے پیریڈ کے نیچے کھنچی وہ سُرخ لکیر شاید میرے لئے روشنی کی وہ کرن تھی جو میرے وجود کے جنگل میں بے محابا در آئی تھی۔

تاریخ حالاں کہ بہت ہی عجیب مضمون ہے۔ عجیب اس طرح کہ اس کا طالب علم کسی بھی مضمون کے طالب علم سے زیادہ صفحات سیاہ کرتا ہے۔ اور اس میں ظاہر ہے نہ صرف روشنائی زیادہ صرف ہوتی ہے، بلکہ ڈھیروں خون بھی پسینے میں شامل ہو جاتا ہے۔ مگر معاوضہ بہت ہی حوصلہ شکن ہوتا ہے۔ ممتحن نہیں معلوم کیوں تاریخ کے پرچے پر نمبر دیتے وقت اپنے تاریخی شعور کا ثبوت نہیں دیتے۔ نتیجتاً تاریخ کا طالب علم کسی دوسرے مضمون کے طالب علم کے مقابلے میں صدمہ پہنچنے کی حد تک گھاٹے میں رہتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ عاقبت اندیش طلباً

ع پسند کہلانا کبھی پسند نہیں کرتے، اس لئے اُنہیں جغرافیہ ہی کیوں نہ پڑھنا پڑے۔ لیکن میرا تاریخ سے عشق،
وزیاں کے اندیشوں سے بہت بلند تھا۔ میں نے نہ صرف یہ کہ ابتدائی اور ثانوی جماعتوں میں تاریخ میں نام پیدا
ائی تعلیم کے لئے بھی تاریخ کا انتخاب کیا۔ میری تاریخ سے اسی دلچسپی کی بناء پر میرے اساتذہ اور ساتھی تنقید
تے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ مجھے بھی آگے چل کر کارلائل کی طرح اِس کا احساس ہوا تھا کہ تمام انسانی تاریخ
چند عظیم شخصیتوں کی سوانح سے عبارت ہے۔ اس انکشاف سے مجھے ایک ذہنی جھٹکا لگا تھا اور ایک لمحہ
ہ لگا تھا جیسے میں نے اپنی تمام عمر ایک ایسے مضمون کے پڑھنے اور سمجھنے میں ضائع کی جس کے صفحات پر انسان
ت انسان شاید ہی کہیں نظر آتا ہے۔ وہ یا تو شہنشاہ یا بادشاہ ہے جس کے جلال و جبروت سے ایک خلق
زاں ہے۔ یا پھر کوئی فوجی جرنیل جس کی تلوار خوں آشام بے شمار مظلوم انسانوں کے سروں پر لہراتی نظر
ے۔ پھر میں کسی بادشاہ یا شہنشاہ کی بنائی ہوئی کوئی قدیم اور عظیم تاریخی عمارت دیکھتا تو مجھے اُس عظیم طاقتور
مور شہنشاہ سے زیادہ جس نے وہ خوبصورت تعمیر کروا کے اپنے بہترین تعمیری شعور کا ثبوت دیا تھا،
ر کمزور اور گمنام مزدور یاد آتے جنہوں نے اُس عمارت کے لئے اینٹیں اور مٹی ڈھوئی تھیں۔ ظاہر ہے
ارت کے خمیر میں کسی شہنشاہ کے تعمیری ذوق سے زیادہ اُن مزدوروں کا پسینہ شامل تھا۔ لیکن کسی
ریخ میں اُن بے شمار پسینے میں نہائے مزدوروں میں سے کسی ایک کا نام بھی محفوظ نظر نہیں آتا، اور نہ اُن کا
ے فوٹو! ہو سکتا ہے میرا یہ احساس عصری تقاضوں کا دین ہو۔ لیکن عصری تقاضے تو ہر دور میں موجود
ہیں۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کے زمانے میں بھی اور اس زمانے میں بھی۔ خیر چھوڑئیے اس بات کو۔ میں تو آپ
اُس پُل کے بارے میں بتانا چاہتا تھا اس پُل کے بارے میں جس کے اُس پار وقت کی رفتار تیز تھی۔ مجھے پُل
پار جانا تھا۔ میں کبھی پُل کے اس پار پہنچ کر ذی شرف لوگوں میں شامل ہو جانا چاہتا تھا۔ لیکن اب میں اُس
خائف تھا۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو میں اُس پُل کی جانب ایک قدم بھی آگے نہ بڑھاتا۔ لیکن میرے پاؤں میں
لگے تھے۔ اور کوئی مجھے پیچھے سے دھکا دے رہا تھا۔ اب! ——— جب کہ ہر لمحہ میرا اُس پُل
سلہ کم ہوتا جا رہا تھا، کاش مجھے کوئی رہنما، کوئی رہبر کوئی میر کارواں مل جائے جو میرا ہاتھ تھام کر مجھے
س کے پار پہنچا دے! .... لیکن یہ پُل شاید میرے تاریخی شعور کی ہی عطا تھا۔
کیوں کہ تاریخ سے میری آشنائی صرف کتابوں کے واسطے سے نہیں تھی۔ میں نے تاریخ کو پتھر، مٹی، چونا
ے میں منجمد دیکھا تھا۔ اور اُس کے ٹھنڈے سنگ بستہ وجود کو محسوس بھی کیا تھا۔ سینکڑوں برس پرانی

عمارتوں کے سائے کتنے ٹھنڈے ہوتے ہیں! تپتی ہوئی دوپہر کی جھلسا دینے والی کیفیت ہو کہ جس کا انکسارات کی گراں جانی! صدیوں پرانی عمارتوں کے سائے میں پہنچ کر فریج میں رکھی ہوئی اشیاء کی طرح ایک ہی درجہ حرارت کے زیر اثر آجاتی ہے۔ پھر نہ تو تپتی ہوئی دوپہر کا مسئلہ رہتا ہے اور نہ جس کا انکسارات! شاید یہی وجہ تھی کہ میں رمضان میں اکثر اپنے دوستوں کے آگے قطب شاہی گنبدوں کی سیر کا پروگرام رکھا کرتا تھا۔ ان دنوں رمضان گرمیوں میں آتے تھے۔ اور میرے دوست میرا دل رکھنے کے لئے سخت گرمی میں روزے کی حالت میں اس صعوبت کو برداشت کرنے کے لئے تیار ہوتے جو طویل راستوں میں سیکل چلانے سے ہو سکتی ہے۔ پھر ہر ایک کے پاس سیکل بھی نہیں ہوتی۔ جس کے پاس سیکل نہیں ہوتی اُس کو کوئی دوست اپنے ساتھ اپنی سیکل پر بٹھا لیتا۔ کتنے پیارے اور کتنے خوبصورت دوست تھے میرے! پھر جب ہم ہانپتے کانپتے گنبدوں کے سائے میں پہنچ جاتے تو جیسے دلوں سے دفعتاً تھکن کا بوجھ اُتر جاتا۔ قلی قطب شاہ کے مقبرے کا چبوترہ تمام مقبروں میں سب سے اونچا اور وسیع تھا۔ اور اُس پر بلند و بالا گنبد تمام گنبدوں میں بڑا اور پرشکوہ! بالکل اُسی طرح جیسا اُس کی شخصیت قطب شاہی بادشاہوں میں قد آور اور نمایاں تھی۔ ہم اس چبوترے پر چڑھتے تو ایک عجیب بلندی کا احساس ہوتا! اور لگتا جیسے تمام فضا ذکر سخن میں معروف ہو۔ قلی قطب شاہ کا ایک دیوان تو وہ تھا جس کو اردو شاعری کا پہلا دیوان ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ اور ایک دیوان وہ جس کو میں زیر ترتیب دیکھ رہا تھا۔ لیکن موخر الذکر دیوان اوّل اور آخر کی سرحدوں سے ورے تھا۔ اس کی تحریر کے لئے کاغذ اور قلم کی حاجت بھی نہیں تھی، پھر میں مقبرہ کی دیوار کا سہارا لے کر ایسے بیٹھ جاتا کہ اپنا بایاں گال دیوار سے لگا دیتا۔ ٹھنڈی سنگ بستہ دیوار کے خواب آور لمس سے میری آنکھیں بند ہو جاتیں۔ اور پھر میں گویا پُل کے اُس پار پہنچ جاتا۔ پُل کے اس پار جہاں وقت کی رفتار تیز تھی ۔ جب میرے دوست مجھے جگاتے تو مجھے ایسا لگتا جیسے مجھے آنکھیں بند کئے ہوئے ایک لمحہ ہی تو ہوا تھا۔ میرے دوست شربت کے گلاس پر گلاس لنڈھا رہے ہوتے ——— ، قلی قطب شاہ کی شعر و سخن کی محفل میں جس میں، میں ابھی لمحہ بھر پہلے شریک تھا اسی طرح سر شام جام پر جام پئے جارہے تھے کہ فروغ سخن کے لئے ایسا کرنا ناگزیر ہے۔ پھر میں برداشت نہ کر سکتا۔ اور اپنی جانب بڑھتے ہوئے اُس ہاتھ کو چوم لیتا جس میں میرے لئے شربت کا گلاس ہوتا۔

پتھر کے واسطے سے میری تاریخ سے آشنائی ایلورہ کے غاروں میں بھی ہوئی تھی ۔ لیکن اس وقت میں ابھی چھوٹا تھا۔ ابھی میرا شعور پوری طرح بیدار نہیں ہوا تھا۔ میں اپنے ماموں زاد بھائی کے ساتھ گیا تھا۔ ان کے

ان کا ایک دوست بھی تھا۔ اُن دونوں کی باتیں میرے لئے غیر دلچسپ تھیں۔ اس کی وجہ وہ عمر کا فرق تھا جو اُن کے اور میرے بیچ حائل تھا۔ ہم بس سے گئے اور بس سے ہی واپس آنا تھا۔ ان دو بسوں کے درمیان اتنا وقت نہیں تھا کہ ہم سب غاروں کی زیارت کا شرف حاصل کر سکتے۔ میرے ماموں زاد بھائی اور اُن کے دوست مجھے غار کے باہر سے آوازیں دیتے اور میں با دلِ ناخواستہ غار سے باہر نکلتا۔ ایک بار وہ جھنجھلا کر پلٹ پڑے تھے۔ شاید بس کا وقت قریب آ رہا تھا اور ہمیں شاید ابھی تین یا چار غار اور دیکھنے تھے۔ پھر تو اُنہوں نے مجھے سختی سے ڈانٹا تھا۔ اُن کی دانست میں میں یقیناً بے وقوفی کا مرتکب ہوا تھا۔ اُنہوں نے مجھے غار کے وسط میں صدیوں سے گیان دھیان میں مصروف گوتم کی بڑی سی مورتی کے سامنے خود بھی گیان دھیان میں مصروف دیکھ لیا تھا۔ میں نے گوتم ہی کی طرح آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اور بالکل اُسی کی طرح آلتی پالتی مار کر بیٹھا تھا۔ میں لمحہ بھر کے لئے غار کی اُسی نیم تاریک فضا سے گوتم کی معیت میں پُل کے اُس پار پہنچ گیا تھا۔ پُل کے اُس پار جہاں وقت کی رفتار تیز تھی! اور گوتم کے بڈھا بننے کے سفر میں اس کا شریک ہو گیا تھا۔ پھر میں اپنے ماموں زاد بھائی کے جگانے پر جاگا تھا۔ اور گوتم ہی کی طرح جس کو اُس کے صدیوں کے گیان دھیان سے جگا دیا گیا ہو سخت جھنجھلاہٹ محسوس کی تھی۔ لیکن بہر حال میں گوتم نہیں تھا۔ چنانچہ اس وقت نہ تو میں اپنے اُس تجربے کو سمجھ پایا تھا اور نہ اُس مداخلت پر اپنی جھنجھلاہٹ اظہار ہی کر سکا تھا

پھر میں نے پتھر کے دور سے گویا ایک قدم آگے بڑھایا تھا۔ یہیں میں نے ایک جست لگائی تھی اور بیچ میں حائل زمانوں کو عبور کر کے دفعتاً گوشت پوست، خد و خال اور قامت زیبا کے حوالے سے تاریخ سے آشنائی پیدا کی تھی۔ لیکن سچ پوچھیے تو اس میں میری اپنی مساعی کو بالکل دخل نہیں تھا۔ میں نے تو صرف اتنا کیا تھا کہ اپنے سامنے مسہری کے وسط میں بیٹھی ہوئی لڑکی کا گھونگھٹ اُلٹ دیا تھا۔ لیکن گھونگھٹ اُلٹنے سے پہلے میں اُس کو بڑی دیر تک مسہری کے وسط میں ایک گٹھری کی شکل میں بیٹھا دیکھتا رہا تھا۔ مجھے لڑکی کا اس طرح سمٹ کر بیٹھنا بہت اچھا لگتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ لڑکی اپنی تمام زندگی میں صرف ایک بار اس طرح سمٹ کر بیٹھتی ہے۔ پھر اُس کے پھیلنے کے دن آجاتے ہیں۔ اور وہ پھیلتی ہی چلی جاتی ہے، پہلے بیوی کی حیثیت سے اور پھر ماں کی حیثیت سے۔ میں نے اپنی تینوں بھابیوں کو اسی طرح سمٹ کر مسہری کے وسط میں بیٹھے دیکھا تھا۔ پھر وہ پھیلتی ہی چلی گئی تھیں۔ اب مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ یہ پھیلی پھیلائی عورتیں وہی لڑکی تھیں جنہیں میں نے مسہری کے وسط میں سمٹ کر بیٹھے دیکھا تھا جب تک وہ مسہری کے وسط میں بیٹھی رہی تھیں میں نے مسہری کے وسط میں سمٹ کر بیٹھے دیکھا تھا۔ جب تک وہ مسہری کے وسط میں بیٹھی رہی تھیں۔ میں انہیں دیکھتا رہا تھا۔ میں ایک لمحہ کے لئے بھی مسہری کے پاس سے ہٹا نہیں تھا۔ آخر خواتین نے مجھے کمرہ سے دھکّے دے کر نکال دیا تھا۔ لیکن اب مجھے دھکّے دے کر نکال دیئے جانے کا کوئی ڈر نہیں تھا۔ برخلاف

اس کے مجھے اُلٹا دھکّے دے کر کمرہ میں پہنچایا گیا تھا۔ اور میرے پیچھے دروازہ بھی بند ہو چکا تھا، چنانچہ میں مسہری کے پاس کھڑا اُس لڑکی کو جو گٹھڑی کی شکل میں مسہری کے وسط میں سمٹ کر بیٹھی تھی دیکھتا رہا تھا، نہیں معلوم کیوں مجھے اس کا گھونگھٹ الٹنے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی تھی کہ میں نے بے شمار لڑکیاں دیکھی تھیں۔ اگر آپ بھی موٹر نشین ہوں تو آپ نے بھی بے شمار لڑکیاں دیکھی ہوں گی۔ اور آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ تقریباً سب ہی لڑکیاں آپ سے زیادہ آپ کی موٹر سے عشق کرتی ہیں، اور آپ کو اپنے اور موٹر کے درمیان ایک پُل سمجھتی ہیں۔ آپ میری ہی طرح اپنے پُل ہونے کے منصب کو نبھانا بھی خوب جانتے ہوں گے۔ میں کسی پُل ہی کی طرح جانتا تھا کہ گاڑی بھاری ہو کہ ہلکی بنیادی طور پر ایک جیسی ہوتی ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ مجھے گھونگھٹ الٹنے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ میں نے شادی سے پہلے بھی نہ تو لڑکی کو دیکھنے کا تقاضہ کیا تھا اور نہ لڑکی کا فوٹو ہی دیکھا تھا۔ گھر والوں نے کہا بھی تھا کہ لیکن میں نے ٹال دیا تھا۔ اس کی وجہ وہی تھی کہ میں جانتا تھا گاڑی بھاری ہو کہ ہلکی بنیادی طور پر ایک جیسی ہوتی ہے۔ مجھے مسہری کے ساتھ کھڑے ہوئے نہیں معلوم کتنی دیر ہو گئی تھی؟ آخر میں نے محسوس کیا تھا کہ اُس سمٹی ہوئی گٹھڑی میں حرکت ہوئی تھی۔ وہ شاید سمٹ کر بیٹھے بیٹھے تھک گئی تھی۔ مجھے اس پر رحم آ گیا تھا۔ بالکل اُسی طرح جیسا سڑک کے کنارے کھڑی اُس لڑکی پر مجھے رحم آ جاتا تھا جو میری موٹر کو اُسی طرح للچائی نظروں سے دیکھتی جیسا کوئی نادیدہ شخص شوکیس میں رکھی کھانے پینے کی اشیاء کو دیکھتا ہے۔ میں نے بڑھ کر دفعتاً اُس کا گھونگھٹ اُلٹ دیا تھا۔ میں نے گویا سڑک کے کنارے اپنی موٹر روک لی تھی۔ مگر وہ لڑکی! ...... میرے بڑھے ہوئے ہاتھ رُک گئے......... لڑکی ہونے کے باوجود کتنی مختلف تھی! ویسی ہی مختلف جیسا قطب مینار بنیادی طور پر عمارت ہونے کے باوجود ماڈرن اِسکائی اسکریپرز سے مختلف ہے۔ پچھلے کچھ دنوں سے میری تاریخ سے دلچسپی میں یقیناً کچھ فرق آ گیا تھا۔ حالاں کہ میں یونیورسٹی میں فلسفہ تاریخ پڑھاتا تھا، لیکن پڑھانا، پڑھانے والے کی دلچسپی کے ساتھ ساتھ پڑھنے والوں کی دلچسپی پر بھی منحصر ہوتا ہے۔ ابتدا میں لڑکوں کی تاریخ سے بے اعتنائی میرے لئے حیرت کا باعث تھی۔ لیکن پھر رفتہ رفتہ میں اس کا عادی ہو گیا تھا۔ اب تاریخی عمارتوں کے سال خوردہ کھنڈروں سے زیادہ میری توجہ کا مرکز ماڈرن اِسکائی اسکریپرز بن گئے تھے۔ اب چم چم کرتی دکانیں مائل بہ التفات سیلز گرلز، برق رفتار لفٹ اور خودکار زینوں نے مجھے اپنے ماضی سے بہت دور کر دیا تھا۔ ماضی! جہاں قطب شاہی گنبدوں کے ٹھنڈے سائے تھے اور ایلورہ کے غاروں کی نیم تاریک خواب آور فضا! ـــــــ مگر مسہری کے وسط میں سمٹ کر بیٹھی ہوئی اُس لڑکی کا گھونگھٹ اُلٹ کر

میں نے گویا اُس دبیز پردے کو دفعتاً چاک کر دیا تھا جو پچھلے کچھ دنوں سے میرے اور میرے ماضی کے بیچ حائل ہوگیا تھا۔ مجھے لگا تھا جیسے میں گرمی کے موسم میں روزے کی حالت میں سیکل پر ایک طویل راستے کو عبور کرکے قطب شاہی گنبدوں کے ٹھنڈے سائے میں پہنچ گیا ہوں اور قُلی قطب شاہ کے پُرشکوہ مقبرے کے چبوترے پر کھڑا ایک عجیب سی بلندی محسوس کر رہا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا گویا تمام فضا فکر سخن میں مصروف ہو۔ اُس لڑکی کے خوبصورت چہرے میں نہیں معلوم کیا بات تھی؟ لانبی لانبی پلکیں، موٹی موٹی غلافی آنکھیں، سیاہ گہری بھویں، پتلے پتلے ہونٹ، اور بیضوی چہرہ! گویا وہ بہت خوبصورت تھی۔ مگر اس خوبصورتی میں شاید کوندے کی وہ لپک نہیں تھی جو رگوں میں بہتے لہو کو کسی تیز رو، منہ زور دریا میں بدل دے۔ اس خوبصورتی میں صدیوں پرانی چاندنی کی وہ خنکی اور ٹھنڈک تھی جو ماضی کے اتھاہ سمندر میں اُتر جانے کی دعوت دیتی ہے۔ میرے لئے یہ دعوت کتنی خوش آیند تھی! میں نے گویا بیچ میں حائل زمانوں کو عبور کرکے ایک بار پھر خود کو پا لیا تھا۔ مجھے گویا ایلورہ کے غاروں میں غار کے وسط میں صدیوں سے گیان دھیان میں مصروف گوتم کی مورتی نے غار کے اندر روک لیا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ قُلی قطب شاہ کے مقبرے کے ٹھنڈے سائے میں مقبرہ کی دیوار کا سہارا لے کر ایسے بیٹھ جاؤں کہ میرا بایاں گال مقبرہ کی دیوار کے ساتھ لگا رہے ——— میں مسہری پر بیٹھ گیا تھا۔ اور میں نے اپنا سر مسہری کے وسط میں سمٹ کر بیٹھی ہوئی لڑکی کی گود میں رکھ دیا تھا۔ مقبرہ کی دیوار کے ٹھنڈے لمس سے میری آنکھیں بند ہوگئیں اور پھر میں پُل کے اُس پار پہنچ گیا تھا۔ پُل کے اُس پار جہاں وقت کی رفتار تیز تھی!

میں پورے ایک سال تک راحیلہ کی گود میں سر رکھے سوتا رہا تھا۔ راحیلہ جو میری بیوی تھی۔ منکوحہ بیوی! ——— ماضی سے میرے تعلق کی ایسی تجدید اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ پھر میں سب کچھ بھول گیا تھا۔ اب مجھے سڑک کے کنارے کھڑی وہ لڑکیاں بھی اپنی جانب متوجہ نہ کر سکتیں جو میری موٹر کو ایسی نظروں سے دیکھتیں جیسا کوئی نادیدہ شخص شوکیس میں رکھی خورد نی اشیاء کو دیکھتا ہے۔ اب مجھے ماڈرن اِسکائی اسکریپرز بھی اپنی جانب متوجہ نہ کر سکتے۔ نہ جھم جھم کرتی دکانیں، نہ مائل بہ التفات سیلز گرلز، نہ برق رفتار لفٹ اور نہ خودکار زینے۔ اب گویا میرا رشتہ حال سے بالکل ٹوٹ چکا تھا۔ میں اس دوران میں یونیورسٹی جاتا رہا تھا۔ لیکن میں کوشش کرتا تھا کہ جلد از جلد گھر واپس پہنچ جاؤں، میں گھر جلد واپس پہنچنا اسی طرح نہیں بھولتا تھا۔ جیسا میں طالب علمی کے زمانے میں اپنی کاپی کے پُشت پر ٹائم ٹیبل کے خانوں میں اُبھرے ہوئے تاریخ کے پیریڈز کو نہیں بھولتا تھا۔ تاریخ کے پیریڈز جن کے نیچے کھینچی سرخ لکیر میرے لئے روشنی کی وہ کرن تھی جو میرے وجود کے جنگل میں بے محابا

در آئی تھی۔

روحیلہ نے میرے اس رویئے کی کبھی مجھ سے شکایت نہیں کی۔ بلکہ میرے ساتھ اسی طرح تمام لگن اور توجہ سے پیش آتی رہی جیسا لڑکیاں اپنے نئے نئے دُلہا کے پیش آتی ہیں۔ اور میں!.......... میں اس دوران میں کبھی ایلورہ کے غاروں کی نیم تاریک فضا میں گوتم کے ساتھ گیان دھیان میں مصروف رہتا۔ تو کبھی قُلی قطب شاہ کی شعروسخن کی محفلوں میں شریک!۔۔شعروسخن کی محفلیں جہاں سرِشام جام پر جام لُنڈھائے جاتے۔ میں کبھی قُلقُل کی آواز پر رقص کرتا تو کبھی پرتوئے کی مثال طواف جام!..... جب میں راحیلہ کی گود میں سر رکھے پل کے اُس پار پہنچ جاتا۔ پل کے اُس پار جہاں وقت کی رفتار تیز تھی!——— تو راحیلہ نہیں معلوم کب میرا سر آہستہ سے اپنی گود سے اُٹھا کر تکیے پر رکھ دیتی۔ وہ میری بیوی تھی۔ منکوحہ بیوی! لیکن میرا اس سے تعلق بس تاریخی تعلق تھا۔ وہی تعلق جو کبھی نیم تاریک ایلورہ کے غاروں کے وسط میں صدیوں سے گیان دھیان میں معروف گوتم کی مورتی سے تھا——— یا پھر قلی قطب شاہ کے پُرشکوہ مقبرہ کے چبوترے کی بلندیوں، فکرِسخن میں ڈوبی ہوئی فضاؤں اور ٹھنڈی دیواروں سے!

لیکن پھر راحیلہ مجھ سے ناراض ہوگئی تھی۔ ایک دن جب میں یونیورسٹی سے واپس آیا تو وہ اپنے میکے جا چکی تھی۔ میں سیدھے اس کے میکے پہنچا تھا۔ لیکن اس نے مجھ سے ملنے سے انکار کر دیا تھا۔ میں نے اُس سے ملنے کی دو چار بار اور کوشش کی تھی۔ لیکن ہر دفعہ ناکامی ہوئی تھی۔ پھر تو اُس نے مستقل طور پر مجھ سے ناطہ توڑ لیا تھا۔ میں کچھ دنوں سخت پریشان رہا تھا، پھر رفتہ رفتہ اُس تیز رو، منہ زور دریا کی لہروں نے مجھے اپنی جانب متوجہ کر لیا تھا جس کا نام حال ہے۔ اب ایک بار پھر میں اُن لڑکیوں کے لئے ایک پل گیا تھا جو مجھ سے زیادہ میری موٹر سے عشق کرتی تھیں۔ ایک بار پھر کسی پل ہی کی طرح مجھے اس کا احساس ہوا تھا کہ گاڑی بھاری ہو کر ہلکی بنیادی طور پر ایک جیسی ہوتی ہے۔ اب ایک بار پھر میں سال خوردہ تاریخی عمارتوں کے ٹھنڈے سایوں سے دور..... ماڈرن اِسکائی اسکریپرز، جَگمَگ کرتی دکانوں، برق رفتار لفٹ اور خودکار زینوں کے بیچ گھر گیا تھا۔ لیکن جب مجھے یہ پتہ چلا کہ راحیلہ اپنی اُس توہین کو برداشت نہ کرسکتی تھی۔ اور بیمار ہو کر اس دنیائے آب و گل سے دور چلی گئی تھی تو اِس خبر نے میری بنیادیں ہلادی تھیں، میں نے خود کو شدت سے مجرم محسوس کیا تھا۔ اور آخر جُرم کے احساس سے نجات حاصل کرنے کے لئے میں نے ملک چھوڑ دیا تھا پھر میں نے پورے دس برس تک دیس دیس کی خاک چھانی تھی لیکن جس میں

میں بھی گیا۔ وہاں اپنے تمام تاریخی شعور کے باوجود اُس ملک کے تاریخی مقامات سے گریزاں رہا تھا۔ اور کوشش کی تھی کہ اپنا تمام وقت ماڈرن اسکائی اسکریپرز، جھم جھم کرتی دکانوں، مائل بہ التفاقات سیلز گرلز، برق رفتار لفٹ اور خود کار زینوں کے بیچ گزار دوں۔ میں اپنی اِس کوشش میں کامیاب بھی ہو گیا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ میرا حال اس ڈرگ رڈکٹ DRUG ADDICT کا سا ہوتا گیا جو خود کو بھلا دینے کی کوشش میں ڈرگ کی مقدار بڑھاتا چلا جاتا ہے۔ پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ ڈرگ کی کوئی بھی مقدار اُس کی اس کوشش میں اُس کی معاون ثابت نہیں ہوتی۔ میں گویا پورے دس برس تک اپنے آپ سے برسرپیکار رہا تھا۔ لیکن کب تک!۔ میں شاید اندر سے ٹوٹ گیا تھا۔ اب ماڈرن اسکائی اسکریپرز بھی مجھے صدیوں پرانے قطب شاہی مقبروں کی طرح سال خوردہ لگتے اور اُن کے سائے مقبروں کے سایوں کی طرح ٹھنڈے! اور جھم جھم کرتی دکانیں، ایلورہ کے غاروں کی طرح تاریک! میں گھبرا کر دنیا کے فیشن ایبل ترین شاپنگ سینٹرز کا رخ کرتا۔ لیکن ہر جگہ صدیوں پرانے سال خوردہ کھنڈر مجھے اپنی راہ میں حائل نظر آتے۔ میں بالآخر اپنے ملک واپس آیا تھا۔

ملک میں قدم رکھتے ہی جو سب سے پہلا کام میں نے کیا تھا وہ یہ کہ اس قبرستان کا پتہ کیا تھا جہاں راحیلہ کی قبر تھی، راحیلہ جس کو قسمت نے میری بیوی بنا کر میرے گھر بھیجا تھا۔ لیکن میں اُس کا شوہر نہ بن سکا تھا۔۔ راحیلہ نے پورا ایک سال میرا انتظار کیا تھا۔ لیکن میں تو اس دوران میں اُس کی گود میں سر رکھے سوتا رہا تھا۔

جب میں راحیلہ کی قبر پر پہنچا تو مجھے لگا جیسے دس سال کا طویل عرصہ پلک جھپکتے میں گزر گیا تھا لیکن! ——— لیکن یہی دس سال میں نے کس مشکل سے کاٹے تھے!۔ کتنے ملکوں کی خاک چھانی تھی، کتنے طویل راستوں کو عبور کیا تھا!۔ اور اس عرصہ میں، میں کتنا تھک گیا تھا! ——— تب! —— مجھے احساس ہوا کہ راحیلہ تو پل کے اُس پار جا چکی تھی۔ پل کے اُس پار جہاں وقت کی رفتار تیز تھی!۔ اور پلک جھپکتے میں صدیاں گزر جاتی تھیں۔ جیسا ایلورہ کے غاروں اور قطب شاہی کے گنبدوں پر صدیاں گزر چکی تھیں۔ یہ تو وہی پل تھا جس کے اس پار جانے کا میں ہمیشہ سے آرزومند رہا تھا ایک لمحہ کے لئے میرا جی چاہتا تھا کہ میں بھی دوڑ کر پل کے اُس پار پہنچ جاؤں۔ لیکن! ——— میں تیز تیز چلتا قبرستان سے نکل گیا تھا۔ پہلی بار میں نے اُس پل سے خوف سا محسوس کیا تھا۔ پھر میں

قبرستان کی مخالف سمت میں چلتا گیا تھا۔ میں شاید اُس پُل سے دور چلا جانا چاہتا تھا۔ دور ــــــ بہت دور!

میں شاید بہت تھک گیا تھا۔ کہتے ہیں مجھے بے ہوشی کی حالت میں اسپتال پہنچایا گیا تھا۔ جب مجھے ہوش آیا تو پتہ چلا کہ مجھے دل کا دورہ پڑا تھا ــــــ دل کا دورہ! ــــــ میں شاید بہت تھک گیا تھا۔ کہتے ہیں مجھے بے ہوشی کے عالم میں اسپتال پہنچایا گیا تھا۔ جب مجھے ہوش آیا تو پتہ چلا کہ مجھے دل کا دورہ پڑا تھا۔ دل کا دورہ! ــــــ میں اس پُل کے قریب پہنچ گیا تھا۔ اُس پُل کے قریب، جس کے اُس پار وقت کی رفتار تیز تھی! کیا بس راستے اُس پُل کی طرف ہی جاتے ہیں؟ مگر اب میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھاؤں گا۔ میں اُس پُل کی طرف کبھی آگے نہیں بڑھوں گا۔ اُس پُل کی طرف جس کے اُس پار وقت کی رفتار تیز تھی! لیکن ــــــ کیا یہ میرے بس میں تھا؟ میرے پاؤں میں تو گویا پہیے لگے تھے اور کوئی مجھے پیچھے سے دھکا دے رہا تھا۔ اب ــــــ جب کہ پُل کے اُس پار جانا میرا مقدّر ہو چکا ہے۔ کاش مجھے کوئی رہنما، کوئی رہبر، کوئی میر کارواں مل جائے جو میرا ہاتھ تھام کر مجھے پُل کے اُس پار پہنچا دے۔ پُل کے اُس پار جہاں وقت کی رفتار تیز تھی!

حمید سہروردی

عقب کا دروازہ

بس یوں سمجھو کہ وہ ابھی کچھ ہی دیر میں آئے گا۔ تم سب ہال اور کرسیاں صاف کر لو۔ اس کے آنے کا یہی وقت ہے اور وہ وعدہ کرنے کے بعد مقررہ وقت پر ضرور آئے گا میں جانتا ہوں کہ آج اس کا دوسرا کوئی پروگرام نہیں ہے۔ اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

چپراسی ہال اور کرسیاں صاف کرنے میں لگے رہے اور وہ دھول کے اٹھنے کی وجہ سے ادھر ادھر ڈائس پر ٹہلنے لگا۔

چپراسیوں نے کہا ـــــ ساب، تمام ہال اور کرسیاں صاف ہو گئیں۔

صاحب نے کہا ـــ اچھا ٹھیک ہے۔ اب تم لوگ باہر لان میں مؤدب کھڑے رہو۔

ایک چپراسی نے کہا، مگر ہم صبح سے یہیں ہیں۔ ابھی تک گھر نہیں گئے۔ ہماری بیوی اور بچے ہمارے گھروں پر انتظار کر رہے ہوں گے، اگر ہم اب گھر نہیں جائیں گے، تو بیوی اور بچے سمجھیں گے کہ ہم نے ان سے خفا ہو کر سنیاس لے لیا ہے۔ آج میرے ساتھ کچھ ایسا ہی ہوا ہے ـــــ ساب میری بیوی صبح ہی صبح درد سے کراہ رہی تھی۔ میں اس کو تنہا گھر پر چھوڑ کر آیا ہوں۔ پتہ نہیں، اب تک وہ بچہ پیدا کر سکی یا نہیں۔ یا پھر کچھ اور ہوا ہو گا۔ وہ مجھے بخشے گی نہیں ـ مجھ پر رحم فرمایئے اور مجھے گھر جانے کی اجازت دیجئے۔ پتہ نہیں، بڑے ساب کب آنے والے ہیں۔

دوسرا چپراسی ـــ اور صاحب، ہمیں بڑے صاحب کی تقریر سے کیا لینا ہے۔ آپ ہمارے مائی باپ ہیں۔ آپ کا کہا، تھوڑی ٹال سکتے ہیں، ہم آپ کا حکم ہوا اور بس کافی ہے۔ آپ کا پسینہ اور ہمارا خون حاضر ہے۔ صاحب ـــ ہمیں اجازت دیجئے ـــ

صاحب نے کہا ـــ کیا تم نہیں جانتے۔ تم اس وقت کس سے بات کر رہے ہو۔ کیا تم نے اپنی

اوقات جھلادی ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہوگا اور دیکھو اندھیرا تیزی سے بڑھ رہا ہے اور اب تو میں تمہاری صورتیں بھی نہیں دیکھ پا رہا ہوں اور جانتے ہو۔ تمہاری صورتیں نظر نہیں آئے گیں، تو میں تمہارے درمیان سے غائب ہو جاؤں گا۔ مناسب یہی ہے کہ تم بجلی جلاؤ۔ میرا تمہارے درمیان سے غائب ہونے کا مطلب یہ ہوگا کہ تم بے یار و مددگار رہ جاؤ گے۔ تم ایڑیاں رگڑ رگڑ کے مر جاؤ گے۔ میری مانو کہ میں ہی تمہاری نگرانی کرنے والا ہوں۔

تیسرا چپراسی ـــ آپ نے بالکل ٹھیک فرمایا ہے۔ صاحب۔ آپ کے بغیر ہمارے زندہ رہنے کا کیا مطلب رہتا ہے اور آپ ہماری جان سے زیادہ عزیز ہیں۔ آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ پر صاحب! ہماری بھی ایک بات ہے کہ میرے صبح گھر سے نکلتے وقت، میرا چھوٹا لڑکا بخار سے بہک رہا تھا۔ میں اس کی باتیں سن کر پریشان ہوگیا تھا اور جب سے اب تک میری آنکھوں میں، اس کا چہرہ گھوم رہا ہے اور دماغ میں اس کی بے تکی باتیں گونج رہی ہیں۔ کیا بتاؤں صاحب وہ کہہ رہا تھا کہ "میں آنے والا ایک ہوں" اتنا ہی یاد رہ گیا۔ پتہ نہیں بخار کی وجہ سے اور کیا کیا کہے جا رہا تھا۔ اس کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ میں بہت پریشان ہوں۔ سر ـــ

صاحب نے کہا ـــ بے وقوفو! کیا تم نہیں جانتے کہ بڑا صاحب آئے گا۔ تمہیں یہاں نہ پاکر خفا نہیں ہوگا اور کیا تم نہیں جانتے کہ ایسے ہی وقت امتحان لیا جاتا ہے۔ تمہاری ترقی کے لئے اور تمہارے پیٹ کے ایندھن کا معقول انتظام کیا جا سکتا ہے۔ تم نہیں سمجھو گے تو ایک بڑے نقصان سے دوچار ہوں گے۔

تینوں چپراسی ہاتھ باندھے گردن نیچی کئے کھڑے ہوئے ہیں اور صاحب اِدھر اُدھر ڈالس پر اپنی مٹھیوں کو بھینچے ہوئے ٹہل رہا ہے ـــ ٹہلتے ٹہلتے کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ روشنی کرو۔ روشنی کے بغیر میرا دم گھٹ جائے گا۔ کیا تم نہیں چاہتے۔ میں کھلی فضا میں سانس لوں

تینوں نے ایک ساتھ کہا۔ ہم بھی یہی چاہتے ہیں۔ آپ خود کھلی فضا میں سانس لیں اور ہمیں بھی۔

صاحب نے کہا ـــ کیا تم میری برابری کرو گے۔

ایک نے کہا ـــ برابری نہیں۔ کم از کم کچھ وقت تو ہمارے ہاتھوں میں تھما دیجیے۔

اب پھر تینوں مودب کھڑے ہیں۔ ہال میں خاموشی طاری ہے اور صاحب کرسی پر اداس سے

اُدھر سے چینی سے دیکھ رہا ہے: اچانک کہہ اٹھا: "روشنی ـــ روشنی تیز کر دو ـــ میں مر جاؤں گا۔ اندھیرا بہت گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ تم سن رہے ہو یا نہیں۔"

تینوں میں ایک ساتھ حرکت پیدا ہوئی اور تینوں باہر جانے کے لیے اٹھے۔

صاحب نے کہا۔ ٹھہرو ـــ تم میں سے ایک ہی جاؤ اور بجلی کا بٹن آن کر دو۔

دو وہیں کھڑے رہے اور ایک وہاں سے باہر کی طرف جانے لگا۔ باہر آکر بجلی کا بٹن ڈھونڈنے لگا بٹن، پتہ نہیں، کہاں ہے؟ یہاں تو نہیں ہے۔ پھر کہاں ہوگا۔ ہاں یاد آیا۔ اس عمارت کے عقب میں ہے۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے چلنے لگا۔ اندھیرے میں صرف اس کے پاؤں کے چلنے کی آواز آ رہی ہے وہ ہال کے عقب میں پہنچ گیا۔ اندھیرے میں، اُسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا ہے۔ یہاں بھی بجلی کا بٹن نظر نہیں آ رہا ہے ـــ اب صاحب ہی سے پوچھنا ہوگا۔ یہاں بجلی کے بٹن کا بورڈ کہاں لگا ہوا ہے ـــ اچانک سامنے کے دروازے کی کھلنے کی آواز آئی۔ وہ گھبرایا ـــ اور ایک زور کی چیخ ماری ـــ ارے کوئی ہے ـــ مجھے بچاؤ ـــ دوسرے ہی ثانیہ وہ سنبھلتا ہوا ہوش میں آیا۔ یہاں تو کوئی نہیں۔ میری تو چیخ ضائع ہو گئی۔ اب وہ آواز لگاتا ہے جس طرف سے دروازہ کی آواز آئی تھی۔ پوچھتا ہے کون ہے؟ کون ہو، تم ـــ؟ کہتے کیوں نہیں۔ . . . . . . ؟ ارے یہاں کون ہوگا۔ صاحب اور میرے دونوں ساتھی، وہاں ہال میں اندھیرا نگل رہے ہیں۔ ہوا سے دروازہ کی آواز آئی ہوگی، مگر یہاں کہاں دروازہ ـــ؟ عقب کا دروازہ ـــ عقب کا دروازہ ـــ اس عمارت کے تمام دروازے سامنے کی طرف کھلتے ہیں۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا۔ کہ اسے اور آوازیں سنائی دیں۔

کرر . . . . کرر . . . . . کر . . . . کر . . . . . کرر . . . . . کرر . . .
. . . کرر . . . کرر . . . . ک . . . . . ر . . . . . ک . . . . . ر . . . .

یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے! میں کہیں ہال والی عمارت سے باہر تو نہیں آ گیا۔ اس عمارت کا دروازہ نہیں ہے۔ یہاں جنگل ہی جنگل ہے ـــ اتنے میں، اسے موٹر کار کی آواز سنائی دی۔

شاید بڑا صاحب آ گیا ـــ اب مجھے ہال میں جانا ہی ہوگا، مگر بجلی کا کیا ہوگا۔ میں بغیر

بجلی جلائے، وہاں کیسے جا سکتا ہوں ـــــ وہ مجھے شوٹ کر دیں گے۔ کیا کیا جائے؟

وہ اندھیرے میں راستہ ٹٹولتا ہوا۔ سڑک پر چلا آیا۔ سڑک پر ایک آدمی تیز تیز ڈگ بھرتا ہوا جا رہا تھا۔

چپراسی نے پوچھا۔ ارے بھئی تم اتنی تیزی سے کہاں جا رہے ہو؟

راہ گیر ـــ مجھے جلدی ہوسٹل پہنچنا ہے۔ ورنہ ہوسٹل کا دروازہ بند ہو جائے گا۔ میں شہر میں گیا تھا۔ کچھ خریدنے کے لیے۔ آنے میں دیر ہو گئی۔ مجھے جلدی جانا ہے۔ نہیں تو مجھے عقب کے دروازے سے کمرہ میں جانا پڑے گا۔ بہتر یہی ہے کہ وقت مقررہ پر پہنچ جاؤں۔ سامنے کا دروازہ کھلا رہے گا ـــــ شہر میں کچھ لوگ باتیں کر رہے تھے کہ شہر میں کوئی بڑا صاحب آنے والا ہے ـــ پتہ نہیں، کون آنے والا ہے۔

چپراسی :۔ ہاں ہاں، تم نے سچ سنا ہے۔

راہ گیر :۔ کب آنے والا ہے۔ بڑا صاحب۔

چپراسی :۔ بس اب آتا ہی ہوگا۔ ہمارا صاحب کہہ رہا تھا کہ کچھ ہی دیر میں آئے گا۔

راہ گیر :۔ کچھ ہی دیر میں۔ کتنی دیر میں آئے گا۔ وقت مقرر نہیں کیا گیا؟

چپراسی :۔ یہ نہیں بتایا گیا۔ اب کیا وقت ہو رہا ہے؟

راہ گیر :۔ وقت وقت ـــ مجھے معلوم نہیں ـــــ میرے پاس گھڑی نہیں ہے ـــ اور بہت دیر سے شہر کے گھنٹہ گھر سے بھی آواز نہیں ـــــ۔

چپراسی :۔ گھنٹہ گھر سے بھی آواز نہیں آئی۔

راہ گیر :۔ ہاں سچ، میں نے بہت دیر سے کوئی آواز نہیں سنی ـــ کیا آپ نے گھنٹہ کی آواز سنی ہے؟

چپراسی :۔ خیر مجھے تو معلوم بھی نہیں ہے۔ گھنٹہ گھر کہاں ہے اور کب گھنٹہ بجتا ہے؟

راہ گیر :۔ پھر تم وقت کیسے معلوم کر لیتے ہو؟

چپراسی :۔ وقت کی کیا ضرورت ہے۔ بس یونہی، سب کچھ چلتا ہے۔

راہ گیر :۔ یونہی، یعنی تم اس سے بالکل بے خبر رہتے ہو۔

چپراسی :- بس ایسا ہی سمجھو اور جان کر بھی کیا کرنا ہے۔ صاحب جیب بلاتا ہے۔ ہم چلے آتے ہیں۔

راہ گیر :- خیر ۔۔۔ ٹھیک ہے۔ میں چلتا ہوں۔ اب تک تو سامنے کا دروازہ بند ہو گیا ہوگا۔ اب تو عقب کے دروازے سے ہی جانا ہوگا۔

چپراسی :- عقب کے دروازے سے! میں بھی اس عمارت کے عقب کے دروازے سے ہی آ رہا ہوں۔ وہاں بس صرف دروازہ کی آواز آ رہی ہے۔ مگر عقب کا دروازہ نہیں ملا۔

راہ گیر :- یہ بھی خوب۔ عقب کا دروازہ ہر ایک کو ملتا ہے کیا ۔۔۔ !؟

چپراسی :- اچھا ۔۔۔

راہ گیر :- اچھا میں چلتا ہوں ۔۔۔

راہ گیر چلا گیا۔ چپراسی راہ گیر کو جاتے ہوئے دیکھتا ہے۔ اب وہ روشنی کی سڑک سے پیچھے کی طرف مڑا۔ میں ادھر سے ہی آیا تھا اور مجھے اِدھر سے ہی جانا ہوگا۔ میرے ساتھی اور میرا صاحب میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ مگر میں وہاں جا کر کیا کہوں گا۔ وہ روشنی سے اندھیرے کی طرف چلا آیا۔ اس کو آہستہ آہستہ کسی کے چلنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ آواز قریب آتی جا رہی ہے۔ کاندھے سے کاندھا ٹکرایا۔ کون ہے؟

دوسرا چپراسی :- میں ہوں تمہارا ساتھی۔ میری آواز نہیں پہچانتے؟

پہلا چپراسی :- کیسے نہیں پہچانا ۔۔۔

دوسرا چپراسی :- ہاں میں ابھی تک روشنی نہیں آئی۔ تم کہاں گئے تھے۔ اِدھر کیوں آئے ہو؟ بجلی کا بٹن۔ وہیں لان میں دائیں بازو ہی میں ہے نا ۔۔۔ کہاں گئے تھے تم؟

پہلا چپراسی :- میں بجلی کا بٹن ڈھونڈتے ڈھونڈتے اِدھر چلا آیا ہوں۔ کیا کہا ۔۔۔ لان میں ہی ہے۔ مگر مجھے دکھائی نہیں دیا۔ تم میرے ساتھ چلو۔ بتاؤ کہ بجلی کا بٹن کہاں ہے۔

دوسرا چپراسی :- خوب۔ وہ کام تمہارا ہے۔

پہلا چپراسی :- پھر۔ تم کہاں جا رہے ہو؟

دوسرا چپراسی :۔ بجلی کا بٹن آن کرنے کے لیے۔

پہلا چپراسی :۔ پھر یہاں کیوں آئے ہو؟ لان تو پیچھے رہ گیا۔

دوسرا چپراسی :۔ پیچھے ہے!

پہلا چپراسی :۔ ہاں عقب میں۔

دوسرا چپراسی :۔ تم کہاں کہاں جاکر آ رہے ہو؟ وہاں صاحب غصہ ہو رہا ہے۔ ذرا سا کام ہے اور تم کب سے نکلے ہوئے ہو؟

پہلا چپراسی :۔ کب سے نکلا ہوا ہوں۔

دوسرا چپراسی :۔ ہاں وقت کیا ہوگا۔

پہلا چپراسی :۔ وقت مجھے معلوم نہیں۔

دوسرا چپراسی :۔ مجھے بھی معلوم نہیں۔

پہلا چپراسی :۔ جانے دو۔ آؤ، میرے ساتھ، ہم صاحب سے کہہ دیں گے کہ بجلی کا بٹن نہیں مل رہا ہے۔

ابھی دونوں قدم اٹھا ہی رہے تھے کہ ایک اور آواز آئی۔

تیسرا چپراسی :۔ کون ہو، تم لوگ ———!؟

پہلا چپراسی :۔ اور تم بھی چلے آئے ہو۔ کیا ہال میں صاحب اکیلا ہے؟

تیسرا چپراسی :۔ پتہ نہیں۔ میں نے دیکھا نہیں۔ ہال میں گھپ اندھیرا ہے۔ میں نے کئی آوازیں دیں۔ مگر ایک بھی آواز کا جواب نہیں ملا۔

دوسرا چپراسی :۔ کیا آج بڑا صاحب نہیں آئے گا؟

تیسرا چپراسی :۔ اب تک تو نہیں آیا۔

پہلا چپراسی :۔ وقت کیا تھا اس کے آنے کا؟

تیسرا چپراسی :۔ وقت تو مجھے بھی معلوم نہیں، میرے ساتھیو۔

دوسرا چپراسی :۔ پھر وہ کب آئے گا۔

تیسرا چپراسی :۔ وہ تو ہمارے صاحب کو ہی معلوم ہوگا۔

پہلا چپراسی :۔ چلو، چل کر صاحب سے ہی پوچھ لیتے ہیں۔

تینوں خاموش خاموش ایک ساتھ چل رہے ہیں۔ دوسرے چپراسی نے خاموشی کو توڑتے ہوئے پوچھا۔ مگر تم نے تو کہا تھا کہ تمھاری آوازیں دینے کے باوجود صاحب نے کوئی آواز نہیں دی — ؟

تیسرا چپراسی :۔ ہاں، میں نے بہت آوازیں دیں۔ صاحب، صاحب، پر آواز نہیں آئی —۔

پہلا چپراسی :۔ کہیں عقب کے دروازے سے تو نہیں چلا گیا —

تیسرا چپراسی :۔ عقب کا دروازہ !

دوسرا چپراسی :۔ یہ کیا ہوتا ہے۔ عقب کا دروازہ —

پہلا چپراسی :۔ مجھے بھی معلوم نہیں —

دوسرا چپراسی :۔ پھر، تم نے عقب کا دروازہ کیسے کہا ؟

پہلا چپراسی :۔ ہاں ہاں، ابھی ایک راہ گیر ملا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ مقررہ وقت پر ہوسٹل نہیں پہنچے گا، تو سامنے کا دروازہ بند ہو جائے گا اور عقب کے دروازے سے جانا ہوگا۔

تیسرے چپراسی نے، شاید سوچتے ہوئے پوچھا۔ یہ عقب کا دروازہ کیا بلا ہے ؟

پہلا چپراسی :۔ دیکھو یہ رہا لان — بائیں بازو دیکھو۔ بجلی کا بٹن ہوگا۔

دوسرا چپراسی :۔ ہاں ہاں دیکھ لو۔ جلدی سے بجلی جلاؤ اور صاحب کی اجازت لے کر چلنے بناؤ۔ بڑے صاحب سے ہمارا کیا کام ہے۔

تیسرا چپراسی :۔ ہاں ٹھیک ہے۔ پہلے بٹن آن کر دو۔

اب تینوں اِدھر اُدھر بٹن ڈھونڈتے ہیں، لیکن بٹن نہیں ملا۔ تینوں کی سانسیں تیز تیز چل رہی ہیں۔ اس دوران میں وہ ایک دوسرے سے ٹکراتے بھی رہتے ہیں۔ تینوں دم چھوڑتے ہوئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

پہلا چپراسی :۔ یہاں بٹن ہے اور نہ روشنی —

دوسرا چپراسی :- تم نے سچ کہا تھا۔

تیسرا چپراسی :- چلو، ہال میں جاکر دیکھتے ہیں۔ صاحب ہے یا چلا گیا۔

تینوں ہال میں داخل ہوتے ہیں اور تینوں ایک ساتھ مل کر آواز لگاتے ہیں لیکن جواب ندارد۔

دوسرے چپراسی نے تیسرے چپراسی سے کہا۔ ارے تم بیڑی پیتے ہو نا، تمہارے پاس ماچس ہوگی۔ تیلی جلاؤ۔

تیسرے چپراسی نے کہا۔ ہاں تیلی جلاتا ہوں، تیلی جلاتا ہے۔

پہلے چپراسی نے تیسرے چپراسی سے کہا۔ تم نے اب تک تیلی کیوں نہیں جلائی؟

تیسرا چپراسی :- میں سوچتا تھا کہ کہیں صاحب بیڑی پیتا نہ دیکھ لے۔

دوسرا چپراسی :- یہ کیوں نہیں کہتا۔ کہ بھول گیا تھا۔

پہلا چپراسی :- ہاں بھول گیا تھا نا۔ ارے یہاں تو کوئی نہیں ہے۔ پھر صاحب کہاں چلا گیا؟

دوسرا چپراسی :- چلو وہاں ڈائس پر دیکھ لیتے ہیں اور وہاں ٹیبل پر کاغذ نظر آرہا ہے۔

تیسرا چپراسی کہنے لگا۔ دیکھو اب راستہ کا اندازہ ہوگیا ہے۔ ڈائس تک چلو۔ ہاں یاد رکھو میرے پاس صرف دو تیلیاں ہیں۔ کاغذ پہ کیا لکھا ہے۔ پڑھ لو۔ چلو، جلدی جلدی چلو۔

تینوں تیزی سے ڈائس پر چلے آئے۔ تیسرے چپراسی نے تیلی جلائی۔ پہلے چپراسی نے کاغذ کو دیکھا۔ وہ ایک دم کورا تھا، لیکن ڈائس کے عقب والا دروازہ کھلا تھا۔ تینوں ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے اور دھڑام سے وہیں گر پڑے۔ عقب کا دروازہ۔

تبصرے

(تبصرے کے لئے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے)

اردو اسالیبِ نثر ———— ڈاکٹر امیر اللہ خاں شاہین

مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ۔ اردو بازار دہلی۔ صفحات:۔ ۳۹۱۔ قیمت ۲۵ روپے

اردو اسالیب نثر ڈاکٹر امیر اللہ خان شاہین (صدر شعبہ اردو میرٹھ کالج) کی قابل ذکر تصنیف ہے جو اُن کی بارہ سال کی محنت کا نتیجہ ہے۔

گزشتہ پندرہ سالوں میں اس موضوع پر ڈاکٹر جمیل جالبی کی "تاریخ ادب اردو" کے علاوہ کوئی اہم کتاب شائع نہیں ہوئی۔ اردو نثر کے ارتقا اور اس کے اسالیب بیان پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ میرے خیال میں اس صورت حال کی وجہ نثری ادب کا تہی دامن ہونا نہیں بلکہ اصلی وجہ یہ ہے کہ ہمارے محققین، ناقدین اور اردو زبان و ادب کے سنجیدہ طالب علموں نے اس سرمائے کے تحقیقی و تنقیدی مطالعہ کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی اور اردو نثر کے نو بہ نو اسالیب، روایات کا مطالعہ اور تجزیے سے اغماض برتتے رہے۔ اس کے مقابلے میں شعری سرمایہ محققین اور ناقدینِ ادب کے زورِ قلم کی جولان گاہ بنا رہا۔ نثر کی قابل ذکر تاریخوں اور تحقیقی کارناموں میں محمد یحییٰ کی "سیر المصنفین" سید محمد کی "ارباب نثر اردو"۔ مولانا احسن مارہروی کی "منثورات"۔ حامد حسن قادری کی "داستانِ نثرِ اردو"۔ اور ڈاکٹر جمیل جالبی کی "تاریخ ادب اردو" وقیع کارنامے ہیں، لیکن اردو نثر آج بھی ارباب علم کی توجہ کی منتظر ہے۔

ڈاکٹر امیر اللہ خاں شاہین نے اپنے لئے اس دشوار گزار راہ کا انتخاب کیا اور توجہ، انہماک اور محنت کے بعد اردو ادب کو ایک قابلِ قدر تصنیف دی۔ اس مقالے میں شاہین صاحب نے نثر اور اسلوب کی تعریفیں متعین کرکے اس بات کی کوشش کی ہے کہ اردو نثر کے اسالیب کا جو مرقع انھوں نے تیار کیا ہے وہ ہر اعتبار سے جامع ہو۔ زیر نظر کتاب میں فاضل مصنف نے نثر نگاروں کی تحریروں کے اقتباسات پیش کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ موازنہ و مقابلہ سے اس کی توضیح بھی کی ہے اور زبان و بیان

لف اسلوبوں کا ناقدانہ محاکمہ بھی کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ مقالہ یقیناً ایک تنقیدی اور تحقیقی
مہ ہے۔

اس مقالے میں اردو اسالیب کی آٹھ سو سالہ تاریخ کا تدریجی ارتقا، تاریخی قرائن کے ساتھ اس
دکھانے کی کوشش کی ہے کہ درمیان کی بعض گم شدہ کڑیوں کو مربوط کیا جا سکے۔ اردو زبان و ادب
ارہویں صدی سے بیسویں صدی کے مکمل آثار چڑھاؤ کو نگاہ میں رکھ کر ان نثر نگاروں کا انتخاب کیا ہے
کے اسالیب ایک طرف اردو کے نثری سرمائے کو قابل اعتبار بناتے ہیں اور دوسری طرف اس کے
مزاج اور میلان کی نشان دہی کرتے ہیں،

ڈاکٹر امیر اللہ شاہین کا یہ مقالہ اردو ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ اس کام پر ہم انہیں
بلباد دیتے ہیں، ـــــــــــــ ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش

تعقبات ـــــــــــــ فتح محمد ملک

مکتبۂ فنون۔ ۴۷ انار کلی لاہور۔ صفحات ۳۵۱۔ قیمت ۱۶ روپے

برصغیر پاک و ہند میں گذشتہ صدی کے دوران کئی ادبی اور فکری تحریکیں ابھریں۔ جنھوں نے تخلیقی
کو مختلف تصورات اور نظریات سے مالا مال کیا، جن کے زیر اثر ہیئت کے نئے تجربے، نئی جہتیں،
ے آہنگ وجود میں آئے۔ نئے تخلیقی تجربات نے تنقیدی صلاحیتوں کو چیلنج کیا اور نقادانِ فکر
دعوتِ فکر دی۔ فتح محمد ملک نے اپنے تنقیدی مضامین کے مجموعے "تعصبات" میں انہی تحریکوں
یرِ اثر پیدا ہونے والے تخلیقی عمل و مسائل کو اپنے تنقیدی فکر کا مرکز بنایا۔

یہ مجموعہ سترہ مضامین پر مشتمل ہے۔ فاضل مصنف نے آٹھ مضامین میں مختلف قومی، ادبی
ری مسائل کو اپنی تنقید کا موضوع بنایا ہے اور انہی کے حوالے سے چند شخصیات کے فکر و فن کا جائزہ
۔ اس طرح وہ مختلف موضوعات اور رجحانات جو بہت عرصے سے ادب کے سلسلے میں زیرِ بحث
یں انہیں ایک مخصوص نقطۂ نظر سے پیش کیا ہے۔ ان تمام مضامین میں وحدتِ خیال کی ایک
ہے۔ کہیں یہ لہر ابھر کر نمایاں صورت اختیار کر لیتی ہے اور کہیں پسِ پردہ اپنا وجود تسلیم
ے، لیکن اس کا فکری دائرہ محدود ہے۔

فاضل مصنف نے بالخصوص ادب میں بے معنویت، بے مقصدیت، روایت سے بغاوت کے رجحانات اور ترقی پسند تحریک کے تضادات کی کڑی گرفت کی ہے۔ ترقی پسند تحریک اپنے وجود میں آنے کے کچھ عرصہ بعد ہی قول و فعل کے تضاد کا شکار ہو گئی تھی، بعض ادیبوں نے ترقی پسندی کی آڑ میں ادب کو اپنے مقصد کے حصول کا آلۂ کار بنایا، اس طرح وہ خلوص اور ظاہر و باطن کی ہم آہنگی جو ادب کی سالمیت کی آئینہ دار ہے مفقود ہوتی گئی۔ ان تمام مسائل پر فتح محمد ملک نے نہایت بے باکی سے قلم اٹھایا ہے۔ ان کے سوچنے کا انداز ہمدردانہ ہے ان کی تنقید میں عصری تہذیبی اور ادبی رجحانات کی تعبیر و توضیح بھی ملتی ہے۔ لیکن بعض مسائل میں ان کی بحث تشنہ ہے جس کی وجہ سے ان کا اختلاف جامعیت کے ساتھ سامنے نہیں آتا۔ مثلاً "خیال کا خوف" میں محدود فکری زاویۂ نگاہ کی وجہ سے وہ اپنے استدلال میں منطقی ربط پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے اور وہ وحدت اثر پیدا نہ ہو سکا جو ایسے موضوعات کے لئے ضروری تھا۔ اس کے باوجود کہ بعض امور میں مجھے ان کی رائے سے اختلاف ہے لیکن ان کی تنقیدی اور توضیحی صلاحیتوں کا مجھے اعتراف ہے۔ ان مضامین میں نظریۂ پاکستان اور اقبال کی متحرک فکری اساس سے گہری وابستگی کا احساس قدم قدم پر ہوتا ہے جس کی لہر تمام مضامین میں جاری و ساری ہے۔

"تعصبات" عمدہ کتابت اور طباعت کے ساتھ سفید کاغذ پر شائع کی گئی ہے۔ یہ کتاب اردو تنقید میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے ——— ڈاکٹر ایم۔ سلطانہ بخش

اختلافات ——— انور سدید

مکتبۂ اردو زبان۔ لاہور / سرگودھا۔ صفحات ۲۳۲ ——— قیمت پندرہ روپے

"اختلافات" انور سدید صاحب کے چودہ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ جسے سفید کاغذ پر اچھی طباعت و کتابت کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔

صحت مند تنقید کے بارے میں میتھیو آرنلڈ کہتا ہے کہ "تنقید کا بنیادی کام تو دیانت داری اور غیر جانب داری کے ساتھ دنیا کے بہترین خیالات سے واقف ہو کر اسے دوسروں تک پہنچانا ہے تاکہ اس طرح تازہ خیالات ہمارے شعور کا حصہ بن سکیں، اگر تنقید نے عملی مصلحت اور عملی پہلو سے روگردانی نہیں کی تو وہ اسی گندی نالی میں پڑی سڑتی رہے گی۔" تنقید کے لئے ضروری ہے کہ وہ پُرخلوص، بغرض الجھی ہوئی، جوش انگیز

پکار، اور علم کے افق کو وسیع تر کرنے والی ہو۔ ایسے میں تنقید سے وہ مسرت حاصل ہو سکتی ہے جو تخلیقی سرگرمی سے حاصل ہوتی ہے۔"

میتھیو آرنلڈ کے دور میں جو صورت حال تھی، اس وقت ہمارے ملک میں تنقید کی صورت حال یہی ہے۔ اردو تنقید کی تاریخ متعصبانہ ناقدین کی رائے سے بھری پڑی ہے۔ ذاتی مغالطوں نے تنقیدی بصیرت کو دھندلا دیا ہے۔ تنقید ہمارے ملک میں علمی و سیاسی مقاصد کو آگے بڑھانے کے کام آ رہی ہے۔ حالانکہ یہ تنقید کا صحیح منصب نہیں ہے۔ ہر نقاد اپنی مخصوص عینک سے تخلیقی ادب کو دیکھتا، جانچتا اور پرکھتا ہے۔ ہمارے ہمارے بیشتر نقاد اس وقت شخصیتوں اور جماعتوں کے آلۂ کار ہیں اور انہی کے مقاصد کی خدمت میں کوشاں ہیں۔ ان کے نزدیک عملی مقصد کو اوّلیت اور ذہن و فکر کی آزادی کو ثانوی حیثیت حاصل ہے۔

انور سدید کا نام ادبی نقادوں کی اس فہرست میں ہے جنھوں نے مصلحت کوشی کی قربان گاہ پر اپنی تخلیقی و تنقیدی صلاحیتوں کو بھینٹ نہیں چڑھایا بلکہ جرأتِ رندانہ کا مظاہرہ کر کے اپنے لئے فکر و نظر کی ایک نئی راہ منتخب کی ہے۔ انور سدید کی حق گوئی اور بیباکی نے ان کے لہجے میں ایک خاص الوکھا تیقن اور اعتماد پیدا کیا ہے۔ اسی تیقن، اعتماد اور لہجے کی کاٹ نے ان کے تنقیدی مضامین کے بارود کو زیادہ دھماکہ خیز بنا دیا ہے۔

اردو تنقید میں ایسے نقاد بہت کم ہیں جنھوں نے اتنے وسیع پیمانے پر تحریکوں اور افراد کے قول و فعل کے تضاد کو ان تحریکوں اور ان افراد کے واسطے سے پیدا ہونے والے ادب میں تلاش کیا ہے۔ ان کے نقطۂ نظر سے ہم اختلاف کر سکتے ہیں لیکن تنقید میں ان کی بصیرت اور ان کا خلوص ہمارے لئے ایک نئے اندازِ فکر کا در وا کر دیتا ہے۔

"اختلاف" اردو تنقید میں ایک قابلِ ذکر اضافہ ہے۔ ——— ڈاکٹر ایم۔ سلطانہ بخش

امکانات ——— عارف عبدالمتین

ٹیکنیکل پبلیشرز۔ اردو بازار لاہور۔ صفحات ۴۴۴۔ قیمت۔ ۲۵ روپے

عارف عبدالمتین اردو ادب کے ممتاز شاعر اور متین نقاد ہیں۔ ان کی شاعری اور تنقید دونوں میں اشتراکی فکر اور اس کی روح جلوہ گر ہے۔ جو نظریات ان کے تنقیدی شعور کے لئے بنیاد کا کام دیتے ہیں

وہی ان کی شاعری کے لئے مواد مہیا کرتے ہیں۔ عارف عبدالمتین ترقی پسند خیالات کو اپنی تحریروں میں اس طور پر سامنے لا کھڑا کرتے ہیں کہ ان کی اہمیت تخلیقی ذہنوں کو ترغیب دلاتی ہے۔ ان کی تحریروں میں وہ شدت اور انتہا پسندی نہیں ہے جو دوسرے نقادوں کے ہاں نظر آتی ہے بلکہ ان کا متوازن رویہ ان کی شخصیت کی پہچان بن گیا ہے۔ اسی لئے وہ اپنی تحریک کی غلطیوں پر برملا نکتہ چینی کرتے ہیں۔

"امکانات" میں شامل تنقیدی مضامین کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک حصہ ان مضامین پر مشتمل ہے جن میں مختلف ادبی مسائل پر بحث کی گئی ہے اور جنھیں "نظریات" کے عنوان کے تحت رکھا ہے، "اطلاقات" میں وہ مضامین شامل ہیں جن میں مختلف مکتبہ ہائے فکر کے ادبا اور شعرا کے فکر و فن کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ اور تیسرے حصے "مصاحبے" میں عارف عبدالمتین کے وہ تین انٹرویو شامل ہیں جو صلاح الدین ندیم۔ پروفیسر غلام حسین اظہر اور پروفیسر حفیظ صدیقی نے لئے تھے۔

عارف عبدالمتین نے "ادب اور مقصدیت" میں ادب کو بے غایت یا مقصود بالذات قرار دینے کو خود فریبی قرار دیا ہے۔ وہ "نئے ادب میں "بے معنویت" کی تحریک کو مسترد کرتے ہوئے اسے غیر صحت مند اور منفی رجحان گردانتے ہیں۔ ادب میں ہیئت اور موضوع کے بارے میں ان کا یہ خیال ہے کہ ترقی پسند فنکار کے لئے موضوع کے ساتھ ساتھ فنی اعتبار سے بھی ترقی پسند ہونا ضروری ہے۔

شاعری میں علامتوں کے مسئلے کے بارے میں ان کی یہ رائے بڑا توازن رکھتی ہے کہ ادب میں علامت کا صرف ایک ہی مقصد ہو سکتا ہے اور وہ ہے مفہوم کی ترسیل کی اعانت۔

عارف صاحب نے انفرادی ادیبوں اور شاعروں کا مطالعہ بھی اپنی نظریات کی روشنی میں کیا ہے۔ چونکہ ان کا مقصد ہر مکتبۂ فکر کے ادیبوں کے تخلیقی عمل کی تحقیق، اور خیر و صداقت کی تلاش ہے، اس لئے ان کا تنقیدی رویہ سنجیدہ اور ہمدردانہ ہے۔

"صلاح الدین ندیم کی شاعری پر لکھے گئے مضمون میں جدید غزل کا مفہوم متعین کرنے کے لئے مختلف گروہوں کے نظریات پیش کر کے خیال افروز بحث کی ہے اور انتہا پسندی کے ساز میں ایک متوازن نئے تلاش کی ہے۔ اس کے علاوہ "منٹو اور ہمارے غیر معتدل رویئے" میں اپنی ہی تحریک کے انتہا پسندوں کے غیر متوازن اور غیر معتدل رویئے پر بحث کی ہے۔ وہ منٹو کی فحاشی کو ایک اضافی شے قرار دیتے ہیں — صادق حسین کا مطالعہ بطور ایک اعتزال پسند افسانہ نگار کے مصنف کی متوازن فکر کا ثبوت ہے —

"تنکے کی ناؤ" کے محاکمہ میں سہراب اسلم کی بردتیوں کی جہاں تعریف و توصیف ملتی ہے وہاں عالمانہ سطح پر اختلاف بھی موجود ہے۔ وزیر آغا کو غیر ترقی پسند کہہ کر اپنی کڑی تنقید کا نشانہ بنانے کے بجائے انہیں اُردو کا مہذب شاعر قرار دیا ہے۔

بلا شبہ عارف عبدالمتین ایک نظریاتی نقاد اور فن میں مقصدیت اور جانبداری کے حامی ہیں۔ وہ فن کار کی غیر جانبداری کو موقع پرستی، غیر ترقی پسندی اور بے شعوری پر محمول کرتے ہیں۔ لیکن مجھے یہاں عارف صاحب سے اختلاف ہے۔ نقاد بھی ایک فن کار ہے اور فن کار کا یہ منصب نہیں کہ وہ عملی مقاصد کو آگے بڑھانے میں شخصیتوں اور جماعتوں کا آلہ کار بن جائے۔ نقادانِ فن کا بنیادی کام یہ ہے کہ وہ عملی مصلحت اور عملی پہلو سے روگردانی کر کے دیانتداری "غیر جانبداری" کے ساتھ دنیا کے بہترین خیالات سے واقف ہو کر اسے دوسروں تک پہنچائے تاکہ وہ خیالات ہمارے شعور کا حصہ بن سکیں۔ انسان میں حقیقی شعور اسی طرح پیدا کیا جا سکتا ہے۔

"امکانات" اردو تنقید میں ایک اضافہ ہے ——— ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش۔

خاک نشیں ——— مرزا ادیب

مکتبۂ عالیہ۔ ایبک روڈ لاہور۔ صفحات ۱۴۴۔ قیمت دس روپے

"خاک نشیں" مرزا ادیب کے ڈراموں کا ایک دلچسپ مجموعہ ہے۔ مرزا ادیب کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں، ڈرامہ نگاری میں ان کی منفرد او ممتاز شخصیت اپنا لوہا منوا چکی ہے۔ میرزا ادیب کی شہرت برصغیر کے علاوہ دوسرے ممالک میں بھی جا پہنچی ہے اور ان کے ڈرامے دوسری زبانوں میں ترجمہ ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔

ایک کامیاب ڈرامے کی عظمت اس کیفیت میں پوشیدہ ہے کہ اس کی ادبی قدر و قیمت اور تمثیلی معیار میں کامل مطابقت ہو۔ میرزا ادیب کے ہاں ڈراموں میں ادبی جمال بھی ہے اور تمثیلی وصف بھی ہے۔ میرزا ادیب زندگی کی انفرادی اور سماجی کشمکش کی بنیادوں پر اپنی ڈرامانگاری کی عمارت کھڑی کرتے ہیں۔ ان کے ڈراموں میں تصادم، تحیّر اور نقطۂ عروج قابلِ ستائش ہے۔ فنی زاویوں سے کرداروں کی تعمیر اور ان میں باہمی مطابقت پیدا کرنے کا پختہ شعور نظر آتا ہے اور بعض جگہ ایسی ڈرامائی کیفیت ضرور

پیدا کر دیتے ہیں جس سے ان کی طباعی کا پتہ چلتا ہے۔

ڈراموں کی زبان عمدہ، مکالمے دلکش اور چست ہیں۔ فکری لحاظ سے ڈرامہ "خاک نشین" بہت بلند ہے۔ اور اس کا شمار اردو کے بہترین ڈراموں میں کیا جاسکتا ہے۔ اس کی تعمیری خوبی واضح اور معاشرتی زاویئے سے اس کی مقصدیت قابل تعریف ہے۔ مقصد کی ہمہ گیری ہی اس ڈرامے کو ایک بلند مقام دیتی ہے۔ اردو کے ہلکے پھلکے یک بابی ڈراموں میں رومان کی ایک مخصوص جگہ ہے۔ "نغمۂ اسیر ساز" ایک رومانی ڈرامہ ہے۔ جس میں مصور ناصر اپنا شاہکار تخلیق کرتا ہے۔ ڈرامے کی تصوراتی سطح بلند ہے رانی ایک مخصوص طبقے کی علامت اور زرینہ دوسرے طبقے کی علامت بن گئی ہے۔ یہی طبقاتی کشمکش اس ڈرامے کا ظاہری تصادم ہے۔ اس ڈرامے میں تصادم کی ظاہری اور باطنی صورتیں خوب ابھری ہیں،

میرزا ادیب کے ڈراموں میں فکری پہلو واضح اور نمایاں ہے۔ حرکت و عمل، کشمکش و تصادم، تذبذب و استعجاب اور نفسیاتِ انسانی کو مدنظر رکھتے ہوئے ڈرامے کے تاثر کو تندہی اور شدت سے ناظر یا قاری کے ذہن پر مرتسم کر دیتے ہیں۔ ڈراموں کا یہ مجموعہ اردو ادب میں یقیناً ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ ——— ڈاکٹر ایم۔ سلطانہ بخش

ہنوز ——— جاذب آفاقی

ملنے کا پتہ :۔ پیر الٰہی بخش کالونی، کراچی۔ ضخامت ۲۰۴ صفحات۔ قیمت سولہ روپے۔ مجلد بیس روپے

کتابت و طباعت نہایت عمدہ، کاغذ چکنا، آفسٹ،

یہ جاذب آفاقی صاحب کے قطعات، نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے۔ جاذب آفاقی صاحب کم و بیش پچاس سال سے شعر کہہ رہے ہیں۔ ایک زمانے میں جانے پہچانے شاعر تھے مگر طویل عرصہ تک گوشہ نشین رہے۔ کچھ عرصہ پہلے اُن کا یہ شعری مجموعہ شائع ہوا ہے۔ اُن کے کچھ قطعات "نیا دور" کراچی میں بھی شائع ہوئے ہیں۔

تقریباً بیس سال پہلے آفاقی صاحب نے اپنے قطعات کا ایک مجموعہ "شب چراغ" کے عنوان سے ترتیب دیا تھا۔ وہ چھپ بھی گیا، لیکن شائع نہ ہو سکا۔ ناشر کے گودام میں آگ لگ گئی اور کتاب کے نسخے اس میں جل گئے۔ "اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے" بہرحال شاعر نے "شب چراغ" کے قطعات میں ترمیم و تنسیخ

یکہ انھیں اس مجموعے میں شامل کر لیا ہے۔ ان کے علاوہ بہت سے نئے قطعات بھی "ہنوز" میں شامل ہیں مجموعی طور پر تقریباً ساڑھے گیارہ سو قطعے ہیں۔ کتاب کا دوسرا حصہ نظموں اور تیسرا حصہ غزلوں پر مشتمل ہے۔

"ہنوز" کا دیباچہ پروفیسر محمد حسن عسکری مرحوم کا لکھا ہوا ہے جس میں انھوں نے جاذب صاحب کی قطعہ نگاری پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور اُن کے فکر و فن کا تجزیہ کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُردو شاعری میں چار مصرعوں والے قطعے پر بطور صنفِ سخن بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ گنی چنی مثالوں سے قطع نظر ہمارے شعرا تفنّنِ طبع کے لئے قطعے کہتے ہیں۔ ان کا مصرف اکثر و بیشتر یہ ہوتا ہے کہ مشاعرے میں غزل پڑھنے سے پہلے چند قطعے پڑھ دئے جائیں ــــــ ان میں گہرے اور سنجیدہ جذبات و خیالات کا اظہار عموماً نہیں ہوتا۔ جاذب آفاقی صاحب کی امتیازی خصوصیت یہ ہے اُنھوں نے قطعے کو بھرپور توجہ اور اعتماد کے ساتھ اظہار و ابلاغ کا وسیلہ بنایا ہے اور بطور صنفِ سخن اسے ایک تازہ زندگی بخشی ہے۔ تخلیقِ فن کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ فنکار کا جمالیاتی تجربہ اپنے اظہار و ابلاغ کا سانچہ یا ہیئت بھی خود ہی لے کر آتا ہے۔ یہ بات بڑی حد تک جاذب آفاقی صاحب پر صادق آتی ہے۔ وہ حیات و کائنات کے محض مشاہدے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ ہر بات پر گہرا غور و فکر کرنے کے عادی ہیں، وہ مسلّمات کو بھی جوں کا توں تسلیم نہیں کرتے، وہ کائنات کی ہر شے کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہیں۔ اس ضمن میں وہ چھوٹے سے چھوٹے تجربے کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اور ہر جزوی جمالیاتی تجربے کو اپنی گرفت میں لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ انھوں نے شعوری یا غیر شعوری طور پر قطعہ کو اپنے اظہار و ابلاغ کا وسیلہ بنایا ہے۔ قطعہ ہی اُن کے سخن کا پیرہ بنا اور یہی آخر کو اُن کا فن ٹھہرا۔ فکری طور پر آفاقی صاحب کا اندازِ نظر فلسفیانہ ہے۔ اُنھوں نے خدا، کائنات، انسان، فطرت اور ان سب کی باہمی رشتوں پر آزادانہ غور و فکر کیا ہے۔ وہ حیات و کائنات کے ایسے گوشوں سے پردہ اُٹھاتے ہیں جو روزمرہ کی زندگی ہمارے سامنے آتے ہیں لیکن ان کی طرف دھیان نہیں جاتا۔ جاذب آفاقی صاحب کا طرزِ احساس منفرد ہے۔ اُن کا اسلوب بھی بہت دلنشیں ہے۔ اُن کے اسلوبِ بیان میں اتنا تنوع اور ایسی رنگارنگی ہے کہ اس کے بیان کے لئے ایک طویل مضمون کی ضرورت ہے۔ اُن کے اسلوب کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے فلسفے اور طنز و مزاح کو ایک دوسرے میں مدغم کر دیا۔ اس پر مستزاد یہ کہ آفاقی صاحب کے کلام میں کلاسیکی زبان و بیان کا لطف ہے۔ صرف لطف ہی نہیں، وہ لفظوں کی خوشبو، اُن کے مزاج اور اُن کی رسائی کی حدود سے خوب اچھی طرح واقف

ہیں۔ شعر گوئی کے سلسلے میں حالی نے "تفحصِ الفاظ" کو جو اہمیت دی ہے، آفاقی صاحب اسے بے تکلفی سے برتنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔

اس مجموعے میں غزلیں اور نظمیں بھی ہیں لیکن اس شعری مجموعے کے قطعات قاری کی توجہ کو اتنی مہلت ہی نہیں دیتے کہ وہ نظموں اور غزلوں کی طرف مبذول ہو سکے ہر قطعے کی یہ کیفیت ہے کہ ع :۔

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست

آخر میں نمونے کے طور پر تین قطعے ملاحظہ ہوں جن سے ان قطعات کی ادبی قدر و قیمت اور اس مجموعے کی اہمیت سامنے آ سکے گی۔

سمیٹیں خود کو ہم کس کس جگہ سے — عجب بکھری ہوئی روداد ہیں ہم
کرے وہ خندہ پیشانی سے برداشت — زمیں پر آخری افتاد ہیں ہم

مرے یہ مشتبہ مبہم خیالات — کبھی نوکر تھے قبریں پاٹنے پر
مگر جب سے یہ مزدوری چھٹی ہے — گزر ان کی ہے جیبیں کاٹنے پر

ترازو اب لئے بیٹھے ہیں جذبات — علامت ہے یہ اپنے ہارنے کی
نگہ رکھیے ذرا ہاتھوں پہ ان کے — انھیں عادت ہے ڈنڈی مارنے کی

"ہنوز" اردو شاعری میں ایک قابل قدر مجموعہ ہے جس کا مطالعہ ہر ادبی ذوق رکھنے والے کو کرنا چاہیئے ——— عالم صدیقی

زین اُجیارا ——— پرتو روہیلہ

ناشر، ماورا پبلشرز کالج روڈ، راولپنڈی۔ ضخامت :۔ پونے دو سو صفحات عمدہ جلد۔ مزین اور دیدہ زیب گردپوش، عمدہ دبیز کاغذ، مزین حاشیہ، لکھائی اور چھپائی خوبصورت، مشہور فن کار صادقین نے متعدد دوہوں کی لفظی تصویر ملی کی اپنے موقلموں سے پیکر تراشی کی ہے ——— قیمت بیس۲۰ روپے

پرتو صاحب نے اپنے دوہوں کے اس مجموعے کو تین حصوں میں ترتیب دیا ہے "گیان دھیان"۔۔۔ "روپ رنگ" اور "گھر انگنائی"۔ پھر ہر حصے میں ایک موضوع کے مختلف پہلوؤں پر جتنے دوہے کہے ہیں انہیں ایک عنوان کے تحت جمع کر دیا ہے۔ دوہا ایک ایسی صنف سخن ہے جس میں انسانی زندگی کے دونوں رخوں "گیان دھیان" اور "رنگ روپ" کی عکاسی ساتھ ساتھ ہوتی ہے۔ پرتو صاحب نے اس روایت کو برتا ہے۔ "گیان دھیان" کے تحت جو دوہے ہیں اُن میں زندگی کے تجربے سے حاصل کی ہوئی بصیرتیں ہیں۔ "روپ رنگ" میں حسن وعشق کی سرشاریاں ہیں اور "گھر انگنائی" میں روزمرہ کی گھریلو زندگی کے جیتے جاگتے مرقعے ہیں۔ لیکن پرتو روہیلہ کے دوہوں کی ایک خاص بات موضوعات کا تنوع ہے۔ پرتو صاحب نے انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے بے شمار پہلوؤں اور عصری معاشرتی زندگی کے گوناگوں مسائل کو اپنے دوہوں میں سمو دیا ہے۔ حقیقت کی تلاش، زندگی، موت، خیر و شر، جبر و قدر، حسن و عشق، تعصبات، جھوٹا وقار، عائلی زندگی، سخت کوشی، غیرت مندی، حبّ وطن ۔۔۔ غرض یہ کہ حسن سے لے کر روزمرہ کی اخلاقیات تک اور تصوف سے لے کر "جوبن مایا" تک، ان کے دوہوں میں سب کچھ ملتا ہے۔

جہاں تک زبان و بیان اور دوہوں کی عام فضا کا تعلق ہے، پرتو صاحب کے یہاں روایت کا رچاؤ ہے۔ لب و لہجہ کی مٹھاس اور دردمندی بھی ہے، بانکپن اور تیکھاپن بھی۔ دوہے کی روایتی زبان کے ساتھ ساتھ جا بجا ترقی یافتہ مروّجہ اردو زبان بھی استعمال کی گئی ہے۔ یہ عمل دوہے کی روایت کو آگے بڑھانے کے لئے ضروری بھی تھا۔ تشبیہ و استعارہ اور دیگر مجازات کے استعمال میں روایت کی پابندی بھی کی گئی ہے اور نئی تشبیہات و اسالیب کو بھی بروئے کار لایا گیا ہے۔ مثلاً

اپنے آپ اُتارے بابو اپنے آپ بٹھلائے
ریل مسافر ٹک ٹک دیکھیں کوئی نہ بوجھ پائے

اپنی اپنی بھاؤنا پرتو اپنی اپنی راسے
چاندنی کے رنگ کی نار سہانے سانولے رنگ کی چاہے

اس مجموعہ کا مطالعہ کرتے وقت جا بجا ایسے دوہے ہماری نظر سے گزرتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ

قدیم دوہے کی روایت نامحسوس طور پر اپنا چولا بدل رہی ہے۔

اس کو دیکھو دادا جس کے حافظ رحمت خان
لوگوں سے وہ کہتا پھرے کیا سیّد، شیخ، پٹھان

کیا پوچھو ہو ہم جیسوں کا کیا ہے دھرم ایمان
پیٹ کے اندر پاپ بھرے ہیں، ہاتھوں میں قرآن

"آیا ہے رمضان" کے عنوان کے تحت متعدد دوہے ہیں جن میں رمضان شریف اور روزے کے حوالے سے مسلمانوں کی اخلاقی پستی پر طنز کیا گیا ہے۔

قیام پاکستان کے بعد ہمارے اُردو شعرا میں دوہے کی صنف کو جمیل الدین عالی نے اپنایا اور قدیم وجدید کی آمیزش سے دوہے کی روایت کو آگے بڑھایا۔ اُن کا مجموعہ "غزلیں، دوہے، گیت" شائع ہو چکا ہے۔ ان کے علاوہ بھی چند ایک شعرا نے اُردو میں دوہے کہے اور کہہ رہے ہیں۔ لیکن پرتو روہیلہ کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے دوہے پر جم کر اور بھرپور توجہ کے ساتھ طبع آزمائی کی اور اس صنف کے نئے امکانات کو تلاش کر کے انھیں بروئے کار لائے ہیں۔ انھوں نے موضوع، اسلوب، ترتیب و تنظیم ہر میدان میں اجتہاد کر کے دوہے کو نئی جہتوں سے آشنا کیا ہے اور اس صنف کو ایک نئے دور میں داخل کر دیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کا فکر انگیز مقدمہ بھی اس مجموعہ میں شامل ہے جس میں دوہے کی صنف اور پرتو کے دوہوں کا خوبصورت تجزیہ کیا ہے۔ ——— **عالم صدیقی**

نشاطِ خواب ——— ناصر کاظمی

ناشر: مکتبہ خیال، لاہور۔ ضخامت: ۱۶۰ صفحات۔ مجلد، رنگین گرد پوش۔ قیمت سولہ روپے
کتاب عمدہ، سفید اور دبیز کاغذ پر ٹائپ میں چھپی ہے۔

اس مجموعے کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں نو نظمیں ہیں۔ پہلی نظم "نشاطِ خواب" خاصی طویل ہے جس میں ہیئت قصیدے کی اور موضوع مثنوی کا ہے۔ یہ ایک فینٹیسی ہے۔ مطلع اوّل کے عنوان کے تحت ایک پُراسرار قصہ بیان کیا گیا ہے۔ مطلع ثانی کے ذیل میں شاعر نے اپنے باکمال اجداد کی روح کی مدح

کی ہے۔ آخر میں سات قطع بند اشعار ہیں جن میں شاعر نے اپنا تعارف کرایا ہے۔ مجموعی طور پر یہ نظم ایک اچھا تجربہ ہے۔ اس کے بعد دو نظمیں "شہرِ غریب" اور "نیا سفر" کے عنوان سے ہیں جن میں شاعر نے علامتی انداز میں اپنے دور اور ماحول کی تصویر کشی کی ہے۔ اس کے بعد مختصر نظمیں ہیں جن میں کچھ منظوم ترجمے بھی شامل ہیں۔

دوسرے حصے میں تینتیس ۳۳ نظمیں ہیں۔ ان میں چھ نعتیں ہیں۔ دو نظموں میں قائدِ اعظم کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ باقی نظمیں حبِّ وطن اور جنگی نغموں پر مشتمل ہیں۔ ان میں سے بہت سے نغمے اور ترانے ریڈیو اور ٹی۔وی سے نشر ہوئے اور مشہور و مقبول ہوئے۔ ان نظموں میں ناصر کاظمی ملک و ملت کا سپاہی بن کے ابھرا ہے۔

ناصر کاظمی بنیادی طور پر غزل کا شاعر ہے۔ چنانچہ اس نے نظموں میں بھی جا بہ جا غزل کی ہیئت اپنائی ہے، ابتدائی نسبتاً طویل نظمیں غزل کی ہیئت میں ہیں۔ نعتیں بھی غزل ہی کے سانچے میں ہیں۔

—————— عالم صدیقی

نظمانے (شعری مجموعہ) —————— محسن بھوپالی

ناشر:۔ عوامی دارالاشاعت، کراچی۔ صفحات ۱۰۴۔ قیمت:۔ بیس روپے
۸۷ ڈی نرسری۔ پی ای سی ایچ ایس۔ کراچی

محسن بھوپالی قیام پاکستان کے بعد ابھرنے والی نسل کے معروف شعراء میں ہیں۔ ۱۹۵۸ء سے قبل کے دنوں میں جب سیاسی بحران اور آئینی تعطل منظرِ عام پر آیا تھا ان کا ایک شعر زبان زدِ خاص و عام ہو گیا تھا، یہاں تک کہ ایک فاضل رہنما نے اس شعر کو قومی اسمبلی کے اجلاس میں بھی سنایا۔ سحر انصاری نے ان کی مجموعی شاعری کو غالباً اسی پس منظر میں "خبر و آگہی" کی شاعری کا عنوان دیا تھا۔ انہوں نے غزل، نظم اور قطعہ جیسی اصناف میں طبع آزمائی کی ہے اور قطعہ نگاری میں اپنی راہ بھی نکالی ہے، گذشتہ دہائی میں انہوں نے مختصر نظموں کو تکنیکی اعتبار سے ڈرامائی اور افسانوی اسلوب اور منفرد آہنگ دینے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ محسن نے اس صنفی تجربے کا آغاز ۱۹۶۲ء میں کیا تھا، اور شروع میں اس کو افسانچوں کا نام دیا تھا۔ اس زمانے میں ان کے معاصر حمایت علی شاعر نے مختصر نظم کی ایک صنف "ثلاثی" کو متعارف کرایا تھا، بعد میں

انہوں نے "افسانچوں" کے بجائے ان نظموں کے لئے "نظمانے" کا نام منتخب کیا۔ ان کے قطعات کا مجموعہ "خجستہ خجستہ" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ گذشتہ دنوں مختصر نظموں کا مجموعہ "نظمانے" بھی منظر عام پر آیا۔ محسن کے اس صنفی تجربے کا ایک قابل حوالہ پہلو زبان اور موضوعات کی عوامیت و عمومیت ہے۔ انہوں نے مروجہ قسم کی سطر بندی اور آراستہ و پیراستہ شعری زبان سے انحراف کرتے ہوئے لب و لہجے اور آہنگ کو ایسا معیار عطا کیا ہے جو نظمانوں کے مجموعی تاثر اور واقعاتی مفاہیم کو عام ذہنوں کے لئے قابل قبول بنا دیتا ہے۔ ان نظموں کا مخاطب ایک پھیلتے اور بڑھتے ہوئے صنعتی و تجارتی شہر کا کامپلکس معاشرہ ہے جہاں چلتے پھرتے ہر لمحہ فوری واقعات و مظاہر رونما ہوتے ہیں، شاعر نے اسی قسم کے واقعات و مظاہر کا معروضی مطالعہ افسانوی اسلوب میں پیش کر دیا ہے۔ ایسی نظم میں تسلسل و تاثر کی یک رنگی کا لطف بھی کم نہیں ہوتا، اور یہی لطف نظمانوں میں شعریت کی فضا کو راہ دیتا ہے۔ منظوم افسانہ گوئی کا یہ تجربہ نیا ہوتے ہوئے بھی روایت سے ربط رکھتا ہے۔ نظمانوں میں خبر آگہی والا وہ بنیادی جوہر موجود ہے جو محسن کی مجموعی شاعری کا غالب جوہر کہا جا سکتا ہے۔ شعری ادب کی تاریخ میں "نظمانے" کا تجربہ اہمیت کا حامل ہے اور اسی وجہ سے یہ مجموعہ اس دور کی شاعری میں انفرادیت کا حامل ہے۔

——————— ریاض صدیقی

بلوچی ادب کا مطالعہ ——————— کامل القادری

ناشر۔ بولان بک کارپوریشن، جناح روڈ، کوئٹہ۔ صفحات ۲۰۸۔ قیمت ۴۵/- روپے

کامل القادری تیرہ کتابیں لکھ چکے ہیں۔ زیر نظر کتاب بھی ان کی بیشتر کتابوں کی طرح بلوچستان کا احاطہ کرتی ہے۔ اس میں انہوں نے بلوچی ادب کا جائزہ پیش کر کے اردو داں طبقے کو بلوچی ادب سے روشناس کرایا ہے،

بلوچی ادب خصوصاً قدیم ادب کیونکہ تحریری صورت میں محفوظ نہیں ہے اس لئے جو کچھ بھی قدیم ادب کی باقیات ہیں وہ بلوچستان کے ان گویوں اور میراثیوں کے حافظے میں محفوظ ہیں جو سینہ بہ سینہ منتقل ہو رہا ہے منتقلی کا یہ عمل اگرچہ بلوچی ادب کے جواہر پاروں کو کسی حد تک قطعی طور پر تلف ہونے سے بچانے ہوتے ہے مگر اس عمل کو کسی طرح بھی پائیدار اور قابل اعتماد نہیں کہا جا سکتا۔ یہ سینہ بہ سینہ منتقلی کامل

ڑک بھی سکتا ہے اور اس میں تبدیلی بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ قادری صاحب نے بڑی محنت و کاوش سے ان ادبی پاروں کو خوبصورتی سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا ہے۔ اس کے لئے انہیں بلوچستان کے پہاڑی کاہدیگیستانی میدانوں کا صبر آزما سفر بھی کرنا پڑا ہے اور گویّوں اور میراثیوں سے خود اس کلام کو سننا پڑا ہے۔ ان کی یہ تحقیق و تلاش نہ صرف اُردو کو بلوچی ادب سے متعارف کراتی ہے بلکہ خود بلوچوں کے لئے بھی ان کے ادب کی ایک مدوّن کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔

بلوچی ادب میں پاکستان کے دیگر علاقائی ادب کی طرح لوک گیتوں کا وافر حصّہ ہے۔ گیتوں کے ساتھ ساتھ رزمیہ داستانیں بھی بلوچی ادب کا حصہ ہیں۔ ان گیتوں اور داستانوں میں بلوچ قوم کی پوری روایات موجود ہیں۔ بلوچوں کی روایت، تہذیب، مزاج اور انداز فکر کو سمجھنے کے لئے ان کے ادب کا یہی حصّہ کافی ہے۔ قادری صاحب نے "بلوچی ادب کا مطالعہ" میں معروف بلوچی شاعروں کے حالات اور ان کے شجرے بھی دیئے ہیں اور تحریری ادب کے بارے میں بھی ایک باب قلم بند کیا ہے۔ اس کتاب میں تحقیق، تدوین اور ترجمے کا امتزاج ہے۔ یہ کتاب نہ صرف بلوچی ادب پر تحقیق مزید کے خواہاں اصحاب کے لئے ایک ناگزیر کتاب ہے بلکہ اہل اردو کے لئے ایک نئی راہ کھولتی ہے۔ مشفق خواجہ صاحب نے اس کتاب پر ایک فکر انگیز مقدمہ لکھا ہے ——— ذہین عالم خاں

چہرہ بہ چہرہ رُو بہ رُو ——— جمیلہ ہاشمی

ناشر:۔ رائٹرز بک کلب، لاہور۔ ضخامت:۔ ۱۱۴ صفحات۔ قیمت:۔ اٹھارہ روپے۔

یہ جمیلہ ہاشمی کا تازہ ناولٹ ہے اس سے پہلے جمیلہ ہاشمی کی پانچ کتابیں شائع ہو چکی ہیں، جن میں ایک ناول، ایک افسانوں کا مجموعہ اور باقی ناولٹ ہیں۔ "تلاش بہاراں" (ناول) اور "آتش رفتہ" (ناولٹ) میں انھوں نے پنجاب کے گھرانوں کے طرز زندگی کی نہایت خوبصورت تصویر کشی کی ہے۔ "آپ بیتی جگ بیتی" افسانوں کا مجموعہ ہے۔ "روہی" (ناولٹ) چولستان (بہاولپور) کے صحرا کی زندگی کے بارے میں ایک دلکش کہانی ہے۔ "اپنا اپنا جہنّم" تین ناولٹوں پر مشتمل ہے۔ یہاں جمیلہ ہاشمی کے موضوع اور کہانیوں کی فضا میں تبدیلی آئی ہے۔ ان ناولٹوں میں مصنّفہ نے پاکستان کی سیاسی اور معاشرتی زندگی پر روشنی ڈالی ہے اور نوجوان نسل کی ذہنی الجھنوں اور کشمکش کی عکاسی کی ہے۔

زیر تبصرہ ناولٹ بھی مصنفہ نے اپنی عام روش سے ہٹ کر لکھا ہے۔ یہ ایک تاریخی ناولٹ ہے جو بہائی فرقہ کی ابتدا اور اس تحریک کے اسباب و عوامل سے متعلق ہے۔ اس پس منظر میں جمیلہ ہاشمی نے اُمِّ سلمٰی (قرۃ العین طاہرہ) کے کردار کو خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس ناولٹ کا عنوان قرۃ العین طاہرہ کی ایک مشہور غزل کے اِس مطلعے سے لیا گیا ہے ؎

گر بتو افتدم نظر چہرہ بہ چہرہ رُو بہ رُو
شرح دہم غمِ ترا، نکتہ بہ نکتہ مُو بہ مُو

قرۃ العین طاہرہ کی یہی غزل علامہ اقبال نے "جاوید نامہ" میں نقل کی ہے۔ یہ ناولٹ شرر کے مشہور ناول "فردوسِ بریں" کی یاد دلاتا ہے۔ "فردوسِ بریں" بھی ایک مذہبی فرقے 'فرقۂ باطنیہ' کے بارے میں ہے۔ اُس میں شیخ علی وجودی کا کردار حسن بن صباح کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس ناولٹ میں جمیلہ ہاشمی کا موضوع بہت نازک ہے، لیکن انہوں نے اپنے موضوع کے ساتھ خلوص برتا ہے۔ انھوں نے ناولٹ کے واقعات اور کرداروں کو ایک فنکار کی نظر سے دیکھا ہے اور ایک فنکار ہی کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ مصنفہ نے نہایت چابکدستی سے پلاٹ اور کرداروں کے ارتقا میں ایک مخصوص نفسیاتی کیفیت کی کارفرمائی دکھائی ہے جس کے نتیجے میں اُس صورتِ حال کا پیدا ہو جانا ناگزیر ہو گیا تھا، جو علامہ اقبال کے اِس شعر کی تفسیر بن کر سامنے آئی ہے ؎

عشق فریب می دہد جانِ امیدوار را ذوقِ حضور در جہاں رسمِ صنم گری نہاد

جمیلہ ہاشمی نے صفوی حکمرانوں اور شاہ قاچار کے دور کے ایران کی مذہبی، معاشرتی، تہذیبی اور سیاسی زندگی اور ماحول پر اُن کے اثرات کو ناولٹ کے پلاٹ میں نہایت خوبصورتی سے سمویا ہے۔ ناولٹ کے کرداروں میں زندگی اور اثر انگیزی ہے۔ مصنفہ نے شیخ احمد احسائی اور اُن کے شاگرد رشید سید کاظم رشتی کی تصویریں نسبتاً مختصر خطوط کے ذریعہ بنائی ہیں۔ مگر یہ اپنی اثر انگیزی کے اعتبار سے اہم کردار ہیں کیونکہ ان کے فلسفے اور تعلیمات نے رفتہ رفتہ ایک مخصوص نفسیاتی فضا پیدا کر کے ایک نئے مذہبی فرقے کے لئے فکری بنیاد فراہم کی۔ اُمِّ سلمٰی (قرۃ العین طاہرہ) بھی انھیں سے متاثر ہوئی۔ مصنفہ نے اُمِّ سلمٰی کے کردار پر بہت زور صرف کیا ہے اور اپنی فنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔ یہ اس ناول کا مرکزی کردار ہے۔ اِسی کے گرد ناولٹ کا تانا بانا بُنا گیا ہے۔ اُمِّ سلمٰی (قرۃ العین طاہرہ)

یک نمونہ کردار ہے۔ وہ قزوین کے ایک مجتہد کی بیٹی اور ایک مجتہد کی بہو ہے۔ اُس کا شوہر اس کا عم زاد ہے۔ وہ بھی مجتہد ہے، اُمّ سلمیٰ عبادات میں مشغول رہنے والی اور مراقبوں اور مجاہدوں کی سختیاں جھیلنے والی لڑکی ہے۔ وہ ملکی دستور کے خلاف اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے اور فلسفے سے شغف رکھتی ہے۔ وہ الٰہیات کے مسائل پر غور و خوض کرتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ نہایت حسین اور نرم و نازک ہے، شاعرہ ہے اور موسیقی سے دلچسپی رکھتی ہے۔ مگر اُس کی روح تشنہ ہے۔ شیخ احمد احسائی کے فلسفے اور سید کاظم رشتی کی تعلیمات نے اُس کی روح میں ایک ہلچل پیدا کر دی ہے۔ وہ نہایت بے تابی سے ظہورِ آلِ محمدؐ کی منتظر ہے۔ وہ ایک خواب مسلسل دیکھتی ہے۔ ایک شخص جس کا چہرہ نقاب میں رہتا ہے۔ وہ شخص دکھائی بھی دیتا ہے، نہیں بھی۔ وہ اُس کی آرزوؤں، جستجوؤں، شاعری اور مذہبی معتقدات کا مرکز بن گیا ہے۔ اُس کو دیکھنے، اُس کو پالینے کی آرزو میں وہ کیا سے کیا بن جاتی ہے۔ اپنا سب کچھ لٹا بیٹھتی ہے۔ اور اپنی زندگی قربان کر دیتی ہے۔

مصنف نے علی محمد (باب) اور محمد علی بار فروش کے کردار بھی فنکارانہ چابکدستی سے پیش کئے ہیں۔ ان کے علاوہ ملا حسین بشرویٔی کا کردار بھی جاذبِ نظر ہے۔ مُلّا صالح (اُمّ سلمیٰ کا باپ) اور مُلّا تقی (اُمّ سلمیٰ کا چچا) کے کردار انیسوی صدی عیسوی کے ایرانی مجتہدوں کے نمائندہ کردار ہیں۔ ملا محمد (ملا تقی کا بیٹا اور اُمّ سلمیٰ کا شوہر) ایک جیتا جاگتا کردار ہے مگر جب مصنف اُسے اُمّ سلمیٰ کے مقابلے میں لاتی ہے تو کہیں کہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مُلّا محمد کے کردار کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا۔

ناولٹ کے ضمنی کرداروں میں بعض ایسے کردار ہیں جو تھوڑی دیر کے لئے سامنے آتے ہیں مگر پڑھنے والے کے دل و دماغ پر اپنا نقش چھوڑ جاتے ہیں۔ مثلاً حسین صادق قافلہ سالار اور اُمّ سلمیٰ کی خادمہ ہانی کے کردار۔

یہ ناولٹ جمیلہ ہاشمی کی تخلیقات میں ایک منفرد حیثیت کا حامل ہے۔ اس میں انہوں نے اپنے مخصوص اسلوب کو قائم رکھتے ہوئے ایک نئے موضوع کو اپنے قلم کی جولانگاہ بنایا ہے اور اپنے فن کو نئے زمان و مکان سے روشناس کرایا ہے۔ ——— عالم صدیقی

مور کے پاؤں (ناول) — نوید انجم

میری لائبریری، لاہور۔ صفحات:۔ ۲۲۳ قیمت :-/۱۶ روپے

ہمارے جانے پہچانے افسانہ نگار نوید انجم اب کی بار ناول "مور کے پاؤں" لیکر ہمارے سامنے آئے ہیں، ہر ادبی تخلیق کی کامیابی اس بات میں ہوتی ہے کہ وہ زندگی کا "استعارہ" بن جائے۔ سو یہ ناول بھی استعارہ ہے ہمارے گرد و پیش اس زندگی کا جو مور کے پروں کی طرح اوپر سے خوبصورت اور رنگا رنگ نظر آتی ہے مگر جس کی بنیاد مور کے پیروں کی طرح بدہیئت ہے۔ نوید انجم نے اپنے اس ناول میں نچلے متوسط طبقے کو اپنی کہانی کی اساس بنایا ہے۔ اس طبقے کی اقتصادی صورت حال، موقع پرستی، اوپر کے طبقے میں شامل ہو جانے کی خواہش، اپنی حیثیت کو بڑھانے کی تگ و دو میں زندگی کی اصل خوشی سے محرومی اور پھر ایک مسلسل کرب، ایک مستقل احساس محرومی، ایک لازوال احساس تنہائی، آشوب اور شکست ——— یہ ہے اس طبقہ کا مقدر۔ نوید انجم نے اس ساری کیفیت، اس ساری صورت حال کو اچھی طرح اپنی کہانی کی بُنت میں شامل کیا ہے۔ کہانی کا پورا تانا بانا ایک کردار کے گرد بُنا گیا ہے۔ اور یہ کردار ہے زلیخا کا۔ زلیخا کے کردار کی نفسیاتی توضیحات اور محبت کی تلاش میں اس کی جنسی بے راہ روی ——— یہی نوید انجم کے ناول کا بنیادی موضوع ہے۔ اس کردار کے حوالے سے ہی دیگر کردار سامنے آتے ہیں اور اسی کے حوالے سے اُن کے معنی متعین ہوتے ہیں۔ عورت کی کردار کشی نوید انجم کی تحریر کا مضبوط پہلو ہے۔ تاہم مردانہ کرداروں پر ان کی گرفت زیادہ مضبوط نہیں ہے۔ یہ محض کردار نگاری کی بات نہیں ہے۔ یہ پورے رویئے کی بات ہے۔ نوید انجم کے مزاج میں ایک تخلیقی انفعالیت ہے۔ اسی کا نتیجہ ان کی زنانہ کرداروں پر گرفت ہے اور اسی سبب سے ان کی تحریروں میں جا بجا ایک حسّی تلذّذ نظر آتا ہے۔ حسّیات کی زیادتی انفعالیت کا اور خیالات و تصورات کی بالادستی فعالیت کا اظہار کرتی ہے۔ اسے ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ حسیات تخلیق کار کے عورت پن کا مظہر ہوتی ہیں جبکہ خیالات و افکار اس کے مردانہ روش کا اظہار ہوتے ہیں۔ یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ "عورت پن" تخلیق کی علامت بھی ہے، لہٰذا ہر تخلیق در یہ خیالات و افکار کو حسیات میں تبدیل کرنے کا دریہ ہوتا ہے۔ یہاں تک تو بات نوید انجم کے حق میں جاتی ہے۔ البتہ ایک چھوٹی سی مگر اہم بات یہ ہے کہ فن پارے کی قدر کے تعین میں اس کا معنوی و فکری عنصر بالآخر زیادہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ نوید انجم روحانی کرب کو جسم کی تڑپ کے حوالے سے دکھاتے ہیں۔ وہ جنسی خواہش کا بیان نہیں کرتے، مختلف طریقوں سے بالخصوص جسمانی حوالوں سے

اس کی تصویریں دکھاتے ہیں۔ ایسی تصویریں جن میں حسیت کمال پر ہوتی ہے۔

نوید انجم نے اپنے مرکزی کردار کو ہر طرف سے ٹھونک بجا کے مکمل کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کردار اس بات کی علامت بھی ہے کہ کھوکھلے ماحول میں المناک کردار بھی کھوکھلے ہوتے ہیں۔ تاجرانہ معاشرے کی محبت بھی تاجرانہ ہوتی ہے۔ خود زلیخا کے کردار کی بے معنویت اور ناآسودگی اسی بات کی غماز ہے۔ وہ خود محبت نہیں کرتی۔ محض یہ چاہتی ہے کہ دوسرے اس سے محبت کریں۔ اس کی نظر میں مرد محض جنسی آسودگی کا ذریعہ ہیں۔ خود ناول نگار بھی اپنے مردانہ کرداروں سے یہی کام لیتے ہیں اور اسی لئے ان کے مردانہ کردار کاٹھ کے اُلّو معلوم ہوتے ہیں۔ تاہم یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مردانہ کرداروں کو انھوں نے اپنے مرکزی کردار زلیخا کو زیادہ ابھارنے کے لئے ہی استعمال کیا ہے۔

یہ ناول میری لائبریری سیریز میں پہلی بار شائع ہوا ہے۔ ۲۲۴ صفحات ہیں۔ سفید کاغذ اور شفاف چھپائی، اس کے الگ گُن ہیں۔ قیمت سولہ روپے ہے۔

سجاد باقر رضوی

سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ: حیات اور کارنامے۔

ڈاکٹر حسینی شاہد

ناشر:۔ انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش ۔ صفحات:۔ ۲۲۴۔ قیمت =/۳۰

ڈاکٹر حسینی شاہد قدیم اُردو کے اُن فاضل محققوں میں سے ایک ہیں جن کی تحریروں اور تصانیف نے طالبانِ ادب کے علم میں غیر معمولی اضافہ کیا ہے۔ "سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ حیات اور کارنامے" لحاظ سے ایک ایسی کتاب ہے جس کو پڑھ کر ایسی بہت سی گتھیاں سُلجھ جاتی ہیں جن پر اب تک اہلِ علم دل طویل بحثیں کرتے رہے ہیں۔ امین الدین اعلیٰ سرزمین بیجاپور کے اُن اولیائے عظام کے خاندان سے تعلق رکھتے جن کے فیض سے سرزمین دکن صدیوں فیض یاب ہوتی رہی ہے۔ حضرت امین الدین اعلیٰ کے دادا میران جی شمس العشاق اور والد حضرت برہان الدین جانم تھے۔ ان دونوں حضرات کی تصانیف

بھی قدیم اُردو ادب کا گراں بہا سرمایہ ہیں۔ ڈاکٹر حسینی شاہد نے اپنی اس تصنیف کو سات ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے باب میں سیاسی، سماجی اور تہذیبی پس منظر بیان کیا ہے۔ دوسرے باب میں امین الدین اعلیٰ اور ان کے خاندان کے حالات مستند مآخذ کے حوالوں سے تحریر کئے ہیں۔ تیسرے باب میں تصوف، چوتھے اور پانچویں باب میں تصانیفِ نظم و نثر کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لے کر چھٹے باب میں زبان کا مطالعہ کیا ہے۔ ڈاکٹر حسینی شاہد نے اس کتاب کے لکھنے میں بڑے جگر کادی اور جان سوزی کا ثبوت دیا ہے اور ایسے مآخذ کو استعمال کیا ہے جو اس سے پہلے کہیں استعمال نہیں ہوئے تھے۔

اس کتاب کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر حسینی شاہد ایک صاف ذہن کے مالک ہیں اور ادر انھیں مواد کے ڈھیر میں سے موتی چننے کا ہنر آتا ہے، نہ صرف موتی چننے کا بلکہ انہیں ربط دے کر خوبصورت ہار بنانے کا بھی پورا سلیقہ ہے۔ پوری کتاب میں کہیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ حسینی شاہد صاحب نے نتائج اخذ کرنے میں عجلت سے کام لیا ہے۔ "حالات" کا باب یقیناً اپنی جگہ اہم ہے لیکن جس طور پر انھوں نے خاندانِ امینیہ کے نظامِ تصوف کو سمجھایا ہے یہ ایک ایسا کام ہے جس سے اہل تحقیق دامن بچاتے ہیں اور شاہد صاحب نے اس باب کو پوری محنت و کاوش سے لکھا ہے۔ اس تصنیف کا ایک نہایت اہم باب مطالعۂ زبان ہے جس میں ڈاکٹر حسینی شاہد نے صرف صرفی و نحوی نقطۂ نظر سے حضرت امین الدین کی تصانیف کا جائزہ لیا ہے بلکہ حضرت امین کی زبان کا میراں جی اور جانم کی زبان سے تقابلی مطالعہ بھی کیا ہے۔ یہ باب اپنی نوعیت اور طرزِ مطالعہ کے اعتبار سے منفرد ہے۔ اس نوع کے لسانی مطالعے اُردو زبان میں بہت کم کئے گئے ہیں۔

اس کتاب میں بہت سے ضمنی مسائل ایسے آئے ہیں جو غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں اور حسینی شاہد کا یہ کہنا کہ "ان نتائج کی روشنی میں محققین کو اپنی پرانی رایوں پر نظرِ ثانی کرنی پڑے گی" اپنی جگہ بالکل درست ہے۔ اس کتاب کی محنت کی داد اتنے مختصر سے تبصرے میں نہیں دی جاسکتی۔ یہ چند سطور تو میں نے محض اس لئے لکھ دی ہیں تاکہ اہل علم اس کتاب کی اہمیت سے واقف ہوسکیں۔ میں اس تصنیف کو اُردو ادب میں ایک گراں بہا اضافہ سمجھتا ہوں اور گزشتہ دس سال میں لکھی جانے والی اس نوع کی تصانیف میں اسے بہت بلند مقام دیتا ہوں۔ ——— ڈاکٹر جمیل جالبی

اقبال اور بعض دوسرے شعراء: —— خواجہ منظور حسین

صفحات ۵۶۳ ۔ قیمت ۹۶ روپے۔ ناشر نیشنل بک فاؤنڈیشن

"اقبال اور بعض دوسرے شعراء" ایک ایسے ذہن اور حافظہ کی عکس ریز شعاع ہے جو اردو اور فارسی کے شعری ادب کی نہایت کی خبر رکھتا ہے، انگریزی ادب کے ہر جہت اور ہر رُخ کا مزاج داں ہے نیز مشرقی اور مغربی علوم و حکمت پر نہ صرف گہری نظر رکھتا ہے بلکہ امتزاجی تنقیدی نظر بھی رکھتا ہے۔

شمع محفل اقبال ہیں اور ان کے گرد بعض دوسرے شعراء میں فیضی، صائب، نظیری، غالب، سنائی، رومی، حافظ، میر، سودا، حسرت، یگانہ، جگر، فراق، فیض، ن۔م۔ راشد ہی نہیں نئی نسل کے شعراء میں سلیم احمد (ص ۲۰۲) حمایت علی شاعر (ص ۲۰۰) انور شعور (ص ۲۰۰) شہزاد احمد (ص ۲۱۱) افتخار عارف (ص ۲۲۳) مجروح سلطان پوری (ص ۲۳۱) وغیرہ بھی پہلو نشیں نظر آتے ہیں، اور یورپی زبان کے شعراء میں شیکسپیئر، ملٹن، ورڈز ورتھ، شیلے، کیٹس، ایلیٹ، ازرا پاؤنڈ، ییٹس وغیرہ نظر آتے ہیں —— اور ان شعراء کا ذکر اقبال سے متعلقہ کسی بحث کی گرہ کشائی کے سلسلے میں در آیا ہے اور کہیں بطور حوالۂ کلام یا پیرایۂ بیان۔

کلامِ اقبال کے فلسفیانہ خیالات و داعیات کی شرح و تعبیر، توضیح و وضاحت پر کتابوں کا ایک قطب مینار بن چکا ہے، جیتا جاگتا اقبال نظروں سے اوجھل ہو چکا ہے۔ کثرتِ تعبیر میں شاعر اقبال گم کر دیا گیا ہے۔ یہ کتاب اسی گم کردہ اقبال کی بازآفرینی کی ایک کامیاب کوشش ہے۔

خواجہ منظور حسین نے اردو اور فارسی ادبیات کے تناظر میں کلامِ اقبال کی تفہیم کی ہے اور ان کے افکار کا جائزہ معروضی نقطۂ نظر سے اُن کے کلام کے پس منظر میں لیا ہے۔ انھوں نے اقبال کے شعری وجدان، مآخذ، فنی نزاکتوں، بصری تمثال، برہنہ گوئی، شعورِ طنز و مزاح، پیرایۂ بیان اور لب و لہجہ کی گرہیں کھولتے ہوئے اپنے مافیہ کی قابلِ اعتماد وضاحت اور لطفِ سخن دوبالا کرنے کے لئے معتد بہ مقدار میں اردو اور فارسی شعراء کے ہم معنی و ہم آہنگ کلام بھی بطور حوالہ پیش کئے ہیں جن سے کلامِ اقبال کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے اور یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ اقبال فارسی اور اردو

ادب کے تناظر میں کس مرتبے کے شاعر تھے۔

یہ کتاب عملی تنقید کی ایک اہم کڑی ہے۔ عملی تنقید، جو نو بہ نو تنقیدی نظریوں میں کھو چکی ہے، ادب کی حقیقی تفہیم کے تعلق سے اس کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس کتاب میں فاضل مصنف کوئی نیا گوشۂ مطالعہ پیش نہیں کرتے (اور شاید مقصود نظر بھی یہ نہ رہا ہوگا)، وہ محض اقبال کی حقیقی روح تک رسائی کا اہتمام کرتے نظر آتے ہیں۔ کہیں فاضل مصنف نے کسی مجمل بیان کی صراحت کی ہے مثلاً فیضی سے اقبال کی فیض یابی کے باب میں خلیفہ عبدالحکیم کے گونگے بیان کی وضاحت کر کے فیضی اور اقبال کے رشتے کی تحدید کی ہے اور کہیں اقبال کے فکر و نظر کے سمجھنے میں جب ناقدانِ اقبال نے ٹھوکر کھائی ہے تو انہوں نے تقبلہ اس کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً حسن عسکری کے نظریۂ فن پر تنقید (ص: ۵۶ و ۱۵۳) ۔ اور کہیں فاضل مصنف نے کسی ناقدِ اقبال کی تائید و حمایت کا فرض ادا کیا ہے مثلاً اقبال نراجی نہ تھے۔ وہ کسی قسم کے نراج STATELESS SOCIETY کے تصور کے ہم نوا نہ تھے، لیکن فاضل مصنف کسی غیر ملکی طالب علم کے ادعیہ کی تائید و حمایت میں یوں رطب اللساں ہوئے "اقبال کے مجوزہ نظام میں نراج کی حمایت کا جو پہلو نکلتا ہے، وہ اُن کے خودی اور قوت کے تصور سے پوری طرح ہم آہنگ نہیں" (ص: ۳۷-۳۳۶) وہ مقامات نہایت پُر مایہ ہیں، جہاں فاضل مصنف اقبال سے دوسرے شعرا خصوصاً فیضی، صائب، ورڈز ورتھ اور غالب کی ہم آہنگی اور ہم نوا آواز کی کیفیات کی نشان دہی کرتے ہیں یا اقبال کے پیرایۂ بیان کے حُسن کے انکشاف کے لیے دانتے، شیکسپیئر، ملٹن، ورڈز ورتھ، شیلے، کیٹس وغیرہ کے پیرایۂ بیان کی جھلکیاں دکھاتے ہیں یا سنائی، رومی، حافظ، نظیری وغیرہ کے سبق آموزی کے بعض پیرائے پر روشنی ڈالتے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب سات ابواب اور ۴۵۶ صفحات پر مشتمل ہے اور صفحہ در صفحہ گُل و لالہ کی بہار ہے یہ کتاب خصوصاً ایسے ذوقِ ادب رکھنے والوں کے لئے سرمایۂ بصیرت ہے جو اقبال کو بڑا فلسفی اور چھوٹا شاعر سمجھتے ہیں۔ یوسف حسین خان، ڈاکٹر احسن فاروقی، اور سلیم احمد نے جس انداز میں شاعر اقبال کو دریافت کرنے کی کوشش کی ہے، یہ کتاب اُسی اُفقی مطالعے کی توسیع اور شاعر اقبال کی بازیابی کے تعلق سے ایک تابناک مشعلِ امید کی حیثیت رکھتی ہے ——— ادارہ

تحریک جد و جہد بطور موضوعِ سخن ——— خواجہ منظور حسین

ناشر: نیشنل بک فاؤنڈیشن صفحات ۲۰۰ قیمت

زیرِ نظر کتاب "تحریک جد و جہد بطور موضوعِ سخن" نو ابواب اور ۴۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس تصنیف میں ایک خاص عہد کے شعری ادب کا مطالعہ تاریخی تناظر میں کیا گیا ہے۔ امیر خاں کی سرافگنی، سید احمد بریلوی کی تحریک، اور ۱۸۵۷ء کی جد و جہد آزادی کے اثرات کی داستان ذوق، مومن، غالب، آتش اور دوسرے شعراء کے کلام سے اخذ کی ہے اور علامہ اقبالؒ پر سید صاحب کے اثرات کی نشان دہی کی ہے۔ فاضل مصنف نے یہ نقطۂ نظر پیش کیا ہے کہ مذکورہ سیاسی واقعات نے اردو کے شعری ادب کو نیا موضوعِ سخن دیا اور نوبہ نو استعارے اور علائم و رموز نے زبان کی تشکیلِ جدید اور تحویلِ معنوی کا رُخ اختیار کیا۔

اس کتاب کے مصنف خواجہ منظور حسین کی ساری عمر ادب کی تعلیم و تفہیم میں بسر ہوئی ہے۔ اُنھوں نے اٹھارہ سال علی گڑھ میں اور دس سال لاہور کے گورنمنٹ کالج میں انگریزی زبان و ادب کا درس دیا۔ اس کے بعد قریباً دس سال تک پاکستان کی یونیورسٹیوں کے مشترک باہمی امور سے سروکار رہا۔ اُنھوں نے بڑی کاوش اور دقتِ نظر کے ساتھ اس نازک ادبی موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ غزل نے اپنے مخصوص علامات و رموز کے ذریعے غمِ جاناں کے ساتھ غمِ دوراں کا اظہار کیا ہے۔ ائمۂ نفسیات کی یہ متفقہ رائے ہے کہ کوئی فنکار، خواہ وہ غزل گو ہی کیوں نہ ہو، اپنے عہد کے سیاسی و فکری میلانات، مادی محرکات، معاشرتی اقدار، تاریخی احوال، ثقافتی اطوار اور روحانی کوائف سے کُلی طور پر لاتعلق اختیار نہیں کر سکتا۔ وہ اپنے عہد کے نشاط و الم، طرب و کرب اور اسلوبِ حیات سے اثر پذیر ہوتا ہے۔ نظم شاعری میں اثر پذیری کے نقوش واضح اور نمایاں ہوتے ہیں اور غزلیہ شاعری میں تہ در تہ "گل و بلبل" اور "بادہ و ساغر" کے حجاباتِ اسفر حائل ہوتے ہیں۔ "جورِ آسمان" اور "ستمِ باغباں" کے پردے میں حکایتِ عالمِ وقت بیان ہوتی ہے۔ غزل کی طرح داری اسی تہ داری میں مضمر ہے۔ کثرتِ تعبیر اس کا خاصہ ہے۔ لہٰذا محض داخلی شواہد پر خواجہ صاحب نے قناعت نہیں کی ہے۔ انھوں نے اپنے موقف کو مدلّل بنانے کے لئے مندرجہ باتوں کو بھی پیش نظر رکھا ہے:

۱ ۔ زیر مطالعہ شعراء کے کلام کی تاریخی ترتیب۔

۲ ۔ خارجی شواہد کی جمع آوری اور تحقیق و تدقیق اور اطلاق ۔

۳۔ علائم و رموز کی معنویت کا تعین اور تحویلِ معنوی کی وضاحت ۔

زیر نظر کتاب اس لحاظ سے بھی قابلِ قدر ہے کہ اس سے "ادب برائے ادب" کے نظریے کا بطلان ہوتا ہے اور کلاسیکی ادب کو تاریخی تناظر میں چھاننے پھٹکنے کی تحریک ہوتی ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ اردو کی غزلیہ شاعری گوشت پوست کی محبوباؤں کے غمزۂ ناز و ادا کے سوا بھی کچھ ہے۔ غزل کے پیچھے میں زندگی کی ہر جہت اور ہر رُخ کا بیان ہوا ہے۔ شرط یہ ہے حجاب اٹھا دے کوئی۔ اور بلاشبہ خواجہ صاحب نے بدرجۂ اتم یہ فریضہ ادا کیا ہے۔ ماورائے سخن کی گرفت آسان نہیں ہوتی ——————— (ادارہ)

ایوانِ غزل (ناول) ——— جیلانی بانو

ناشر :۔ ناولستان جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵، صفحات ۴۶۲، قیمت ۱۶/=

جب تک عورتیں اور مرد، مرد اور عورتوں میں دلچسپی لیتے رہیں گے اچھے ناول تخلیق ہوتے رہیں گے اس دلچسپی میں زمان و مکان اور نسل و رنگ کی کوئی قید نہیں اور نہ ہی دشمنوں سے کوئی سروکار ۔

جیلانی بانو کا ناول "ایوانِ غزل"، اس دلچسپی کی بڑی واضح عکاسی ہے ۔ غزل کا لغوی مطلب ہے عورتوں سے باتیں کرنا۔ اور پھر یہ تو ایوانِ غزل ہے ۔ یعنی بے شمار باتیں، بے شمار عورتیں اور بے شمار باتیں۔ تخت پر سجی بنی سنوری عورتوں سے باتیں، نواڑی پلنگوں اور چھپرکٹوں پر نازنخرے سے پڑی ہوئی عورتوں سے باتیں، کسی اٹوانٹی کھٹوانٹی لیے ہوئے روٹھی رانی سے باتیں، کسی کونے کھدرے میں دبکی ہوئی کنیز زادی سے چھیڑ چھاڑ، مالن، بہشتن اور دھوبن سے کانا پھوسی ۔ کتاب پڑھتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ بہت سی عورتیں اپنی آنکھوں میں ڈھیروں حیرانیاں بھر کر ان نام نہاد شعرائے کرام سے

پوچھتی ہیں "غزل گوئی کا یہ سلسلہ کب ختم ہوگا؟ یعنی عورتوں سے باتیں کرنے کی روایت! ایسے میں پھر کوئی "ایوانِ غزل" کا باسی کسی قیصر، کسی چاند، کسی بتول بیگم یا کسی غزل کو دبوچ اس کے کان کے پاس "کافی بائی کو رر" کرتا ہوا گزر جاتا ہے۔ یہ کہ تم حوّا آدم کی میراث ہو۔ تمہاری پیدائش کا واحد مقصد حوّا کے بیٹے کی ترانی کی سننے کے سوا اور کچھ نہیں۔" ایوانِ غزل" میں جیلانی بانو یہی خیال لیکر چلی ہیں کہ عورت کا واحد مقصد مرد کی جنسی تسکین کے سوا اور کچھ نہیں۔ چار سو باسٹھ صفحے کی اس کتاب میں ہمیں بہت سی عورتیں سر پر پیر رکھے ہوئے اپنے دونوں ہاتھوں سے کانوں کو بند کیے، آنکھوں میں حیرانیاں بھرے چاروں اور دوڑتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ جن کے پیچھے مرد شکاری کتوں کی طرح لگے ہوئے ہیں۔

اس کتاب میں "روشنی کے مینار" اور "موم کی مریم" کی مصنفہ ایک دوسرے انداز سے ہمارے سامنے آتی ہے۔ بے باک، نڈر اور صاف گو۔ جو حقائق اس کے سامنے ہیں ان کا بڑی بے باکی اور فنکارانہ چابکدستی سے سامنا کرتی ہوئی جبکہ ہند و پاک کے بیشتر جغادری ادیب کچھ تو احمقانہ تجربات کی دنیا میں ٹامک ٹوئیے مار رہے ہیں اور کچھ فلسفہ، تاریخ اور مشاہیرِ عالم اور بڑے بڑے ناموں اور دیگر دوسری قسم کی بیساکھیوں کا سہارا لے کر لڑکھڑا کر لڑکھڑا کر چل رہے ہیں۔ ایسے میں جیلانی بانو اپنے مشاہدے، حقیقت نگاری اور زبان اور بیان کی کاٹ کے ساتھ اپنی جگہ پر بڑی مضبوطی سے جمی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ عزیز احمد مرحوم کی ایسی بلندی، ایسی پستی، کے بعد جیلانی بانو دوسری تری مصنفہ ہیں جنھوں نے حیدرآباد کے نوابی خاندان کی پردہ کشائی کی ہے اور حقائق کو اپنے اور اپنے دور کے احساسات اور روایتوں سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اور میرے خیال میں یہ ایک کامیاب کوشش ہے۔ سرحد پار سے آیا ہوا ہندوستانی مصنفہ کا یہ ناول بلاشبہ اُردو کے تخلیقی ادب میں ایک قیمتی اضافہ ہے۔

——— نکہت حسن

توازن ——— محمد علی صدیقی

ناشر ادارۂ عصر نو ۴۲ ہمایوں کالونی کراچی۔ ۱۸

محمد علی صدیقی کے مختلف النوع ۲۶ مضامین کے مجموعے کا نام "توازن" ہے جو ۲۳×۳۶/۱۹ کے ۲۷۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتابت، طباعت اور جلد بندی بہت اچھی ہے۔ قیمت ۲۶/۰

ان مضامین میں محمد علی صدیقی صاحب کا اندازِ نظر ترقی پسند ادبی نقاد اور ترقی پسند اصولِ انتقاد سے مختلف اور امتزاجی نوعیت کا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ موجودہ تنقیدی سانچوں اور اوضاع سے وہ مطمئن نہیں ہیں اور وہ کسی نئے تنقیدی راستے کی تلاش میں ہیں۔ ساتھ ساتھ انہوں نے عصری ادب اور اس کے گوناگوں تقاضوں کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش میں سطح سے نیچے اترنے اور قعرِ دریا میں جھانکنے کی بھی کوشش کی ہے۔ یورپی انواع فلسفہ کے چشموں کا پانی پیا ہے اور اس کے شیریں اور کڑوے کسیلے ذائقے کا گراف تیار کیا ہے۔ قدیم اور جدید ادبی تحریکوں کی فلسفیانہ بُنَت کو ادھیڑ کر دیکھنے کی کوشش کی ہے، جو نو واردانِ بساطِ ادب کا تکیہ کلام ہے۔ جدیدیت، وجودیت، تجریدیت، رمزیت، اثباتیت کا ادب سے کیا رشتہ ہے اور اردو ادب پر ان کے کیا اثرات ہیں ۔۔! اور یوں محمد علی صدیقی کوڈویل کے ناتمام کام کی تکمیل کی جانب بڑھے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ کوڈویل نے مادی نظریہ کی اساس پر اصولِ تنقید وضع کیا تھا اور محمد علی صدیقی اس مجموعے میں محض اثبات و نفی کا گراف بناتے ہیں اور عینی مفکروں اور ادیبوں کو محتاط و مشروط انداز میں مسترد یا قبول کرتے ہیں۔ اُن کا یہی رویہ ترقی پسند ادبی تحریک اور نقادوں کے سلسلے میں نظر آتا ہے کہیں کہیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے ہم عصر ادیب یا شاعر کی شخصیت سے مرعوب ہو گئے ہیں مثلاً یہ بات "ضیاء جالندھری ایک مطالعہ" میں خاص طور پر نمایاں ہے۔

" توازن " ہمارے معاصر ادب کی ایک قابلِ مطالعہ کتاب ہے جس میں محمد علی صدیقی نے فکرِ مغرب کے پس منظر میں اردو کے جدید تر ادب پر ہونے والے اثرات کا نہ صرف گراف بنایا ہو بلکہ اثباتیت موجودیت، جدیدیت، لسانی نراجیت اور اس قسم کے دوسرے منفی رجحانات کی فکری اساس بھی دریافت کی ہے اور ساتھ ساتھ اُن سے رونما ہونے والے المیہ کی نشان دہی بھی کی ہے ——— (ادارہ)

کروچے کی سرگذشت ——— محمد علی صدیقی

صفحات ۱۴۴ - قیمت ۱۲ روپیہ ۴۲ ہمایوں کالونی کراچی - ۱۸

زیر نظر کتاب کروچے کے ذہنی سفر کی داستان ہے - یہ سرگذشت ۱۹۱۵ء میں لکھی گئی - اُس وقت کروچے کی عمر پچاس سال کی تھی - وہ اپنی اہم تصنیفات کی تکمیل کر چکا تھا، جمالیات، لسانیات، تاریخِ ادب، تاریخِ فنون، منطق، نظریہ، تاریخ، اخلاقیات، معاشیات، سیاسیات، نظریہ قانون کے موضوعات پر خیال افروز رسائل و مضامین کی گونج اطالیہ کے باہر بھی سنائی دے رہی تھی اور ہم اُردو والے بھی اُس کے فلسفۂ جمال اور ادب کے رشتے سے روشناس ہو چکے تھے۔ کروچے ادب کو قائم بالوجود اور مقصود بالذات سمجھتا تھا اور ادبی تنقید میں جمالیاتی قدر کی تلاش کرتا تھا - ادب کو اخلاقی، سیاسی، مذہبی، سماجی فرائض و وظائف سے آزاد سمجھتا تھا۔

زیر نظر کتاب کا ۱۹۲۷ء میں انگریزی ترجمہ آکسفورڈ نے شائع کیا تھا - اور پہلی مرتبہ محمد علی صدیقی نے اسے اردو میں منتقل کیا ہے - اور یہ خوشی کی بات ہے کہ انہوں نے ترجمہ کو "طبع زاد" بنانے کی کوشش نہیں کی - اس کتاب کا مقدمہ پروفیسر عبد الحمید کمالی نے لکھا ہے اور انہوں نے کروچے کی فکر کا صاف و شستہ اور سہل زبان میں وضاحت سے جائزہ لیا ہے - انواعِ فلسفہ پر اُن کی نگاہ گہری اور اندازِ تحریر دلکش ہے - کمالی صاحب کا یہ مقدمہ کروچے فہمی کے لئے ایک خاص معنویت کا حامل ہے - اردو کے سرمایہ میں مختلف النوع طریقے سے اضافے کی جو کوشش ہو رہی ہے، ان میں ایک ترجمہ بھی ہے - محمد علی صدیقی کو ہم مبارکباد کا مستحق سمجھتے ہیں کہ انہوں نے ایک اچھی کتاب کا اچھا ترجمہ کیا - (ادارہ)

صفحات - ۱۴۴ قیمت =/۱۲

شیشے کی آبرو ——— قمر عباس ندیم، صفحات ۱۸۸، قیمت ۸ روپے، مکتبۂ دانیال، کراچی ۳

یہ خوش آئند بات ہے کہ شعری ادب کے برعکس اردو کے عصری افسانوی ادب پر وجودیت،

اشاریت، تجربیت، جدیدیت، تجریدیت اور اسی انواع کے درآمدہ نظریوں کا کابوس سوار نہیں۔
نئے افسانہ نگار بڑی خود اعتمادی سے اپنی زمین اور اس کے رنگ روپ پر انحصار کرتے نظر آتے ہیں۔
گذشتہ دو سالوں میں جو افسانوی ادب کے مجموعے شائع ہوئے ہیں، ان میں "کہانی پن" کی خصوصیت پائی جاتی ہے۔

زیر نظر کتاب "شیشے کی آبرو" سولہ افسانوں پر مشتمل ہے۔ قمر عباس ندیم ذہنی طور پر ترقی پسند نظریۂ فکر کے دلدادہ ہیں، لیکن اس مجموعے میں ہماری ملاقات ایک ایسے متجسس نوجوان سے ہوتی ہے جو کسی فکری پیمانے کے بجائے زندگی میں رونما ہونے والے واقعات و حوادث اور اس کے نتیجے میں ابھرنے والے منفی و مثبت کرداروں سے ہمارا تعارف کراتا ہے۔ پیارے بھائی، آمنہ باجی، ساجد ڈبو، شریف ایسے کردار ہیں جنھیں ہم آسانی سے فراموش نہیں کر سکتے۔ زندگی کی بُنت میں ان کے رگ و ریشے کے تار بُنے ہوئے ہیں۔ یہ پیارے لوگ کسی فلسفۂ حیات سے واقف نہیں لیکن زیست کرنا جانتے ہیں۔

قمر عباس ندیم نے ان افسانوں میں نچلے طبقے کی عکاسی بڑی خود اعتمادی سے کی ہے اور ان کی جہدِ حیات، دُکھ سُکھ، کرب و نشاط کی بڑی منہ بولتی تصویریں دکھائی ہیں۔ زبان و بیان، کردار نگاری مکالمہ اور افسانوی تشکیل کے لحاظ سے توازن و تناسب پایا جاتا ہے۔ یہ سب اچھے افسانے ہیں لیکن واقعی بڑے فن پارے کی تخلیق کے لئے یم زندگی کو بلونے کی ضرورت ہے۔ (ادارہ)

میں محسوس کرتا ہوں میں سوچتا ہوں (مجموعۂ کلام) ـــــ احسن علی خان

صفحات ۱۵۲۔ قیمت ۱۲روپے۔ فیروز سنز، صدر روڈ راولپنڈی

اپنی شمع سخن کو تہِ داماں چھپائے رکھنا ہم شاعر لوگوں کا شیوہ نہیں ہے بلکہ اگر استعارہ بدلنے کی اجازت ہو تو ہم میں سے بیشتر "کانا اور بے دوڑی" زیادہ قرینِ مصلحت سمجھتے ہیں۔ نہ جانے احسن علی خان صاحب نے اس کے برعکس اب تک اپنے تعلق سے اظہار کے بجائے اخفاء کا کام لینا کیوں مناسب سمجھا، خیر بالکل ایسا تو نہیں ہے، احباب کی صحبتوں میں اور کبھی کبھار ادبی جرائد کے وسیلے سے میری طرح چند اور پڑھنے اور سننے والے ان کے اشعار سے لطف یاب ضرور ہوتے رہے لیکن اوّل تو یہ حلقہ محدود تھا اور دوم ان فرد فرد منظومات سے ان کے

شیرازۂ خیال کے جملہ اوصاف کا صحیح اندازہ بھی مشکل سے ہوتا ہے۔ اب جو لبوازِ تساہلِ بسیار وہ یہ نسخہ تالیف کر کے سامنے لے ہی آئے ہیں تو کچھ مسرت بھی ہے کہ ہمعصر ادب میں ایک قطعی منفرد اور خیال انگیز مجموعے کا اضافہ ہوا اور کچھ تاسف بھی ہے کہ احسن صاحب کی کم آمیزی کی وجہ سے یہ کتاب جتنی توجہ اور قدردانی کی مستحق ہے وہ شاید ہم نہ پہنچ سکے لیکن مجھے امید ہے کہ وقت اس کی تلافی کردے گا۔

ہماری شاعرانہ لعت پر تغزل کا جو رنگ غالب ہے متقدمین میں سب سے پہلے نظیر اکبر آبادی نے اس سے انحراف کیا تھا لیکن یہ کاوش پیش از وقت تھی اس لئے کلاسیکی روایت کا جزو نہ بن سکی۔ اس کے بعد مولانا حالی اور ان کے رُفقار نے انگریزی شاعری کے تتبع میں مناظرِ فطرت اور اخلاقی مسائل پر روزمرۂ زبان میں طبع آزمائی کی کوشش کی لیکن یہ اپنے دل کی بات نہ تھی اس لئے آگے نہ بڑھ سکی۔ اکبر الٰہ آبادی کے طنزیہ تیر و نشتر زیادہ مقبول ہوئے لیکن یہ میدان بہت جلد صحافی شعرار نے سنبھال لیا۔ پھر حال میں جدت پسند نوجوانوں نے کچھ نئی راہیں تلاش کرنے کی سعی کی لیکن انہیں کچھ تو شاعری کے سُر تال پر پورا عبور نہ تھا اور کچھ ان کے ہاں صادق جذبہ و خیال کم تھا اور منفی قسم کی جھنجھلاہٹ (CYNICISM) زیادہ۔ احسن علی خان صاحب نے ان سب سے الگ طرزِ بیان اختیار کی ہے جس میں غزل کا چٹخارہ نہیں ہے، تشبیہ و استعارہ کے بیل بوٹے نہیں ہیں لیکن ان آرائشوں کے بغیر بھی اچھی شاعری کے سبھی تلازمے موجود ہیں، سوچ، احساس سلاست، اور سلاستِ اظہار، موزونی و آہنگ، اور کفایتِ الفاظ۔

احسن نے اس دفتر کے صرف ایک باب کا عنوان "نیش و نشتر" رکھا ہے، لیکن ان کے جملہ کلام کے لئے یہی عنوان موزوں ہے اس لئے کہ ان کا شیرازہ ایک تُندو تیز طنز و تلخی ہی سے عبارت ہے لیکن یہ طنز و تلخی مردم کیا ہے اس کی جتنی داد دی جائے کم ہے۔ یہ کتاب اردو زبان میں ایک بیش بہا اضافہ ہے۔

(ادارہ)

مجلۂ تحقیق شمارہ ۱-۲ اور ۳-۴ مدیر ڈاکٹر وحید قریشی

کلیۂ علوم اسلامیہ و ادبیات شرقیہ پنجاب یونیورسٹی۔ لاہور۔ قیمت فی شمارہ ۱۰ روپے

ڈاکٹر وحید قریشی بڑی صلاحیتوں کے انسان ہیں۔ جس ادارہ میں وہاں علم و تحقیق کی فضا روشن ہو جاتی ہے۔ برسوں تک وہ صحیفہ لاہور کے مدیر رہے اور اسے ایک ایسا قابلِ ذکر تحقیقی مجلہ بنا دیا کہ برصغیر

کے علمی حلقوں میں آج تک اس کے حوالے آتے ہیں۔ اب انھوں نے پنجاب یونیورسٹی لاہور سے مجلۂ تحقیق کے نام سے ایک اور رسالہ جاری کیا ہے جس میں اُردو، عربی و فارسی زبانوں اور ادیبوں کے بارے میں ایسے اچھے علمی مضامین شائع کئے ہیں کہ یہ رسالہ بھی محققوں اور اہلِ علم کی نظر کا مرکز بن جائیگا۔ ہم ڈاکٹر وحید قریشی کو مجلۂ تحقیق کی اشاعت پر مبارکباد پیش کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ وہ اُسے پابندی کے ساتھ شائع کر کے اسی طرح علم و ادب کی خدمت کرتے رہیں گے۔

_______ (ادارہ)

آداب سلطنت و رسوم معاشرت ـــــــ قمر آستاں بیگم

غضنفر اکیڈمی پاکستان کراچی۔ صفحات ۷۶۰۔ قیمت ۲۵/-

عرب تہذیب و تمدن ہمارا اصلی ورثہ ہے لیکن عربی زبان سے ناواقفیت کی بنا پر ہم اس ورثے سے اپنی آنکھیں روشن نہیں کر سکتے۔ قمر آستاں بیگم نے جو عربی زبان و ادب پر اچھی نظر رکھتی ہیں اردو میں پہلی بار ہمیں عرب ورثے کے گوناگوں پہلوؤں سے روشناس کرایا ہے۔ ابو عبداللہ یاقوت (وفات ۶۲۵ھ) نے مختلف موضوعات پر عربی زبان میں سترہ کتابیں لکھیں جن میں وہ کتاب بھی شامل ہیں جسے دنیا "معجم الادباء" کے نام سے جانتی ہے۔ یہ کتاب چھوٹی بڑی ۱۲ جلدوں پر مشتمل تھی۔ اس میں یاقوت نے ان ادیبوں کا احوال لکھا ہے جنھوں نے عربی زبان کی خدمت کی ہے۔ اس میں نحویین، لغویین، نسابین، بھی شامل ہیں اور شعرا اور ادبا بھی۔ یہ کتاب اپنی وسعت تحقیق اور معلومات کے لحاظ سے آج تک ایک اہم بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں نہ صرف اہلِ علم کے حالات درج ہیں بلکہ اسلامی تہذیب و تمدن، معاشرت وطرزِ زندگی، معاملات اور آداب سلطنت وغیرہ کی ایسی جھلکیاں بھی موجود ہیں کہ اس کے مطالعہ سے چھٹی صدی ہجری تک کے اسلامی تمدن کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ قمر آستاں بیگم نے یاقوت کی اس کتاب کو توجہ سے پڑھا اور مختلف عنوانات کے تحت، زمانی ترتیب سے وہ سلسلہ وار عربی سے اردو میں ترجمہ کر کے یکجا کر دیا جو اس کتاب کے ضخیم صفحات اِدھر اُدھر بکھرا پڑا تھا۔ نتیجہ یہ ہے کہ "آدابِ سلطنت اور رسوم معاشرت" کے مطالعہ سے عرب تہذیب کی ایک بھرپور تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ عربوں نے کس طرح اپنی سلطنت کا انتظام چلایا۔ کون کون سے شعبے قائم کئے۔ عدل و انصاف کو عوام تک

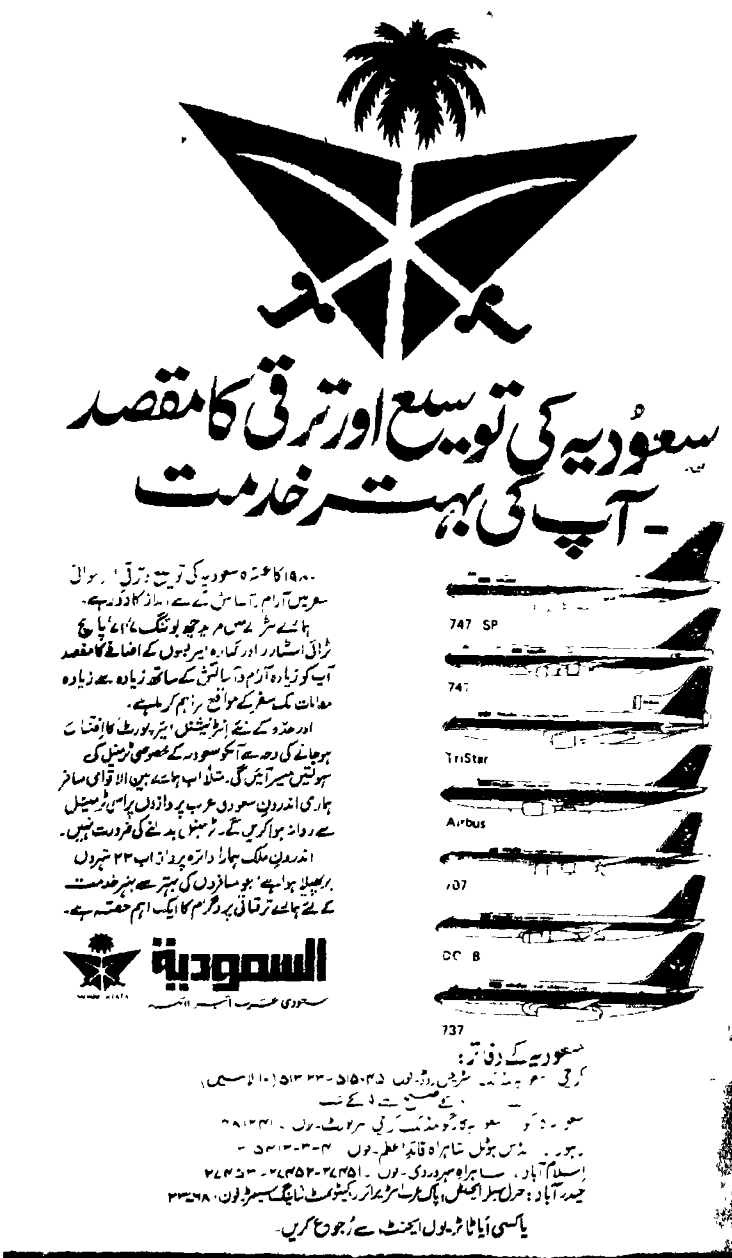
پہنچانے کے لئے انھوں نے کیا کیا طریقے اختیار کئے۔ ان کا طرزِ معاشرت کیا تھا۔ علوم و فنون کی سرپرستی کی کیا نوعیت تھی، لباس، کھانے، زیورات، سامانِ آرائش کیا کیا تھے۔ آدابِ محفل کیا تھے۔ عورتوں کے ساتھ کیسا سلوک کیا جاتا تھا۔ حسن و عشق کا کیا تصور تھا۔ ان کے عام تصورات اور اوہام کیا تھے۔ ان کے کھیل کود اور پسندیدہ مشاغل کیا تھے۔ تہوار، تقریبات اور جلسے جلوسوں کے رنگ تھے، موسیقی و رقص کے کیا ڈھنگ تھے۔ معاشرے میں کیا خرابیاں تھیں۔ لوگوں کا طرزِ عمل کیا تھا۔ ان کے اصولِ تعلیم کیا تھے۔ نصاب اور تعلیم کے مختلف طریقے کیا تھے۔ غرض کہ یہ اور ایسے بے شمار موضوعات اس کتاب میں حوالوں کے ساتھ مرتب کئے گئے ہیں۔ قمر آستاں بیگم نے جس محنت، لگن اور خلوص کے ساتھ یہ کام کیا ہے وہ بیزاری یا بے دلی، افسردگی یا دل گرفتگی کے سبب سے نہیں، بلکہ انسانی ہمدردی اور عدل و انصاف سے دل بستگی کے سبب ہے، چنانچہ ان کی سوچ میں احساس کی گرمی اور احساس میں سوچ کی کھنک انتہائی موثر ہے۔

مجھے امید ہے کہ یہ مجموعہ اہلِ دل اور اہلِ نظر حلقوں میں مقبول اور مستحسن ہوگا

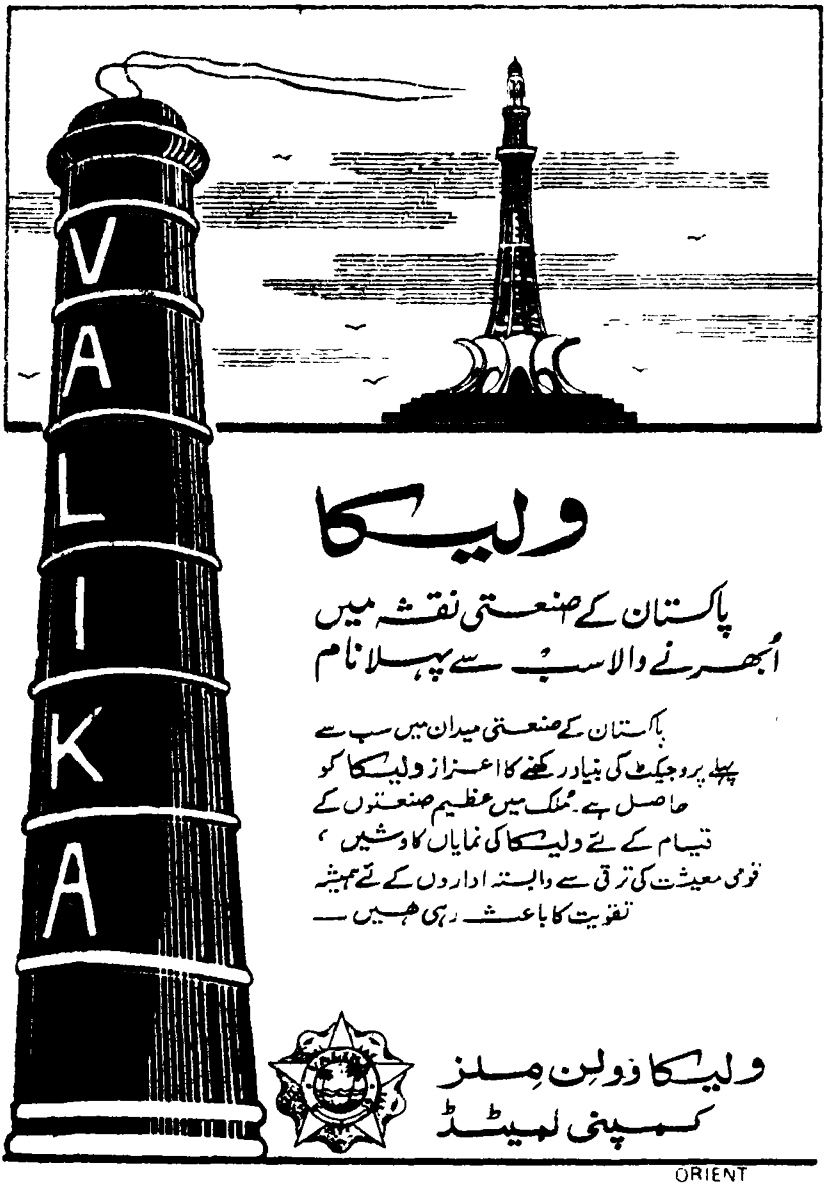
فیض احمد فیض


men demand
CAPSTAN
the world over
CAPSTAN
FILTER


ہم نے دیکھا تم نے دیکھا
دیکھ چکا جگ سارا
سب سے اچھا بیٹری سیل
تھری اسٹار ہمارا
3-STARS
3-STARS
پاکستان بیٹری
مینوفیکچرنگ کمپنی لمیٹڈ۔ ایس آئی۔ ٹی۔ ای۔ کراچی
adcom 155–2


سعودیہ کی توسیع اور ترقی کا مقصد
- آپ کی بہتر خدمت
۱۹۸۰ کا عشرہ سعودیہ کی توسیع، ترقی اور ہوائی
سفر میں آرام و آسائش کے نئے انداز کا دور ہے۔
ہمارے بیڑے میں مزید جمبو بوئنگ ۷۴۷، پانچ
ٹرائی اسٹار اور کشادہ ایئر بسوں کے اضافے کا مقصد
آپ کو زیادہ آرام و آسائش کے ساتھ زیادہ سے زیادہ
مقامات تک سفر کے مواقع فراہم کرنا ہے۔
اور جدہ کے نئے انٹرنیشنل ایئرپورٹ کا افتتاح
ہو جانے کی وجہ سے آپ کو سعودیہ کے خصوصی ٹرمینل کی
سہولتیں میسر آئیں گی۔ مثلاً اب جاتے ہیں الاقوامی مسافر
ہماری اندرون سعودی عرب پروازوں پر اسی ٹرمینل
سے روانہ ہوا کریں گے۔ ٹرمینل بدلنے کی ضرورت نہیں۔
اندرون ملک ہمارا دائرہ پرواز اب ۲۳ شہروں
پر پھیلا ہوا ہے، جو مسافروں کی بہتر سے بہتر خدمت
کے لئے ہمارے ترقیاتی پروگرام کا ایک اہم حصہ ہے۔
السعودية
سعودی عرب ایئر لائنز
747 SP
747
TriStar
Airbus
707
DC 8
737
سعودیہ کے دفاتر:
اسلام آباد، شاہراہ سہروردی۔ فون ۲۷۴۵۱-۲۷۴۵۲-۲۷۴۵۳
حیدر آباد: جنرل سیلز ایجنٹ، پاک عرب ٹریڈرز، گیسٹ ہاؤس ٹریڈ سینٹر، فون ۲۳۰۶۸
یا کسی آیاٹا ٹریول ایجنٹ سے رجوع کریں۔

NATIO


VALIKA
ولیکا
پاکستان کے صنعتی نقشہ میں
اُبھرنے والا سب سے پہلا نام
پاکستان کے صنعتی میدان میں سب سے
پہلے پروجیکٹ کی بنیاد رکھنے کا اعزاز ولیکا کو
حاصل ہے۔ ملک میں عظیم صنعتوں کے
قیام کے لئے ولیکا کی نمایاں کاوشیں،
قومی معیشت کی ترقی سے وابستہ اداروں کے لئے ہمیشہ
تقویت کا باعث رہی ہیں ۔
ولیکا وولن ملز
کمپنی لمیٹڈ
ORIENT



اورینٹ ایڈورٹائزرس لمیٹڈ
سرگرم عمل
ORIENT ADVERTISERS LIMITED
28th
MILESTONE OF MASS COMMUNICATIONS
on job
ORIENT
ADVERTISERS
LTD
194-A, Sindhi Muslim Housing Society,
Karachi-3
Phone 430133 - 35
LAHORE 61286
ISLAMABAD 25909
PESHAWAR 72777
QUETTA 72976

ایک قابلِ مطالعہ کتاب

اُردو افسانہ : روایت اور مسائل

مرتبہ

پروفیسر گوپی چند نارنگ

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں

مارچ ۱۹۸۰ء کے آخری تین دنوں میں "ہندو پاک اردو افسانہ سیمینار" منعقد ہوا۔ اس کتاب میں نہ صرف وہ مقالات شامل ہیں جو سیمینار میں پڑھے گئے بلکہ فاضل مرتب نے وہ معرکتہ الآرا مضامین بھی شامل کر دیئے ہیں جو معتبر نقادوں نے اردو افسانے کے بارے میں وقتاً فوقتاً لکھے۔

۳۴۷ صفحات پر مشتمل یہ خوبصورت کتاب اپنے موضوع و مواد کے اعتبار سے ایک ایسا یادگار مجموعہ ہے جس کے مطالعے سے اردو افسانے کی بھرپور تصویر سامنے آجاتی ہے۔

اس کتاب کی ایک قابلِ ذکر بات یہ بھی ہے کہ اُردو میں ایسی خوبصورت کتابیں بہت کم شائع ہوتی ہیں ضخامت حسنِ طباعت، عمدہ آفسٹ کاغذ، خوبصورت گیٹ اپ، مضبوط سنہرے ٹھپے کی جلد، جاذبِ نظر سرورق کو دیکھتے ہوئے قیمت بھی نہایت مناسب ہے یعنی ۷۵ روپے۔

ناشر:- ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔ لال کنواں دہلی ۱۱۰۰۰۶



کچھ مشروبات محض پیاس بہلاتے ہیں اور کچھ پیاس بھڑکاتے ہیں
لیکن رُوح افزا پیاس بجھاتا ہے۔
رُوح افزا
مشروبِ مشرق
ہمدرد
ہم خدمتِ خلق کرتے ہیں
آوازِ اخلاق
قیامت کے دن ترازو میں
جو چیز سب سے زیادہ بھاری ہوگی
وہ حُسنِ اخلاق ہوگا
HRA